سلسلۂ دار المصنفین (۶۰)

بسلسلۂ تاریخ اسلام

دولتِ عثمانیہ

سلطنتِ عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریۂ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل

جلد اوّل

از عثمان اوّل سنہ ۶۸۷ھ / ۱۲۸۸ء تا مصطفیٰ رابع سنہ ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء

مرتبہ

محمد عزیر ایم اے (علیگ)

رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

باہتمام

مولوی مسعود علی ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

سنہ ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء

۷۸۶

فہرست مضامین

دولتِ عثمانیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ دولت عثمانیہ

دار المصنفین نے تاریخ اسلام کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی آخری کڑی تاریخ دولت عثمانیہ ہے، جس کو ہمارے رفیق مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے نے تقریباً سات برس کے مطالعہ اور محنت کے بعد لکھا ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کی یہ پہلی تاریخ ہے جو اردو زبان مین لکھی گئی ہے، اس سے پہلے ہماری زبان مین اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض یورپین مصنفون کے تراجم اور خیالات تھے،

اس تاریخ کی دوسری خصوصیت اس کی جامعیت ہے یعنی یہ کہ یہ ترکون کی شروع سے موجودہ زمانہ کی پوری تاریخ ہے اور اس لحاظ سے بھی اس کی حیثیت اہم ہے،

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کی مختلف جلدین جیسے جیسے تیار ہوتی جائینگی چھپتی جائینگی چنانچہ اس کا پہلا حصہ چھپ چکا ہے، دوسرا زیر طبع ہے،

تاریخ دولت عثمانیہ دو حصون مین ختم ہوگی، پہلا حصہ آج شائع ہورہا ہے، اور دوسرا پریس مین جانے کو تیار ہے،

سید سلیمان (ناظم دار المصنفین)

۷ شوال ۱۳۵۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

عثمانی ترک جن کا یہ نام کسی نسل یا قوم کی طرف نہین بلکہ اُن کے پہلے فرمانروا عثمان خان کی طرف منسوب ہے، ایشیاے کوچک مین پہلے خانہ بدوشون کی حیثیت سے داخل ہوے پھر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتون مین شمار کی جانے لگی، تین سو برس گذرنے نہ پاے تھے کہ عثمانی سلطنت وسعت اور طاقت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان سلطنت بن گئی، اس کے عروج کا دور مشرق مین سلطان سلیم اوّل اور مغرب مین سلیمان اعظم کی فتوحات پر ختم ہوتا ہے، جس کی حکومت ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسیع حصون مین قائم تھی، اس عہد مین عثمانی ترک ایک مرکزی یوروپین طاقت تھے، ہنگری ان کے زیر نگین تھا، اور آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کی دیوارون تک اُن کی فوجین پہنچ چکی تھین، ان کی ہیبت سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی،

لیکن سلیمان اعظم کی زندگی ہی مین سلطنت کے اندر بعض کمزوریون کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے جو اس کی وفات کے بعد روز بروز نمایان ہوتے گئے، سلیمان کے بعد جتنے سلاطین تخت پر بیٹھے ان مین سے معدودے چند کے علاوہ کسی مین سلطنت عثمانیہ

کی فرمانروائی کی اہلیت جیسی چاہئے نہ تھی، چنانچہ جس طرح آہستہ آہستہ اس سلطنت کا عروج ہوا تھا اسی آہستگی کے ساتھ اس کا زوال بھی شروع ہوا، اور اس کے زوال کی مدت بھی اس کے عہدِ عروج کی طرح تین سو سال ہے، ان مین سے آخری ڈیڑھ سو برس مین سلطنت عثمانیہ اپنے سے کہین زیادہ طاقتور سلطنتون کا مقابلہ کرتی رہی، مگر اندرونی کمزوریون کے باعث ایسی پے درپے شکستین اٹھائین کہ بالآخر ۱۹۱۸ء مین اس کا خاتمہ ہو گیا،

حال مین جمہوریہ ترکیہ نے اپنے چند سالہ قیام مین ان تمام کمزوریون کو جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی کا باعث ہوئی تھین دور کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس کوشش مین اس کی کامیابی تاریخ عالم کے حیرت انگیز کارنامون مین سے ہے، اس نے گذشتہ سلطنت کے کھنڈر پر ایک مستحکم قلعہ تعمیر کر لیا ہے جو ترکی قوم کے عزم و استقلال کی ایک زندہ مثال ہے، یورپ کا "مرد بیمار" دم توڑنے کے بعد نہ صرف جی اٹھا بلکہ اس کے اندر صحت و شباب کی ساری قوتین عود کر آئین تاآنکہ بیسوین صدی کی عیسائی دنیا کو بھی اس معجزہ کا قائل ہونا پڑا،

ذیل کے صفحات ان ہی واقعات کی تفصیل پر مشتمل ہین، یہ سرگذشت بارہا بیان ہو چکی ہے، تاہم اپنے اندر کچھ ایسی کیفیت رکھتی ہے کہ تکرار سے جی نہین گھبراتا ترکون نے اسلام کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہین، دفاع و جہاد کے فرض کو جس سرفروشی سے ادا کیا ہے، اس کا اعتراف جتنی بار بھی کیا جائے کم ہے، صرف یہی ایک چیز ہر اس تالیف کیلئے معقول وجہ ہو سکتی ہے جو عثمانی ترکون کے کارنامون پر ترتیب دیجائے، لیکن اگر اس کے علاوہ صحتِ روایات کا بھی حتی الامکان پورا پورا اہتمام کیا گیا ہو، اور محض واقعات کے بیان کرنے پر قناعت نہ کی گئی ہو، بلکہ اسباب و علل کی تلاش بھی رہی ہو، اور اس قوم کے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ عبرت کی نظر سے کیا گیا ہو تو مرتب کے لئے شاید کسی معذرت کی

ضرورت نہین،

ان صفحات کی ترتیب مین عثمانی ترکون کی تاریخ سے متعلق انگریزی، عربی اور فارسی کی مستند ترین کتابون نیز بعض منتخب ترکی اور فرانسیسی تاریخون کے ترجمون سے مدد لی گئی ہے، اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ حتی الامکان فروگذاشت نہین کیا گیا ہے،

محمد عزیز (علی گڈہ)

۱۴ اگست ۱۹۳۹ء

ترک

ترک اول اول چھٹی صدی عیسوی میں روشناس ہوتے ہیں، یہ ایک خانہ بدوش قوم تھی جو مشرقی ایشیا اور وسط ایشیا میں گھومتی پھرتی تھی، اور وقتاً فوقتاً مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کی آبادیوں پر حملہ آور ہو کر انھیں ویران کر دیتی تھی، چھٹی صدی عیسوی میں اس نے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی، اس سلطنت کے بانی کا نام چینی تاریخوں میں "تومین" (Tumen) اور ترکی کتبوں میں "بومین" (Bumin) درج ہے، تومین ۵۵۲ء میں مرگیا، اس کے بھائی نے جس کا نام "استامی" (Istami) تھا مغرب میں فتوحات حاصل کیں، دونوں بھائی الگ الگ حکومتوں پر حکمراں تھے، اہل چین ان حکومتوں کو شمالی ترکوں کی سلطنت اور مغربی ترکوں کی سلطنت کہتے تھے، پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں ان دونوں حکومتوں کو سلطنت چین کی اطاعت قبول کرنی پڑی، لیکن ۶۳ھ ہجری (۶۸۲ء) میں شمالی ترکوں نے چین کی فرماں روائی سے آزاد ہو کر اپنی سابق خود اختیاری پھر حاصل کر لی، کتبات "اورخان" جو منگولیا کے دریائے اورخان کے نام سے منسوب ہیں، اور ترکی زبان کی قدیم ترین یادگار ہیں، ترکوں کی اسی شمالی سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سلطنت ۱۲۶ھ ہجری (۷۴۴ء) تک قائم رہی، مغربی ترکوں میں "ترگیش" (Turgesh) کا قبیلہ سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس کے

سرداروں نے پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے آخر میں خاقان کا لقب اختیار کر لیا تھا، لیکن ۱۲۱ھ ہجری (۷۳۹ء) میں عربوں نے نصر بن سیار کی قیادت میں ترگیش کی حکومت کا خاتمہ کر دیا،

ترک اسلام میں | ترکوں اور عربوں کے تعلقات پہلی صدی ہجری میں ولید اول کے عہد خلافت سے شروع ہوئے، اسی عہد میں قتیبہ بن مسلم نے بیکند، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) فرغانہ، شاش (تاشقند) اور کاشغر کے ترکی علاقے فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کی، لیکن ان فتوحات کا اثر ترکوں کے قبول اسلام پر بہت کم پڑا، اور وہ بدستور بت پرستی کرتے رہے، البتہ سمرقند میں قتیبہ کی بت شکنی نے بت پرستی کا بھی خاتمہ کر دیا، جب قتیبہ وہاں پہنچا تو اسے بہت سے بتخانے نظر آئے جن کی نسبت عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ ان کے ساتھ بے ادبی کرنے والا فوراً ہلاک ہو جائیگا، قتیبہ نے ان بتخانوں میں آگ لگا دی، مگر اس پر کچھ آنچ نہ آئی، یہ دیکھکر بت پرستوں نے اسلام قبول کر لیا[1]،

حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے مختصر عہد خلافت (۹۹-۱۰۱ھ مطابق ۷۱۷-۷۲۰ء) میں اشاعت اسلام کی خاص طور پر کوشش کی، تو منجملہ اور ممالک کے انھوں نے ماوراء النہر کے (ترک) بادشاہوں کو بھی اسلام کی دعوت دی، اور ان میں سے بعض اسلام لائے[2]، پھر عبد اللہ بن معمر الیشکری کو دعوت اسلام کے لئے ماوراء النہر بھیجا، اور وہاں کے بعض قبیلے مسلمان ہو گئے، اس کے بعد خلیفہ ہشام کے عہد (۱۰۵-۱۲۵ھ مطابق ۷۲۴-۷۴۳ء) میں ابو صیدا کی تبلیغ سے ماوراء النہر کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے، سمرقند اور بخارا وغیرہ سے

---

[1] "دعوت اسلام" از آرنلڈ، مطبوعہ علی گڈھ ص ۲۳۸ (The Preaching of Islam by T. W. Arnold)

[2] فتوح البلدان، از بلاذری، مطبوعہ قاہرہ ص ۴۳۲،

جو ترکستان کے علاقے تھے جزیہ اور خراج کی رقمیں بیت المال میں آتی تھیں، خراج کے سلسلہ میں ترکستان سے لونڈیاں اور غلام بھی بھیجے جاتے تھے، جو رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے لگے، پھر بھی معتصم باللہ کی خلافت (۲۱۸-۲۲۷ھ مطابق ۸۳۳-۸۴۲ء) تک ترکوں میں اسلام کی اشاعت عام طور پر نہ ہو سکی، سب سے پہلے خلیفہ منصور (۱۳۶-۱۵۸ھ مطابق ۷۵۴-۷۷۵ء) نے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا لیکن اس کے عہد میں ان کی جماعت بہت قلیل تھی، اور فوج اور حکومت میں صرف عربوں اور ایرانیوں کا اقتدار تھا، ہارون الرشید کے زمانۂ خلافت میں اہلِ عرب اور اہلِ فارس کے درمیان جو حریفانہ کشمکش پیدا ہوئی، اس نے امین کے زوال کے ساتھ عربوں کی قوت کا بھی خاتمہ کر دیا، اور مامون کے عہد میں جس کی ماں ایرانی النسل تھی ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا، اس کے بعد جب معتصم خلیفہ ہوا تو اس نے ایرانیوں کے اقتدار سے خائف ہو کر ترکوں سے مدد حاصل کرنی چاہی، اور چونکہ اس کی ماں ترک تھی، اس لئے طبعاً اسے ترکوں کی جانب میلان بھی تھا، چنانچہ اس نے ہزاروں ترک غلام خرید کر انھیں اسلامی تعلیم اور فوجی تربیت دی، اور اب فوج میں ترکوں کی تعداد اور قوت تیزی کیساتھ بڑھنے لگی، گبن لکھتا ہے کہ "معتصم نے جو اس خطرناک مثال کا سب سے پہلا بانی ہے پچاس ہزار سے زیادہ ترکوں کو دار الخلافت میں لاکر آباد کیا"[۱] اس نے ان کے لئے طلاکار ریشمی لباس تجویز کیا، اور زریں پٹکے وردی میں شامل کئے، جس کی وجہ سے ترکی دستے دوسری فوجوں سے ممتاز معلوم ہوتے تھے، ہر سال ہزاروں ترک غلام پایہ تخت

---

[۱] تاریخ زوال روما از گبن، جلد ۴ ص ۴۷ مطبوعہ فریڈرک وارن اینڈ کمپنی، لندن ۱۸۹۰ء،
(Decline and Fall of the Roman Empire. by E. Gibbon. Vol. IV. Frederick warne & Co London -1890

میں لائے جاتے تھے، ان میں سے کچھ محافظ شاہی دستہ میں داخل کئے جاتے تھے، اور باقی فوج میں بھرتی ہوتے تھے، جو اپنی قابلیت میں زیادہ ممتاز ہوتے تھے وہ فوجوں کے سپہ سالار مقرر کئے جاتے تھے، جوں جوں ترکوں کی قوت فوج میں بڑھتی گئی، عربی دستے کم ہوتے گئے، ترکوں کو چونکہ خلیفہ کی خاص سرپرستی حاصل تھی، اس لئے وہ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے، اور بغداد کی سڑکوں پر بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے تھے، جس سے اکثر عورتیں اور بچے ٹکرا کر زخمی ہوجاتے تھے، اور بعض اوقات مر بھی جاتے تھے، اس لئے بغداد کے باشندے ان کے مظالم سے بہت جلد عاجز آگئے، جب معتصم کے پاس ان کی شکایتیں کثرت سے پہنچنے لگیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ ترکوں کے لئے بغداد سے باہر ایک چھاؤنی بنائی جائے، اس غرض کے لئے اس نے سامرا کا مقام پسند کیا، جو بغداد سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، یہ مقام اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے اس کا نام بدل کر سرمن رأے (جس نے دیکھا خوش ہوا) رکھ دیا، فوجی بارکوں کے علاوہ خلیفہ اور وزراء کے لئے بھی عالیشان محل تیار کئے گئے، اور چونکہ معتصم نے بغداد کا قیام ترک کرکے اپنی ترک سپاہ کے ساتھ سامرا میں رہنا شروع کر دیا تھا، اس لئے رعایا کے ہر طبقہ کے لوگ اسی نئے شہر میں آکر آباد ہونے لگے، اور تھوڑے ہی دنوں میں سامرا ایک نہایت پررونق شہر بن گیا، وہ سنہ ۲۲۱ھ سے لیکر سنہ ۲۶۹ھ (سنہ ۸۳۶ء لغایۃ سنہ ۸۹۴ء) تک سات خلفائے عباسیہ کا دار السلطنت رہا، جب معتمد تخت پر بیٹھا تو اس نے سامرا کو چھوڑ کر پھر بغداد کو پایۂ تخت بنایا۔

معتصم کی ترک نوازی کی وجہ سے رفتہ رفتہ ترکی شہزادے اور امراء بھی ترکستان سے آکر سامرا میں آباد ہونے لگے، جنمیں بعض بت پرست اور بعض آتش پرست تھے، اور بعض مسلمان ہوگئے تھے، دار الخلافت میں رہنے کے بعد غیر مسلم ترکوں میں بھی اسلام پھیلنے لگا،

اور اس تعلق سے ماوراء النہر کے ترکوں میں جو اپنے وطن میں مقیم تھے اسلام کی اشاعت ہونے لگی، ترک سرداروں کے اسلام قبول کر لینے سے ان کے جرگے اور قبیلے بھی مسلمان ہوتے گئے، چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں ترک بطوع خاطر بکثرت اسلام میں داخل ہوئے، ۳۴۹ھ ہجری (۹۶۰ء) میں دو لاکھ ترک گھرانے (خیمے) مسلمان ہوئے[1]، ابن اثیر کا بیان ہے کہ ماوراء النہر کی ایک ترکی قوم کے دس ہزار گھرانے جو بلاساغون اور کاشغر کے نواح میں اسلامی علاقوں پر دھاوے مارا کرتے تھے، صفر ۴۳۵ھ (ستمبر ۱۰۴۳ء) میں اسلام لائے[2]۔

خلیفہ معتصم کے بعد ترکوں کا اقتدار فوج و حکومت میں روز بروز بڑھتا گیا، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ خلیفہ بغداد کا عزل و نصب تمام تر انہی کے ہاتھ میں آگیا، نہ صرف تخت بلکہ خلیفہ کی زندگی بھی انہی کے رحم و کرم پر تھی، انھوں نے متعدد خلفاء کو ذلیل کرکے تخت سے اتارا اور بعضوں کو قتل بھی کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دولت عباسیہ کا زوال سلطنت کے ہر حصہ میں نمایاں ہونے لگا، مختلف صوبوں کے گورنروں نے پایۂ تخت سے آزاد ہو کر اپنی اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں، مثلاً ایرانی گورنروں نے خراسان میں طاہریہ، فارس میں صفاریہ، ماوراء النہر میں سامانیہ، آذربیجان میں ساجیہ اور جرجان میں زیاریہ کی جداگانہ حکومتیں قائم کر لیں، اسی طرح ترکوں نے مصر میں طولونیہ، ترکستان میں ایلکیہ، پھر مصر میں اخشیدیہ اور افغانستان و ہند میں دولت غزنویہ کی بنیاد ڈالی، یہ تمام حکومتیں تیسری صدی کے وسط سے چوتھی صدی ہجری کے وسط تک قائم ہو گئیں، پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں ترکوں کے ایک گروہ نے خراسان میں دولت سلجوقیہ

---

[1] ابن اثیر جلد ۸ صفحہ ۳۹۶ مطبع بریل، تجارب الامم از ابن مسکویہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۱۔ [2] ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۳۵۵ مطبع بریل

کا سنگ بنیاد رکھا،

آل سلجوق | آل سلجوق کا مورث اعلیٰ دقاق تھا جو کاشغر کے ترکی قبائل کا ایک رئیس تھا، سلجوق جس کے نام سے یہ خاندان مشہور ہے اسی کا لڑکا تھا، سلجوق اپنے غیر مسلم ترک فرماں روا کو چھوڑ کر بخارا کی اسلامی مملکت میں چلا آیا، اور یہاں وہ اور اس کا پورا قبیلہ مسلمان ہو کر بخارا کے قریب مقام جند میں قیام پذیر ہوا، اس کے بعد اس نے غیر مسلم ترکوں پر فتوحات حاصل کر کے اپنی قوت بہت بڑھالی،

سلجوق نے اپنی وفات کے وقت تین لڑکے چھوڑے، ارسلان، میکائیل اور موسیٰ دولت سلجوقیہ کے وارث میکائیل کے تین لڑکے ہوئے، بیغو، طغرل بیگ، جعفر بیگ، لیکن سلطنت کی فرماں روائی طغرل بیگ کو ملی جس نے اپنے زور و قوت کا سکہ گرد و پیش کے ملکوں پر بٹھا دیا، محمود غزنوی نے سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر ان سے جنگ شروع کر دی، لیکن چند عارضی فتوحات کے بعد اس کو اور اس کے لڑکے مسعود کو شکستیں اٹھانی پڑیں، اور آل سلجوق تمام خراسان پر قابض ہو گئے، اس کے بعد انھوں نے جرجان طبرستان، اور خوارزم پر بھی قبضہ کر لیا، اور پھر طغرل بیگ نے اصفہان، تبریز، اور حلوان کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب بغداد میں ترکوں اور آل بویہ کی باہمی مخاصمت نے سخت بد امنی پھیلا رکھی تھی، خلیفہ معتصم کے بعد دولت عباسیہ پر روز بروز ترکوں کا تسلط بڑھتا گیا، لیکن چوتھی صدی ہجری سے آل بویہ نے اپنا اقتدار خلافت بغداد پر قائم کرنا شروع کیا، جس سے ترکوں کی قوت پر اثر پڑنے لگا، ان حریفوں کی کشمکش نے تمام سلطنت میں ہنگامہ برپا کر دیا اور بغداد کی حالت خصوصیت کے ساتھ بد سے بدتر ہونے لگی، مجبور ہو کر ترک سرداروں نیز خلیفہ قائم بامر اللہ نے طغرل بیگ

طغرل بیگ

کو اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے طلب کیا، چنانچہ طغرل بیگ رمضان ۴۴۷ھ ہجری (دسمبر ۱۰۵۵ء) میں بغداد میں داخل ہوا، اور ملک رحیم کو گرفتار کرکے دولت آل بویہ کا خاتمہ کردیا، اب بغداد میں آل سلجوق کا اثر قائم ہوگیا، خلیفہ نے "سلطان شرق و غرب" کے خطاب سے طغرل بیگ کی عزت افزائی کی، اس کے بعد طغرل بیگ نے عراق، موصل اور دیار بکر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، پھر الپ ارسلان کے دور حکومت میں ایشیائے کوچک اور شام بھی فتح ہوگیا اور ملک شاہ نے ۴۸۵ھ ہجری (۱۰۹۲ء) میں عدن اور یمن پر بھی قبضہ کرلیا، اس طرح پانچویں صدی سے ساتویں صدی ہجری تک خلیفہ بغداد کے ایشیائی مقبوضات کا بیشتر حصہ آل سلجوق کے زیر نگیں رہا،

سلاجقۂ روم | اس خاندان کا بانی سلیمان بن قطلمش تھا، قطلمش طغرل بیگ کے سرداروں میں تھا، لیکن بعد میں اس نے الپ ارسلان کے خلاف بغاوت کرکے خود مختاری حاصل کرلی، اور بالآخر ۴۵۶ھ ہجری (۱۰۶۴ء) میں رے کے قریب جنگ میں مارا گیا، اس کا بیٹا سلیمان قسمت آزمائی کے لئے ایشیائے کوچک میں چلا آیا اور ۴۷۰ھ ہجری (۱۰۷۷ء) میں نائسیا پر جو بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور شہر تھا، قبضہ کرکے اسے اپنا پایہ تخت بنایا، اور ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، ۴۷۷ھ (۱۰۸۴ء) میں اس نے انطاکیہ کو بھی اپنی حکومت میں شامل کرلیا، لیکن پہلی جنگ صلیبی میں سلاجقۂ روم کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، ۴۹۰ھ (۱۰۹۷ء) میں نائسیا ان کے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا، اور اسی کے ساتھ ایشیائے کوچک کے مغربی حصہ میں بھی ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور اس علاقہ پر بازنطینیوں کا قبضہ ہوگیا، اب صرف ایشیائے کوچک کا اندرونی حصہ ان کے پاس رہ گیا تھا، لیکن وہاں بھی دانشمندیوں سے مقابلہ تھا، غرض چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں سلاجقۂ روم کی حالت بہت نازک

نظر آتی تھی لیکن مسعود بن قلیج ارسلان نے اس گرتی ہوئی سلطنت کو سنبھالا، اور قونیہ کو
پایۂ تخت بنا کر ایک مضبوط حکومت قائم کی، اس کے جانشین قلیج ارسلان ثانی نے اپنی
فتوحات سے سلطنت میں اضافہ کیا، اور دانشمندیوں کو مغلوب کر کے انھیں اپنا محکوم بنایا، ۵۸۸ھ
(۱۱۹۲ء) میں قلیج ارسلان ثانی کا انتقال ہوگیا، اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا بیٹا غیاث الدین
کیخسرو اول تخت نشین ہوا، اس نے بازنطینیوں سے جنگ کر کے انطاکیہ کے بندرگاہ پر قبضہ کر لیا
اور اس کے بعد اس کے جانشین عز الدین کیکاؤس اول نے سنوپ کو بھی فتح کر لیا، عز الدین
کیکاؤس اور اس کے بعد علاء الدین کیقباد کا دور حکومت شان و شکوہ کے لحاظ سے سلاجقۂ
روم کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، لیکن غیاث الدین کیخسرو ثانی ہی کے عہد ۶۳۶-۴۴ھ ہجری
مطابق (۱۲۳۸-۴۶ء) سے سلطنت کا زوال شروع ہوگیا جو پھر نہ رکا، اس دوران میں تاتاری طوفان
ایشیائے کوچک کی سرحد تک پہونچ چکا تھا، اور ارض روم اور سرحدی قلعوں پر تاتاریوں
کا قبضہ ہوگیا تھا، آخر کار ۶۴۱ھ ہجری (۱۲۴۳ء) میں کوزاداغ کی جنگ نے دولت سلجوقیہ
کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، اور آل سلجوق کی آزادی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی، صلح کے بعد تاتاری
چلے گئے، لیکن ۶۴۳ھ ہجری (۱۲۴۵ء) میں کیخسرو ثانی کی وفات پر جب اس کے تینوں لڑکوں
کی مشترکہ حکومت کی وجہ سے سلطنت میں بدنظمی پیدا ہوئی تو تاتاریوں نے پھر حملے شروع کر دیئے
اس درمیان میں ایک لڑکا مر گیا، اور تخت کے دعویدار بقیہ دو لڑکے عز الدین اور رکن الدین
رہ گئے، ہلاکو نے سلطنت کو ان دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا، مغربی صوبے عز الدین
(کیکاؤس ثانی) کو اور مشرقی رکن الدین (قلیج ارسلان رابع) کو دیئے، لیکن حکومت در اصل
تاتاریوں کی تھی، اور سلاطین سلجوقیہ کا عزل و نصب انہی کے ہاتھوں میں تھا، تاتاریوں
کے تشدد سے عاجز آکر امرائے سلطنت نے اہل مصر سے مدد کی درخواست کی، اور مصریوں

نے ایشیائے کوچک میں تاتاریوں کو شکست دیکر بھگا دیا، لیکن ان کی واپسی کے بعد تاتاریوں نے پوری طرح انتقام لیا، اور دولتِ سلجوقیہ کے رہے سہے اقتدار کو بھی خاک میں ملا دیا، سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر متعدد امرار نے مختلف صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم کرلیں، ان میں بنو کرمان اور بنو اشرف اپنی قوت و اثر کے اعتبار سے زیادہ ممتاز تھے، تاتاریوں نے بار بار ان خودسر امیروں کو زیر کرنے کی کوشش کی، مگر عارضی شکستوں کے بعد یہ اپنا اقتدار پھر قائم کر لیتے تھے، اور ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے زوال پر انھوں نے مستقل حکومتیں قائم کرلیں، چنانچہ دولت سلجوقیہ کے خاتمہ کے قریب ایشیائے کوچک میں صاروخاں، قرہ سی، ایدین، تکہ، حمید، کرمانیہ، کرمیان، قسطمونی اور منتشا کی خودسر حکومتیں قائم ہوچکی تھیں،

ارطغرل

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کی ابتدا میں شاہانِ خوارزم کی قوت اوجِ شباب پر تھی، وہ ایران (خراسان) اور شام (عراق) میں آلِ سلجوق کے بیشتر مقبوضات پر قابض ہو چکے تھے اور ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو فتح کرلینا چاہتے تھے، لیکن عین اس وقت جب وہ اس حوصلہ کی تکمیل کے لئے تیار ہو رہے تھے چنگیز خانی طوفان اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اٹھا، اور سلطنت خوارزم کو پاش پاش کر ڈالا، اس سلطنت کی تباہی کے بعد ترکی قبائل جنوب کی طرف بھاگے، ان میں سے بعض ایران اور شام میں پہونچے، اور وہاں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں بہت کچھ اقتدار حاصل کیا، اور ترکمانی مشہور ہوئے، اور بعض جنوب کی طرف بڑھے، اور مصر کے سلاطین مملوک سے معرکہ آرا ہوئے، جو خود ترکی النسل تھے، لیکن مصر میں انھیں شکست ہوئی، اور وہاں سے واپس ہوکر وہ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں سے آملے، انہی ترکی قبائل میں جو چنگیز خاں کے حملہ کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے، ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا، یہ قبیلہ ترکان اوغوز کے قبیلہ کا ایک جزو تھا جو ارطغرل کے باپ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں اپنے وطن خراسان کو چھوڑ کر مختلف ملکوں میں گھومتا ہوا شام کی طرف جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا، قبیلہ کا بیشتر حصہ اس وقت منتشر ہو گیا، لیکن جو

لوگ رہ گئے، وہ ارطغرل اور اس کے بھائی دوندار کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے اور سلطان علاء الدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہو گئے،

پہلا معرکہ | یہ جماعت جو صرف چار سو بیس[1] گھرانوں پر مشتمل تھی، سلطان علاء الدین کے زیر سایہ پناہ لینے کے لئے پایہ تخت قونیہ کی طرف جا رہی تھی، کہ راستہ میں انگورا کے قریب ارطغرل کو دو فوجیں مصروف جنگ نظر آئیں، وہ کسی فریق سے واقف نہ تھا، لیکن یہ دیکھکر کہ انمیں سے ایک تعداد کے لحاظ سے کمزور اور دوسری قوی ہے، اپنے سواروں کے مختصر دستہ کے ساتھ جن کی مجموعی تعداد صرف چار سو چوالیس تھی کمزور فریق کی حمایت کے لئے بڑھا، اور اس جانبازی سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا، فتح حاصل کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ جس فریق کی اس نے یوں بروقت مدد کی تھی وہ سلطان علاء الدین سلجوقی کی فوج تھی، جسے تاتاریوں کی ایک بڑی فوج نے گھیر رکھا تھا،

سنگ بنیاد | ارطغرل کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان علاء الدین نے اسے سغوت کا زرخیز علاقہ جو دریائے سقاریہ کے بائیں جانب بازنطینی سرحد کے قریب واقع تھا جاگیر میں عطا کیا اور سغوت کا شہر بھی اسے دیا، اس علاقہ میں ارطغرل اور اس کے ساتھیوں نے جو خراسان اور آرمینیا سے آئے تھے، بود و باش اختیار کی، علاء الدین نے ارطغرل کو اس جاگیر کا سپہ دار بھی مقرر کر دیا، چونکہ ارطغرل کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی، اسلئے بازنطینی قلعداروں سے اکثر جنگ کی نوبت آتی رہتی تھی، ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی شجاعت کا سکہ بٹھا دیا، اور اس کی فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے

---

[1] "ترکی سلطنت" از لارڈ ایورسلے ص ۱۳ (The Turkish Empire - by Lord Eversley)

ترکی قبائل جو ایشیائے کوچک میں پہلے سے آباد تھے، اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے، اور اس کی لڑائیوں میں شریک ہونے لگے، اس طرح اس کی قوت روز بروز بڑھتی گئی، اور اس کا اقتدار گردوپیش کے علاقوں میں قائم ہونے لگا،

سلطان علاء الدین کے لئے ایک جاگیردار کا اس طرح قوت و اقتدار حاصل کرلینا تشویش کا باعث ہوتا، لیکن ایشیائے کوچک میں دولت سلجوقیہ اندرونی اختلال اور امراء کی بغاوتوں کے سبب سے زوال کی آخری منزل میں تھی، اگرچہ قونیہ میں سلاجقۂ روم کی قدیم شان و شوکت اب بھی نمایاں تھی، تاہم حکومت کا دائرہ بہت محدود رہ گیا تھا، ایک طرف تاتاریوں نے جنوبی اور مشرقی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا، تو دوسری طرف عیسائیوں نے شمال اور مشرق کے قدیم بازنطینی صوبوں کے اکثر حصے واپس لے لئے تھے، وسطی اور جنوبی حصہ میں متعدد سلجوقی سرداروں نے خودمختار حکومتیں قائم کرلی تھیں، سرحدی علاقوں میں جنگ کا سلسلہ عموماً جاری رہتا تھا، اور تاتاری حملوں کا خطرہ کبھی دور نہیں ہوتا تھا، ایسی حالت میں ارطغرل جیسے دلیر سردار اور نائب کی فتوحات سے علاء الدین کو بجائے تشویش کے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا، اور اس نے ارطغرل کو مزید انعامات عطا کئے، چنانچہ جب ینی شہر اور بروصہ کے درمیان ایک جنگ میں ارطغرل نے علاء الدین کے نائب کی حیثیت سے تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو شکست دی، تو سلطان نے اس کے صلہ میں اسکی شہر کو بھی اس کی جاگیر میں دے دیا، اور پوری جاگیر کا نام سلطانونی (صدر سلطانی) رکھا، نیز ارطغرل کو اپنے مقدمۃ الجیش کا سپہ سالار مقرر کیا، اس وسیع علاقہ میں بکثرت چراگاہوں اور زرخیز زمینوں کے علاوہ متعدد قلعے بھی تھے، مثلاً قراجہ حصار، بلے جیک، اینیگی وغیرہ، لیکن سلطانونی کے اکثر حصوں پر خود سرامیروں کا قبضہ

تھا، اور اس جاگیر پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے ارطغرل اور اس کے بعد عثمان کو دونوں جنگ کرنی پڑی، ہلال سلطان علاءالدین کے علم کا نشان تھا، ارطغرل نے بھی اس کے نائب کی حیثیت سے اسی نشان کو اختیار کیا، جو آج تک ترکوں کی عظمت کا قومی نشان ہے[1]

۶۸۷ھ ہجری (۱۲۸۸ء) میں ارطغرل نے نوے سال کی عمر میں انتقال کیا، اور سغوت کے قریب دفن ہوا،

---

[1] تاریخ ترکان عثمانی، از کریسی جلد ۱ ص ۵، (History of the Ottoman - Yurks by Edward creasy)

عثمان خاں اوّل

سنہ ۶۸۷ھ تا سنہ ۷۲۶ھ مطابق سنہ ۱۲۸۸ء تا سنہ ۱۳۲۶ء

ارطغرل کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا عثمان اس کا جانشین ہوا، یہ دولت عثمانیہ کا بانی اور سلطنت عثمانیہ کا پہلا تاجدار ہے، ارطغرل نے اپنے زور و قوت اور دولت سلجوقیہ کے تفرق و انتشار کے باوجود کبھی خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا، اور گو سلجوقی امراء نے سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر متعدد خود سر حکومتیں قائم کر لی تھیں، لیکن وہ خود آخر دم تک سلطان قونیہ کا ایک وفادار جاگیردار ہی رہا، عثمان نے بھی یہی روش اختیار کی، اور اپنی فتوحات سے سلطان کی شان و شوکت کو ایک حد تک محفوظ رکھا،

یہ وہ زمانہ تھا جب دولت سلجوقیہ دم توڑ رہی تھی اور ایشیائے کوچک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اس بنا پر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے اس سے بہتر موقع عثمان کو نہیں مل سکتا تھا، لیکن اس نے اپنی توجہ زیادہ تر بازنطینی علاقوں کی طرف مبذول رکھی، جس کے مختلف اسباب تھے، پہلی وجہ تو یہ تھی کہ خود اس کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی، اور بازنطینی سلطنت کی کمزوری روز بروز نمایاں ہوتی جارہی تھی، یہ اسی کمزوری اور شہنشاہ قسطنطنیہ کی ایک سیاسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ کوہ المپس (Olympus)

کے دروں کی حفاظت نہ ہو سکی، اور ترک بتھینیا (Bithynia) کے میدانوں میں داخل ہوگئے، شہنشاہ پلیلوگس (Palaeologus) کے عہد تک ان دروں کی حفاظت اس علاقہ کی رعیت (میلیشیا) کے سپرد تھی، اور وہ لوگ اس خدمت کے معاوضہ میں ٹیکسوں سے بری تھے لیکن اس کے بعد شہنشاہ نے اس رعایت کو منسوخ کر دیا، اور دروں کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی، نیز خراج کی رقم سختی سے وصول کرنی شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دروں کی حفاظت میں غفلت ہونے لگی، اور وہ جفاکش پہاڑی لوگ محض کسان ہو کر رہ گئے، جن میں نہ کوئی جوش باقی رہا، اور نہ فوجی نظم و تادیب[1]، بازنطینی سلطنت جو کسی زمانہ میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی، فرقہ وارانہ جنگوں اور انتہائی بدنظمیوں میں مبتلا تھی، جس کے باعث اس میں کسی طاقتور حریف کے مقابلہ کی قوت باقی نہیں رہی تھی، ایشیائے کوچک میں اس کے سابق مقبوضات میں سے صرف چند شہر مثلاً بروصہ، نائسیا، نائکومیڈیا، اور ان کے نواحی اضلاع باقی رہ گئے تھے، جو شمال مغرب میں واقع تھے، نیز باسفورس اور بحر مارمورا کے ساحلی خطے ابھی تک قسطنطنیہ کے زیر حکومت تھے، اناطولیہ کے بقیہ تمام علاقے جو پہلے بازنطینی سلطنت میں داخل تھے، اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے، عثمان کے لئے بازنطینی علاقوں کی طرف متوجہ ہونے کی دوسری وجہ اسلام کی تبلیغ تھی، تیسری وجہ بازنطینیوں سے برسرپیکار ہونے کی یہ تھی کہ عثمان کے لئے دوسری جانب قدم بڑھانے کی گنجائش نہ تھی، سلجوقی امراء جنھوں نے خود سر حکومتیں قائم کر لی تھیں طاقت میں اس سے بڑھے ہوئے تھے،

قراجہ حصار

لیکن ان ترغیبات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ عثمان نے با اقتدار ہونے کے ساتھ ہی حملے شروع کر دیئے، اس کی لڑائیاں ابتداءً مدافعانہ تھیں، بازنطینی قلعہ دار دولت سلجوقیہ

[1] گبن "تاریخ زوال روما" جلد ۴ صفحہ ۳۸۱،

کے سرحدی علاقوں پر وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتے رہتے تھے، سلطان قونیہ کے ایک نائب کی حیثیت سے عثمان کو ان حملہ آوروں کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھنا پڑا، پہلے ہی سال قراجہ حصار کا معرکہ پیش آیا، عثمان نے اس قلعہ کو فتح کرکے بازنطینیوں کو آئندہ کے لئے متنبہ کر دیا، سلطان علاء الدین نے قراجہ حصار اور اس کے گرد و پیش کی تمام اراضی جو عثمان نے بزور شمشیر حاصل کی تھی، اسے جاگیر میں دیدی، نیز بک کے خطاب سے سرفراز کرکے اسے اپنا سکہ جاری کرنے اور اپنا نام جمعہ کے خطبہ میں شامل کرنے کی بھی اجازت دی، اس طرح لقب کے علاوہ بادشاہی کے تمام امتیازات عثمان کو حاصل ہو گئے،

استقلال، یہ کمی بھی چند سالوں کے بعد پوری ہو گئی، ۶۹۹ سنہ ہجری (۱۳۰۰ء) میں تاتاریوں نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا، اور اسی جنگ میں سلطان علاء الدین مارا گیا، بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا قاتل خود اس کا لڑکا غیاث الدین تھا جس نے تخت سلطنت کی خاطر ایسا کیا،[۱]
بہر حال تاتاریوں نے غیاث الدین کو بھی قتل کر دیا، اور ایشیائے کوچک میں دولت سلجوقیہ کا خاتمہ ہو گیا، اب عثمان بالکل آزاد اور خود مختار تھا، اور آئندہ اس نے تمام فتوحات ایک خود مختار فرماں روا کی حیثیت سے حاصل کیں،

سلجوقی امرا میں عثمان کا سب سے بڑا حریف امیر کرمانیہ تھا، چنانچہ ایشیائے کوچک کے ترکوں کی سرداری اور پورے ملک کی حکومت کے لئے فریقین کے درمیان عثمان کی زندگی ہی میں جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جو اس کے متعدد جانشینوں کے عہد تک جاری رہا، خود عثمان نے بھی امیر کرمانیہ کو کئی بار نیچا دکھایا، لیکن سلطنت بازنطینی کے زرخیز مقبوضات زیادہ تر اس کی توجہ کا مرکز تھے، اور اس کی زندگی کے آخری چھبیس (۲۶) سال کے کارنامے

[۱] تاریخ دولت علیہ عثمانیہ، از محمد فرید بک، مطبوعہ مصر ۱۳۱۴ سنہ ہجری، ص ۳۱،

میں بازنطینی ہی شہروں اور قلعوں کی فتوحات نمایاں ہیں،

عثمان کے کارنامے تاہم عثمان کا مقصد زندگی صرف فتوحات کا حاصل کرنا اور گردوپیش کی یاستوں کو اپنا مطیع بنانا نہ تھا، ۶۹۹ھ ہجری (۱۲۹۱ء) سے ۶۹۷ھ ہجری (۱۲۹۸ء) تک اس نے اپنی توجہ تمامتر حکومت کے انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی، حکومت کے مختلف شعبے قائم کرکے حکام کا تقرر کیا، اور رعایا کی فلاح و بہبود کے انتظامات میں مصروف رہا، لیکن دوسرے ترک سرداروں نے جو عثمان کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھے، اسکی خاموشی کو ضعف پر محمول کیا، اور بازنطینی قلعداروں سے اتحاد کرکے اس کے مقبوضات پر حملہ آور ہوئے، اس طرح جنگ کا جو سلسلہ ۶۹۷ھ ہجری (۱۲۹۸ء) میں چھڑا وہ ابتداءً عثمان کی طرف سے بالکل مدافعانہ تھا، لیکن ان حملہ آوروں کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، عثمان نے ان سب کو شکست دی، نواح کے چھوٹے چھوٹے سرداروں کو مطیع کیا، بازنطینی قلعے یکے بعد دیگرے فتح کئے اور بالآخر ینی شہر پر قبضہ کرکے اسے اپنی مملکت کا پایہ تخت بنایا، ۷۰۱ھ ہجری (۱۳۰۱ء) میں عثمان کو تاکومیڈیا سے متصل قیون حصار کے مقام پر پہلی بار شہنشاہ قسطنطنیہ کی باقاعدہ افواج سے مقابلہ پیش آیا، جس میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی، اور چھ سال کے اندر اس کی فتوحات کا دائرہ بحر اسود کے ساحل تک پہنچ گیا، بازنطینی قلعے پے در پے مسخر ہوتے گئے، اور بروصہ، نائسیا اور تاکومیڈیا کے گرد فوجی چوکیوں کا ایک مضبوط حصار قائم ہوگیا، اس خطرہ کو دور کرنے کی غرض سے بازنطینیوں نے تاتاریوں کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، عثمان نے اپنے لڑکے اورخاں کو حملہ آوروں کے مقابلہ میں بھیجا، تاتاریوں کو سخت شکست ہوئی اور بازنطینیوں کی امید کی یہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی،

فتح بروصہ اور عثمان کی وفات ۷۱۷ھ ہجری (۱۳۱۷ء) میں عثمان نے بروصہ کا محاصرہ کیا، جو

ایشیائے کوچک میں سلطنت بازنطینی کا ایک نہایت اہم شہر تھا، محاصرہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، بالآخر ۷۲۶ھ ہجری (۱۳۲۶ء) میں عاجز آکر محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے اور شہر کو خالی کر دیا، اور ترکی فوج اورخاں کی سرکردگی میں فاتحانہ طور پر بروصہ میں داخل ہوئی، عثمان اس وقت سغوت میں بستر مرگ پر تھا لیکن وفات سے قبل اورخاں یہ خوشخبری لیکر اس کے پاس پہنچ گیا، عثمان نے اورخاں کی ہمت و شجاعت کی داد دے کر اسے اپنا جانشین مقرر کیا، اور بلا تفریق تمام رعایا کے ساتھ یکساں عدل و انصاف اور بھلائی کرنے کی وصیت کی، پھر یہ ہدایت کی کہ اسے بروصہ میں دفن کیا جائے، اور اس شہر کو عثمانی مملکت کا پایہ تخت بنایا جائے، چنانچہ اس وصیت کے مطابق اسے بروصہ میں دفن کیا گیا، اور اس کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

سلطنت عثمان دولت عثمانیہ کا پہلا تاجدار ہے، اس بنا پر عموماً اس کے نام کے ساتھ "سلطان" کا لقب بھی شامل کر دیتے ہیں، لیکن خود اس نے اور اس کے بعد اورخاں اور مراد اول نے صرف "امیر" ہی کا لقب اختیار کیا[۱]، ارطغرل کی وفات پر اس کے مقبوضات کا دائرہ صرف اسکی شہر اور چند مواضعات پر ختم ہو جاتا تھا، عثمان نے اپنی اڑتیس سال کی حکومت میں اس دائرہ کو جنوب میں کوتاہیہ اور شمال میں بحر مارمورا اور بحر اسود کے ساحلوں تک وسیع کر دیا، اس کی قلمرو کا طول تقریباً ۱۲۰ میل اور عرض تقریباً ۶۰ میل تھا[۲]، آبادی صرف ترکوں پر مشتمل نہ تھی، بلکہ بیشتر علاقے چونکہ سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات سے حاصل کردہ تھے، اس لئے آبادی میں ایک بڑی تعداد یونانی اور سلافی باشندوں کی بھی تھی جو بجوشی

---

[۱] کریسی، جلد ۱ ص۱، [۲] "ترکی سلطنت" از لارڈ اورسلے ص۱۵، مطبوعہ لندن ۱۹۲۴ء،
(The Turkish Empire, by Lord Eversley)

مسلمان ہو کر ترکوں میں شامل ہو گئے تھے، ایورسلے لکھتا ہے کہ یہ عیسائی کسی جبر سے اسلام نہیں لائے کیونکہ تاریخ میں نہ تو قیدیوں کے قتلِ عام کا کوئی ذکر ہے اور نہ بحیثیت غلام انھیں فروخت کرنے کا، بلکہ ان کے اسلام لانے کی وجہ یہ ہوئی کہ قسطنطنیہ کے یونانیوں نے جو فطری طور پر ان کے محافظ تھے، انھیں چھوڑ دیا تھا[1]، اسلام میں داخل ہونے کے بعد فاتح اور مفتوح کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو گئے، اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی جو دوسری ترکی ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی اور اپنے کو "عثمانی" کہتی تھی،

عثمان کا اسلام اس موقع پر خود عثمان اور اس کے قبیلہ کے اسلام لانے کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے، اب سے بیس بائیس سال قبل تک یہ امر عموماً مورخین کے نزدیک مسلّم تھا کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی ایشیائے کوچک میں داخل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے لیکن ۱۹۱۶ء میں مسٹر ہربرٹ گبنس نے اپنی مستند تالیف "اساسِ سلطنتِ عثمانیہ"[2] کو شائع کر کے یہ تازہ تحقیق پیش کی، کہ سغوت میں بودوباش اختیار کرنے کے وقت عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ بت پرست تھے، مسٹر گبنس کے دلائل حسب ذیل ہیں:-

تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں خراسان اور ماوراء النہر کے دوسرے علاقوں کی جو قومیں ایشیائے کوچک کی سرحد پر نمودار ہوئیں ان کے اسلام لانے کا کوئی صریح ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا، ان سے پہلے کے ترک حملہ آور جب اس ملک میں داخل ہوئے تو وہ کئی پشتوں سے عربی اسلام کے زیر اثر رہتے آئے تھے، چنانچہ آلِ سلجوق بھی مسلمان ہی تھے لیکن بعد کے آنے والے ترک جن میں عثمان پیدا ہوا کچھ بہت زیادہ اسلام کے زیر اثر نہیں

---

[1] ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے ص ۱۲ مطبوعہ لندن ۱۹۲۴ء،

[2] The Foundation of the Ottoman Empire. by H. Adams Gibbons. New York, 1916.

رہے ہے، خود عثمانیوں کے مورخ نشری کے بیان سے بھی صاف اشارہ ملتا ہے کہ عثمان کا مورث
اعلیٰ سلیمان شاہ اور اس کے ساتھی جو اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے، اور پچاس ہزار
گھرانوں پر مشتمل تھے، غیر مسلم تھے، وہ کہتا ہے کہ ان میں سے کچھ شامی ترکمانوں کے آباؤ
اجداد تھے، اور بقیہ اون تمام خانہ بدوش قوموں کے جو روم میں ادھر ادھر پھرا کرتی تھیں اور خود نشری کے زمانہ
میں بھی موجود تھیں، بارہویں صدی عیسوی اور اسکے بعد کے سیاحوں کی بکثرت شہادتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا
ہے، کہ یہ قومیں بت پرست تھیں، اُن مختلف ترکی قبیلوں نے جو اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک
میں داخل ہوئے، جب عثمان کا قبیلہ وہاں آیا، ملک کے مغربی حصہ میں پہونچ کر اپنے آپ کو
ایک اسلامی ماحول میں پایا، وہ تعداد میں تھوڑے تھے، اُن کے لئے اس سے زیادہ قدرتی
بات کوئی نہ تھی کہ اپنے سلجوقی اقربا کا مذہب اختیار کرلیں، یہ اتنی قدرتی بات تھی کہ اسکے
ذکر کی کوئی ضرورت سمجھی ہی نہیں گئی، عثمان اور اس کے قبیلہ کے اسلام لانے سے عثمانی
قوم پیدا ہوئی، کیونکہ اسلام ہی نے ان مختلف قوموں کو جو ایشیائے کوچک کے شمالی مغربی
گوشہ میں آباد تھیں، متحد کرکے ایک قوم بنا دیا، یہ سلاجقہ قونیہ کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس
تبدیل مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ ہجری (۱۲۹۰ء) کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں
شروع ہوگئیں، حالانکہ اس سے قبل سغوت کی زندگی کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے
خالی تھے، ارطغرل اور عثمان ایک دیہاتی سردار کی حیثیت سے سغوت میں سیدھی سادی
زندگی بسر کرتے تھے، اور ان کے تمام حوصلے اپنے چھوٹے سے گاؤں ہی تک محدود تھے
اون کی اُس زمانہ کی کسی جنگ یا فتح کا ذکر تاریخ میں موجود نہیں، ارطغرل کیساتھ چار سو سپاہی تھے
اور عثمان کے ہمراہ اس سے زیادہ سپاہیوں کے ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی،
اس کے تعلقات اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بالکل صلح و دوستی کے تھے، نشری کا بیان ہے

کہ اس ملک کے کافر و مسلم دونوں ارطغرل اور اس کے لڑکے کی عزت کرتے تھے، کافر و مسلم کا کوئی سوال ہی نہ تھا، پھر دفعۃً ہم عثمان کو اپنے پڑوسیوں پر حملہ آور ہوتے اور ان کے قلعوں کو فتح کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، سنہ ۶۸۹ ہجری (سنہ ۱۲۹۰ء) سے سنہ ۶۹۹ ہجری (سنہ ۱۳۰۰ء) تک وہ اپنے مقبوضات کو وسیع کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سرحد بازنطینی علاقوں سے مل جاتی ہے، اس کے سپاہیوں کی تعداد چار سو سے بڑھکر چار ہزار تک پہنچ جاتی ہے، ہم ایک قوم کا ذکر سننے لگتے ہیں، جو ترک نہیں بلکہ اپنے سردار کے نام پر "عثمانی" کہلاتی ہے، اس سردار کا نام خود بھی اس کی قوم ہی کے نام کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، یہ لوگ یونانیوں (بازنطینیوں) اور تاتاریوں دونوں کے یکساں دشمن ہیں، اور متعین طور پر اسلام سے وابستہ ہیں، ان میں ایک ایسا تبلیغی جوش ہے جو صرف انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے، جنھوں نے حال ہی میں مذہب تبدیل کیا ہو، ان کی باہمی وحدت اور ایشیائے کوچک کے دوسرے ترکوں سے ان کا قطعی طور سے مختلف ہونا، چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی ساٹھ سالوں میں اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ یورپ انھیں بحیثیت ایک قوم کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ایشیائے کوچک کی دوسری جماعتوں کی بہ نسبت چونکہ یہی لوگ یورپ کے سامنے زیادہ آئے، اس لئے اہل یورپ نے انھیں محض "ترک" کہنا شروع کیا، اور ان کو اناطولیہ کے تمام ترکوں کا نمائندہ سمجھنے لگے[1]

پروفیسر گرمانس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:- "اپنے پیش روؤں کی طرح جنھوں نے ایشیائے کوچک میں بود و باش اختیار کر لی تھی" کے خان لی" بھی ترک ہی تھے، البتہ ان کی بولی ذرا ان سے مختلف تھی، ایک اور فرق یہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لا چکے تھے لیکن یہ نو وارد ہنوز اپنے قدیم خانہ بدوشی کے مسلک پر قائم تھے، ان کے

[1] "اساس سلطنت عثمانیہ" از ہربرٹ گبنس ص ۲۹-۲۵،

سردار ارطغرل کے بیٹے عثمان کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ہے اس سے ہمارا یہ قیاس حق بجانب ہے کہ انھوں نے ایشیائے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ہونے کے بعد اسلام قبول کیا۔[1]

مال خاتون | وہ روایت یہ ہے کہ اسکی شہر سے قریب اتبرونی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک خدا رسیدہ عالم ادہ بالی رہا کرتے تھے، عثمان اپنی نوعمری کے زمانہ میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا، ان کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی جس کا نام مال خاتون تھا، ایک روز اتفاق سے عثمان کی نظر اس دوشیزہ پر پڑ گئی، اور وہ دیکھتے ہی اوس پر فریفتہ ہوگیا، اس نے نکاح کا پیغام دیا، لیکن ادہ بالی چونکہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لئے فرقِ مراتب کا لحاظ کرکے انھوں نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا، دو سال تک عشق و محبت کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا، اور عثمان نے ادہ بالی کے گھر کی آمد و رفت جاری رکھی، اس درمیان میں چند اور ترک سرداروں نے بھی جو طاقت اور وجاہت میں عثمان سے بڑھے ہوئے تھے، مال خاتون سے شادی کی خواہش کی لیکن ادہ بالی نے ان کو بھی صاف جواب دیا، بالآخر ایک رات جب عثمان ادہ بالی کے ہاں مقیم تھا، اس نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا، کہ ایک چاند ہلال بن کر ادہ بالی کے سینہ سے نکلا، اور رفتہ رفتہ بدر کامل بن کر اس کے سینہ میں اتر آیا، پھر اس کے پہلو سے ایک زبردست درخت نمودار ہوا، جو بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں، درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہہ رہے تھے، اور چار بڑے بڑے پہاڑ کوہ قاف، کوہ بلقان، کوہ طور اور کوہ اطلس

---

[1] "ترکوں کی اسلامی خدمات" از ڈاکٹر جولیس گرمانس ص۱، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۳۲ء

اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے، دفعتًہ ایک نہایت تیز ہوا چلی، اور اس درخت کی پتیوں کا رخ جو شکل میں تلوار سے مشابہ تھیں ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا، یہ شہر جو دو سمندروں اور دو براعظموں کے اتصال پر واقع تھا، مثل ایک انگوٹھی کے دکھائی دیتا تھا، جس میں دو نیلم اور دو زمرد جڑے ہوئے تھے، عثمان اس انگوٹھی کو پہننا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، بیدار ہونے کے بعد اس نے یہ خواب ادہ بالی سے بیان کیا، ادہ بالی نے اس میں عثمان کے شاندار مستقبل کی تعبیر دیکھکر نیز اسے ایک اشارۂ غیبی سمجھ کر مال خاتون کو اس کے نکاح میں دیدیا، ادہ بالی ہی کی تلقین سے عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے،

ذاتی اوصاف عثمان میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے، جو ایک بانی سلطنت کے لئے ضروری ہیں، اس کی ہمت اور شجاعت غیر معمولی تھی، اُسے قیادت کا ملکہ خداداد حاصل تھا، میدانِ جنگ میں اس کی بہادری سپاہیوں میں دلیری کی روح پھونک دیتی تھی، اور انتظام حکومت میں اس کی دانش مندی رعایا کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی، اس کے عدل و انصاف کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، اس کی عدالت میں ترک و تاتار، مسلم و عیسائی سب برابر تھے، رعایا کی بہبودی اس کا نصب العین اور ملک کی خوشحالی اس کا مطمح نظر تھا، قرون اولیٰ کے مجاہدوں کی طرح اس کا طرزِ زندگی نہایت سادہ اور نمائش سے بالکل پاک تھا، دولت اس نے کبھی جمع نہیں کی، تمام مالِ غنیمت غریبوں اور یتیموں کا حصہ نکالنے کے بعد سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا تھا، یہانتک کہ اس کے رہنے کا جو مکان تھا، اس میں سونے چاندی یا جواہرات کی قسم سے کوئی چیز بھی اس کے مرنے کے بعد نہیں ملی، صرف ایک کفتان، ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمکدان، چند خالص عربی گھوڑے، زراعت کے لئے چند جوڑ بیل، اور بھیڑوں کے کچھ گلے اعلم اور اسلحہ کے علاوہ بس یہی اس کی ساری کائنات

تھی، وہ نہایت فیاض، نہایت رحم دل اور نہایت مہمان نواز تھا، ان خصوصیات کی وجہ سے اس کی ہردلعزیزی عام تھی، چنانچہ تخت نشینی کے موقع پر جب اسکی تلوار، جو ابھی تک محفوظ ہے، اس کے جانشینوں کی کمر سے باندھی جاتی تھی تو ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کیجاتی تھی کہ "خدا اس میں بھی عثمان ہی جیسی خوبیاں پیدا کردے"۔

لیکن ان خوبیوں کے ساتھ عثمان کے دامن پر ایک بیگناہ کے خون کی چھینٹیں بھی نظر آتی ہیں، ۶۹۸ھ ہجری (۱۲۹۹ء) میں جب اس نے یونانیوں کے قلعہ کوپری حصار پر حملہ کا عزم کیا تو پہلے اپنے فوجی سرداروں کو بلاکر مشورہ طلب کیا، اس مجلس میں اس کا بوڑھا چچا دوندار بھی تھا، اس نے یونانیوں کی قوت کا اندازہ کرکے حملہ کرنے کے خلاف رائے دی، عثمان نے اس خوف سے کہ مبادا دوندار کے مشورہ سے دوسرے سرداروں کی ہمتیں بھی پست نہ ہوجائیں فوراً ایک تیر مار کر اسے ہلاک کردیا، بوڑھے چچا کا یہ قتل آج خواہ کتنا ہی معیوب نظر آئے لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے یہ ایک بالکل معمولی واقعہ تھا اور اگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی کم ہوجاتی ہے،

پہلی مسجد، عثمان نے اپنے ابتدائی عہد حکومت میں ایک مسجد اسکی شہر میں تعمیر کرائی جو سلطنت عثمانیہ کی پہلی مسجد ہے،

اورخاں

۷۲۶ھ تا ۷۶۱ھ مطابق ۱۳۲۶ء تا ۱۳۵۹ء

عثمان نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھوٹے بیٹے اورخاں کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، اورخاں کی عمر اس وقت (۴۲) سال کی تھی، اور وہ فن سپہگری میں عثمان کے زیر نگرانی مہارت اور کمال حاصل کر چکا تھا، اس کے بڑے لڑکے علاء الدین نے اپنا وقت علوم فقہیہ کی تحصیل میں صرف کیا تھا، فن حرب سے اس کو مناسبت نہ تھی، تاہم عثمان کی وفات کے بعد اورخاں نے سلطنت کو باہم تقسیم کر لینے پر آمادگی ظاہر کی، لیکن علاء الدین نے باپ کی وصیت نیز اپنی سکون پسند طبیعت کی بنا پر اس کو نامنظور کیا، اور اورخاں کے اصرار پر صرف انتظام مملکت کی ذمہ داری قبول کی یعنی تخت سلطنت سے کنارہ کش ہونے کے باوجود بار سلطنت کا اٹھانا قبول کیا، اور دولت عثمانیہ کے پہلے وزیر کی حیثیت سے آئین ملک کی ترتیب و تنظیم میں مشغول ہوا۔

اصلاحات، علاء الدین نے تین چیزوں پر خاص طور سے توجہ کی، سکہ، لباس اور فوج، اگرچہ سلطان علاء الدین سلجوقی نے عثمان کو خطبہ کے علاوہ اپنے نام کا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دیدی تھی، تاہم عثمان نے صرف خطبہ ہی پر قناعت کی تھی، اور اپنا سکہ

جاری نہیں کیا تھا، اورخاں کی تخت نشینی کے وقت تمام ایشیائے کوچک میں صرف سلجوقی سکے رائج تھے، اب علاء الدین نے بادشاہت کے اس امتیاز کو بھی اختیار کیا اور عثمانی مملکت میں اورخاں کے نام کے سکے جاری کئے[۱]، اب تک لوگوں کے لباس میں بھی کوئی خاص فرق وامتیاز نہ تھا، علاء الدین نے رعایا کے مختلف طبقوں کے لئے مختلف قسم کے لباس تجویز کرکے ان کے متعلق قوانین نافذ کئے، شہری اور دیہاتی مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کا لباس الگ الگ مقرر کیا[۲]،

فوج، لیکن علاء الدین کا سب سے بڑا کارنامہ وہ فوجی اصلاحات ہیں جن سے دولت عثمانیہ کی طاقت دفعۃً بڑھ گئی، اور جو تین سو برس تک اس کی حیرت انگیز فتوحات کی ضامن رہیں، ارطغرل اور عثمان کے زمانہ میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی، بلکہ یہ دستور تھا کہ جب کوئی جنگ پیش آنے والی ہوتی تو پہلے سے اعلان کردیا جاتا کہ جو شخص لڑائی میں شریک ہونا چاہے، وہ فلاں روز فلاں مقام پر حاضر ہو جائے، چنانچہ یہ رضاکار سوار مقررہ وقت اور مقررہ مقام پر جمع ہو جاتے تھے، اور لڑائی ختم ہونے کے بعد واپس چلے جاتے تھے، انھیں کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی، بلکہ جو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا، وہی ان کی خدمت کا معاوضہ ہوتا تھا، ان کی کوئی مخصوص وردی بھی نہیں تھی، بااینہمہ یہ سپاہی اعلیٰ درجہ کے شہسوار ہوتے تھے اور مضبوطی کے ساتھ صف قائم کرکے ایک دیوار کی طرح میدان جنگ میں آگے بڑھتے تھے[۳]، عثمان کے عہد تک تو اس طریقہ سے کام چلتا رہا، لیکن اس کے بعد سلطنت کی توسیع

۱؎ "ترکی قدیم وجدید" از سدرلینڈ منزیس، جلد ۱ ص۵۰، (Turkey Old and New by Sutherland Menzies. Vol. I. London 1882)

۲؎ گبن، جلد ۴ ص۳۸۱، ۳؎ ہربرٹ گبنس، ص۸۱،

اور استحکام کے لئے یہ نظام ناکافی ثابت ہوا اور ایک باقاعدہ اور مستقل فوج کی ضرورت محسوس ہونے لگی، چنانچہ علاء الدین نے تنخواہ دار پیادوں کی ایک فوج مرتب کی جس کا نام "پیادے" تھا، یہ دس دس، سو سو، اور ہزار ہزار کے مختلف دستوں میں تقسیم تھی، اس کی تنخواہیں اونچی اونچی تھیں، لیکن اس کے قیام کو زیادہ روز نہ ہوئے تھے کہ اس میں اپنی قوت کا بیجا احساس پیدا ہو گیا، اور اس کی سرکشی خود اورخاں کے لئے تشویش کا باعث ہونے لگی، چنانچہ اورخاں نے اس امر میں علاء الدین اور قرا خلیل سے (جو خاندان شاہی سے ازدواجی تعلق رکھتا تھا، اور علاء الدین کے بعد وزیر سلطنت ہو کر خیر الدین پاشا کے نام سے مشہور ہوا) مشورہ کیا، قرا خلیل نے جو تجویز پیش کی اس نے نہ صرف پیادوں کی طرف سے مطمئن کر دیا بلکہ آئندہ تین صدیوں کے لئے عثمانی فتوحات کی رفتار میں ایک سیلاب کی قوت و سرعت بھی پیدا کر دی۔

ینی چری

وہ تجویز یہ تھی کہ عیسائی اسیرانِ جنگ میں سے دس بارہ سال کے قوی اور ہونہار لڑکوں کی ایک تعداد منتخب کر کے اسلام میں داخل کی جائے، اور پھر باقاعدہ فوجی تعلیم دیکر ان کی ایک مستقل فوج قائم کی جائے، اورخاں کو یہ رائے پسند آئی، اور اس نے ایک ہزار عیسائی لڑکوں کو منتخب کر کے انھیں فوجی تعلیم و تربیت دینی شروع کی، دوسرے سال ایک ہزار لڑکے اور چنے گئے، اور یہ سلسلہ تین سو برس تک برابر جاری رہا، جب کبھی ہزار لڑکوں کی یہ سالانہ تعداد ان لڑکوں سے پوری نہ ہو سکتی جو اوس سال کی جنگ میں قید ہوتے، تو عیسائی رعایا کے لڑکوں سے کمی پوری کر لی جاتی، لیکن سلطان محمد رابع کے عہدِ حکومت میں یہ نظام بدل گیا، اور ۱۰۵۸ھ ہجری (۱۶۴۸ء) سے خود انہی سپاہیوں اور ترکوں کے لڑکے اس فوج میں داخل کئے جانے لگے، اس فوج کا ترکی نام ینی چری (نئی فوج) ہے

جو عربی میں انکشاری ہو گیا ہے، اورخاں نے جب اسے مرتب کیا، تو نو عمر سپاہیوں کے پہلے دستہ کو حاجی بکطاش کی خدمت میں جو ملک میں اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے مشہور تھے لے گیا، اور ان سے دعا کی خواہش کی، حاجی موصوف نے اس فوج کے لئے فتح و نصرت کی دعا کی، اور اس کا نام ینی چری رکھا، سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی تین صدیوں میں جو اس کے عروج و ترقی کا زمانہ تھا، ینی چری کی قوت شباب پر تھی، اور سلطنت کی تمام فتوحات زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کی رہین منت تھیں، جو لڑکے اس فوج کے لئے منتخب کئے جاتے تھے، پہلے انھیں ایسے ماحول میں رکھا جاتا تھا کہ وہ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوتے جائیں، اسلام قبول کرنے کے بعد انھیں سلطان کی خاص نگرانی میں فن حرب کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، ان کی فوجی تربیت میں حد درجہ سختی برتی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے شدائد کو آسانی سے برداشت کر لیتے تھے، اپنے والدین، وطن، اور مذہب چھوٹنے کے بعد ان کی تمام امیدیں سلطان کی اطاعت، دولت عثمانیہ کی خدمت اور اسلام کی حمایت سے وابستہ ہو جاتی تھیں، اور یہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا، سلطان کو ان پر پورا اعتماد تھا: اور وہ ہمیشہ ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتا رہتا تھا، ینی چری کے متعلق مزید حالات آگے آئیں گے،

جاگیردار اور بے ضابطہ پیادے ینی چری کے بعد علاء الدین نے دوسری فوجوں کی تنظیم شروع کی: اب تک "پیادوں" کی مستقل فوج کو تنخواہیں دی جاتی تھیں، لیکن اس خیال سے کہ ان کو مفتوحہ علاقوں کی حفاظت سے ایک خاص وابستگی پیدا ہو جائے، علاء الدین نے اب تنخواہ کے بجائے انھیں جاگیریں دیدیں اور فوجی خدمت کے علاوہ ان جاگیروں سے متصل سڑکوں کی مرمت بھی ان کے فرائض میں داخل کر دی، پیدل سپاہیوں کی ایک

بے ضابطہ فوج بھی مرتب کی گئی، اس کو نہ تو ینی چری کی طرح تنخواہیں ملتی تھیں، اور نہ پیادوں کی طرح جاگیریں، میدانِ جنگ میں سب سے آگے انہی کا دستہ ہوتا تھا، اور دشمن کے پہلے حملے کی باڑھ آگے بڑھ کر یہی روکتے تھے، جب ان سے مقابلہ کرنے میں غنیم کی قوت کمزور ہو جاتی یا ان کے میدان چھوڑ کر بھاگنے کی وجہ سے اسے اپنی فتح کا یقین ہونے لگتا، اس وقت دفعۃً ینی چری کی آہنی فوج اس کے سامنے نمودار ہوتی، اور جنگ کا سارا نقشہ دیکھتے دیکھتے بدل جاتا، عموماً ان بے ضابطہ سپاہیوں ہی کی نعشوں پر سے گذر کر ینی چری آخری حملہ اور فتح کے لئے بڑھتے تھے،

تنخواہ دار اور جاگیردار سوار پیادوں کی طرح سواروں کی بھی دو قسمیں تھیں، باضابطہ اور بے ضابطہ مستقل تنخواہ دار سوار چار دستوں میں تقسیم کئے گئے تھے، ان کی تعداد ابتدا میں (۲۴۰۰) تھی لیکن سلیمان اعظم کے عہد میں (۴۰۰۰) تک پہونچ گئی تھی، وہ سلطان کے داہنے اور بائیں چلا کرتے تھے، اور جنگ میں اس کے محافظ دستہ کا کام دیتے تھے، شاہی سواروں کے ان دستوں میں سے ایک دستہ "سپاہیوں" کا تھا، "سپاہی" کا لفظ عموماً سوار فوج کیلئے استعمال کیا جاتا تھا لیکن شاہی سواروں کا ایک خاص دستہ بھی اس نام سے موسوم تھا، تنخواہ دار سواروں کے علاوہ علاء الدین نے جاگیردار سواروں کی بھی ایک فوج مرتب کی، ان جاگیروں کو زعامت اور تیمار کہتے تھے،

اکنجی تنخواہ دار اور جاگیردار سواروں کے علاوہ بے ضابطہ سواروں کی بھی ایک فوج تھی جو اکنجی کہلاتے تھے، ان کو نہ تنخواہیں ملتی تھیں نہ جاگیریں، جنگ میں لوٹ مار کر جو کچھ حاصل کر لیتے وہی ان کا معاوضہ تھا، قدیم دستور کے موافق عثمانی فوجوں کی روانگی کے وقت یہ ایک بڑی تعداد میں بلائے جاتے تھے، یہ گویا مقدمۃ الجیش تھے، اور باقاعدہ افواج کیلئے

پہلے ہی سے راستہ صاف کر رکھتے تھے، دشمن کے دلوں میں ان کی دہشت بھی ینی چری اور سپاہیوں سے کم نہ تھی، لیکن انہی کو سب سے زیادہ خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا،

عثمانی فوج کے مخصوص امتیازات

علاء الدین نے اپنی فوجی اصلاحات سے ترکوں کی ایک باضابطہ اور مستقل فوج تیار کر دی، جس کی نظیر ایک صدی بعد تک یورپ میں پیدا نہ ہو سکی، چارلس ہفتم شاہ فرانس کے پندرہ فوجی دستے جو عہد جدید کی پہلی مستقل فوج سمجھی جاتی ہے، اورخاں کی مستقل اور تنخواہ دار سپاہ سے پورے سو برس بعد وجود میں آئے[۱] مسٹر ہربرٹ گبنس نے عثمانیوں کے اس امتیاز سے جسے عموماً تمام مورخین تسلیم کرتے آئے ہیں انکار کیا ہے، اور ایڈورڈ سوم شاہ انگلستان کی باقاعدہ پیدل فوج کا ذکر کیا ہے، جس نے ۱۳۴۶ء میں جنگ کریسی میں حصہ لیا تھا، لیکن جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں ایڈورڈ نے ایک ایسی فوج مرتب کی تھی، جو صرف ضرورت کے وقت جنگ کے لئے طلب کی جا سکتی تھی[۲] برخلاف اس کے اورخاں کی فوج ایک مستقل فوج تھی، جسے باقاعدہ تنخواہیں دی جاتی تھیں، اور جو ہمہ وقت جنگ کے لئے مستعد اور تیار رہتی تھی، چنانچہ یہ امر مسٹر گبنس کو بھی تسلیم ہے کہ فوج کی مکمل تنظیم اور اسے ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رکھنے کی اولیت عثمانیوں ہی کو حاصل ہے[۳] علاء الدین کے فوجی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ بادشاہ اور فوج کے درمیان براہ راست تعلق پیدا ہو گیا، اور درمیانی اشخاص کی ضرورت باقی نہیں رہی. جن کی وساطت سے عثمان اور طغرل کے سپاہی فراہم ہوتے تھے، بے ضابطہ پیدل اور سوار فوجوں کے علاوہ جو صرف لڑائی کے موقعوں پر بلائی جاتی تھیں، بقیہ تمام فوج تنخواہ دار یا جاگیردار تھی، اور سب کی کمان سلطان کے ہاتھ میں تھی،

۱؎ کریسی جلد ۱ ص ۲۰ ، ۲؎ ہربرٹ گبنس نوٹ ص ۸۲ ؛ ۳؎ ایضاً ص ۸۲ ،

مسٹر گبنس نے ایک قدیم اور واقف کار سیاح بروکئے (Broquiere) کا بیان نقل کیا ہے کہ عثمانیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ عیسائی فوجیں کب آرہی ہیں، اور کہاں ان سے مقابلہ کرنا زیادہ مفید ہوگا، وجہ یہ تھی کہ عثمانی جنگ کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور ان کے چاؤش اور جاسوس صحیح رہنمائی کرتے تھے، سیاح مذکور لکھتا ہے:- "وہ (عثمانی) دفعۃً روانہ ہو سکتے ہیں، اور سو عیسائی سپاہی بہ نسبت دس ہزار عثمانیوں کے زیادہ شور کریں گے، طبل بجتے ہی وہ فوراً کوچ کر دیتے ہیں، اور جب تک حکم نہ ملے ہرگز اپنے قدم نہیں روکتے، ہلکے اسلحہ سے مسلح ہونے کی وجہ سے وہ ایک رات میں اتنی مسافت طے کر لیتے ہیں جتنی ان کے عیسائی حریف تین دن میں طے کرتے ہیں[1]"

پاشا علاء الدین پہلا عثمانی ترک ہے جسے پاشا کا خطاب ملا، اس کے بعد یہ خطاب اورخان کے سب سے بڑے لڑکے سلیمان کو دیا گیا، شروع میں پاشا کا خطاب عثمانی فرماں رواکے بڑے لڑکے کے لئے مخصوص تھا، لیکن مراد اول کا بڑا لڑکا چونکہ باغی ہو گیا تھا، اور بقیہ لڑکے اس وقت نابالغ تھے اس لئے مراد نے یہ خطاب قرا خلیل کو دیا، اس کے بعد ولی عہد کی تخصیص جاتی رہی، اور بڑے بڑے فوجی اور ملکی عہدہ داروں کو بھی یہ خطاب دیا جانے لگا، اسی طرح وزارت کا عہدہ بھی علاء الدین کے بعد شاہی خاندان سے نکل گیا[2]

نائکومیڈیا اور نائسیا کی فتح اورخان نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال (۷۲۶ھ ہجری مطابق ۱۳۲۶ء) میں نائکومیڈیا پر قبضہ کر لیا، بروصہ چند مہینے قبل فتح ہو چکا تھا، سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات میں اب صرف ایک ہی بڑا شہر نائسیارہ گیا تھا، جو اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے قسطنطینہ سے دوسرے درجہ پر تھا، اورخان نے اس کا بھی محاصرہ شروع کیا، اور

[1] ہربرٹ گبنس ص۴۴، [2] ایضاً ص۱۰۶-۷،

۷۳۰ھ (۱۳۳۰ء) میں اسے فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، اورخان نے ناٹیا کے باشندوں کو اجازت دیدی تھی کہ اگر چاہیں تو اپنا تمام مال و اسباب لے کر کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں لیکن بروصہ کے باشندوں کی طرح یہ لوگ بھی بکثرت اسلام میں داخل ہوگئے، اور اپنے وطن ہی میں مقیم رہے،

قراسی پر قبضہ

۷۳۴ ہجری (۱۳۳۴ء) میں ترکی ریاست قراسی کے امیر نے انتقال کیا، اس کے بڑے لڑکے نے تخت پر قبضہ کرکے اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کرادیا، اورخان چھوٹے لڑکے کا طرفدار تھا، اس کے خون کا بدلہ لینے کے لئے وہ قراسی پر حملہ آور ہوا، بڑا لڑکا شکست کھا کر بھاگا، اور ۷۳۶ ہجری (۱۳۳۶ء) میں پوری ریاست پر اورخان کا قبضہ ہوگیا، اس کے بعد اورخان نے اناطولیہ کے شمالی مغربی گوشہ کی چند اور چھوٹی چھوٹی ترکی ریاستیں بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کرلیں، قراسی اور ان دوسری ترکی ریاستوں کی آبادی زیادہ تر ترکوں پر مشتمل تھی لیکن ساحلی علاقوں میں ایک خاصی تعداد یونانیوں کی بھی تھی جنھوں نے بروصہ اور ناٹیا کے اکثر باشندوں کی طرح اسلام قبول کرلیا،

زمانۂ امن کے کارنامے

ان فتوحات کے بعد تقریباً بیس[2] سال تک کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی اور اورخان پوری توجہ کے ساتھ ملکی اور فوجی آئین کی تنظیم و تکمیل میں مصروف رہا، اس نے تمام ملک میں امن و امان قائم کیا، مسجدیں، مدرسے اور رفاہ عام کی مختلف شاندار عمارتیں بنوائیں، بروصہ میں ایک نہایت عالی شان مسجد، ایک بڑا مدرسہ اور ایک شاہی اسپتال تعمیر کرایا، بڑے بڑے فضلاء اور اہل کمال کو طلب کیا، اور بروصہ کی شہرت اتنی پھیلی کہ ایرانی اور عربی طلبہ علوم مشرقیہ کے قدیم مدرسوں سے آکر وہاں تعلیم حاصل کرنے لگے، ناٹیا میں بھی

---

[2] گبن جلد ۴ ص ۳۸۱،

ایک مسجد تعمیر کی، اور اس کے متصل ایک مدرسہ قائم کیا، جو دولتِ عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا اور بہت مشہور ہوا، اسی شہر میں اورخاں نے غریبوں کے لئے پہلا لنگر خانہ بھی جاری کیا[1]،

حکومت کی پالیسی جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے، خاندان عثمانی کے ابتدائی تاجداروں کی ایک بڑی خصوصیت جس کا اثر سلطنت کے استحکام پر نمایاں طور سے پڑا یہ تھی کہ جب وہ کسی ملک کو فتح کرتے تھے، تو قبضہ کے بعد ہی اس کے اندرونی نظم و نسق میں مصروف ہو جاتے تھے، اُن کا مقصد محض فتوحات حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ وہ مفتوحہ علاقوں کو اپنے آئین و ضوابط کے مطابق تنظیم دیکر مکمل طور پر سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس طرح بجائے اس کے کہ اپنی فتوحات سے مختلف صوبوں اور بے میل آبادیوں کو ایک غیر مرتب شکل میں اکٹھا کرتے انھوں نے ایشیائے کوچک میں ایک مرتب اور پائدار حکومت قائم کر لی، عہد قدیم و جدید کی دوسری مشرقی سلطنتوں کے مقابلہ میں دولتِ عثمانیہ کے زیادہ مدت تک قائم رہنے کی ایک بڑی وجہ اس کے ابتدائی فرماں رواؤں کی یہی پالیسی ہے، اور چونکہ اس پالیسی پر یورپ، شام اور مصر سے زیادہ ایشیائے کوچک کی فتوحات میں عمل کیا گیا، اس لئے وہاں عثمانیوں کی حکومت کو زیادہ استقلال بھی نصیب ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ ایشیائے کوچک میں استقلال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی، کہ وہاں ترکوں کی آبادی کثرت سے پھیلی ہوئی تھی لیکن سلطنت کے استحکام میں فاتحین عثمانی کی اس دانشمندانہ پالیسی کو بھی کچھ کم دخل نہ تھا،

سلطنت بازنطینی سلطنت کے اندرونی انتظامات سے فارغ ہو کر اورخاں یورپ کی جانب متوجہ ہوا اور اُسکی زندگی کے آخری چند سال سلطنت بازنطینی کے یوروپین علاقوں میں قدم جمانے کی کوشش میں صرف ہوئے، یہ سلطنت آٹھویں صدی ہجری (چودھویں

---

[1] "ترکی قدیم و جدید" از منزیس جلد ۱ صفحہ ۵۹،

صدی عیسوی) کے وسط میں نہایت کمزور ہو چکی تھی، اس کے مقبوضات جو صدیوں تک یورپ میں دریائے ڈینوب اور ایشیا میں اناطولیہ اور شام تک پھیلے ہوئے تھے، اب صرف تھریس، مقدونیا کے ایک جز جس میں سالونیکا شامل تھا، اور یونان میں موریا کے ایک بڑے حصہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے، ایشیائی مقبوضات تقریباً کل کے کل عثمانیوں کے قبضہ میں جا چکے تھے، یورپ میں بھی سرویا کا باقتدار فرماں روا اسٹیفن ڈوشن (Stephen Dushan) جزیرہ نمائے بلقان کے نصف سے زیادہ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر کے سالونیکا اور اس کے بعد قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا حوصلہ کر رہا تھا۔ خانہ جنگیوں نے سلطنت کو اور بھی کمزور کر دیا تھا، ۷۳۹ھ (۱۳۳۸ء) میں شہنشاہ اینڈرونیکس سوم کے انتقال پر اس کا گرینڈ چانسلر، کنٹاکوزین اس کے نابالغ لڑکے جان پلیولوگس کا ولی اور ملکہ اینا کے ساتھ اس کا مدار المہام مقرر ہوا، کنٹاکوزین نے اس پر قناعت نہ کر کے ۷۴۴ھ (۱۳۴۳ء) میں نیکوٹیکا میں اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا، ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور اس نے اس کی مخالفت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں لڑائی چھڑ گئی، اور دونوں نے اورخاں سے مدد کی درخواست کی، اس سے پہلے بھی بعض ترکی امیروں نے تخت قسطنطنیہ کے مختلف دعویداروں میں سے کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دیا تھا، کنٹاکوزین نے اورخاں سے چھ ہزار عثمانی سپاہی مانگے، اور اس حمایت کے عوض اپنی لڑکی تھیوڈورا کو اس کی شریک زندگی بنانے کے لئے پیش کیا، اورخاں نے یہ شرط منظور کی، اور ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں چھ ہزار سپاہی کنٹاکوزین کی مدد کے لئے یورپ میں بھیجے، کنٹاکوزین نے ان سپاہیوں کی مدد سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، جو ملکہ کے قبضہ میں تھا، ایک سال کے محاصرہ کے بعد خود شہر کے بعض لوگوں کی غداری کی وجہ سے کنٹاکوزین فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوا، اور

ملکہ کو مجبوراً صلح کے لئے راضی ہونا پڑا، صلح اس بات پر قرار پائی کہ کنٹاکوزین اور اس کی بیوی نیز ملکہ اینا اور شہزادہ جان پلیولوگس تخت نشین کردیئے جائیں، چنانچہ چاروں کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی، اس اتحاد کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے کنٹاکوزین نے اپنی چھوٹی لڑکی کی شادی نوجوان شہنشاہ جان سے کردی، اورخاں کا نکاح بھی شہزادی تھیوڈورا سے ہوگیا، اورخاں نے تھیوڈورا کو اس کے آبائی مذہب مسیحیت پر قائم رہنے کی اجازت دی،

یورپ میں پہلا قدم، صلح کے بعد اورخاں کے چھ ہزار سپاہی جو اس نے کنٹاکوزین کی مدد کیلئے بھیجے تھے واپس آگئے، لیکن چند ہی سال بعد ان کی ضرورت پھر پیش آئی، ۷۵۰ھ (۱۳۴۹ء) میں اسٹیفن ڈوشن شاہ سرویا نے سالونیکا پر حملہ کیا، اور یقین تھا کہ اسے فتح کرنے کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے گا، اس نازک موقع پر کنٹاکوزین اور جان پلیولوگس دونوں نے اورخاں سے مدد کی درخواست کی، اب کی بار اورخاں نے بیس ہزار سپاہی روانہ کئے، ان کی مدد سے سالونیکا میں اسٹیفن کو شکست ہوئی اور قسطنطنیہ کی فتح کا حوصلہ جو اس کے دل میں بار بار پیدا ہوتا تھا اب ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، جنگ کے خاتمہ پر عثمانی سپاہی پھر واپس بلالئے گئے، مگر چار سال کے بعد اورخاں کو اپنی فوجیں آبنائے باسفورس کے مغربی ساحل پر بھیجنے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا جو یورپ میں عثمانیوں کے قدم جمنے کا سبب ثابت ہوا، کنٹاکوزین تاج و تخت میں جان پلیولوگس اور ملکہ اینا کی شرکت کو زیادہ دنوں تک گوارا نہ کرسکا اور ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) میں اس نے حکومت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے چاہے، جان نے اس کی شدید مخالفت کی اور خانہ جنگی شروع ہوگئی، کنٹاکوزین نے حسب دستور سابق اورخاں سے پھر مدد کی درخواست کی اور اس کے معاوضہ میں یورپین ساحل کا ایک قلعہ پیش کیا، اورخاں نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کی سرکردگی میں بیس ہزار

سپاہی روانہ کئے، ان کی مدد سے کنتا کوزین نے جان پلیولوگس کو شکست دیکر قسطنطنیہ کے
تخت پر قبضہ کرلیا، سلیمان پاشا نے حسب معاہدہ قلعہ زنپ (Tzympe)
پر قبضہ کرکے اس میں عثمانی دستے متعین کردیئے، اس کے چند ہی دنوں بعد تھریس میں زلزلہ
آیا جس سے بہتیرے شہروں کی شہر پناہیں منہدم ہوگئیں، انہی میں گیلی پولی بھی تھا جو دردانیال
کے مغربی ساحل پر سب سے زیادہ اہم قلعہ تھا، اور زنپ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھا، سلیمان پاشا
نے اسے تائید غیبی خیال کیا اور گیلی پولی پر فوراً قبضہ کرلیا، قلعہ کے یونانی دستوں نے یہ سمجھا
کہ خدا کی مرضی یوں ہی تھی، نیز وہ ترکوں کے دفعۃً پہنچ جانے سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ
کوئی مزاحمت نہ کرسکے، اس درمیان میں کنتا کوزین نے سلیمان پاشا سے دس ہزار دوکات
کے عوض زنپ سے قبضہ اٹھالینے کی خواہش کی، اور سلیمان پاشا نے اسے منظور بھی کرلیا، مگر اس
معاملہ کی تکمیل سے قبل ہی گیلی پولی کا واقعہ پیش آگیا، جس کے بعد سلیمان پاشا نے زنپ کی واپسی سے
بھی انکار کردیا، اور گیلی پولی کی شہر پناہ کو درست کرکے اس میں ترکی فوج کا ایک مضبوط دستہ
متعین کردیا، اس کے بعد اس نے تھریس کے چند اور مقامات بھی فتح کرلئے اور بہت سے
ترکوں اور عربوں کو لاکر ان مقبوضات میں آباد کردیا،

گیلی پولی کی فتح سے ترکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء)
میں انھوں نے پہلی بار فاتح کی حیثیت سے یورپ میں قدم رکھا، اور مسیحی یورپ میں ایک
عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے ویانا کی دیوار
تک پھیل گئی، قرون اولیٰ کے مجاہدوں نے دین حق کے پیغام سے مغربی یورپ کو بہرہ اندوز
کیا تھا، اور اپنے علوم کی روشنی اس کے ظلمت کدہ میں پہنچائی تھی، لیکن مشرقی یورپ پر
ہنوز تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور اس کی سرزمین ایک مشعل ہدایت کی منتظر تھی، یہ سعادت

عثمانیوں کے ہاتھوں کے لئے مقدر ہو چکی تھی، عرب مجاہدوں نے جس فرض کی تکمیل یورپ کے مغربی حصہ میں کی تھی ترک مجاہدوں نے اسے مشرق میں پورا کیا،

جان پلیولوگس ان واقعات سے کنٹا کوزین کے خلاف قسطنطینیہ میں سخت برہمی پھیلی جس نے بغاوت اور انقلاب کی شکل اختیار کر لی، ہر شخص اس پر غداری وطن کا الزام عائد کرتا تھا، اور اسی کو ترکوں کے یورپ میں لانے کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا، آخر رائے عامہ سے مجبور ہو کر اسے تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا، اس نے اپنی زندگی کے بقیہ تیس سال ایک خانقاہ میں گذار دیئے، اور اس مدت میں اپنے عہد کی ایک تاریخ لکھ ڈالی، اس کی ملکہ راہبہ بن گئی، قسطنطنیہ کے لوگوں نے جان پلیولوگس کو بلا کر تخت پر بٹھایا، اس نے پچاس سال تک حکومت کی، لیکن اس طویل مدت میں سلطنت بازنطینی کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی، اور ترکوں کا تسلط بڑھتا ہی گیا، انھوں نے قلعہ شورلو اور ڈیموٹیکا کو فتح کرنے کے بعد پھر خالی کر دیا، لیکن جنوبی تھریس پر ان کا قبضہ مستقل ہو گیا، اور شہنشاہ جان کو مجبوراً اورخاں سے صلح کر کے اس قبضہ کو تسلیم کرنا پڑا، اس کے بعد سلطنت بازنطینی گویا دولت عثمانیہ کی ایک باجگذار حکومت بن گئی،

سلیمان پاشا اور اورخاں کی وفات ۷۵۹ھ (۱۳۵۸ء) میں سلیمان پاشا شکار کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور اس کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا، یہ شہزادہ فن سپہ گری و سپہ سالاری میں ممتاز اور خاندانِ عثمانی کے تمام اعلیٰ اوصاف کا حامل تھا، اورخاں کو اس کی وفات کا سخت صدمہ ہوا، اور دوسرے ہی سال اس کا بھی انتقال ہو گیا،

اورخاں نے اپنے تینتیس سال کے دورِ حکومت میں عثمانی مقبوضات کو بہت زیادہ وسعت دی، اس نے نہ صرف ایشیائے کوچک کے بقیہ بازنطینی علاقوں پر قبضہ

کر لیا، اور بعض ترکی ریاستیں مملکتِ عثمانیہ میں شامل کر لیں، بلکہ یورپ میں داخل ہو کر تھریس کا ایک حصہ بھی فتح کر لیا، جو بر اعظم میں عثمانی فتوحات کا ایک شاندار مقدمہ تھا، جن فوجی اور ملکی آئین پر سلطنتِ عثمانیہ کی عظمت قائم ہوئی، ان کا بنیادی پتھر اسی نے اپنے ہاتھوں سے رکھا، عثمان کی حیثیت ایک امیر سے زیادہ نہ تھی، لیکن اورخان کے کارناموں نے اسے پادشاہی کا حقدار ثابت کر دیا،

تاہم اس پادشاہی میں بھی درویشی کی شان بدستور قائم رہی، اور اس وصف میں وہ عثمان ہی کا مثیل تھا، مسٹر گبنس لکھتے ہیں، کہ ناکیسا میں وہ غریبوں کو روٹی اور شوربہ اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا تھا، علوم و فنون کی سرپرستی آلِ عثمان کی ایک خاص خصوصیت تھی، اورخان کا یہ امتیاز بھی بہت نمایاں تھا، بڑے بڑے مشہور علما اور مشایخ اس کی صحبت میں رہا کرتے تھے ان ہی میں سے بعض کو وہ اپنے قائم کردہ مدرسوں میں مدرس مقرر کرتا، مثلاً ملا داؤد قیصری اور تاج الدین کرد، جو یکے بعد دیگرے ناکیسا کے مدرسے میں مدرس اول مقرر ہوئے، بروصہ کے علم و فضل کی شہرت اس وقت بھی قائم رہی، جب یہ دولتِ عثمانیہ کا پایۂ تخت نہ رہ گیا، اور مدتوں یہ شہر اہلِ فضل و کمال کا مرکز بنا رہا، یہیں عثمانیوں کے اولین شعرا نے اپنے کلام سنائے اور یہیں ان کے بڑے بڑے شیوخ و ابدال کے مزارات پر آج بھی عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے ہیں،

مراد اوّل

سنہ ۷۶۰ھ تا ۷۹۱ھ مطابق سنہ ۱۳۵۹ء تا سنہ ۱۳۸۹ء

اورخاں کی وفات پر اس کا چھوٹا لڑکا مراد چالیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس میں ملک گیری اور حکمرانی کی وہ تمام خصوصیات بدرجہ غایت موجود تھیں، جو آلِ عثمان کے ابتدائی فرماں رواؤں کا طرۂ امتیاز تھیں، اس کی غیر معمولی فوجی قابلیت نے ایک قلیل مدت میں یورپ کی متعدد مملکتوں کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، اور انتظام حکومت کے خداداد ملکہ نے ان مفتوحات کو سلطنت کا ایک مستقل جزو بنا دیا،

اورخاں نے اپنے عہد میں سلطنت کو بہت کچھ وسعت دی تھی، لیکن اناطولیہ کی بعض ترکی ریاستیں رقبہ میں اب بھی اس سے بڑھی ہوئی تھیں، مراد کی تخت نشینی کے وقت سلطنت عثمانیہ ایشیائے کوچک کے شمالی مغربی حصہ، اور یورپ میں زنپ گیلی پولی، اور تھریس کے بعض دیگر مقبوضات پر مشتمل تھی، جہاں سلیمان پاشا نے ترکوں اور عربوں کی نوآبادیاں قائم کر دی تھیں، اس کا مجموعی رقبہ بیس ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھا، اور آبادی بھی دس لاکھ سے کم ہی تھی[1]، مراد نے صرف تیس سال کی مدت میں سلطنت کو پانچ گنا بڑھا دیا،

ایشیائے کوچک میں بغاوت، عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد مراد نے سب سے پہلے یورپ کی طرف بڑھنے کا قصد کیا، لیکن امیر کرمانیہ نے اُس قدیم عداوت کی بنا پر جو اس کے خاندان

---

[1] ایورسلے صفحہ ۳۱،

اور آل عثمان کے درمیان چلی آتی تھی، ایشیائے کوچک میں مراد کے خلاف بغاوت برپا کر دی جسے فرو کرنے کے لئے مراد کو یورپ کا قصد ملتوی کرنا پڑا، اس نے فوراً موقع پر پہونچ کر بغاوت کا استیصال کیا، ادھر سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد وہ یورپ کی طرف متوجہ ہوا، اور ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) میں درۂ دانیال کو عبور کر کے فتوحات کا وہ حیرت انگیز سلسلہ شروع کیا جو ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں صرف اسکی شہادت پر جنگ کسووا میں ختم ہوا،

فتوحات تھریس | مراد کی تخت نشینی کے وقت سلطنت بازنطینی کی حالت نہایت ابتر تھی اس کے تمام ایشیائی مقبوضات پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا، اور یورپ میں قسطنطنیہ کے علاوہ صرف شمالی تھریس اور مقدونیا اور موریا کے کچھ حصے باقی رہ گئے تھے، باہمی عداوتوں کے باعث ابتدا میں کوئی عیسائی حکومت ترکوں کے مقابلہ میں اس کی مدد کے لئے آمادہ نہ ہوئی یہ سلطنت بلاشبہہ ایک مسیحی سلطنت تھی، اور ترکوں کا حملہ مذہبی نقطۂ نظر سے نہایت خطرناک تھا لیکن یورپ میں محاربات صلیبی کی قدیم روح تقریباً فنا ہو چکی تھی، اور یونانی اور لاطینی کلیساؤں کی شدید مخاصمت نے اتحادِ عمل کے لئے بہت کم گنجایش باقی رکھی تھی،

ان حالات میں مراد نے دردانیال کو عبور کر کے ایک زبردست فوج کے ساتھ تھریس میں قدم رکھا، اور سب سے پہلے قلعہ شورلو پر قبضہ کیا جو قسطنطنیہ سے صرف پانچ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، اس کے بعد دوسرا قلعہ کرک کلیسے ([illegible]) فتح ہوا پھر ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) میں اسکی بابا کے مقام پر بازنطینیوں کے ساتھ ایک سخت معرکہ پیش آیا جس میں مراد نے انھیں بری طرح شکست دی نتیجہ یہ ہوا کہ ادرنہ نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے اور تقریباً تمام تھریس مراد کے قبضہ میں آگیا، اس کے بعد عثمانی جنرل لالہ شاہین نے بلغاریا میں داخل ہو کر فلپوپولس کو فتح کر لیا، جو کوہ بلقان کے جنوب میں سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا، اور شہنشاہ

قسطنطنیہ کو مجبور ہو کر مراد سے صلح کرنی پڑی، اس نے معاہدہ کیا کہ تھریس کے جو علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں، انھیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا، عثمانیوں کے آئندہ حملوں میں سرویا اور بلغاریا کو مدد نہ دیگا، اور اناطولیہ کے ترکی امراء کے مقابلہ میں مراد کی اعانت کرے گا، اسکے بعد مراد بروصہ کو واپس گیا،

جنگ ماریٹزا | یورپ میں مراد کا مقابلہ اس وقت تک صرف بازنطینیوں سے تھا، اور دوسری مسیحی حکومتوں نے ترکوں کی مدافعت میں سلطنت بازنطینی کو مطلق مدد نہیں دی تھی، یہانتک کہ پوپ نے بھی جس نے اس سے پیشتر محاربات صلیبی کی تحریک میں اس قدر نمایاں حصہ لیا تھا، مراد کی ان فتوحات پر کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا، بلکہ یونانی کلیسا کے پیرووں کی تباہی کو اطمینان کی نظر سے دیکھتا رہا، مگر اب فلپوپولس کی فتح نے معاملہ کی صورت بالکل بدل دی، یہ شہر اگرچہ سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا تاہم بلغاریا میں واقع تھا، اس کی فتح نے عثمانی فوجوں کے لئے بلغاریا کا راستہ کھول دیا، ترکوں کا یہ اقدام بالآخر کلیسائے روما کی زیر سایہ حکومتوں کے لئے بھی تردد کا باعث ہوا، اور پوپ اربن پنجم (Urban V) نے ہنگری، سرویا، بوسنیا، اور ولاچیا کے فرماں رواؤں کو آمادہ کیا کہ ترکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لئے اپنی فوجیں روانہ کریں، چنانچہ اتحادیوں نے ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) میں بیس ہزار فوج تھریس روانہ کی اور یہ اعلان کیا کہ وہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر چھوڑیں گے، مراد اس وقت اناطولیہ میں تھا، یہ خبر سنکر وہ فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا، لیکن اس کے پہونچنے سے پہلے ہی لالہ شاہین ایک مختصر فوج کے ساتھ جو تعداد میں مسیحی لشکر کی نصف تھی ان کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھا، اور ایک روز رات کو جبکہ اتحادی فوجیں ادرنہ سے قریب دریائے ماریٹزا کے ساحل پر اپنے خیموں کے اندر شراب وکباب کی سرمستیوں میں مبتلا تھیں

دفعتہً حملہ آور ہو کر تقریباً سب کو تہ تیغ کر دیا، جو لوگ لالہ شاہین کی تلوار سے بچ گئے انھوں نے دریا کو عبور کرنے کی کوشش میں ڈوب کر جان دی، یوں گویا پوری عیسائی فوج ہلاک ہو گئی، شاہ ہنگری جو موقع پر موجود تھا بمشکل جان بچا کر بھاگ سکا،

یہ پہلا معرکہ تھا جو عثمانیوں کو یورپ کی سلافی قوموں کے ساتھ پیش آیا، اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوہ بلقان کے جنوب کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، اس سے عیسائیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا اور مراد نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آیندہ اپنی سلطنت کو بجائے ایشیا کے یورپ میں وسعت دینے کی کوشش کرے گا، اسی غرض سے اس نے اب ڈیموٹیکا کو جو تھریس میں واقع تھا، پایہ تخت بنایا، اور پھر تین سال کے بعد ادرنہ کو دارالسلطنت قرار دیا، جس کی یہ حیثیت فتح قسطنطنیہ تک قائم رہی، ادرنہ سے مراد نے بلقانی ریاستوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، جنگ مارٹیزا کے بعد مراد اور شہنشاہ قسطنطنیہ کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا جس کے رو سے شہنشاہ نے سلطان کا باجگذار ہونا منظور کیا، اور آیندہ جنگوں میں عثمانی فوج کی حمایت میں اپنی فوج کا ایک دستہ بھیجنے کا وعدہ کیا،

شہنشاہ کی ناکامی کچھ دنوں تک تو شہنشاہ قسطنطنیہ خاموشی کے ساتھ خراج ادا کرتا رہا، لیکن پھر اسے اپنی محکومی ناقابل برداشت محسوس ہونے لگی، چنانچہ ۷۷۱ھ (۱۳۶۹ء) میں اس نے رومہ کا سفر کیا، اور پوپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یورپ کی مسیحی حکومتوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارنے کی درخواست پیش کی، اس نے پوپ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی ذلت گوارا کی، یونانی کلیسا کے ان تمام عقائد سے تبری ظاہر کی، جو کلیسائے رومہ سے مختلف تھے، اور مذہبی معاملات میں کلیسائے رومہ کی برتری بھی تسلیم کر لی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کا مقصد حاصل نہ ہوا، اور مسیحی حکومتیں ترکوں کے خلاف اعلان جنگ

کے لئے آمادہ نہ ہوئیں، شہنشاہ ناکام و نامراد قسطنطنیہ کو واپس ہوا، واپسی میں جب وہ وینس سے گذر رہا تھا، تو وہاں کے بعض ساہوکاروں نے جن سے رومہ کے سفر کے لئے اس نے روپیہ قرض لیا تھا، اسے گرفتار کر لیا، اس کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا، کہ قرض ادا کر سکے، اس کا بڑا لڑکا اینڈرونیکس جسے وہ قسطنطنیہ میں اپنا جانشین بنا گیا تھا، حکومت کی لذت سے آشنا ہو کر باپ کی رہائی کا خواہشمند نہ تھا، اس لئے اس نے بھی قرض ادا کرنے کی کوشش نہ کی، لیکن چھوٹے لڑکے مینوئل نے اپنی املاک فروخت کر کے قرض کی رقم فراہم کی اور شہنشاہ کو آزاد کرایا، قسطنطنیہ پہونچنے کے بعد شہنشاہ نے اینڈرونیکس کو حکومت کے تمام منصبوں سے معزول کر دیا، اور اس کی جگہ مینوئل کو مقرر کر کے اسے اپنے ساتھ تاج و تخت کا شریک بھی قرار دیا،

صاوجی کی بغاوت، اینڈرونیکس کا لڑکا جس کا نام بھی اینڈرونیکس تھا، اپنے باپ کی اس حق تلفی پر سخت برافروختہ ہوا، اور اس نے مراد کے سب سے چھوٹے لڑکے شہزادہ صاوجی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ دونوں مل کر شہنشاہ اور مراد کو تخت سے اتار دیں اور ان کی جگہ خود فرماں روا بن جائیں، مراد اس وقت ایشیائے کوچک میں تھا، اور صاوجی یورپ میں ترکی سپاہ کا افسر اعلیٰ تھا، اس نے مراد کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر فوراً بغاوت کا اعلان کر دیا، ادھر اینڈرونیکس نے بھی نوعمر بازنطینی امراکی ایک جماعت اپنے ساتھ لیکر شہنشاہ کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کی، ان شہزادوں کی متحدہ بغاوت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی، مراد اس خبر کو سنتے ہی یورپ پہنچا، شہنشاہ نے اینڈرونیکس کے جرم سے اپنی برائت پیش کی، اور اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے پوری آمادگی ظاہر کی، اس نے مراد کی یہ تجویز بھی منظور کر لی کہ گرفتاری کے بعد دونوں شہزادے اپنی بینائی سے محروم کر دیئے جائیں صاوجی کی

فوج نے اپنے سلطان کی زبان سے معافی کا وعدہ سن کر باغی شہزادہ کا ساتھ چھوڑ دیا، صاووجی اینڈرونیکس اور نوجوان بازنطینی امرا گرفتار کرکے مراد کے سامنے لائے گئے، مراد نے پہلے صاووجی کی آنکھوں میں گرم سیسہ پلا کر اسے اندھا کر دیا، اور پھر اسے قتل بھی کرا دیا۔ بازنطینی امرا دریائے مارٹیزا میں غرق کر دیئے گئے، اینڈرونیکس شہنشاہ کے پاس بھیجدیا گیا، اس نے حسب وعدہ اس کی آنکھوں میں بھی سیسہ ڈلوا دیا لیکن اس طرح کہ خفیف سی بینائی باقی رہ گئی۔

ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو ایک جدید معاہدہ کرنا پڑا، جس کی رو سے اس نے دولت عثمانیہ کی باجگذاری از سر نو تسلیم کی عثمانی لشکر میں فوجی خدمت انجام دینے کا وعدہ کیا، اور ضمانت کے طور پر اپنے لڑکے مینوئل کو مراد کی خدمت میں بھیج دیا۔

فتوحات بلغاریا، مقدونیا و سرویا اگرچہ بلغاریا نے جنگ مارٹیزا میں شرکت نہیں کی تھی تاہم تھریس کی فتح اور عیسائیوں کی شکست نے اسکو بھی نہایت اہم خطرات میں مبتلا کر دیا خصوصاً ادرنہ اور فلیپوپولس پر قبضہ ہو جانے کے بعد بلغاریا اور مقدونیا کی راہ ترکوں کے لئے کھل گئی، ریاستہائے بلقان کے باہمی بغض و عناد نے ان کی قوتوں کو کمزور کر دیا تھا، اس لئے مراد کو شروع میں ان کی متحدہ طاقت سے مقابلہ پیش نہیں آیا، ۷۶۸ھ (۱۳۶۶ء) اور ۷۷۱ھ (۱۳۶۹ء) کے درمیان وہ بلغاریا میں بڑھتا چلا گیا، اور کوہ رودوپ تک وادی مارٹیزا پر قابض ہو گیا، سرویا اب تک بلغاریا کا شریک نہ تھا، لیکن مراد کی ان فتوحات کے بعد اس نے بلغاریا سے مل کر ترکوں کا سدباب کرنا چاہا، ۷۷۳ھ (۱۳۷۱ء) میں لالہ شاہین نے صوفیا کے قریب سماکوف کے میدان میں بلغاری اور سروی افواج کا مقابلہ کیا اور انکو سخت شکست دی، اس جنگ کے بعد کوہ بلقان تک بلغاریا کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، دوسرے سال لالہ شاہین اور عثمانی فوج کے دوسرے مشہور جنرل

افرنیوس نے مقدونیا پر حملہ کیا جو اسٹیفن ڈوشن کے زمانہ سے سرویا کا ایک صوبہ تھا اور کوالا ڈروما اور سریز کے شہروں کو فتح کرتے ہوئے دریائے وردار کو عبور کرکے قدیم سرویا، البانیا اور بوسنیا میں داخل ہوئے، لازار شاہ سرویا نے شکست کے بعد مراد کی اطاعت قبول کرلی، بلغاریہ کے بادشاہ سیسمان نے بھی اپنی لڑکی حرم سلطانی میں پیش کرکے صلح کی درخواست کی، چنانچہ بلغاریا کا وہ حصہ جو کوہ بلقان کے شمال میں واقع تھا اور اس وقت تک سلطنت عثمانیہ میں شامل نہیں کیا گیا تھا اس کی حکومت میں رہنے دیا گیا، اس کے بعد ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) تک مراد اپنے ایشیائی مقبوضات کی توسیع و استحکام میں مصروف رہا، ۷۸۳ھ میں اس نے پھر سرویا کا رخ کیا، اور عثمانی فوج نے دریائے وردار کو عبور کرکے موناستر پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں صوفیا فتح ہوا، سیسمان کو اپنی ملکہ اور خاندان کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر مراد سے رحم کی درخواست کرنی پڑی[1]، مراد نے سالانہ خراج قبول کرکے اسے بلغاریا کے تخت پر قابض رہنے کی اجازت دیدی، ۷۸۸ھ (۱۳۸۶ء) میں پچیس روز کے شدید محاصرہ اور سخت جنگ کے بعد نش پر بھی جو سرویا کے قلب میں ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا نیز قسطنطین اعظم کے مولد ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا تھا، مراد کا قبضہ ہوگیا، سرویا کو اب مقاومت کا یارانہ رہا، اس نے ہزار پونڈ نقرئی سالانہ خراج اور عثمانی لشکر کے لئے ہزار سوار دینے کا وعدہ کرکے صلح کرلی،

امن و اصلاحات کا زمانہ ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) سے ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) تک کا زمانہ مراد کے دورِ حکومت میں امن کا زمانہ تھا، اس مدت میں اس نے کوئی جنگ نہیں چھیڑی اور اپنی توجہ زیادہ تر سلطنت کے انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی، اس نے فوجی نظام

۱؎ بلقان از ولیم ملر، سلسلۂ اسٹوری آف دی نیشنز، ص ۱۸۵،

میں اصلاحات جاری کیں اور جاگیری نظام کو مکمل کیا، مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں قائم کر کے سپاہیوں کو دیں اور ہر جاگیردار کو جنگ کے موقعوں پر ایک یا ایک سے زیادہ مسلح سوار فراہم کرنے کا ذمہ دار بنایا، یہ فوجی جاگیریں چھوٹی اور بڑی دو قسموں کی تھیں، چھوٹی کو تیمار اور بڑی کو زعامت کہتے تھے[1]، اس نے شاہی زمینیں الگ قائم کیں، اور مسجدوں نیز دوسرے مذہبی اداروں کے لئے بہت سی زمینیں وقف کر دیں، مراد نے عیسائی رعایا کی ایک جماعت بھی ادنیٰ فوجی خدمات کے لئے مرتب کی، اصطبل وغیرہ کی صفائی، خیموں کو نصب کرنا اور اکھاڑنا، سامان کی گاڑیوں کی دیکھ بھال، اور اسی قسم کے دوسرے کام ان لوگوں کے فرائض میں داخل تھے، مراد ہی کے عہد میں سپاہیوں کے علم کے لئے سرخ رنگ تجویز ہوا جو عثمانی فوجوں کا قومی رنگ ہو گیا[2]،

اناطولیہ میں سلطنت کی توسیع لیکن امن کے اس زمانہ میں بھی مراد توسیع سلطنت کی تدبیروں سے غافل نہ تھا، ۷۷۳ھ (۱۳۷۱ء) میں اس نے شہزادہ بایزید کا نکاح امیر کرمیاں کی لڑکی سے کر دیا، عروس کو ریاست کرمیاں کا بڑا حصہ اور قلعہ کوتاہیہ جو اپنے مقام کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا جہیز میں ملا، اور یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، شادی کی تقریب بروسہ میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی، اناطولیہ کی تمام ترکی ریاستوں کے نمائندے اور سلطان مصر کے سفیر شریک ہوئے، یہ لوگ اپنے ساتھ عرب کے صبا رفتار گھوڑے، یونان کی حسین کنیزیں اور اسکندریہ کے حیرت انگیز ریشمی کپڑے نذر کے طور پر لائے تھے منجملہ اور تحائف کے سونے اور چاندی کے ظروف بھی تھے جنہیں طلائی اور نقرئی سکے بھرے ہوئے تھے، نیز پیالے اور طشت تھے جنہیں جواہرات جڑے ہوئے تھے، یہ تمام چیزیں مراد

---

[1] ان کے متعلق تفصیلات آئندہ آئیں گی [2] کریسی جلد ۱ ص ۳۸ ،

نے اپنے مہمانوں میں تقسیم کر دیں، لیکن جب عروس نے کرمیان کے قلعوں کی کنجیاں پیش کیں تو انھیں اپنے ہی پاس رکھا[1]۔ ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں مراد نے ریاست حمید کے امیر کو آمادہ کیا کہ اپنی ریاست کا ایک بڑا حصہ اس کے ہاتھ فروخت کر ڈالے جس میں آق شہر کا ضلع بھی شامل تھا، ریاست حمید کا یہ علاقہ شامل کر لینے سے سلطنت عثمانیہ کی سرحد ریاست کرمانیہ سے بالکل متصل ہو گئی، کرمانیہ اور آل عثمان کی آویزش ابتدا سے چلی آتی تھی، اسے دور کرنے کے خیال سے مراد نے اپنی لڑکی نفیسہ کا عقد علاء الدین امیر کرمانیہ سے کر دیا، چنانچہ تقریبًا دس سال یہ صلح قائم رہی، لیکن ان میں سے ہر فریق اناطولیہ کے ترکوں کی سرداری کا دعویدار تھا اور باوجود اس کے کہ ایشیائے کوچک کی متعدد ترکی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں، امیر کرمانیہ کی خودسری اور شورش انگیزی مراد کو اس کے ایشیائی مقبوضات کی طرف سے مطمئن نہیں ہونے دیتی تھی، چنانچہ ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور قونیہ میں علاء الدین کو بری طرح شکست ہوئی، مراد اگر چاہتا تو علاء الدین کو قتل کر کے اس کی ریاست پر قابض ہو جاتا، لیکن نفیسہ کی التجاؤں سے متاثر ہو کر اس نے علاء الدین کا قصور معاف کر دیا، اور اس کی ریاست اسے پھر بخش دی، علاء الدین نے مراد کو اپنا آقا تسلیم کیا، اسی جنگ میں شہزادہ بایزید نے اپنے حملوں کی حیرت انگیز سرعت اور شدت کی بنا پر یلدرم (بجلی) کا لقب حاصل کیا تھا، اس کے بعد مراد بروصہ کو واپس گیا، اب اس کی خواہش تھی کہ بقیہ عمر آرام اور یاد الٰہی میں گذار دے، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے ریاست تکہ پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا، اور جس فوجی افسر نے یہ تجویز پیش کی تھی اسے یہ جواب دیا کہ "امیر تکہ بہت غریب اور کمزور ہے، مجھے اس سے

---

[1] "ترکی" از لین پول، سلسلہ "اسٹوری آف دی نیشنس" ص۱۴،

جنگ کرنے میں شرم آنی چاہئے، شیر کھیوں کا شکار نہیں کرتا لیکن بہت جلد اس بوڑھے شیر کو دوسرے شیروں کے مقابلہ کے لئے اپنی آرام گاہ سے نکلنا پڑا،

مسیحی حکومتوں کا اتحاد یورپ میں اس وقت (۷۹۱ھ ۱۳۸۹ء) تک تقریبًا تمام قدیم تھریس اور جدید رومیلیا سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوچکا تھا، اس کے علاوہ بعض دوسری اہم فتوحات بھی حاصل ہوچکی تھیں، ان علاقوں میں ترک اور عرب نوآبادیاں قائم کردی گئی تھیں، اور وہاں کے اکثر باشندے دوسرے مقامات کو منتقل کردیئے گئے تھے، ان نوآبادیوں نے عیسائیوں میں ایک عام بےچینی پیدا کردی، ینی چری کے لئے ہر سال ایک ہزار عیسائی لڑکوں کے مطالبہ سے اس بےچینی میں برہمی بھی شامل ہوگئی، ترکوں کے خلاف غصہ کا جذبہ پورے جوش کیساتھ موجود تھا، اسے مشتعل کرنے کے لئے جس چنگاری کی ضرورت تھی وہ بھی جنگ قونیہ کے بعد ہاتھ آگئی، اس جنگ میں عثمانی فوج کے ساتھ سرویا کے دو ہزار سپاہی بھی شریک تھے، جو سابق معاہدہ کی روسے طلب کئے گئے تھے، کوچ سے پہلے ہی مراد نے فوج میں اعلان کرادیا تھا، کہ کرمانیہ کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد بھی ریاست کے عام باشندوں کی جان و مال کو ہرگز کسی قسم کا نقصان نہ پہونچایا جائے، اور جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کریگا وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا، لیکن سروی سپاہیوں نے جو یورپ کے دستور کے مطابق دشمن کے ملک میں پہونچ کر ہر قسم کی غارت گری کو بالکل جائز خیال کرتے تھے اس حکم کی تعمیل سے انکار کردیا، اور راستہ میں نہایت وحشیانہ طریقہ پر لوٹ مار شروع کردی، مراد نے ان میں سے بہتوں کو سخت سزائیں دیں اور بعضوں کو قتل بھی کرادیا، اس کا یہ فعل فوجی قانون کے روسے بالکل جائز تھا، لیکن اہل سرویا کے لئے یہ سخت اشتعال کا باعث ہوا، اور شاہ سرویا نے جس کی سلطنت اسٹیفن دوشن کے عہد میں بلغراد سے دریائے [illegible]

تک اور بحر اسود سے بحر ایڈریاٹک تک پھیلی ہوئی تھی عیسائی حکومتوں کا ایک عظیم الشان اتحاد قائم کرکے ترکوں کے استیصال کا بیڑا اٹھایا، اس اتحاد میں سرویا، بوسنیا، اور بلغاریا کی حکومتیں آگے ہوئیں البانیا، ولاچیا اور ہنگری نے پوری قوت کے ساتھ شرکت کی، پولینڈ نے بھی اپنی فوج بھیجی سلافی قوموں کا اتنا زبردست اتحاد اس سے پہلے کبھی قائم نہیں ہوا تھا سرویا نے مغربی یورپ کی حکومتوں کو بھی شرکت کی دعوت دی لیکن وہ مختلف وجوہ سے ادھر متوجہ نہ ہوسکیں، محاربات صلیبی کا قدیم جوش فرو ہوچکا تھا، اور ہنوز ارض مقدس کو ترکوں سے آزاد کرانے کا سوال پیدا نہ ہوا تھا، علاوہ بریں چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ کی مغربی سلطنتوں کی اندرونی حالت اور ان کے حکمرانوں کی ذاتی کمزوریاں اس اتحاد کی شرکت سے مانع تھیں، لیکن اسوقت تمام یورپ کے متحد نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب لاطینی کلیسا کا وہ شدید افتراق تھا جس نے کل مغربی سلطنتوں کو دو متخاصم جماعتوں میں تقسیم کردیا تھا، ایک جماعت پاپائے روما کے زیر فرمان تھی، اور دوسری اس کے حریف پوپ کی حلقہ بگوش تھی، جس نے اویناں (واقع فرانس) کو اپنے جدید کلیسا کا مرکز قرار دیا تھا،

جنگ کسووا بہرحال سرویا نے مشرقی حکومتوں کے اتحاد سے جو قوت فراہم کرلی تھی، وہ بظاہر ترکوں کو یورپ سے نکال دینے کے لئے کافی تھی، مراد نے اس اجتماع کی خبر بروصہ میں سنی اور گو اس کی عمر ستر سال کی ہوچکی تھی تاہم عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے فوراً روانہ ہوگیا، اتحادیوں نے مراد کے پہونچنے سے پہلے ہی بوسنیا میں ایک عثمانی فوج پر حملہ کیا، اور منجملہ بیس ہزار ترک سپاہیوں کے پندرہ ہزار کو تہ تیغ کر ڈالا، اس کے بعد فوراً ہی علی پاشا مراد کے حکم کے مطابق درۂ دربند کی راہ سے کوہ بلقان کو عبور کرکے بلغاریا میں داخل ہوا، اور شوملہ اور ترنوا پر قبضہ کرکے دریائے ڈینوب کی طرف بڑھا سیسمان، شاہ بلغاریا نے بھاگ کر نائکوپولس میں پناہ

لی، لیکن بہت جلد اُسے مراد سے معافی مانگ کر صلح کر لینی پڑی، شرائطِ صلح یہ تھے کہ سلسٹریا کا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا جائیگا، اور بلغاریا سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا، سیسمان کی علٰحدگی کے باوجود شاہِ سرویا نے استقلال کے ساتھ جنگ جاری رکھی، اور سیسمان بھی چند ہی دنوں میں معاہدہ کو توڑ کر پھر سرویا سے مل گیا، اس نے سلسٹریا سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا، اور ایک فوج سرویا کی مدد کے لئے روانہ کی، مراد نے علی پاشا کو اُس کے مقابلہ میں بھیجا، سیسمان پھر نائکوپولس میں پناہ گزین ہوا، اور یہ اہم قلعہ دوبارہ فتح ہوا، مراد نے اس مرتبہ بھی سیسمان کی جان بخشی کی، لیکن اس کی بار بار کی غداری کی سزا میں بلغاریا کا جنوبی حصہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، لازار شاہِ سرویا اپنے دوسرے حلیفوں کے ساتھ برابر ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا، بالآخر اس نے تمام اتحادی افواج کو جمع کر کے ایک فیصلہ کن معرکہ کا تہیہ کیا، اور اپنے لشکر کی کثرت و قوت پر اعتماد کر کے مراد کے پاس آخری جنگ کا پیغام بھیجا، چنانچہ ۱۵ جون ۱۳۸۹ء (۷۹۱ھ) کو کسووا کے میدان میں وہ آخری مقابلہ پیش آیا جس نے اتحادیوں کا شیرازہ پراگندہ کر کے سرویا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، جنگ اختتام کے قریب تھی کہ میلوش کوبیلوویچ (Milosh Kobilovich) نامی ایک سروی امیر عثمانی لشکر کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا، اور وہاں شاہِ لازار کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے اس نے یہ بیان کیا کہ مجھے کچھ نہایت اہم باتیں سلطان سے کہنی ہیں، چنانچہ وہ مراد کی خدمت میں لایا گیا، لیکن قدمبوسی کے وقت اُٹھکر دفعۃً اس نے مراد پر خنجر سے حملہ کیا، اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر بھاگ جانے کی کوشش کی، سپاہیوں نے چشم زدن میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، مگر مراد کو زخم کاری پہونچ چکا تھا، اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر کا مہمان اور ہے، اسی حالت میں اس نے آخری حملہ کا حکم دیا، جس نے جنگ کا فیصلہ کر دیا،

وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات پورے کر رہا تھا کہ لازار گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا، اس نے اس کے قتل کا حکم دیا، اور کچھ دیر بعد خود بھی جان بحق تسلیم ہوا، میلوش کے واقعہ کے بعد سے یہ قاعدہ ہو گیا کہ جب کوئی اجنبی شخص سلطان کے حضور میں لایا جاتا تو دو آدمی اس کے بازو پکڑے رہتے، تاکہ وہ فریب نہ کر سکے، انیسویں صدی سے اس قاعدہ کی پابندی جاتی رہی، تاہم گذشتہ صدی میں بھی غیر ملکوں کے سفیروں کو سلطان کے بہت قریب جانے کی اجازت نہیں دیجاتی تھی،[1]

جنگ کسووا کے بعد پانچ سو برس تک اہل سرویا نے پھر کبھی متحد ہو کر ترکوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کی، بہتیرے بھاگ کر جبل اسود (مونٹی نیگرو) میں پناہ گزیں ہو گئے اور وہاں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے برابر جنگ کرتے رہے، بہت سے بوسنیا اور ہنگری میں جا کر آباد ہو گئے، لیکن بحیثیت ایک خود مختار حکومت کے سرویا کا خاتمہ ہو گیا، اگرچہ اس کے بعد بھی ستر سال تک سرویا کی عنانِ حکومت ملکی فرماں رواؤں کے ہاتھ میں رہی، تاہم اس کی حیثیت محض ایک باجگذار مملکت کی تھی،

مراد کے کارنامے مراد کا عہدِ حکومت تاریخِ آلِ عثمان کے اہم ترین عہدوں میں ہے، اس نے تیس سال تک حکومت کی، ان میں سے چوبیس سال میدانِ جنگ میں صرف کئے، اور ہر جنگ میں کامیاب رہا، مراد سے پہلے ترکوں کا مقابلہ یورپ کی قوموں میں سے صرف بازنطینیوں سے ہوا تھا جن کی سلطنت اپنے زوال کی آخری منزلیں طے کر رہی تھی لیکن مراد کی ظفریاب فوجیں ان ملکوں میں بھی پھیل گئیں جو یورپ کی نہایت طاقتور سلافی قوموں کے زیرِ نگیں تھے، اور بلغاریا، سرویا، اور بوسنیا پر دولت عثمانیہ کا تسلط قائم ہو گیا، مراد ہی

[1] "ترکی" از لین پول ص۴۵،

کے عہد میں اوّل بار آلِ عثمان اور اہلِ ہنگری کا مقابلہ پیش آیا جس میں موخر الذکر کو سخت شکست اٹھانی پڑی، مراد کی فتوحات نے سلطنت عثمانیہ کے دائرۂ اقتدار کو دریائے ڈینوب تک پہونچا دیا، اور گو بعض ریاستوں مثلاً سردیا اور بوسنیا سے محض خراج قبول کرنے پر قناعت کی گئی، تاہم تھریس، مقدونیا، اور جنوبی بلغاریا کی ریاستیں کمل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں،

مسٹر گبنس لکھتے ہیں: "تیس سال تک مراد نے عثمانیوں کی سیادت ایسے سیاسی تدبر کے ساتھ کی کہ اس عہد کا کوئی مدبر اس پر فوقیت نہ حاصل کر سکا، محض اس لئے کہ مراد کی بہ نسبت محمد فاتح اور سلیمان اعظم سے متعلق ہمارے معلومات بہت زیادہ ہیں، مراد کا صحیح مقام کہ وہ خاندان عثمانی کا سب سے زیادہ ممتاز و کامیاب ماہر سیاست اور محارب تھا، کبھی پہچانا نہ جا سکا، جب ہم ان دشواریوں کا جن کا اس نے مقابلہ کیا، اُن مسائل کا جنھیں اس نے حل کیا، اور اس کے عہد حکومت کے نتائج کا موازنہ اس کے زیادہ پر شکوہ جانشینوں کے کارناموں سے کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ اگر وہ ان سے بڑھ کر نہیں تو ان کے برابر ضرور رہے، جو تغیر اس نے اپنی مدت حیات کے اندر کر دیا وہ تاریخ کے نہایت حیرت انگیز واقعات میں سے ہے، اس کی فتوحات کو پانچ صدیوں تک قائم رہنا تھا، ۱۹۱۸ء کے معاہدہ برلن تک ان میں سے بعض حال کی جنگ بلقان کے طوفان کے بعد بھی باقی رہ گئی ہیں[۱]"

مراد نے مسیحی علاقے فتح کر کے ان میں اسلامی حکومت قائم کی لیکن عیسائیوں کو بجبر اسلام میں داخل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، برخلاف اس کے اس نے انھیں پوری

---

[۱] ہربرٹ گبنس، ص ۱۷۱،

مذہبی آزادی دے رکھی تھی، جس کی واضح شہادت اس خط میں محفوظ ہے جو ۷۸۷ھ ہجری (۱۳۸۵ء) میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو لکھا تھا، بطریق مذکور نے اقرار کیا ہے، کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی بخش دی تھی، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۷۶۷ھ (۱۳۶۶ء) اور ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) کے درمیان بطریق اعظم کے دفتر میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کی بدسلوکی کی درج نہیں ملتی،[1]

---

[1] ہربرٹ گبنس ص۱۷۸،

بایزید اوّل یلدرم

سنہ ۷۹۱ھ تا سنہ ۸۰۵ھ مطابق سنہ ۱۳۸۹ء تا سنہ ۱۴۰۲ء

مراد کی شہادت کے بعد ہی جنگ کسووا کا بھی خاتمہ ہو گیا، شہزادہ بایزید جب اتحادیوں کو پوری طرح شکست دینے کے بعد اپنے لشکر میں واپس آیا تو فوج کے تمام سرداروں نے اس کا خیر مقدم وارثِ تاج و تخت کی حیثیت سے کیا، لیکن تخت نشین ہونے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ یعقوب کو جس نے اس جنگ میں شجاعت اور فوجی قابلیت کے اعلیٰ جوہر دکھائے تھے فوراً قتل کرا دیا، باپ کی لاش ابھی سرد بھی نہیں ہوئی تھی الفتنۃ اشد من القتل کی آڑ لے کر یعقوب کے وجود کو سلطنت کے لئے فتنہ قرار دیا گیا، اور صاوجی کی بغاوت نظیر میں پیش کی گئی، تختِ سلطنت کی خاطر آلِ عثمان میں یہ پہلا قتل تھا، جس نے آئندہ کے لئے مثال قائم کر دی،

سردیا سے صلح اتحادیوں کی شکست کے بعد بھی سردیا نے کچھ دنوں تک جنگ جاری رکھی، لیکن بالآخر اسے صلح کر لینی پڑی، بایزید نے سردیا کی خود مختاری قائم رکھی اور صرف اس کے باجگذار ہونے پر اکتفا کی، لازار کے جانشین شاہ اسٹیفن نے سالانہ خراج کے علاوہ پانچ ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ سلطان کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رکھنے کا معاہدہ کیا، نیز اپنی بہن شہزادی ڈسپینا کو بایزید کے نکاح میں دیدیا، اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سلط

کی تمام لڑائیوں میں وہ اپنی فوج لے کر خود شریک ہوا کریگا، چنانچہ آخر وقت تک وہ اس معاہدہ پر قائم رہا، اور نائکوپولس اور انگورہ کی معرکۃ الآرا جنگوں میں اسٹیفن بایزید کے دوش بدوش لڑتا رہا، اور سروی افواج کی خدمات حد درجہ وقیع اور موثر ثابت ہوئیں،

شہنشاہ سے جدید صلحنامہ، سرویا سے صلح کرنے کے بعد بایزید قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا، اور اینڈرونیکس کے تخت پر بٹھانے کی دھمکی دیکر شہنشاہ جان پیلیولوگس کو ایک جدید صلحنامہ پر مجبور کیا، جس نے بازنطینی سلطنت کی رہی سہی حیثیت بھی خاک میں ملا دی، جان اور اس کے لڑکے مینوئل نے جو تخت سلطنت میں اپنے باپ کا شریک تھا، معاہدہ کیا کہ تیس ہزار طلائی سکے بطور خراج ہر سال ادا کرتے رہیں گے، اور بارہ ہزار کا ایک فوجی دستہ بایزید کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رکھیں گے، ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کے مقبوضات میں سے اب صرف ایک قلعہ فلاڈلفیا اور باقی رہ گیا تھا، اس صلحنامہ میں وہ بھی بایزید کے نام لکھ دیا گیا، لیکن اس قلعہ کے یونانی افسر نے شہنشاہ کے حکم کے باوجود قلعہ خالی کرنے سے انکار کر دیا، بایزید نے شہنشاہ کو مجبور کیا کہ وہ خود اپنی فوج کے ذریعہ سے قلعہ خالی کرا دے، چنانچہ دولت بازنطینیہ کے انتہائی زوال کا یہ عبرتناک واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ یونانی سپاہیوں نے فلاڈلفیا پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے بایزید کے حوالہ کر دیا،

اناطولیہ کی فتوحات ایشیائے کوچک کی اکثر ترکی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں، بایزید نے باقی ماندہ پر بھی قبضہ کر لینا چاہا اور سب سے پہلے ایدین کی طرف بڑھا، ایدین کو فتح کرنے کے بعد اس نے امنتشا اور صاروخاں کا رخ کیا، ان ریاستوں کے امیروں نے بھاگ کر امیر قسطمونی کے پاس پناہ لی، اور امنتشا اور صاروخاں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں، ایدین، امنتشا اور صاروخاں کی فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عثمانی ترک

بحر ایجین کے ساحل تک پہونچ گئے، یہیں سے عثمانی بحری طاقت کی ابتدا ہوتی ہے، گو بایزید کے عہد میں اس کو ترقی نہ ہوسکی، ساٹھ جہازوں کا پہلا عثمانی بیڑا[1] ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) میں روانہ ہوکر جزیرہ کیوس (Chios) پر حملہ آور ہوا، اس کے بعد بایزید نے سمرنا پر حملہ کیا، یہ شہر یروشلم کے مبارزین سینٹ جان کا مقبوضہ تھا، بحری قوت کے ناکافی ہونے کی وجہ سے بایزید کو چھ ہفتوں کے بعد سمرنا کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا، ریاست تکہ کے ایک حصہ پر مراد کے زمانہ میں قبضہ ہوچکا تھا، بایزید نے بقیہ علاقہ کو بھی اپنی حدودِ سلطنت میں لے لیا، اب صرف دو[2] ریاستیں کرمانیہ اور قسطمونی سلطنت عثمانیہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، بایزید نے کرمانیہ پر بھی حملہ کیا، حالانکہ کرمانیہ کے امیر علاء الدین سے اس کی بہن بیاہی ہوئی تھی، اور پایہ تخت قونیہ کا محاصرہ کرلیا، علاء الدین نے کرمانیہ کا ایک ٹکڑا جسمیں آق شہر بھی شامل تھا بایزید کی نذر کرکے صلح کرلی،

قسطنطنیہ کا محاصرہ

ان فتوحات کے بعد جن کا اکثر حصہ بغیر کسی جنگ کے ہاتھ آیا تھا، بایزید پھر دردانیال کو عبور کرکے ادرنہ چلا گیا، اس درمیان میں جان پلیو لوگس نے قسطنطنیہ کے تین گرجے مسمار کرادیئے تھے، اور وہ اُن کے سامان سے نئے قلعے تعمیر کرانا چاہتا تھا، بایزید نے اس ارادہ سے شہنشاہ کو بجبر باز رکھا، چند ہی دنوں کے بعد جان کا انتقال ہوگیا، اس کا لڑکا مینوئل جو کچھ عرصہ سے بایزید کے دربار میں مامور تھا، شہنشاہ کے انتقال کی خبر سن کر چپکے سے بھاگ کر قسطنطنیہ پہونچا اور اپنے باپ کا جانشین ہوا، بایزید کو یہ بات ناگوار ہوئی، اور اس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا، سات مہینے تک محاصرہ جاری رہا، پھر چونکہ بایزید کو بلغاریا میں سجسمنڈ شاہِ ہنگری کے جارحانہ اقدام کو روکنے کے لئے فوجیں

---

[1] ہربرٹ گبنس، صفحہ ۱۸۶،

درکار تھیں، اس لئے اس نے دس سال کے لئے صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا، شرائطِ صلح بہت سخت تھے، سالانہ خراج کی رقم تیس ہزار طلائی کراؤن مقرر ہوئی مسلمانوں کے لئے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی جسمیں بایزید نے ایک ترکی قاضی مقرر کیا، اور کلیسائے مشرق کے اس مرکز میں ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کی گئی، جس کے میناروں سے توحید اسلامی کا اعلان ہونے لگا[1]، مسٹر گبنس نے لکھا ہے کہ مینوئل نے شہر کے سات سو مکانات بھی مسلمانوں کو دیدیئے اور غلطہ کا نصف حصہ بایزید کے حوالہ کر دیا جسمیں اس نے چھ ہزار عثمانی فوج متعین کر دی، شہر کے باہر جو انگور کے باغ اور ترکاریوں کے کھیت تھے ان کی پیداوار کا عشر بھی صلحنامہ کے رو سے عثمانی خزانہ کو دیدیا گیا، اسی وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا[2]،

ولاچیا اسکے بعد بایزید نے ولاچیا کا رخ کیا اور اسے دولت عثمانیہ کا باجگذار بنا کر بوسنیا اور ہنگری کی طرف بڑھا، ابتدا میں ترکوں کو بوسنیا اور ہنگری کی متحدہ افواج سے شکست ہوئی اور نائکوپولس کا مضبوط قلعہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا لیکن سجسمنڈ کی یہ کامیابی بالکل عارضی تھی، اور چند ہی دنوں میں اسے شکست کھا کر بھاگنا پڑا، نائکوپولس پر پھر ترکوں کا قبضہ ہو گیا،

بلغاریا کی فتح ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں بایزید نے اپنے سب سے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کو بلغاریا کی طرف روانہ کیا، بلغاریا کا جنوبی حصہ مراد ہی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا، بایزید نے شمالی حصہ پر بھی قبضہ کر لینا چاہا، شاہ سیسمان نے جم کر مقابلہ کیا لیکن تین ہفتہ کے محاصرہ کے بعد پایہ تخت ترنووا فتح ہو گیا، اور پورے ملک پر ترکوں کا

---

[1] گبن جلد ۴ ص ۳۹۳، [2] ہربرٹ گبنس ص ۱۹۹،

تسلط ہوگیا، اب شمالی بلغاریا بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کرلیا گیا، بلغاریا کا شاہی خاندان ختم ہوگیا، بلغاریا کا اسقفِ اعظم جلاوطن کردیا گیا، اور بلغاری کلیسا قسطنطنیہ کے یونانی کلیسا کا ماتحت بنا دیا گیا، اور اس کی یہ محکومی ٹھیک پانچ سو برس تک قائم رہی، بلغاریا کے جن باشندوں نے اسلام قبول کرلیا، ان کی زمینیں ان ہی کے قبضہ میں چھوڑ دی گئیں، باقی سارا علاقہ فوجی جاگیروں کی شکل میں ترکوں کو دیدیا گیا،

ویدین اور سلسٹریا نائکوپولس پہلے ہی فتح ہوچکا تھا، بایزید نے ویدین اور سلسٹریا پر بھی قبضہ کرلیا، یہ تینوں قلعے ہنگری کی سرحد پر واقع تھے، ان کی فتح کے بعد ترکوں نے ہنگری کے سرحدی علاقہ میں چھوٹے چھوٹے حملے شروع کردیئے، بایزید اب ہنگری پر حملہ کرنے کی تیاری کررہا تھا کہ دفعۃً اسے ایشیائے کوچک کی جانب متوجہ ہونا پڑا،

کرمانیہ کرمانیہ اور آلِ عثمان کی عداوت بدستور چلی آتی تھی، مراد نے اپنی ایک لڑکی کا نکاح علاء الدین سے کرکے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن اناطولیہ کے ترکوں کی سرداری اور آلِ سلجوق کی قائم مقامی کا حوصلہ امیر کرمانیہ کو چین نہیں لینے دیتا تھا، وہ ہر موقع پر دولتِ عثمانیہ کو نقصان پہونچانے کی کوشش کرتا، مراد کے عہد میں بھی وہ ایک سے زائد بار اپنی دشمنی کا ثبوت دے چکا تھا، اور اب بایزید کے مقابلہ میں بھی اُس نے اپنی وہی قدیم روش قائم رکھی، چنانچہ بایزید جب ہنگری کی فتح کی تیاری کررہا تھا علاء الدین نے اناطولیہ کے عثمانی علاقوں پر حملہ کردیا، انگورہ اور بروصہ کے درمیان سخت معرکہ ہوا جسمیں عثمانی فوج کو بُری طرح شکست ہوئی، اور تیمور تاش پاشا جو سالارِ عسکر اور ایشیائے کوچک میں بایزید کا نائب سلطنت تھا، علاء الدین کے ہاتھ میں گرفتار ہوگیا، یہ خبر سنکر بایزید سرعت کے ساتھ اناطولیہ پہونچا اور آق چائی کے مقام پر کرمانی لشکر کو شکست دیکر علاء الدین

اور اس کے دو لڑکوں محمد اور علی کو قید کرلیا، علاء الدین اور اس کے دونوں لڑکے تیمور تاش پاشا کی حراست میں رکھے گئے، اور اس نے بایزید کی اجازت کے بغیر تینوں کو پھانسی دیدی، بایزید یہ معلوم کرکے بہت برہم اور رنجیدہ ہوا، لیکن پھر اس مقولہ کو یاد کرکے خاموش ہوگیا کہ "ایک امیر کی موت اتنی بری نہیں جتنا ایک صوبہ کا نقصان" لارڈ ایورسلے نے اس ترکی مقولہ کو قرآن کریم کی ایک آیت قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ اس آیت کے بموجب بایزید نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کرمانیہ کی پوری ریاست پر قبضہ کرکے اسے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرلیا جائے[1] اسلام کی دشمنی میں اتنا سفید جھوٹ جو بیسویں صدی کے ایک انگریز مورخ کے قلم سے نکلا ہے قرونِ وسطیٰ کے مسیحی مفتریوں کو بھی نہ سوجھا ہوگا، بہرحال کرمانیہ پر بایزید کا قبضہ ہوگیا، اور ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی قائم مقامی کے لئے اب آلِ عثمان کا کوئی حریف باقی نہ رہا،

بقیہ ترکی ریاستیں | اس کے بعد ۹۶-۹۵-۷۹۵ھ (۹۴-۱۳۹۳ء) میں بایزید نے سیواس، سمسون، اور اماسیا میں اپنی فوجیں روانہ کیں اور ان علاقوں کو بھی فتح کرلیا، اب صرف ریاست قسطمونی سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی، دوسری مفتوحہ ریاستوں کے امراء قسطمونی میں جاکر پناہ لیتے تھے، بایزید نے اسی امر کو بنائے مخالفت قرار دیکر قسطمونی پر بھی حملہ کیا، اور اناطولیہ کی اس آخری ترکی ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا،

سلطان بایزید | ان فتوحات کے بعد امیر کا لقب جسے اب تک عثمانی فرماں روا اختیار کرتے آئے تھے، بایزید کو اپنی عظمت وشان کے مقابلہ میں فروتر معلوم ہونے لگا، چنانچہ اس نے مصر کے عباسی خلیفہ کی اجازت سے سلطان کا لقب اختیار کرلیا، خلیفہ کو عملاً

اگرچہ کوئی اقتدار حاصل نہ تھا تاہم اسلامی دنیا میں اس کی مذہبی حکمرانی اب بھی تسلیم کیجاتی تھی، اور بایزید جیسے بادشاہ کو بھی جو اپنی سطوت میں یورپ اور ایشیا کے بڑے سے بڑے فرمانرواؤں کا حریف تھا سلطان کے لقب کو جائز قرار دینے کے لئے خلیفہ ہی کا فرمان حاصل کرنا پڑا،

اس موقع پر لین پول عام مورخین سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آل عثمان میں بایزید پہلا شخص نہیں ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، بلکہ برٹش میوزیم اور دوسرے مقامات پر عثمانیوں کے جو سکے محفوظ ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اورخان اور مراد اول بھی اپنے سکوں پر سلطان کا لقب کندہ کراتے تھے، عثمان کے نام کا کوئی سکہ موجود نہیں (کیونکہ اگرچہ سلطان علاء الدین سلجوقی نے اسے اپنا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دیدی تھی، تاہم اس نے اس حق کو استعمال نہیں کیا) اور غالباً پہلا عثمانی سکہ اورخان کے عہد میں جاری ہوا، پس بایزید کے لئے سلطان کا لقب صرف اس بنا پر ایک نئی چیز ہوسکتا ہے کہ اس نے اس کے لئے خلیفۂ اسلام کی اجازت بھی حاصل کرلی[1]

وتفریحیش یورپ اور ایشیا کی ان عظیم الشان فتوحات کے بعد بایزید نے کچھ دنوں آرام کرنے کا قصد کیا، اور ہمہ تن محل سرا کے عیش و نشاط میں محو ہوگیا، شہزادی ڈسپینا کی ترغیب سے اس نے شراب بھی شروع کردی تھی[2] جسے اس وقت تک کسی عثمانی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، شراب کا سرور عیش کے دیگر لوازم کا بھی متقاضی ہوا، اور پھر تو اس سلسلہ کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو باقی رہی ہو، لیکن جام و سبو کی یہ تمام سرمستیاں بایزید کے قوائے عمل کو مضمحل نہ کرسکیں، اور جب اس نے سنا کہ یورپ نے ایک زبردست صلیبی اتحاد

[1] لین پول، صنہ، نٹ نوٹ، [2] نولس (Knolles) بحوالہ لین پول صہ ۴۹.

قائم کرکے سلطنت عثمانیہ کے استیصال کا بیڑا اٹھایا ہے، تو عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے یوں اٹھ کھڑا ہوا، جیسے کوئی خواب شیریں سے آسودہ ہو کر تازہ قوت کے ساتھ بیدار ہوتا ہے،

صلیبی اتحاد

جنگ کسووا کے بعد سرویا کی تسخیر نے ہنگری کی آزادی کو سخت خطرہ میں ڈال دیا تھا خصوصاً نانکوپولس، ویدین اور سلسٹریا کے فتح ہو جانے کے بعد ترکوں کیلئے ہنگری کا راستہ کھل گیا تھا، ان کے متواتر حملوں سے عاجز آکر سجسمنڈ شاہ ہنگری نے یورپ کی عیسائی سلطنتوں سے مدد کی درخواست کی، چونکہ ہنگری کلیسائے رومہ سے وابستہ تھا، اس لئے پوپ نے بھی اس کی سرپرستی کی اور ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کردی، ابتک ترکوں کے خلاف عیسائیوں کا جو اتحاد قائم ہوا تھا، اسمیں مغربی یورپ کی حکومتوں نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا، اس مرتبہ سجسمنڈ کی خاص کوشش یہ تھی کہ فرانس بھی اس کی مدد کے لئے اپنی فوجیں روانہ کرے، اتفاق سے اس زمانہ میں فرانس اور انگلستان کے درمیان جنگ موقوف تھی جس کی وجہ سے فرانس کو اس اتحاد کی شرکت میں تامل نہ ہوا، فرانس اور برگنڈی کے پرجوش نوجوان بھی مشرقی یورپ کے میدانوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے کے لئے بیچین تھے، طے یہ پایا کہ ڈیوک آف برگنڈی کا لڑکا کونٹ ڈی نیورس (Count de Nevers) ایک فوج لے کر شاہ ہنگری کی مدد کے لئے روانہ ہو، اور وہی فرانسیسی اور دوسرے سوار دستوں کا سالار عسکر مقرر کیا جائے، ان بہادروں کے پیش نظر صرف ہنگری کی مدد نہ تھی بلکہ منصوبے یہ تھے کہ ہنگری میں بایزید کی قوت کو توڑنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بڑھیں اور پھر دردانیال کو عبور کرکے شام میں داخل ہوں، ارض مقدس پر قبضہ کریں، اور یروشلم اور درگاہ شریف کو مسلمانوں کے ہاتھ سے آزاد کرائیں، غرض شہرت اور ناموری کے شوق میں مبارزین

جوق در جوق اکٹھا ہونے لگے، شاہی خاندان اور فرانسیسی امرا کے ممتاز اشخاص جو فن سپہگری میں خاص شہرت رکھتے تھے، اس مقدس مہم میں شریک ہوئے، یہ منتخب فوج ۷۹۸ھ (مارچ ۱۳۹۶ء) میں فرانس سے روانہ ہوئی، راستہ میں جرمنی سے گذرتے ہوئے جرمنی کے شاہی خاندان کے بعض افراد مثلاً فریڈریک، کاونٹ آف ہوہنزولرن (Count of Hohenzollern) اور روڈس کے مبارزین سینٹ جان کا افسر اعلیٰ بھی ایک مضبوط دستہ لے کر شامل ہوگیا، ان کے علاوہ سجسمنڈ نے بویریا اور اسٹائریا کے سوار دستے بھی فراہم کرلئے تھے، مغربی یورپ کے مسیحی مجاہدوں کی مجموعی تعداد دس بارہ ہزار تھی، اور وہ سب کے سب اپنی شجاعت کے نشہ میں اس قدر سرشار تھے کہ ان کا دعویٰ تھا کہ اگر آسمان بھی گرنے لگے تو وہ اپنے نیزوں کی نوک پر اس کو روک لیں گے، سجسمنڈ نے اپنی مملکت سے جس قدر فوج ممکن تھی فراہم کی اور امیر ولاچیا کو بھی اس صلیبی اتحاد میں شریک ہونے پر آمادہ کیا، حالانکہ تھوڑے ہی دنوں پہلے ولاچیا اور دولت عثمانیہ میں صلح ہوچکی تھی اور امیر ولاچیا سالانہ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کرکے اپنی خودمختاری برقرار رکھ سکا تھا، مسیحی فوجوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ تھی[1]،

ابتدائی فتوحات اتحادی فوجیں بودا واقع ہنگری میں اکٹھا ہوئیں اور وہاں سے کچھ ٹرانسلوینیا اور ولاچیا کی راہ سے اور کچھ سرویا کے راستہ سے عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ ہوئیں، چونکہ سرویا کا بادشاہ بایزید کا حلیف تھا اور کامل وفاداری کے ساتھ اپنے معاہدہ پر قائم تھا، اس لئے ان مسیحی مجاہدوں نے سرویا کے باشندوں کے ساتھ بھی جو تمامتر عیسائی ہی تھے، وحشیانہ قتل و غارت گری کا وہی سلوک کیا جو وہ ترکوں کے ساتھ کرتے، سب سے پہلے سجسمنڈ نے ویدین پر حملہ کیا اور اسے فتح کرکے سسٹووا اور

آرسوو پر قبضہ کرتا ہوا نائکوپولس کی طرف بڑھا، نائکوپولس پہونچ کر فوراً اس کا محاصرہ کر لیا، نائکوپولس کے کمانڈر یوغلان بے نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا، اور محاصرہ کی انتہائی شدت کے باوجود حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، اسے یقین تھا کہ بایزید اس کی مدد کو ضرور پہونچے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بایزید جو اس درمیان میں اپنی بہترین فوج کے ساتھ روانہ ہو چکا تھا، برقی سرعت کے ساتھ محاصرہ کے سولھویں دن نائکوپولس پہونچ گیا،

مسیحی لشکر میں قمار بازی اور مےخواری کا ایک ہنگامہ برپا تھا، اس نشہ کو ابتدائی فتح کے جرعات نے اور بھی تیز کر دیا تھا، عیسائیوں خصوصاً فرانسیسیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ بایزید اس قدر جلد آ پہونچے گا، وہ علانیہ کہتے تھے کہ اسے ان کے مقابلہ میں آبنائے باسفورس کے عبور کرنے کی بھی جرات نہ ہوگی، وہ ترکی فوجوں کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے تھے اور انھیں اپنا حریفِ مقابل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے، ان کو اپنی کامیابی کا اس درجہ یقین تھا کہ انھوں نے یہ دریافت کرنے کی بھی مطلق فکر نہ کی کہ ترک آ تو نہیں رہے ہیں، ان مجاہدینِ صلیب کے ساتھ ان کی طوائفیں بھی آئی تھیں[1]، جن کی عشوہ طرازیوں نے فوجی کیمپ کو نشاط محل بنا رکھا تھا،

معرکۂ نائکوپولس ۲۳ ذی قعدہ ۷۹۸ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۱۳۹۶ء کو کاونٹ ڈی نورس اپنے فرانسیسی ساتھیوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً اسے یہ اطلاع ملی کہ ترکی فوج قریب آ گئی، سب کے سب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑائی کے لئے ہتھیار باندھنے لگے، وہ چاہتے تھے کہ بلا تاخیر ترکوں پر حملہ کر دیں، سجسمنڈ عثمانیوں کے اصولِ جنگ

---

[1] ایورسلے ص ۴۹،

سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ سب سے آگے بے قاعدہ اور غیر مرتب دستے ہوتے ہیں، جو دشمن کے پہلے حملہ کا زور توڑنے کے لئے آگے رکھے جاتے ہیں، اصلی اور باقاعدہ فوج ان کے پیچھے ہوتی ہے، اسی بنا پر اس نے فرانسیسی فوج کو مشورہ دیا کہ ان بے قاعدہ سواروں پر حملہ کر کے اپنی قوت کو ضائع نہ کریں، بعض فرانسیسی کمانڈروں نے اس رائے سے اتفاق کیا، لیکن دوسروں نے اس بدگمانی کی بنا پر کہ سجسمنڈ پہلے خود حملہ کرنا چاہتا ہے، یہ گوارا نہیں کیا کہ فرانسیسی دستے ہنگری کی فوج سے پیچھے رہیں اور اس مشورہ کی مخالفت کی، فرانس کے نوعمر بہادروں نے بھی اس رائے کی پرجوش مخالفت کی اور اسی جوش میں اُن ترک قیدیوں کو جو ان کے قبضہ میں تھے اور جنھوں نے امن کے وعدہ پر ہتھیار ڈالے تھے قتل کر ڈالا،

بایزید نے عیسائی لشکر سے تھوڑے فاصلہ پر اپنی خاص فوج کو روک کر پہلے بے قاعدہ فوج دشمن کے مقابلہ میں روانہ کی اور ان کی مدد کے لئے ینی چری اور سواروں کا ایک دستہ آگے بڑھایا، فرانس کے نوعمر نائٹ ترکوں کے اصول جنگ سے بالکل ناواقف تھے وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ عثمانیوں کی اصلی فوج بے قاعدہ فوج کے پیچھے ہوتی ہے، سجسمنڈ نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر انھوں نے اس کی ایک نہ سنی اور پوری قوت کے ساتھ ترکوں کے مقدمۃ الجیش پر ٹوٹ پڑے، آسانی کے ساتھ اسے شکست دیتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور پھر ینی چری اور سواروں کی صفوں کو چیرتے ہوئے جنھیں بایزید نے پہلے روانہ کر دیا تھا، اسی جوش میں اتنی دور نکل گئے، کہ باقی ماندہ اتحادی فوجوں سے ان کا تعلق تقریباً منقطع ہو گیا، دفعۃً انھیں بایزید کی چالیس ہزار بہترین فوج نظر آئی جسے دیکھتے ہی ان کو اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا، اور انھوں نے فوراً واپس ہونے کی

کوشش کی، مگر واپسی اب اون کے اختیار سے باہر تھی، آگے سلطان کی تازہ دم فوج تھی اور پیچھے سے وہ ترکی دستے جنھیں وہ منتشر کر چکے تھے، دوبارہ جمع ہو کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر کہ اب جان بچانا کسی طرح ممکن نہیں، وہ مایوسانہ طور پر نہایت بے جگری سے لڑے، اور ان چھ ہزار بہادروں میں سے تقریبًا سب کے سب مارے گئے، جو بچ رہے وہ قید کر لئے گئے، صرف چند ایسے تھے جو بھاگ کر عیسائی لشکر میں پہونچ سکے، اس کے بعد بایزید سجسمنڈ کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھا، اسے دیکھتے ہی اتحادی فوج کے دونوں بازو فورًا بھاگ کھڑے ہوئے، البتہ قلب لشکر نے جو ہنگری، بویریا اور اسٹائریا کے دستوں پر مشتمل تھا، اور جس کی کمان خود سجسمنڈ کے ہاتھ میں تھی، جم کر مقابلہ کیا، لیکن یہ جنگ تین گھنٹہ سے زیادہ نہ قائم رہ سکی، اتحادیوں کو بُری طرح شکست ہوئی، ان کے ہزاروں سپاہی کام آئے اور دس ہزار گرفتار کر لئے گئے، سجسمنڈ چند سرداروں کے ساتھ بمشکل جان بچا کر بھاگا، اس جنگ میں اسٹیفن کی سروی فوج سے جو بایزید کی حمایت میں لڑ رہی تھی، عثمانی فوج کو بڑی مدد پہونچی،

فتح کے بعد بایزید نے میدانِ جنگ کا معاینہ کیا، اُس وقت اُسے مقتول ترکوں کی تعداد کا اندازہ ہوا، نیز یہ معلوم کر کے کہ ابتدائے جنگ میں جن ترکوں نے مغلوب ہو کر جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیئے تھے انھیں بھی عیسائیوں نے نقضِ عہد کر کے قتل کر ڈالا، اس کا رنج وغصہ اور بھی زیادہ ہوا، اور اس نے تہیہ کر لیا، کہ اُن کے خون کا بدلہ عیسائی قیدیوں سے لے کر رہے گا، چنانچہ دوسرے روز صبح کو اُس نے تمام عیسائی قیدیوں کو جن کی تعداد دس ہزار تھی، اپنے سامنے کھڑا کر کے ان کے قتل کا حکم دیا، قیدیوں میں کونٹ ڈی نیورس بھی تھا، بایزید نے اسے قتل سے مستثنیٰ کر دیا، اور اسے اجازت دی

کہ قیدیوں میں سے چوبیس عیسائی شرفا کو منتخب کرے، اور ان سب کی بھی جان بخشی کر دی، اس کے بعد قتل شروع ہوا، جو چار بجے شام تک جاری رہا، جب ہزاروں قتل ہو چکے تو امرائے سلطنت کی درخواست پر بایزید نے جلادوں کو ہاتھ روکنے کا حکم دیا اور جو قیدی بچ رہے تھے ان میں سے ایک خمس سلطان کا حصہ علیٰحدہ کرنے کے بعد بقیہ ان مسلمان سپاہیوں کو تقسیم کر دیئے جنھوں نے ان کو جنگ میں گرفتار کیا تھا، کونٹ ڈی نیورس اور اس کے چوبیس ساتھی، ایک سال تک زیر حراست رہے لیکن بایزید نے ان کی حیثیت کے مطابق انھیں عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور جب ان کا زر فدیہ فرانس سے آگیا تو انھیں وطن جانے کی اجازت دیدی اور رخصت کے وقت جب یہ لوگ بایزید کے لطف و عنایت اور حسن سلوک کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس نے جان کونٹ ڈی نیورس کو مخاطب کر کے یہ تقریر کی :۔ "جان! مجھے خوب معلوم ہے کہ تو اپنے ملک میں ایک بڑا سردار اور ایک طاقتور رئیس کا لڑکا ہے، تو نوجوان ہے، اور ابھی تیرے لئے امید کے بہت سے سال باقی ہیں، ممکن ہے میدان جنگ میں تیری اس پہلی کوشش کی ناکامی پر لوگ تجھے قابل الزام ٹھہرائیں، اور تو اس اتہام کو رفع کرنے اور اپنی شہرت دنیک نامی کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک طاقتور فوج اکٹھا کر کے میرے مقابلہ میں جنگ کے لئے آئے، اگر میں تجھ سے ڈرتا تو تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے تیرے ایمان اور عزت پر حلف لے لیتا کہ نہ تو اور نہ وہ کبھی میرے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائیں گے، لیکن نہیں میں ایسی حلف کا مطالبہ نہ کروں گا، برخلاف اس کے میں خوش ہونگا، اگر تو اپنے ملک میں واپس پہونچکر ایک فوج جمع کرے اور اسے لے کر یہاں آئے، تو مجھے ہمیشہ میدان جنگ میں اپنے

مقابلہ کے لئے تیار پائے گا، جو بات میں اس وقت کہہ رہا ہوں اُسے تو جس شخص سے بھی چاہے نقل کر دینا، کیونکہ میں ہمیشہ جنگی کارناموں نیز اپنی فتوحات کی توسیع کے لئے تیار اور خواہشمند رہتا ہوں[1]"۔ کونٹ ڈی نیورس اور اس کے ساتھیوں میں سے صرف ایک نائٹ مارشل بوسیکار (Boucicaut) نے بایزید کی یہ دعوت قبول کی، وہ ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں چند جہاز اور بارہ سو نائٹ اور پیدل فوج لے کر قسطنطنیہ پہونچا اور شہنشاہ کو شہر کی مدافعت میں مدد دی، اس کے علاوہ کسی اور کو بایزید کے مقابلہ میں آنے کی پھر کبھی ہمت نہ ہوئی،

مزید فتوحات جنگ نائکوپولس کے بعد عثمانی فوجوں نے ولاچیا، اسٹائریا اور ہنگری پر حملے شروع کئے اور پیٹروارڈین کے شہر پر قبضہ کر لیا، ایک ترکی دستہ نے سرمیا پر یورش کی اور ساحلِ ڈنیوب کے جو قلعے عیسائیوں نے لے لئے تھے ان کو دوبارہ حاصل کیا، بایزید خود بوداپر چڑھائی کی تیاری کر رہا تھا لیکن دفعۃً بیمار پڑ گیا، اور ہنگری کی یہ مہم ملتوی کر دی گئی،

یونان کی فتح اس کے بعد بایزید ادرنہ کو واپس ہوا، اور وہاں پہونچ کر قسطنطنیہ کے شہنشاہ کو مجبور کیا کہ جان کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائے ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) میں وہ دفعۃً یونان پر حملہ آور ہوا، اور آسانی کے ساتھ تھسلی، فوسیس، ڈورس اور لوکرس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد اس کے دو جنرلوں یعقوب اور افرنوس نے خاکنائے کورنتھ کو طے کر کے جنوب کا رُخ کیا، اور تمام موریا کو فتح کر لیا، موریا کے تیس ہزار یونانی باشندے بایزید کے حکم سے ایشیائے کوچک میں منتقل کر دیئے گئے، اور اُن کی جگہ ترکوں کی نوآبادیاں

[1] کریسی جلد ۱ ص ۹۸،

قائم کردی گئیں، موریا پر تھیوڈور پلیولوگس شہنشاہ قسطنطنیہ کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا، اس نے بایزید کی سیادت قبول کرلی، اور دولت عثمانیہ کا باجگذار بن گیا،

قسطنطنیہ کا محاصرہ | یونان کی فتح کے بعد بایزید پھر ادرنہ لوٹ آیا، اور اب اس نے قسطنطنیہ پر فوراً قبضہ کرنے کا تہیہ کرلیا، اس سے قبل بھی وہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کرچکا تھا، اور شہنشاہ کو اپنا پایہ تخت محفوظ رکھنے کے لئے بہت سخت شرائط پر دس سال کے لئے صلح کرلینی پڑی تھی، لیکن اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے ہی یونان کی فتح سے فارغ ہوکر بایزید پھر قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا، اور اس نے ایک خاص ایلچی کے ذریعہ سے شہنشاہ کے پاس یہ پیام بھیجا، کہ وہ تاج وتخت سے دست بردار ہوجائے ورنہ شہر بزور شمشیر فتح کرلیا جائیگا، اور اس وقت وہاں کے باشندے رحم وکرم کے مستحق نہ سمجھے جائیں گے، اس نے یہ بھی کہلایا کہ قسطنطنیہ کے معاوضہ میں شہنشاہ اپنے لئے کوئی دوسری حکومت پسند کرے جو اسے دیدی جائے گی، قسطنطنیہ کے باشندے بایزید کی قوت سے واقف ہونے کی وجہ سے چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جنگ کی نوبت نہ آنے دیں، لیکن جان کو امید تھی کہ عیسائی حکومتیں قسطنطنیہ کی محافظت میں اس کی مدد سے دریغ نہ کریں گی، اس لئے اس نے ایلچی کو یہ جواب دے کر رخصت کردیا: "اپنے آقا سے کہدو کہ باوجود اس کے کہ ہم ضعیف وناتوان ہیں ہم خدا کے سوا کسی دوسری طاقت سے نہیں ڈرتے. وہی کمزور کی حفاظت کرتا ہے اور طاقتور کا غرور توڑتا ہے، سلطان کو اختیار ہے جو چاہے کرے"

اس جواب کے بعد بایزید نے فوراً قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا، اسی محاصرہ کے دوران میں مارشل بوسیکا شہنشاہ کی مدد کے لئے فرانس سے آیا تھا،

حالات کا انقلاب | لیکن عین اس وقت جب بایزید قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا،

اس کے ایشیائی مقبوضات میں نہایت انقلاب انگیز حالات رونما ہو رہے تھے جن سے مجبور ہو کر اسے محاصرہ اٹھا لینا پڑا، اب تک بارہ سال کی مدتِ حکومت میں جو مسلسل جنگوں پر مشتمل تھی بایزید کو ہمیشہ کامیابی ہوتی گئی، اس نے ایشیائے کوچک کے بڑے حصہ مقدونیا شمالی بلغاریا اور تھسلی کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا، اور سلطنت بازنطینی، سرویا، ولاچیا، بوسنیا اور یونان کے بیشتر حصہ کو دولتِ عثمانیہ کا باجگذار بنا لیا تھا، نائکوپولس کے میدان میں اس نے یورپ کی متحدہ اور بہترین فوجوں کو نہایت سخت شکست دیکر صلیبی اتحاد کی قوت کو پاش پاش کر ڈالا تھا، اس وقت تک کسی جنگ میں اسے ناکامی نہیں ہوئی تھی، لیکن آئندہ دو سالوں میں جو اس کی حکومت کے آخری سال تھے اسے اتنی زبردست شکست اٹھانی پڑی کہ اس کی تمام فتوحات پر پانی پھر گیا، اور کچھ دنوں کے لئے سلطنتِ عثمانیہ کی عظمت خاک میں مل گئی، خود بایزید کا خاتمہ بھی قید کی حالت اور بےکسی کے عالم میں ہوا، اس تباہی و بربادی کا سبب وہ آویزش ہوئی جو بایزید اور تیمور کے درمیان پیدا ہو گئی تھی،

تیمور تیمور کی سلطنت دیوارِ چین سے لے کر ایشیائے کوچک کی سرحد تک اور بحرِ ارل سے دریائے گنگا اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی، اس کی زندگی کے ابتدائی سال اپنے ہمسایہ تاتاری امرا سے جنگ کرنے میں گذرے پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں اس نے ان سب کو زیر کر کے سمرقند کو اپنا پایہ تخت بنایا، اور اس کے بعد فتوحات کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کی وسعت کے سامنے سکندر، سیزر، اٹیلا، چنگیز خاں، شارلیمین اور نپولین کی سلطنتیں حقیر معلوم ہوتی ہیں، اس نے پینتیس ۳۵ سال سے کم مدت میں ستائیس مملکتیں فتح کر لی تھیں، اور نو شاہی خاندانوں کو فنا کر دیا تھا، اس کی یہ حیرت انگیز جہانگیری صرف ذاتی شجاعت اور

اعلیٰ فوجی قابلیت کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اُس کے تدبر اور ملکہ حکمرانی کو بھی اس میں بہت کچھ دخل تھا، اس کا مجموعۂ قوانین جسے اس نے فوج، عدالت اور مالیہ کے انتظام کے لئے مرتب کرایا تھا، اس کے تدبر اور صحیح غور وفکر کا ثبوت پیش کرتا ہے، اس کے جاسوس مختلف بھیسوں میں خصوصاً زائرین اور درویشوں کے لباس میں ہر طرف گھومتے رہتے تھے، اور ان کی مکمل رپورٹیں احتیاط کے ساتھ دفتر میں درج کیجاتی تھیں، اس طرح تیمور کو اپنے دشمنوں کی قوت اور کمزوری کی صحیح اطلاع بہم پہونچتی رہتی تھی، اُسے اپنے سپاہیوں پر اسقدر اقتدار حاصل تھا کہ وہ اس کے حکم پر نہ صرف بڑی سے بڑی سختی برداشت کرنے اور اپنی جانیں نثار کرنے پر آمادہ ہوجاتے تھے، بلکہ عین فتح کے موقع پر اگر وہ حکم دیتا تو لوٹ مار سے بھی ہاتھ کھینچ لیتے اور مالِ غنیمت سے دست بردار ہوجانے میں مطلق پس وپیش نہ کرتے اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا سلوک شریفانہ اور فیاضانہ تھا، لیکن جو لوگ اس کی مخالفت کرتے انھیں سخت سے سخت سزائیں دیتا، جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے، تیمور نے دہشت انگیزی کو بھی فتح کا ایک خاص ذریعہ بنا رکھا تھا، اور جو سزائیں وہ پوری پوری آبادیوں کو دیتا اُن سے اکثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی فوری اشتعال کا نتیجہ نہ تھیں، بلکہ پہلے سے سمجھ بوجھ کر طے کرلی گئی تھیں،

جنگ نائکوپولس کے بعد بایزید کے بعض فوجی افسروں نے ایشیائے کوچک کے مشرق میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کی سرحد جارجیا تک پہونچ گئی تھی، اُدھر تیمور کی حکومت اس سے پہلے ہی جارجیا اور بحر کاسپین کے دوسرے مغربی ممالک میں قائم ہوچکی تھی۔ دونوں سلطنتوں کے ہم سرحد ہوجانے کی وجہ سے انکے درمیان جلد یا بہ دیر تصادم کا واقع ہونا ناگزیر تھا، تیمور کی سلطنت کے بعد بایزید ہی کی

سلطنت اُس وقت دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور سلطنت تھی، بایزید اپنی سابق فتوحات کے نشہ میں اتنا سرشار تھا کہ اُس نے تیمور کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا اور ایک ایسے فاتح کو برانگیختہ کر دیا جس کے نام کی دہشت سے بڑے بڑے بادشاہوں کے تخت متزلزل ہو جاتے تھے، سرحدی جھگڑوں کے علاوہ آویزش کے اور اسباب بھی تھے، مثلاً ایک دوسرے کے باجگذار رئیسوں کو حملہ کی دھمکی دینا، اور ایک دوسرے کے باغیوں کو پناہ دینا، باغیوں سے مراد وہ امراء تھے جن کی ریاستوں پر بایزید نے قبضہ کر لیا تھا، اور وہ بھاگ کر تیمور کے پاس پناہ گزیں ہوئے تھے، اسی طرح وہ امراء بھی باغی سمجھے جاتے تھے جن کی ریاستیں تیمور نے فتح کر لی تھیں اور جنھیں بایزید نے اپنے دربار میں پناہ دی تھی، یہ لوگ اپنی ریاستوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے تیمور اور بایزید کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، اسی سلسلہ میں دونوں کے درمیان نہایت تلخ خط و کتابت شروع ہوئی، اور بالآخر نوبت جنگ کی آگئی،

سیواس

۸۰۳ھ (۱۴۰۰ء) میں تیمور نے آرمینیا کی طرف سے عثمانی سرحد میں داخل ہو کر سیواس کا محاصرہ کر لیا، جو چند سال پہلے بایزید کے قبضہ میں آیا تھا، اس شہر کی دیواریں نہایت مضبوط تھیں، اور ترکی دستہ نے بایزید کے سب سے بڑے لڑکے ارطغرل کی سرکردگی میں اس کی محافظت بھی ایسی جانبازی کے ساتھ کی کہ تیمور کی سات آٹھ لاکھ فوج شروع میں کامیاب نہ ہو سکی، لیکن آخر میں تیمور نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس کا جواب محصورین کے پاس نہ تھا، اس نے چھ ہزار مزدور لگا کر دیواروں کی بنیادیں کھدوانا شروع کر دیں اور اس درمیان میں شہتیروں کی تھونی لگا کر دیواروں کو گرنے سے روکے رکھا، جب کھدوائی کا کام پورا ہو گیا، اور بنیادوں کے اندر بڑی بڑی سرنگیں تیار ہو گئیں،

تو شہتیروں میں آگ لگوا دی اور تمام دیواریں دیکھتے دیکھتے ان ہی سرنگوں میں بیٹھ گئیں حملہ آوروں کے لئے اب کوئی روک نہ تھی، اور شہر پر فوراً قبضہ ہو گیا، تیمور نے سیواس کے محافظ دستہ سے دل کھول کر انتقام لیا، ان میں سے چار ہزار آرمینیوں کو اس نے زندہ دفن کرا دیا، اور ارطغرل اور بقیہ ترک سپاہیوں کو قتل کر دیا،

بایزید اس وقت قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، سیواس کے مفتوح ہونے اور ارطغرل کے قتل کی خبر سن کر وہ فوراً وہاں سے روانہ ہوا، اور تیمور کے مقابلہ کیلئے ایشیائے کوچک پہونچا، لیکن تیمور اس درمیان میں شام اور مصر کی طرف روانہ ہو چکا تھا، دو سال کے بعد وہ پھر لوٹا، اور سیواس پہونچنے کے بعد بایزید اور اس کے درمیان خط و کتابت دوبارہ شروع ہوئی جو پہلے سے بھی زیادہ تند اور تیز تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین نے ایک فیصلہ کن جنگ کا عزم کر لیا،

جنگ انگورہ بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ تیمور کے مقابلہ کے لئے سیواس کی طرف بڑھا، لیکن تیمور کی کثیر فوج کے لئے جس کی تعداد سات آٹھ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے سیواس کا میدان تنگ تھا، اس لئے وہ بایزید کے پہونچنے سے پہلے ہی انگورہ کی طرف روانہ ہو گیا، اور وہاں پہونچ کر فوراً انگورہ کا محاصرہ کر لیا، اسے یقین تھا کہ بایزید انگورہ کے بچانے کی ضرور کوشش کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور محاصرہ کی اطلاع پا کر بایزید نے بجائے سیواس جانے کے فی الفور انگورہ کی طرف کوچ کر دیا، وہاں پہنچکر اس نے دیکھا کہ تیمور شہر کے شمال مغرب کی جانب جو فوجی نقطۂ نظر سے میدان کا بہترین حصہ ہے، اس کا انتظار کر رہا ہے، تیمور نے صرف یہی نہیں کیا کہ میدان کے اس حصہ پر پہلے سے قبضہ کر لیا، بلکہ اس نے بایزید کے مقابلہ کے لئے اور تمام ضروری

اور احتیاطی تدبیریں بھی کر لی تھیں، وہ بایزید کی طاقت سے پوری طرح واقف تھا اسلئے ہر ممکن طریقہ سے اسے کمزور کرنے کے ذرائع اختیار کر چکا تھا، بایزید کی فوج میں ایک بڑی تعداد تاتاریوں کی بھی تھی، تیمور کے خفیہ ایجنٹ بھیس بدل کر عثمانی لشکر میں جاتے تھے، اور ان تاتاریوں کو اندر اندر بایزید کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کی عصبیت برانگیختہ ہوگئی، اور وہ عین جنگ کی حالت میں ٹوٹ کر تیمور کی فوج سے جا ملے، بایزید کی جزرسی اور بخل کی وجہ سے فوج میں پہلے ہی سے بددلی پھیلی ہوئی تھی جسے تیمور کے جاسوسوں کی ریشہ دوانیوں نے اور بھی تیز کر دیا، عثمانی فوج کے افسروں نے یہ حالت دیکھ کر بایزید کو جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر اس نے مطلق التفات نہ کیا اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں تیمور کی فوجی طاقت کا صحیح اندازہ بھی نہ کر سکا، اس نے یہ بھی نہ کیا کہ اس موقع پر فراخدلی سے کام لے کر سپاہیوں کو انعام واکرام سے خوش کرتا، برخلاف اس کے تیمور کے مقابلہ میں محض اپنی شانِ استغنا کے مظاہرہ کی غرض سے وہ انگورہ پہونچنے کے بعد ایک روز پوری فوج کو ساتھ لے کر شکار کے لئے روانہ ہوگیا، جس مقام پر یہ شکار رکھا گیا تھا، وہاں پانی بہت کم تھا، اور پانچ ہزار عثمانی سپاہی پیاس کی شدت سے مر گئے، جو باقی رہ گئے وہ بھی گرمی اور پیاس کی تکلیف سے بہت خستہ ہو رہے تھے،

بایزید جب شکار سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی لشکرگاہ پر تیمور کا قبضہ ہے اور جس چشمہ سے عثمانی فوج پانی لے سکتی تھی، اس کا رخ بھی تاتاریوں نے پھیر دیا ہے، جس کی وجہ سے پانی بہت کم دستیاب ہوسکتا ہے، حالات کی نامساعدت میں اس واقعہ نے اور بھی اضافہ کیا، بایزید کے لیے اب بلا تاخیر جنگ شروع کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ چہارشنبہ ۱۷ ذی الحجہ ۸۰۴ھ (۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء) کو وہ فیصلہ کن معرکہ

پیش آیا جس نے بقول گبن تیمور کی شہرت وعظمت کو حیاتِ ابدی بخش دی اور بایزید کی ذلت ورسوائی کو ہمیشہ کے لئے یادگار بنا دیا، لڑائی طلوعِ فجر سے قبل شروع ہوگئی تھی، اور غروبِ آفتاب کے بعد تک جاری رہی، اس روز بایزید نے سپہ گری اور سپہ سالاری کے جوہر خوب خوب دکھائے، اس کی خاص فوج نے بھی غیر معمولی شجاعت سے کام لیا، اور نہایت جانبازی کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرتی رہی، لیکن تیمور کی فوجی قابلیت اور اس کی فوج کی کثرت کے سامنے بایزید کی ساری کوششیں بے سود نظر آنے لگیں، علاوہ بریں سب سے زیادہ نقصان اسے خود اپنے سپاہیوں سے پہونچا، اس کی فوج کے تاتاری دستے پہلے ہی سے غداری کے لئے آمادہ تھے، وہ لڑائی شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد تیمور کی فوج سے جا ملے، اناطولیہ کی ترکی ریاستوں مثلاً آیدین، منتشا، صاروخان، اور کرمیان کے دستے بھی جن کو بایزید نے بجبر اپنی فوج میں بھرتی کیا تھا، عین موقع پر غدار ثابت ہوئے، اور سب کے سب بھاگ کر اپنے اپنے امیروں کے علم کے نیچے پہونچ گئے جو تیمور کی فوج میں بایزید کے خلاف لڑ رہے تھے، البتہ اسٹیفن اپنے سروی دستوں کے ساتھ وفاداری اور جانبازی کا حق ادا کرتا رہا، لیکن لڑائی ختم ہونے سے پہلے ہی اسے بھی راہِ فرار اختیار کرنی پڑی، اب صرف بایزید دس ہزار ینی چری کے ساتھ میدان میں باقی رہ گیا تھا، اس مختصر فوج نے ساتھ آٹھ لاکھ تاتاریوں کے مقابلہ میں جیسی حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا، اس کی مثال خود ینی چری کی تاریخ میں کم نظر آتی ہے، لیکن آخرکار گرمی اور پیاس کی شدت نے ان کے بازو کمزور کر دیئے، اور تاتاریوں کی کثرت غالب ہو کر رہی، بایزید کے بعض افسروں نے لڑائی کی حالت دیکھ کر چند گھنٹے پیشتر ہی اسے میدانِ جنگ چھوڑنے کی رائے دی تھی، لیکن اس نے اس مشورہ کو حقارت کیساتھ ٹھکرا دیا

تھا، اب جب کہ وقت نکل چکا تھا بایزید نے بھاگنے کی کوشش کی مگر محمود خانِ چغتائی نے تعاقب کرکے اسے گرفتار کرلیا، اس کے پانچ لڑکوں میں سے جو لڑائی میں شریک تھے تین دشمن کی زد سے بچ کر نکل گئے، شہزادہ سلیمان نے یورپ کا رُخ کیا، شہزادہ محمد نے اماسیا پہونچ کر دم لیا، اور شہزادہ عیسیٰ کرمانیہ کی طرف بھاگا، شہزادہ موسیٰ گرفتار ہوگیا، پانچویں لڑکے شہزادہ مصطفیٰ کا حشر معلوم نہ ہوسکا، ممکن ہے لڑائی میں مارا گیا ہو، بہرحال وہ ایسا غائب ہوا کہ کسی کو اس کا سراغ نہ ملا،

قیدی سلطان آلِ تیمور کا مورخ شرف الدین علی بیان کرتا ہے کہ جب بایزید قیدی کی حیثیت سے دست بستہ تیمور کے سامنے لایا گیا، تو تیمور نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا، اور اس کے ہاتھ کھلوا کر عزت و احترام کے ساتھ اپنے قریب بٹھایا، پھر اسکی حالت پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے، کہنے لگا کہ "اگرچہ احوالِ عالم تمامتر خداوند تعالیٰ کے ارادہ وقدرت کے مطابق پیش آتے ہیں اور کسی دوسرے کو حقیقۃً کوئی اختیار واقتدار حاصل نہیں ہے، تاہم انصاف اور حق یہ ہے کہ تم پر جو مصیبت آئی ہے وہ خود تمھاری لائی ہوئی ہے تم نے بارہا اپنی حد سے باہر قدم رکھا، اور بالآخر مجھے انتقام پر مجبور کر دیا، پھر بھی چونکہ تم اس دیار میں کفار سے جہاد کررہے تھے میں نے بہت کچھ تحمل کیا، اور ان حالات میں جو فرض ایک خیر اندیش مسلمان کا تھا اسے بجا لایا، میری خواہش تھی کہ اگر تم فرماں برداری کی راہ اختیار کرو تو مال و لشکر کی جس قدر ضرورت تمھیں ہو اس سے تمھاری مدد کروں، تاکہ تم اطمینان وقوت کیساتھ جہاد میں مشغول رہ سکو، اور دیارِ اسلام کے اطراف واکناف سے بیدینوں کے شرک کی شوکت کو فنا کردو........ لیکن تم نے سرکشی اور عناد اختیار کیا، حتیٰ کہ معاملہ نہایت تک پہونچ گیا سب جانتے ہیں کہ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور یہ قوت و غلبہ جو

خداوند تعالیٰ نے مجھکو بخشا ہے تم کو حاصل ہوتا تو اُس وقت مجھ پر اور میرے لشکر پر کیا گذرتی لیکن اس فتح کے شکرانے میں جو خدا کے فضل وعنایت سے مجھے حاصل ہوئی ہے میں تمھارے اور تمھارے آدمیوں کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ نہ کروں گا، دل کو مطمئن رکھو۔[1] بایزید نے انفعال کیساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور آیندہ کے لئے اطاعت کا وعدہ کیا، تیمور نے اسے خلعت شاہانہ پہنا کر مزید لطف وعنایت کی توقع دلائی، اس کی خواہش پر شہزادہ موسیٰ بھی جو قید میں تھا آزاد کرکے اس کے پاس بھیج دیا گیا، اور تیمور نے ان کے رہنے کے لئے اپنے خیمہ کے قریب ایک عالیشان خیمہ نصب کرایا، اور بعض عالی مرتبت امرار کو ان کی خدمت میں مامور کیا، بروصہ سے جب حرم سلطانی لایا گیا تو تیمور نے شہزادی ڈیسپینا اور اسکی لڑکی کو بھی بایزید کے پاس بھجوا دیا۔

بایزید کی موت لیکن یہ مراحم خسروانہ بایزید کے زخم دل کے لئے نمک کا کام دے رہے تھے اور شاہی خیمہ بھی اسکے لئے قید خانہ سے کم نہ تھا، اپنی سابق عظمت وسطوت کی یاد اسے کسی لمحہ چین نہیں لینے دیتی تھی، اضطراب یہاں تک بڑھا کہ اس نے آخرکار بھاگنے کا عزم کرلیا لیکن اُس کی اس کوشش کی اطلاع تیمور کو ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ اب اسکی نگرانی سختی کے ساتھ کی جانے لگی، تاتاری لشکر جب ایک مقام سے دوسرے مقام کو کوچ کرتا تو تیمور بایزید کو بھی ساتھ لیتا جاتا، لیکن تشہیر سے بچنے کے لئے بایزید ایک پالکی میں سفر کرتا تھا جس پر پردہ پڑا رہتا تھا، اس پالکی میں لوہے کی جالی کا کام تھا، جس کی بنا پر مشہور ہوگیا کہ تیمور قیدی سلطان کو لوہے کے پنجرے میں بند رکھتا ہے، اور جہاں جاتا ہے اپنے ساتھ اس پنجرے کو بھی لئے جاتا ہے بہرحال بایزید کے قلب ودماغ پر اپنی قید ورسوائی کا اسقدر جانکاہ اثر پہلے ہی پڑ چکا تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک اسے برداشت نہ کرسکا، اور صرف آٹھ مہینے بعد اس کی روح

---

[1] ظفرنامہ از مولانا شرف الدین علی یزدی، جلد دوم صفحہ ۴۳۸-۴۳۹، کلکتہ ۱۸۸۸ء۔

قفسِ عنصری اور قفسِ فولادی دونوں سے بیک وقت آزاد ہوگئی، تیمور کو جب اسکی اطلاع ہوئی، تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اُس فاتح کشور کشا کے لئے بھی جس نے لاکھوں انسانوں کو قتل کرادیا، اور دل میں تاثر کی خفیف سی لرزش بھی محسوس نہ کی، آلِ عثمان کے اتنے جلیل القدر سلطان کی یہ عبرت انگیز موت ایک دردناک واقعہ تھی، تیمور نے موسیٰ کو آزاد کرکے بایزید کی نعش شاہانہ احترام کے ساتھ بروصہ کو روانہ کی جہاں وہ سابق تاجدارانِ عثمانی کے پہلو میں سپردِ خاک کردی گئی، خود تیمور بھی اس کے بعد دو ہی سال زندہ رہا،

سلطنت عثمانیہ کا ظاہری خاتمہ

جنگ انگورہ نے صرف بایزید کی زندگی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ بھی نیست و نابود ہوگئی، تیمور نے ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلی گئی تھیں، پھر اُن کی حکومتوں پر برقرار کردیا، اور ایشیائے کوچک کا کوئی علاقہ آلِ عثمان کے ہاتھ میں باقی نہ رہا،

محمد اوّل

۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ، مطابق ۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۱ء

سلطنت کی حالت

بایزید کے انتقال کے وقت سلطنت عثمانیہ بظاہر فنا ہوچکی تھی، ایشیائے کوچک عثمانیوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا، اس کے کچھ حصے ترکی امیروں کے قبضہ میں واپس جاچکے تھے، اور کچھ ابھی تک تاتاریوں کے قتل و غارت گری کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے، یورپ میں بھی سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کی حالت امید افزا نہ تھی، بلغاریا، بوسنیا اور ولاچیا کی رعایا بغاوت کے لئے آمادہ تھی اور سلطنت بازنطینی اپنے مقبوضات کو واپس لینے کا حوصلہ کررہی تھی، لیکن پریشانی اور ناامیدی کے ان حالات میں بھی سلطنت عثمانیہ نے اپنی غیر معمولی قوتِ بقا کا ثبوت دیا، اور دس بارہ سال کی قلیل مدت میں اس نے نہ صرف اپنے تمام قدیم مقبوضات واپس لے لئے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ رونما ہوئی،

تیموری فوجوں نے ایشیائے کوچک کی غارت گری کے بعد دوسری سمت کا رُخ کیا، اُن کے واپس جانے کے بعد ایشیائے کوچک میں ان کا کوئی نشان باقی نہ رہا، میدان پھر عثمانیوں اور قدیم ترکی امیروں کی قوت آزمائی کے لئے خالی ہوگیا،

شہزادوں کی باہمی جنگ

بایزید کے چھ لڑکوں میں سے پانچ اس کے ساتھ جنگ انگورہ میں شریک تھے، ان میں سے ایک مصطفےٰ نامی غالباً لڑائی میں مارا گیا تھا، دوسرا

موسیٰ بایزید کے ساتھ گرفتار ہوگیا تھا، باقی تین جان بچا کر بھاگ گئے، ان میں سب سے بڑا لڑکا سلیمان وزیر اعظم علی پاشا کو ساتھ لے کر ادرنہ پہونچا اور بایزید کے انتقال کے بعد سلطنت عثمانیہ کے یورپی حصہ کا مالک بن بیٹھا اور اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، دوسرا لڑکا عیسیٰ بروصہ آیا اور اس نے وہاں بایزید کی جانشینی کا اعلان کر دیا، محمد سب سے چھوٹا لیکن سب سے لائق تھا، وہ ایشیائے کوچک کے شمال مشرق میں اماسیا کے چھوٹے سے علاقہ پر قابض ہوگیا، بایزید کے انتقال کے بعد ان تینوں میں سلطنت کے لئے کشمکش ہونے لگی، کچھ دنوں کے بعد چوتھا بھائی موسیٰ بھی جسے تیمور نے بایزید کی وفات پر رہا کر دیا تھا تاج وتخت کے لئے قسمت آزمائی کرنے آگیا،

شروع میں محمد اور عیسیٰ کے درمیان جنگ چھڑی، محمد ایشیائی مقبوضات کو برابر برابر تقسیم کر لینا چاہتا تھا لیکن عیسیٰ پوری سلطنت کا دعویدار تھا، جنگ میں عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر سلیمان سے مدد طلب کرنے کے لئے یورپ پہنچا، سلیمان عیسیٰ کی حمایت میں فوج لے کر ایشیائے کوچک میں داخل ہوا، ابتدا میں محمد کو دشواری پیش آئی، لیکن بالآخر اس نے موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ یورپ میں داخل ہو کر سلیمان کے مقبوضات پر حملہ کر دے، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی، اور سلیمان عیسیٰ کو چھوڑ کر اپنے مقبوضات کی حفاظت کے لئے فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا، عیسیٰ کو شکست ہوئی، اور وہ خدا جانے کہاں غائب ہوگیا، اور پھر کہیں اس کا پتہ نہ چلا،

یورپ میں سلیمان اور موسیٰ کے درمیان جنگ شروع ہوگئی، سلیمان کا برتاؤ اپنی فوج کے ساتھ بہت سخت تھا اور سپاہیوں میں اس کی طرف سے عام بیزاری پھیلی ہوئی تھی، اس کی سختی سے عاجز آکر فوج باغی ہوگئی، اور اسے قتل کر دیا، سلیمان کے قتل کے

بعد موسیٰ اورنہ کے تخت کا مالک بن بیٹھا، اور اس نے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کردیا،
اس کے بعد موسیٰ نے قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاری شروع کی شہنشاہ نے محمد سے مدد کی درخواست کی، اور محمد اپنی ترکی فوج اور سرویا کے ایک دستہ کے ساتھ شہنشاہ کی مدد کے لئے یورپ میں داخل ہوا، یہ بھی عجیب منظر تھا، ایک ترکی فوج موسیٰ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھی، اور دوسری محمد کی قیادت میں قسطنطنیہ کی محافظت کررہی تھی،

آخرکار موسیٰ کو محاصرہ اٹھاکر پسپا ہونا پڑا، محمد نے اس کا تعاقب کیا، سرویا کی سرحد پر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بہت قریب پہونچ گئیں اور جنگ کی نوبت آنیوالی ہی تھی کہ موسیٰ کے فوجی سرداروں نے جو اس سے بہت نالاں تھے بغاوت کا اعلان کردیا، اور پوری فوج محمد سے جاملی، موسیٰ زخمی ہوکر بھاگا، اور تلاش کے بعد اس کی نعش ایک دلدل میں پائی گئی،

محمد کی تخت نشینی تخت سلطنت کے لئے محمد کا کوئی حریف اب باقی نہیں رہا، اس کے سلطان ہونے کا اعلان کیا گیا، اور ایشیا اور یورپ کی تمام رعایا نے اس کا خیر مقدم کیا، بحیثیت سلطان کے اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی، لیکن اس مختصر مدت میں بھی اس نے غیر معمولی اہلیت کا ثبوت دیا، اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کے انتشار کا خاتمہ کیا، بلکہ اپنی خداداد فوجی اور آئینی قابلیت سے دولت عثمانیہ کو ویسا ہی طاقتور اور مستحکم بنادیا، جیسا کہ تیمور کے حملہ سے قبل وہ تھی، سلطنت کے استحکام کے لئے اس نے امن وصلح کو ضروری سمجھا، اور اس مقصد کو پیش نظر رکھکر گردوپیش کی تمام مملکتوں سے صلح کے معاہدے کئے، سا
اس نے بازنطینی سلطنت کے چند مقبوضات شہنشاہ کو واپس کردیئے اور اس سے آخر وقت تک صلح قائم رکھی،

لیکن کبھی کبھی اُسے میدانِ جنگ میں آنے کے لئے بھی مجبور ہونا پڑا، اور اُس وقت اُس نے ثابت کر دکھا دیا کہ تدبر اور نظم و نسق کی اہلیت کے علاوہ فوجی قابلیت میں بھی وہ اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں ہے، کرمانیہ، کرمیان، اور دوسری ترکی ریاستیں تیمور کے حملہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے آزاد ہو گئی تھیں، محمد نے ان سب کو تاتاریوں کی حمایت سے الگ کر کے دولت عثمانیہ کی فرماں روائی قبول کرنے اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا، امیر کرمانیہ نے کئی بار بغاوت کی لیکن محمد نے ہر بار اسے شکست دیکر معاف کر دیا، اور صرف اظہارِ اطاعت پر قناعت کر کے اس کی جان بخشی کی، اس نے درویشوں کے گروہ کو جس نے بہت زیادہ طاقت حاصل کر لی تھی، اور آخر میں بغاوت کا اعلان بھی کر دیا تھا شکست دیکر اس فرقہ کا استیصال کر دیا،

ذاتی اوصاف محمد کے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کی شہادت دینے میں تمام مورخین متفق اللفظ ہیں، وہ بے حد کشادہ دل اور منصف مزاج تھا، اپنے وعدوں کو سخت پابندی سے پورا کرتا، اسکی عدالت میں ہر مذہب، ہر قوم اور ہر فرقہ برابر تھا، اس کی رعایا ہر جگہ خوشحال تھی، عیسائی رعایا کی بہبودی کا اسے خاص طور پر خیال رہتا تھا، اور انکے ساتھ وہ کسی قسم کی زیادتی کو روا نہ رکھتا، اس نے ادب کی سرپرستی بڑی فیاضی سے کی، اور اُسی کے مختصر عہدِ حکومت میں شعر و شاعری کا مذاق عثمانیوں میں اوّل اوّل شروع ہوا،

محمد نے اکتالیس سال کی عمر میں ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں وفات پائی، اور بروصہ میں مسجد خضرا سے متصل جسے اُس نے خود تعمیر کرایا تھا، دفن ہوا، یہ مسجد اسلامی طرز تعمیر اور سنگ تراشی کا بہترین نمونہ خیال کی جاتی ہے، محمد نے اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر بھی مکمل کرائی، جسے مراد اوّل نے بنوانا شروع کیا تھا، لیکن بایزید کی بے توجہی کی وجہ سے نامکمل رہ گئی تھی اسنے

اپنی مسجد کے قریب ہی دو عمارتیں اور بنوائیں، ایک میں مدرسہ قائم کیا، اور دوسری میں غریبوں کے لئے طعام خانہ،

معیار عظمت اگرچہ دولت عثمانیہ کے اول دس فرماں رواؤں میں صرف محمد ہی ایسا تھا جس کے عہد میں سلطنت کی توسیع نہیں ہوئی تاہم جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ تباہی کی جس منزل تک پہونچ گئی تھی اور پھر گیارہ سال کی مسلسل خانہ جنگیوں سے جو مزید خطرات پیدا ہو گئے تھے، اُن پر نظر رکھتے ہوئے محمد کا یہ کارنامہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں دکھائی دیتا کہ اس نے سلطنت کے کسی صوبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور گو اُس کے مختصر عہد حکومت میں ایشیائے کوچک کی ترکی ریاستوں پر پوری طرح قبضہ نہ ہو سکا پھر بھی اس نے ان سب کو زیر کر کے دولت عثمانیہ کے دامن سے وابستہ رکھا، اُس کو بجا طور پر سلطنت کے بانیوں میں شمار کر سکتے ہیں،

مراد ثانی

۸۲۴ھ تا ۸۵۵ھ مطابق ۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء

مراد اور مصطفیٰ کی جنگ

سلطان محمد اول کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا مراد جو ایشیاے کوچک میں سلطان کا قائم مقام تھا، اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، محمد اول نے اپنے مختصر زمانہ حکومت میں تیموری حملہ کے تمام اثرات مٹا دیئے تھے اور سلطنت کو گویا از سر نو قائم کر کے مستقل و مستحکم بنا دیا تھا، لیکن مراد کی نوعمری سے اُن فرماں رواؤں کی ہمتیں بڑھ گئیں، جن کو سلطان مرحوم نے اپنی قوت اور حکمت عملی سے سلطنت عثمانیہ کا حلیف و مطیع بنا لیا تھا، سب سے پہلے شہنشاہ قسطنطینیہ نے اُن تمام احسانات کو فراموش کر کے جو محمد اول نے اُس کے ساتھ کئے تھے، آل عثمان کے ساتھ اپنے قدیم لبغض و عناد کی بنا پر مراد کی کمسنی سے فائدہ اٹھانا چاہا، اور مصطفیٰ نامی ایک شخص کو جو اپنے کو سلطان بایزید یلدرم کا لڑکا کہتا تھا اور تخت سلطنت کا دعویدار تھا، مراد کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، یہ وہی مصطفیٰ تھا جو سلطان محمد اول کے مقابلہ میں بھی آیا تھا، اور بالآخر شکست کھا کر قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہوا تھا، اور جس کی نظر بندی کے معاوضہ میں شہنشاہ قسطنطنیہ سلطان سے ایک کثیر رقم ہر سال پاتا تھا، شہنشاہ نے اس معاہدہ کے ساتھ کہ بشرط کامیابی وہ گیلی پولی نیز بحر اسود کے ساحل کے تمام بازنطینی شہر جو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لئے گئے تھے شہنشاہ کو واپس کر دیگا،

مصطفےٰ کو رہا کر دیا، اور اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے روانہ کیا، مراد اُس وقت ایشیائے کوچک میں تھا، اُس نے مصطفےٰ کے مقابلہ میں ایک فوج بایزید پاشا کی سرکردگی میں بھیجی لیکن یورپ میں ترکی افواج کا بیشتر حصہ مصطفےٰ کا طرفدار ہوگیا تھا، بایزید پاشا کو شکست ہوئی، اور وہ مارا گیا، اس کے بعد مصطفےٰ شہنشاہِ قسطنطنیہ کے فراہم کئے ہوئے جہازوں میں دردانیال کو عبور کرکے ایشیائے کوچک میں پہنچا، مراد نے بڑی لیاقت اور شجاعت سے اس کا مقابلہ کیا، اور شکست دی، مصطفےٰ بھاگ کر گیلی پولی میں محصور ہوگیا، مراد نے گیلی پولی کو فتح کرکے مصطفےٰ کو گرفتار کرلیا، اور اس کو سولی دیدی، اس طرح اس آخری فتنہ کا بھی خاتمہ ہوگیا جس کا سلسلہ بایزید یلدرم کی وفات کے بعد اُس کے لڑکوں کی باہمی آویزش اور قوت آزمائی سے شروع ہوا تھا،

قسطنطنیہ کا محاصرہ | مراد نے شہنشاہ کی اس غداری کے جواب میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کرلیا، اور ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کے محاصرہ کے لئے بیس ہزار فوج کے ساتھ پہونچ گیا بازنطینیوں نے نہایت بہادری اور مذہبی جوش کے ساتھ ترکوں کا حملہ روکا، مراد نے اس محاصرہ میں جس غیر معمولی فوجی لیاقت کا ثبوت دیا، اس کی مثال اس عہد کی فوجی تاریخ میں شاذ و نادر ملتی ہے[1]، قوی اُمید تھی کہ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر رہے گا، لیکن شہنشاہ نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس سے مراد کو مجبوراً محاصرہ اٹھا کر اپنی سلطنت کی حفاظت کے لئے ایشیائے کوچک کا رخ کرنا پڑا، مراد کا ایک چھوٹا بھائی مصطفےٰ نامی تھا، قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت وہ ایشیائے کوچک میں تھا، شہنشاہ نے کوشش کرکے اُس کو مراد کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، امیر کرمانیہ اور امیر کرمیان نے اُس کی مدد کی، اور

[1] کریسی جلد اص ۹۶،

مصطفیٰ نے اُن کی مدد سے ایشیائے کوچک میں مراد کی ایک فوج کو شکست دیکر اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، یہ خبر سن کر مراد قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر فوراً ایشیائے کوچک پہنچا، مصطفیٰ کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود گرفتار کر لیا گیا، اس کے گرفتار کرنے والوں نے مراد کے علم و اجازت کے بغیر اُسی وقت اس کو سولی پر چڑھا دیا،

ترکی ریاستوں کی اطاعت اس فتنہ کو فرو کرنے کے بعد مراد ایشیائے کوچک کی اُن ترکی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا جو تیموری حملہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے بالکل آزاد ہو گئی تھیں، اور اُس کی بیخ کنی کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی تھیں، امیر کرمانیہ ان سب میں پیش پیش تھا، مراد کے خلاف مصطفیٰ کو کھڑا کرنے میں بھی زیادہ تر اُسی کا ہاتھ تھا، اس کا یہ طرزِ عمل اُس قدیم عناد پر مبنی تھا، جو آلِ عثمان اور کرمانیہ کے درمیان ابتدا سے چلا آتا تھا چنانچہ مراد نے اس کی سرکوبی کے لئے کرمانیہ پر حملہ کیا، اور محمد بک کو قتل کرکے اسکے لڑکے ابراہیم کو وہاں کا امیر بنایا، اُس نے کرمانیہ کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا، بلکہ صرف اُس کے باجگذار ہونے پر قناعت کی، یہی معاملہ اس نے دوسری ریاستوں مثلاً کرمیان، قسطمونی، منتشا، صاروخان اور حمید وغیرہ کے ساتھ بھی کیا، اور ان سب کو سلطنت عثمانیہ کا مطیع و باجگذار بنا لیا، اس طرح ایشیائے کوچک میں آلِ عثمان کا وہی اقتدار پھر قائم ہو گیا جو جنگ انگورہ سے پہلے تھا، امیر قسطمونی باجگذار ہونے کے علاوہ اپنی نصف ریاست سے بھی سلطان کے حق میں دست بردار ہو گیا، اور اپنی بیٹی اُسکے نکاح میں دیدی، ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں امیر کرمیان لاولد مر گیا، اس کی وصیت کے مطابق ریاست کرمیان سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی،

شہنشاہ سے صلح اور چند جدید مقبوضات ایشیائے کوچک میں امن قائم کرنے کے بعد مراد ۸۲۷ھ

(۱۴۲۴ء) میں یورپ کو واپس ہوا، اس درمیان میں شہنشاہ مینوئل کا انتقال ہوچکا تھا، اور اُس کی جگہ اُس کا لڑکا جان پلیولوگس قسطنطینیہ کا فرماں روا تھا، مراد نے دوبارہ قسطنطینیہ کا محاصرہ نہیں کیا، بلکہ جان سے صلح کرلی، جان نے تیس ہزار دکات سالانہ خراج دینے کا معاہدہ کیا، اور سیلمبریا اور درکوس کے سوا زیتون اور تمام دوسرے یونانی شہر جو دریائے اسٹرانیا اور بحر اسود کے ساحل پر باقی رہ گئے تھے، سلطان کے حوالے کردیئے، یوں بازنطینی سلطنت کا خاتمہ چند دنوں کے لئے اور ملتوی ہوگیا،

سالونیکا کی فتح سالونیکا بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور اور نہایت اہم شہر تھا، گذشتہ سو سال کے اندر یہ تین بار ترکوں کے قبضہ میں آیا لیکن کچھ دنوں کے بعد ہر بار یونانیوں نے اسے واپس لے لیا، شہنشاہ جان کے دورِ حکومت میں اس کا حاکم شہنشاہ کا بھائی اینڈرونیکس تھا، اینڈرونیکس نے غداری کرکے اس شہر کو وینس کے ہاتھ فروخت کردیا، چونکہ یہ مقدونیا کا ایک اہم شہر تھا اور اس سے قبل تین بار ترکوں کے قبضہ میں رہ چکا تھا، اس لئے مراد نے اس معاملہ بیع کی مخالفت کی اور ۸۳۳ھ (۱۴۳۰ء) میں سالونیکا کو بزورِ شمشیر فتح کرکے مع اس کے ملحق علاقہ کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا،

سرویا کی فتح سالونیکا کی فتح کے بعد مراد اپنی سلطنت کی شمالی مغربی سرحد کی جانب متوجہ ہوا، ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) میں اسٹیفن لازارویچ شاہ سرویا کا انتقال ہوگیا، اور اس کی جگہ جارج برینکوویچ تخت نشین ہوا، اسٹیفن اُس معاہدہ کے مطابق جو اس نے جنگ کسووا کے بعد بایزید یلدرم سے کیا تھا، ہمیشہ سلطنت عثمانیہ کا ایک وفادار حلیف رہا، اُس نے اپنی بہن شاہزادی ڈیسپینا کو بایزید کے نکاح میں دے کر اس تعلق کو اور زیادہ مضبوط کردیا تھا، لیکن جارج کو مراد کے ساتھ کوئی ذاتی تعلق نہ تھا، اور اس نے تخت نشینی کے بعد ہی سرویا میں ترکوں کے

اقتدار کی مخالفت شروع کر دی، اُس نے ترکوں کے خلاف ہنگری سے باہمی امداد کا ایک معاہدہ کیا اور دریائے ڈینوب کے ساحل پر سمندریا میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا، مراد نے جارج کے معاندانہ ارادوں سے واقف ہو کر اس قلعہ کا مطالبہ کیا، اور انکار پر جارج کے مقابلہ کیلئے بڑھا، سرویا کو شکست ہوئی اور پورے ملک پر ترکی افواج کا قبضہ ہو گیا ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) میں سرویا تمام تر ترکوں کے تسلط میں آگیا[1]،

عیسائی حکومتوں میں ایک نئی تحریک ہنگری کو جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے آزادی کا موقع مل گیا تھا، اور وہ رفتہ رفتہ استحکام حاصل کرتا جاتا تھا، مراد کے ابتدائی دور حکومت میں وہ اتنی قوت حاصل کر چکا تھا کہ ترکی حملہ کی مدافعت کر سکے، سرویا پر ترکوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد ہنگری کے سرحدی علاقوں میں دونوں سلطنتوں کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، اہل بوسینیا بھی ترکوں کی قربت سے خائف تھے، البانیا کو اپنی آزادی کی طرف سے خطرہ تھا، اور ولاچیا جو سلطنت عثمانیہ کا باجگذار تھا اپنی خودمختاری کے لئے بیتاب تھا، تاہم مراد کی تخت نشینی سے تقریباً بیس سال بعد تک ان مختلف عیسائی حکومتوں کے درمیان کوئی اتحاد قائم نہ ہو سکا، اور ان میں سے ہر حکومت علٰحدہ علٰحدہ مراد سے جنگ و صلح کرتی رہی، لیکن جب ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں لاڈسلاس شاہ پولینڈ، ہنگری کے تخت پر بیٹھا تو سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں کی قوت بہت کچھ بڑھ گئی، اور ایک متحدہ مقابلہ کا حوصلہ ان میں پیدا ہو،، اس حوصلہ کا محرک حقیقتہً ایک فوجی سردار ہونیاڈے نامی تھا جو حال ہی میں مغربی یورپ سے واپس آیا تھا اور جس کی غیر معمولی شجاعت کا شہرہ تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا، ہونیاڈے نے ہنگری پہونچ کر ترکوں کے مقابلہ کا بیڑا اٹھایا، اور بیس سال

---

[1] بقان از ملر صفحہ ۲۹۳،

تک برابر سلطنت عثمانیہ سے جنگ کرتا رہا،

بلغراد ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) میں مراد کو بلغراد کے حملہ سے ناکام واپس ہونا پڑا، یہ دریائے ڈینوب کے ساحل پر سرویا کا ایک نہایت اہم شہر تھا لیکن ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) سے ہنگری کا مقبوضہ تھا، ہنگری میں داخل ہونے کے لئے اس شہر کی فتح ناگزیر تھی، مراد نے اسی خیال سے اس کا محاصرہ کیا لیکن ہنگری کے عزم و استقلال کے مقابلہ میں آخر کار اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا،

ہونیاڈے کی کامیابی اسی زمانہ میں عثمانی جنرل مزید پاشا ٹرانسلوینیا میں ہرمان اسٹاٹ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، ہونیاڈے اس قلعہ کی مدد کے لئے بڑھا، اور ایک مختصر فوج کے ساتھ ترکوں کے عظیم الشان لشکر کو شکست دی، اس معرکہ میں بیس ہزار ترک مارے گئے ہونیاڈے نے مزید پاشا اور اس کے لڑکے کو اپنے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا، اس کی لہو کی پیاس کسی طرح بجھتی ہی نہ تھی، مقتولوں کی چیخ اور تڑپ میں اسے خاص لذت محسوس ہوتی تھی چنانچہ اس فتح کے بعد جب وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دستر خوان پر بیٹھا تو اسی وقت ترک قیدیوں کو سامنے بلا کر سب کو نہایت بیدردی سے قتل کرا دیا، ہر فتح کے بعد جو دعوت ہوتی تھی اس میں مہمانوں کو یہ خونیں تماشا بھی ضرور دکھایا جاتا تھا، یہ ہونیاڈے اور ترکوں کا پہلا مقابلہ تھا، مراد نے اس شکست کی خبر سنکر اسّی ہزار کی ایک دوسری فوج شہاب الدین پاشا کی سرکردگی میں روانہ کی، وازاگ کے مقام پر مقابلہ ہوا اور ہونیاڈے نے عثمانی لشکر کو پھر شکست دی،

صلیبی اتحاد ہونیاڈے کی شاندار کامیابی اور ترکوں کی پے در پے شکستوں سے یورپ کی تمام حکومتوں میں امید کی ایک لہر دوڑ گئی، اور یورپ سے ترکوں کو نکال دینے کیلئے

ایک زبردست عیسائی اتحاد قائم کر لیا گیا، شاہ لاڈسلاس جو اس وقت ہنگری اور پولینڈ دونوں مملکتوں کا فرماں روا تھا اُس تحریک کا روح رواں تھا، اس اتحاد میں ہنگری، پولینڈ، ولاچیا اور بوسنیا کی حکومتیں اپنی پوری قوت کے ساتھ شریک ہوئیں، سرویا بھی جو اسٹیفن کے عہد میں عثمانیوں کا نہایت وفادار حلیف تھا اب اس کے جانشین جارج برینکوویچ کی سرکردگی میں اتحادیوں کی صف میں شامل ہو گیا، فرانس اور جرمنی نے مبارزین کی ایک کثیر فوج بھیجی، ان کے علاوہ یورپ کے ہر ملک سے ایک بڑی تعداد سپاہیوں کی خود آکر شریک ہوئی لیکن سب سے زیادہ جوش پوپ نے دکھایا، اس نے اپنے نمائندہ کارڈینل جولین سیزارینی (Julian Cesarini) کو ایک مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا، اور یورپ کے ہر حصہ سے اس جنگ کے لئے ایک کثیر رقم فراہم کر کے بھیجی، حقیقۃً یہ ایک صلیبی جنگ تھی جو عیسائیت کے مذہبی جوش نے اسلام کے خلاف چھیڑی تھی جمہوریہ وینس اور جمہوریہ جنوا نے بھی اپنے بحری بیڑوں سے مدد کی، اور چونکہ عثمانیوں کے پاس اُس وقت تک کوئی بحری فوج نہ تھی اس لئے خیال تھا کہ مراد کی خاص فوجیں ایشیائے کوچک سے جہاں وہ امیر کرمانیہ سے جنگ میں مصروف تھیں یورپ میں منتقل نہ کی جا سکیں گی، اتحادی افواج بظاہر شاہ لاڈسلاس کے زیر کمان تھیں لیکن دراصل ان کا سردار ہونیاڈے تھا جو اس وقت مسیحی دنیا کا سب سے بڑا جنرل خیال کیا جاتا تھا،

ترکوں کی شکست | مراد اس وقت کرمانیہ کی بغاوت کے سلسلہ میں ایشیائے کوچک میں تھا، اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی لشکر نے ۸۴۷ھ ۱۴۴۳ء میں دریائے ڈینوب کو عبور کیا، اور نیش کے مقام پر عثمانی فوج کو شکست دی، اس کے بعد ہونیاڈے نے صوفیا پر قبضہ کر لیا، اور پھر کوہ بلقان کو عبور کر کے فلپوپولس پر حملہ کی تیاری شروع کی، کوہ بلقان کے

دامن میں ترکوں نے ایک بار اور مقابلہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی اُن کو شکست ہوئی، عیسائیوں کے لئے میدان اب خالی تھا، مسلسل فتوحات سے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں، مراد ایشیائے کوچک میں تھا، اور پیہم شکستوں نے ترکی فوج کو بہت کچھ کمزور کر دیا تھا، باایں ہمہ ہونیاڈے نے اُس مقصد کے خلاف جسے پیش نظر رکھ کر عیسائی حکومتوں کا یہ اتحاد قائم کیا گیا تھا، واپسی کا عزم کیا اور اپنی کامیابیوں کی داد لینے کے لئے پوری فوج کے ساتھ بودا کو واپس چلا گیا،

صلحنامہ زیجیڈین

مراد نے ہونیاڈے کا تعاقب کرنے کے بجائے اتحادیوں سے صلح کر لینا زیادہ مناسب خیال کیا، کارڈینل جولین صلح کا مخالف تھا، لیکن طویل گفت و شنید کے بعد بالآخر ۲۶ ربیع الاول ۸۴۸ھ (۱۲ جولائی ۱۴۴۴ء) کو زیجیڈین (Szegedin) کے مقام پر ایک صلحنامہ مرتب ہوا جس کے رو سے سرویا سلطنت عثمانیہ سے آزاد کر دیا گیا، اور ولاچیا ہنگری کو دیدیا گیا، اس کے علاوہ مراد نے ساٹھ ہزار ڈوکات عثمانی جنرل محمد چلپی کا زر فدیہ ادا کیا، جو گذشتہ جنگ میں عیسائیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا، یہ صلح دس سال کے لئے کی گئی اس پر پابند رہنے کے لئے لاڈسلاس نے انجیل اور مراد نے قرآن کو ہاتھ میں لے کر قسم کھائی

مراد کی تخت سے کنارہ کشی

ایشیائے کوچک میں امن پہلے ہی قائم ہو چکا تھا، اس صلحنامہ سے یورپ کی جنگ کا بھی بظاہر خاتمہ ہو گیا، اور مراد کو ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا، بیس بائیس سال کی مسلسل لڑائیوں نے اس کو امور سلطنت کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ بقیہ زندگی سکون کے ساتھ گذار دے، صلحنامہ زیجیڈین کے تکملہ کے بعد جب وہ ایشیائے کوچک میں واپس گیا، تو اسے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ علاء الدین کی وفات کی خبر معلوم ہوئی، یہ شہزادہ نہایت لائق اور بہادر تھا، مراد کو اس کی وفات کا بیحد رنج ہوا، اور اس نے سلطنت سے مستقل طور پر کنارہ کش ہو جانے کا فیصلہ کر لیا

چنانچہ اپنے دوسرے لڑکے محمد کو جس کی عمر صرف چودہ سال تھی، تخت پر بٹھا کر وہ ریاست ایدین میں چلا گیا،

عیسائیوں کی معاہدہ شکنی، لیکن جس زندگی کی تلاش میں مراد نے تخت چھوڑ کر ایدین کی سکونت اختیار کی تھی وہ حاصل نہ ہو سکی، جوں ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ مراد سلطنت سے کنارہ کش ہو گیا ہے، اور اُس کی جگہ نوعمر و ناتجربہ کار محمد تخت نشین ہے، عیسائیوں کے دلوں میں ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کا حوصلہ ایکبار پھر پیدا ہوا صلحنامہ زیجیڈین کی تحریر کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گذرا تھا کہ ہنگری کی مجلس قومی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کا فیصلہ کر لیا، اس غداری کا اصل محرک کارڈینل جولین تھا جو پوپ کی پوری تائید کے ساتھ معاہدہ شکنی پر زور دے رہا تھا، شہنشاہِ قسطنطنیہ بھی اس تحریک میں پیش پیش تھا، حالات تمامتر عیسائیوں کے لئے امید افزا تھے سلطنت عثمانیہ کی زمامِ حکومت ایک نوعمر لڑکے کے ہاتھ میں تھی،[1] ایشیائے کوچک میں امیر کرامانیہ نے پھر بغاوت شروع کر دی تھی، اور عثمانی فوجیں اس کے فرو کرنے میں مصروف تھیں، دردانیال پر جنوا، وینس اور برگنڈی کے بحری بیڑوں کا قبضہ تھا جن کی موجودگی میں ترکی افواج کا ایشیائے کوچک سے یورپ میں آنا محال تھا، پھر بھی لاڈسلاس شاہ ہنگری کو صلحنامہ کی خلاف ورزی کرنے میں تامل تھا، لیکن کارڈینل جولین نے اپنے مذہبی اثر سے کام لے کر اس کو مجبور کر دیا، اور بادشاہ کے ضمیر کو اس فتویٰ سے مطمئن کر دیا کہ غیر عیسائیوں کیساتھ معاہدہ کی پابندی نہیں کرنی چاہئے، ہنگری کی مجلس قومی کے بعض ارکان کی مخالفت بھی اسی فتویٰ سے دبا دی گئی، اور جولین نے مجلس میں اعلان کیا کہ اس فتویٰ میں خود پوپ کی تائید بھی شامل ہے، اُس نے مجلس کو مخاطب کر کے کہا، "کیا تم اس موقع پر اُن امیدوں کو توڑ دو گے، جو لوگوں نے تمھارے ساتھ قائم کر رکھی

[1] کریسی جلد ص ۱۰۰

ہیں اور اس خوش بختی سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے جو تمھیں نصیب ہوئی ہے، ‏ "تمھارا عہد و پیمان تمھارے خدا اور تمھارے مسیحی بھائیوں کے ساتھ ہے، اور وہ سابق معاہدہ اُس ناعاقبت اندیشانہ اور مخالفِ مذہب عہد کو ساقط کر دیتا ہے، جو مسیح کے دشمنوں سے باندھا گیا ہو، دنیا میں اس کا نائب یا پاپائے روما ہے جس کی اجازت کے بغیر تم نہ کوئی وعدہ کر سکتے ہو اور نہ اسے پورا کر سکتے، اُس کی طرف سے میں تم کو دروغ حلفی سے بری الذمہ کرتا ہوں، اور تمھاری فوج کو برکت دیتا ہوں، شہرت اور نجات کی راہ پر میرے پیچھے پیچھے چلو، اور اگر اب بھی تمھیں کچھ پس و پیش ہے تو میں اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں۔" ابتدا میں ہونیاڈے نے بھی معاہدہ زیجیڈین کی خلاف ورزی سے اختلاف کیا، لیکن جب یہ وعدہ کیا گیا کہ بلغاریا کو ترکوں سے فتح کرنے کے بعد اُسے وہاں کا بادشاہ بنا دیا جائے گا، تو وہ راضی ہو گیا، البتہ اُس نے یہ شرط کی کہ معاہدہ شکنی کا اعلان یکم ستمبر تک ملتوی کر دیا جائے، یہ شرط اس وجہ سے نہ تھی کہ اسے اب بھی کچھ تامل باقی تھا، بلکہ اس خیال سے پیش کی گئی تھی کہ اس وقت تک اتحادی صلحنامہ سے پورا فائدہ اٹھالیں، اور اُن تمام قلعوں اور علاقوں پر قابض ہو جائیں جنھیں ترک معاہدہ کے مطابق دیانتداری کے ساتھ خالی کر رہے تھے، شاہ سرویا کو اُس کی سلطنت میں اضافہ کا لالچ دیا گیا، اور وہ بھی معاہدہ شکن اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا،

لین پول لکھتا ہے کہ جس طریقہ سے یہ غداری عمل میں لائی گئی، اُس سے زیادہ معیوب بات یورپ کے سورماؤں اور ایک بڑے سپہ سالار کی شہرت کے لئے تصور میں بھی نہیں آ سکتی جس وقت عثمانی دستے مذکورۂ بالا قلعوں اور علاقوں سے نکل آئے

---

[1] گبن جلد ۴ صفحہ ۴۶۷،

اور اتحادیوں نے صلحنامہ سے پوری طرح فائدہ اٹھالیا، شاہ لاڈسلاس کارڈینل جولین، اور ہونیاڈے یکم ستمبر کو بیس ہزار فوج کے ساتھ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے، ترک اس فریب سے بالکل بے خبر تھے نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد قلعے اُن کے ہاتھوں سے نکل گئے قلعوں کے ترکی دستے یا قتل کردیئے گئے یا چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر دیئے گئے، بحر اسود کے ساحل پر پہونچ کر حملہ آوروں نے جنوب کا رُخ کیا، اور کئی اہم مقامات کو فتح کرتے ہوئے وارنا پہونچے، اور اس مشہور شہر کا محاصرہ کرلیا، یہاں بھی ترک اس اچانک حملہ کے لئے بالکل تیار نہ تھے، مجبوراً انھیں ہتھیار ڈال دینے پڑے، اور وارنا پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا،

جنگ وارنا اس درمیان میں دولت عثمانیہ کے بہی خواہوں نے ان واقعات کی خبر سن کر مراد سے گذارش کی کہ یہ وقت گوشۂ عزلت سے نکل کر میدانِ جنگ میں آنے کا ہے، ورنہ شہزادہ محمد کی نوعمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر دشمن بڑھتے آئیں گے، چنانچہ مراد بہ عجلت تمام چالیس ہزار جنگ آزمودہ سپاہیوں کو لے کر اتحادیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا، دردانیال پر عیسائی بیڑوں کا قبضہ تھا لیکن اس نے جنوا کے جہازوں کو فی سپاہی ایک دوکات کی شرح سے محصول ادا کر کے اپنی پوری فوج کو یورپ میں منتقل کر دیا، اتحادیوں کو مراد کی آمد کا گمان بھی نہ تھا، کہ اچانک انھیں اس کے قریب پہونچنے کی اطلاع ملی، مراد نے وارنا سے چار میل کے فاصلہ پر اپنے خیمے نصب کر دیئے اور جنگ کی تیاری کرنے لگا،

ہونیاڈے کو سابق کامیابیوں کی بنا پر اپنی فتح کا پورا یقین تھا، چنانچہ اس نے مجلس حربی کے بعض ارکین کا یہ مشورہ بھی قبول نہ کیا کہ لشکرگاہ کے گرد ناکہ بندی کر کے مراد

کے حملہ کا انتظار کرنا چاہیئے بلکہ خود ہی مراد پر حملہ کرنے کے لئے پوری فوج کے ساتھ چل کھڑا ہوا، ۲۶ رجب ۸۴۸ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۴۴۴ء کو دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں، عیسائی فوج کے یمین و یسار میں ہنگری اور ولاچیا کے بہترین دستے تھے ہنگری کے دستوں کے ساتھ کارڈینل جولین کی سرکردگی میں صلیبی مجاہدوں کی ایک خاص جماعت بھی تھی، لاڈسلاس شاہی دستہ اور ہنگری اور پولینڈ کے نوجوان امرا کو لیکر قلب لشکر کو قوت پہونچا رہا تھا، ہونیاڈے پوری فوج کا سپہ سالار اعظم تھا، ترکوں کی طرف پہلی دو صفیں بے ضابطہ سوار اور پیدل فوجوں کی تھیں، داہنے بازو کی کمان رومیلیا کے بیلر بے کے ہاتھ میں اور بائیں بازو کی اناطولیہ کے بیلر بے کے ہاتھ میں تھی، ان صفوں کے پیچھے مرکز میں خود سلطان مراد کے زیر کمان ینی چری اور شاہی سوار دستے تھے ایک اونچے نیزہ کے سرے پر صلحنامہ زیجیدین کی نقل فوجی نشان کی طرح ہوا میں لہرا رہی تھی، اور بقول کریسی اُس منتقم حقیقی کو پکار رہی تھی، جو لوگوں کو نقضِ عہد کی سزا دیتا ہے، لڑائی شروع ہونے کے قریب ہی تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے عیسائیوں کے دلوں میں بدشگونی کا خطرہ پیدا ہو گیا، دفعۃً ہوا کا ایک سخت جھونکا آیا اور اُن کے تمام علم سوائے بادشاہ کے علم کے زمین پر گر گئے،

ابتدا میں عیسائیوں کا حملہ بہت کامیاب رہا، ترکوں کی پہلی دو صفوں کے قدم اکھڑ گئے، اور فوج میں اتنا انتشار پیدا ہوا کہ مراد کو اپنی شکست کا یقین ہونے لگا، زندگی میں پہلی اور آخری بار صبر و استقلال کا سررشتہ ایک لمحہ کے لئے اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور اس نے گھوڑا موڑ کر بھاگنے کا قصد کیا، لیکن اناطولیہ کے بیلر بے نے جو قریب ہی تھا بڑھ کر لگام پکڑ لی اور عرض کی کہ ابھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، مراد کو بھی تنبہ ہوا اور

اُس نے فوراً گھوڑا روک کر ینی چری کو ہمت دلانا شروع کی، دیکھتے دیکھتے جنگ کا نقشہ بدل گیا، ینی چری نے پے درپے اتنے سخت حملے کیے کہ عیسائی پسپا ہونے لگے، لاڈسلاس نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا لیکن اُس کا گھوڑا زخمی ہو کر گرا اور بعض ینی چری سپاہیوں نے اُسے گھیر کر گرفتار کر لیا، لاڈسلاس نے خواہش کی کہ اسے قید کر لیا جائے، مگر ترکوں میں عیسائیوں کی معاہدہ شکنی سے اس درجہ برہمی پھیلی ہوئی تھی کہ انھوں نے اس کی خواہش پر مطلق توجہ نہ کی، ایک پرانے ینی چری خواجہ خیری نے فوراً اس کا سر کاٹ کر ایک نیزے پر رکھا اور نیزے کو بلند کر کے عیسائیوں کی طرف بڑھا، امرائے ہنگری کے دل اس منظر کو دیکھتے ہی بیٹھ گئے اور وہ نہایت بدحواسی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگے، ہونیاڈے نے تھوڑی دیر جم کر مقابلہ کیا، اور اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ کم سے کم لاڈسلاس کا سر ترکوں سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لے، مگر اُسے کامیابی نہ ہوئی، اور آخر کار وہ بھی بقیہ عیسائی دستوں کے ساتھ بمشکل جان لے کر بھاگا، لیکن اس سے قبل اتحادی فوجوں کا دو ثلث حصہ قتل ہو چکا تھا، شاہ لاڈسلاس کے علاوہ مقتولین میں دو مشہور بشپ اور بعض نہایت ممتاز فوجی افسر بھی تھے لیکن سب سے زیادہ عبرت انگیز نعش کارڈینل جولین کی تھی جو معاہدہ زیجیڈین کی شکست کا خاص محرک اور عیسائیوں کی ہلاکت کا اصلی سبب تھا، جس گناہ کو اپنے سر لے کر اس نے ہنگری کی قومی مجلس کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا اُس کی نعش اس کے وبال کا ایک ایسا مرقع تھی جو مکافاتِ عمل کے خدائی قانون کو فاتح و مفتوح دونوں کے سامنے مجسّم شکل میں پیش کر رہا تھا،

اس جنگ کے نتائج! جنگ وارنا کے بعد ہنگری پر ترکوں کا قبضہ تو فوراً نہ ہو سکا لیکن سرویا اور بوسنیا کی مملکتیں مکمل طور پر فتح کر لی گئیں، یہ دونوں جو یونانی کلیسا سے وابستہ تھیں

دولت عثمانیہ کے زیر تسلط آنا بھی چاہتی تھیں کیونکہ ہونیاڈے کی کامیابی کی صورت میں انھیں بجبر لاطینی کلیسا میں داخل کرنے کی دھمکی دی گئی تھی، سرویا کا مورخ رانکی (Ranke) نقل کرتا ہے کہ ایک بار جارج برنیکوویچ نے ہونیاڈے سے دریافت کیا کہ اسے کامیابی حاصل ہوئی تو مذہب کے متعلق اس کا رویہ کیا رہیگا، ہونیاڈے نے جواب دیا کہ میں سرویا کو رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر مجبور کروں گا، اس کے بعد برنیکوویچ نے یہی سوال مراد سے کیا، اس نے جواب دیا کہ میں ہر مسجد کے پاس ایک گرجا بنوادوں گا، اور لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہوگی کہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجد میں جاکر عبادت کریں خواہ گرجا میں، اسی طرح کلیسائے رومہ کی مذہبی تعدیوں نے بوسنیا کی تسخیر میں بھی ترکوں کی مدد کی اور آٹھ روز کے اندر بوسنیا کے ستر قلعوں نے عثمانی فوجوں کے لئے اپنے پھاٹک کھول دیئے، بوسنیا کا شاہی خاندان مٹ گیا، اور اس کے بہت سے ممتاز امراء اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے[1]۔

ینی چری کی بغاوت اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد مراد نے تاج و تخت پھر شہزادہ محمد کے حوالے کیا، اور ایدین کی پرکیف فضا میں علماء و مشائخ کی صحبتیں دوبارہ شروع ہوئیں، لیکن اب کی بار بھی یہ عزلت پسندی راس نہ آئی، وارنا کی شکست نے عیسائیوں کی قوت کو تو بالکل توڑ دیا تھا، اور سلطنت عثمانیہ کو اب کسی خارجی خطرہ کا خوف نہ تھا لیکن محمد کی کم سنی سے خود ینی چری نے فائدہ اٹھانا چاہا اور تنخواہ کے اضافہ کا مطالبہ پیش کیا، محمد کے انکار پر انھوں نے بغاوت کردی اور ادرنہ میں قتل و غارت کا بازار ایسا گرم کیا کہ وزرائے سلطنت نے مجبور ہوکر مراد سے بمنت استدعا کی کہ زمام حکومت اپنے

---

[1] کریسی، جلد ۱ ص ۱۱۴،

ہاتھ میں لے کر اس فتنہ کو فرو کرے، چنانچہ مراد کو بادل ناخواستہ ایدین کا سکون پرور خلوت پھر چھوڑنا پڑا، اس کے ادرنہ پہونچتے ہی باغیوں نے سر اطاعت خم کر دیا اور شہر میں امن قائم ہو گیا، دوبارہ کے تجربہ سے مراد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ محمد میں ابھی سلطنت کے سنبھالنے کی کافی قابلیت پیدا نہیں ہوئی، چنانچہ اس نے پھر تخت چھوڑنے کا قصد نہیں کیا، بلکہ بقیہ زندگی امور سلطنت کے سر انجام دینے میں گذار دی، بادشاہوں کے تخت سے دست بردار ہو جانے کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں، ان میں سے بعض کا حالات سے مجبور ہو کر دوبارہ عنان سلطنت کو ہاتھ میں لینا بھی ثابت ہے لیکن دوسری بار تخت چھوڑ کر پھر سلطنت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لینا ایک ایسا استثنائی واقعہ ہے جو صرف مراد ثانی کے ساتھ مخصوص ہے، اور جس کی کوئی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، گبن کے نزدیک مراد کی زندگی اور سیرت کا سب سے زیادہ موثر واقعہ یہی ہے کہ یہ فلسفی سلطان دنیاوی عظمت کی بے حقیقتی سے آگاہ ہو کر چالیس سال کی عمر میں دوبار تخت سے علٰحدہ ہو گیا،[ل]

موریا | لیکن اب تخت پر آنے کے بعد مراد کی زندگی کے بقیہ چھ سال تقریباً تمام تر میدان جنگ ہی میں گذرے، سب سے پہلے اسے موریا کی طرف توجہ کرنی پڑی، جہاں شہنشاہ قسطنطنیہ کے دو بھائی قسطنطین اور طامس علٰحدہ علٰحدہ حصوں پر حکمراں تھے قسطنطین نے اپنے مقبوضات کے تحفظ کے لئے خاکنائے کورنتھ کی قلعہ بندی کی اور ادھر سے اطمینان کر لینے کے بعد تھیبیز (Thebes) کے شہر پر جو اسکی سرحد سے قریب سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ تھا دفعۃً حملہ کر کے قبضہ کر لیا، اس واقعہ کی اطلاع پا کر مراد فوراً موریا کی طرف روانہ ہوا، کورنتھ کا مضبوط قلعہ اس کی راہ میں کسی قدر حائل ہوا، مگر عثمانی توپوں کی گولہ باری کے سامنے وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا عثمانی فوج میں توپوں کے استعمال کا یہ پہلا موقع تھا، کورنتھ

[ل] تاریخ دولت علیہ عثمانیہ از [illegible]

کی فتح کے بعد موریا کا راستہ بالکل صاف ہو گیا، اور قسطنطین اور طامس کے لئے اظہارِ اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا، انھوں نے خراج دینا منظور کیا اور موریا بھی دولتِ عثمانیہ کی باجگذار ریاستوں میں شامل کر لیا گیا،

کسووا کی دوسری جنگ | وارنا کی شکست کے بعد ہونیاڈے ترکوں سے انتقام لینے کی تیاریوں میں مصروف رہا، اُس کے دامنِ شہرت پر وارنا کا داغ بہت ہی بدنما تھا، چنانچہ اُس نے چار سال کے اندر اسّی ہزار کی ایک زبردست فوج پھر جمع کر لی، اور دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سرویا میں داخل ہوا، یہاں ہنگری، سرویا اور بوسنیا کی فوجیں متحد ہو کر مراد کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئیں، سرویا اور بوسنیا نے جنگ وارنا کے بعد دولتِ عثمانیہ کی سیادت قبول کر لی تھی، مگر ہونیاڈے کی کوششوں سے یہ دونوں حکومتیں اپنے معاہدہ سے منحرف ہو گئیں اور مکمل آزادی کی خواہش انھیں مراد کے بالمقابل میدانِ جنگ میں پھر کھینچ لائی، یہ قوت آزمائی کسووا کے اُسی میدان میں ہوئی جہاں تقریباً ساٹھ سال پیشتر مراد اول نے سرویا کی طاقتور سلطنت کو شکست دے کر اسے اپنا مطیع بنا لیا تھا، تین روز کی شدید جنگ کے بعد ۱۷ شعبان ۸۵۲ھ (۱۷ اکتوبر ۱۴۴۸ء) کو مراد نے ہونیاڈے کی متحدہ افواج کو بری طرح شکست دی، کسووا کی اس دوسری عظیم الشان جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرویا کی آزادی سلب کر لی گئی اور وہ چند سال بعد سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، مراد نے بوسنیا سے سالانہ خراج قبول کرنے پر اکتفا کیا،

اسکندر بک | اس درمیان میں البانیا میں ایک نیا فتنہ پیدا ہو گیا تھا، مراد کے ابتدائی عہدِ حکومت میں البانیا کی ایک ریاست کا امیر جان کستریوٹ (John Castriot) دولتِ علیہ کا مطیع ہو گیا تھا، اور بطور ضمانت اُس نے اپنے چار لڑکے مراد کی خدمت

میں بھیجدیئے تھے، ان میں سے تین تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے، چوتھا لڑکا جارج کستریو زندہ رہا اور اس کی ہونہاری اور فراست نے بہت جلد سلطان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا مراد نے اپنی ذاتی نگرانی میں جارج کو اسلامی اور فوجی تعلیم دلوائی، اور اُس کی لیاقت اور شجاعت سے خوش ہو کر محض اٹھارہ سال کی عمر میں اُسے ایک سنجق کا حاکم بنادیا، اور اسکندر بک کے لقب سے سرفراز فرمایا، جان کستریو کا جب انتقال ہوا تو مراد نے اُس کی ریاست سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی، یہ بات اسکندر بک کو بہت ناگوار گذری، لیکن اُس نے ایک عرصہ تک اپنے اندرونی جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا جب ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں ہونیاڈے کے مقابلہ میں عثمانی فوجوں کو شکست ہوئی تو اسکندر بک نے موقع کو غنیمت سمجھا، اور اپنے باپ کی ریاست پر قبضہ کرنے کیلئے تیار ہو گیا، چنانچہ ایک روز وہ رئیس آفندی یعنی سلطان کے چیف سکریٹری کے خیمہ میں دفعۃً داخل ہوا، اور اُس کے گلے پر خنجر رکھ کر البانیا کے مضبوط شہر آق حصار (جس کا قدیم نام Croia تھا) کے ترک افسر کے نام ایک حکمنامہ لکھوا لیا کہ شہر اور اس کے ملحق علاقے بحیثیت گورنر کے اسکندر بک کو دیدیئے جائیں، یہ تحریر حاصل کر لینے کے بعد اُس نے رئیس آفندی کو فوراً قتل کر دیا، اور اُسی وقت البانیا کی طرف روانہ ہو گیا، آق حصار پہونچ کر اس فرمان کے ذریعہ سے وہ شہر پر قابض ہو گیا، اس کے بعد اس نے اپنے ارتداد کا اعلان کیا، اور دین عیسوی کی حمایت اور البانیا کی آزادی کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، البانیا کے مختلف جرگوں کے سردار اس کے علم کے نیچے جمع ہونے لگے، ان کی مدد سے اُس نے متعدد قلعوں پر قبضہ کر لیا، اور پھر ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے آبائی علاقوں میں داخل ہوا، اس کے بعد تمام قومی امرائے

اُسے اپنا سر دار تسلیم کر لیا، تقریباً پچیس سال تک وہ ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا، البانیا کے پیچ در پیچ پہاڑی دروں کی وجہ سے عثمانی فوجوں کو کھل کر لڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا، اور متعدد کوششوں کے باوجود البانیا مراد کی حیات میں پوری طرح مسخر نہ ہو سکا،

مراد کی وفات ۵ محرم ۸۵۵ھ (۹ فروری ۱۴۵۱ء) کو مراد نے ادرنہ میں وفات پائی تجہیز و تکفین قدیم پایہ تخت بروصہ میں ہوئی،

اخلاق و اوصاف مراد کے عدل و انصاف اور شریفانہ اوصاف کا اعتراف اُس کے دشمنوں نے بھی کیا ہے، یونانی مورخین بھی اُس کی فوجی قابلیت کے علاوہ اُسکی اخلاقی عظمت کی شہادت دیتے ہیں، اور اس باب میں ترک مورخین کے ہمنوا ہیں[۱]، لارڈ ایورسلے جس کے قلم سے آل عثمان کے محاسن کا اعتراف بہت شاذ ہوتا ہے، مراد کے عہدِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"اُس کی حکومت پر نظر ڈالنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُس نے توسیعِ سلطنت کے مقصد سے لڑائیاں لڑیں، تقریباً ہر جنگ کے لئے وہ مجبور کیا گیا، تین بار امیر کرمانیہ نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، ہر بار مراد نے اُس کو شکست دی اور کرمانیہ کو صرف ایک باجگذار ریاست بنا لینے پر قناعت کی، اور اس کی آزادی کو فنا کر کے اسے سلطنت میں ضم کر لینے پر اصرار نہیں کیا، یہ دکھایا جا چکا ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کا طرزِ عمل کس قدر غدارانہ تھا، اور مراد اس کے مقبوضات کے دائرہ کو تنگ سے تنگ کر دینے میں کس درجہ حق بجانب تھا، اسیطرح سالونیکا پر بھی مراد کا حملہ جب کہ وہ شہر جمہوریہ وینس کے ہاتھ میں تھا بالکل حق بجانب تھا، کیونکہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو اسے فروخت کرنے اور یوں ایک غیر حکومت کو وہاں قدم جمانے کی جگہ دینے کا کوئی حق نہ تھا، شمالی سرحد پر جو

لڑائیاں ہوئیں اُن میں مراد کو اہل ہنگری اور اُن کی حلیف مسیحی طاقتوں کے جارحانہ اقدام سے مجبور ہو کر میدان میں آنا پڑا، اتحادیوں نے تلوار سے فیصلہ چاہا، اور فیصلہ اُن کے خلاف ہوا۔

گبن ایک ترک مورخ کا بیان نقل کرتا ہے:۔

"سلطان مراد نے انچاس سال کی عمر پائی، اور تیس سال، چھ مہینے، آٹھ روز حکومت کی، وہ ایک عادل اور شجاع فرماں روا تھا، نہایت کشادہ دل، مستقل مزاج، عالم، رحمدل، پابندِ مذہب، اور فیاض، وہ اہل علم اور اُن تمام لوگوں سے جو کسی علم یا فن میں کمال رکھتے محبت کرتا، اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتا، وہ ایک نیک شہنشاہ اور ایک جلیل القدر سپہ سالار تھا، کسی شخص نے مراد سے زیادہ یا اس سے بڑی فتوحات نہیں حاصل کیں، اُس کے عہدِ حکومت میں سپاہی ہمیشہ فتحیاب تھا اور شہری خوش حال، اور مامون، جب وہ کسی ملک کو فتح کرتا تو سب سے پہلے وہاں مسجدیں اور کاروان سرائیں، ہسپتال اور مدرسے تعمیر کراتا، ہر سال وہ ایک ہزار طلائی سکے سادات کی نذر کرتا اور ڈھائی ہزار مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، اور بیت المقدس کے دیندار لوگوں کے لئے بھیجتا"[1]

اس کے بعد گبن خود اپنی تحقیق لکھتا ہے:۔

"مراد کے عدل و انصاف اور بردباری کی تصدیق اُس کے طرزِ عمل نیز خود عیسائیوں کی شہادت سے ہوتی ہے جن کا خیال ہے کہ اُس کے عہد کی خوشحالی اور اُس کی پرسکون موت اُس کے غیر معمولی اوصاف کا صلہ تھی، اپنی عمر اور فوجی قوت کے دورِ شباب میں بھی اُس نے شاذ ہی کسی میدانِ جنگ میں قدم رکھا جب تک پہلے دشمنوں کی طرف سے اُس کو جنگ کے لئے کافی طور پر برانگیختہ نہ کیا گیا، دشمن کے مطیع ہو جانے کے بعد

---

[1] ایوریسلے صا۲،

فاتح سلطان اپنے ہتھیار کھول کر رکھ دیتا تھا، اور صلحناموں کی پابندی میں اُس کا عہد ناقابل شکست اور مستحکم تھا، حملہ کی ابتدا عموماً اہل ہنگری کی طرف سے ہوا کرتی تھی، اسکندر بک کے خلاف اسکو اشتعال خود اسکندر بک کی بغاوت کی وجہ سے پیدا ہوا، اور کرمانیہ کے غدار امیر کو عثمانی سلطان نے دو بار زیر کیا، اور دونوں مرتبہ معاف کر دیا، قبل اس کے کہ وہ مور پر چڑھائی کرے تھیبیز پر جو دریا کا فرماں روا اچانک حملہ کر چکا تھا، جہاں تک سالونیکا کی فتح کا تعلق ہے، بایزید کا پوتا اہل وینس کی تازہ خریداری کو زیر بحث لا سکتا تھا، اور قسطنطنیہ کے پہلے محاصرہ کے بعد سلطان کو پھر کبھی پلیولوگس کی مصیبت، غیر موجودگی یا اذیتوں کی بنا پر سلطنت بازنطینی کے بجھتے ہوئے چراغ کو گل کر دینے کی ترغیب نہیں ہوئی۔"[1]

---

[1] گبن جلد ۴ صفحہ ۴۶۰ و ۴۶۱،

محمد فاتح

۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء

شہزادہ محمد ریاست ایدین میں تھا جب اُسے مراد کی وفات کی اطلاع ملی، وہ فوراً ایک عربی گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ کہتا ہوا کہ جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں میرے ساتھ آئیں دردانیال کی طرف روانہ ہوگیا، اور اسے عبور کرکے ادرنہ پہنچا، تخت نشینی کے وقت ینی چری کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اُسے انعامات تقسیم کرنے پڑے، جس سے آئندہ کیلئے ایک مثال قائم ہوگئی اور ینی چری میں اپنی اہمیت کا مزید احساس پیدا ہوگیا،

معصوم بھائی کا قتل

زمام سلطنت کو ہاتھ میں لینے کے بعد محمد نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے شیر خوار بھائی کو جو سرویا کی شہزادی کے بطن سے تھا آئندہ فتنہ کے خوف سے حوض میں غرق کرادیا، معصوم بچہ کا یہ قتل عین اُس وقت عمل میں آیا جب غریب و بیکس ماں سلطان کے حکم سے بالکل بے خبر اُس کی تخت نشینی پر دربار میں تہنیت پیش کر رہی تھی،

شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش

محمد کی تخت نشینی سے تین سال قبل بازنطینی سلطنت کا آخری فرماں روا قسطنطین یازدہم قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھ چکا تھا، قسطنطین ایک بہادر شہزادہ تھا لیکن محمد کو برافروختہ کرنے میں اُس نے اُسی شدید غلطی کا اعادہ کیا جس کا خمیازہ اُس کے

پیشرو مینوئیل کو مراد ثانی کے ہاتھوں بھگتنا پڑا تھا، سلطان بایزید یلدرم کا ایک پوتا اورخاں نامی جو شہزادہ سلیمان کی اولاد سے تھا قسطنطنیہ میں نظر بند تھا اس کے مصارف سلطان کی طرف سے ادا ہوتے تھے قسطنطین نے اس رقم میں اضافہ کا مطالبہ کیا، اور عدم منظوری کی صورت میں اورخاں کو محمد کے مقابل کھڑا کر دینے کی دھمکی دی، اس نے اپنی غلط فہمی سے یہ خیال کیا کہ محمد اب بھی ویسا ہی ناتجربہ کار ہے جیسا کہ چھ سال قبل تھا، اسے معلوم نہ تھا کہ اس قلیل مدت میں نوعمر سلطان کی قوتیں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی پاچکی ہیں، اور اکیس ہی سال کی عمر میں وہ ارادہ کی پختگی، فوجی قابلیت، اور ملکی تنظیم و تدبیر میں اپنے پیشروؤں کا حریف بن چکا ہے، محمد اس وقت ایشیائے کوچک کی بعض شورشوں کے فرو کرنے میں مصروف تھا، اس نے بازنطینی سفرار کو نرمی کے ساتھ جواب دے کر ٹال دیا لیکن وزیر اعظم خلیل پاشا نے قسطنطین کو اس احمقانہ مطالبہ کے خطرات سے متنبہ کیا، اور سفرا سے کہا کہ "تمھارا جنون قسطنطنیہ کو سلطان کے ہاتھوں میں دے کر رہیگا، یورپ میں اورخاں کے سلطان ہونے کا اعلان کرو، اہل ہنگری کو اپنی مدد کے لئے بلاؤ، جو صوبے تم واپس لے سکتے ہو واپس لے لو، لیکن بہت جلد تم کو بازنطینی سلطنت کا خاتمہ بھی نظر آجائے گا"

قسطنطنیہ کی اہمیت، اصل یہ ہے کہ ابتدا ہی سے محمد نے قسطنطنیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کا تہیہ کر لیا تھا، سینوپ اور طرابزون کے علاوہ قدیم بازنطینی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقوں پر عثمانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا، یورپ میں بھی صرف قسطنطنیہ اور اسکے مضافات اس سلطنت میں باقی رہ گئے تھے، قیاصرہ کی وہ عظیم الشان سلطنت جو اپنی وسعت اور قوت کے لحاظ سے کبھی دنیا کی تمام سلطنتوں پر فوقیت رکھتی تھی اب تباہی

اور بربادی کی آخری حد تک پہونچ گئی تھی اور جہاں تک وسعت اور قوت کا تعلق تھا گویا فنا ہو چکی تھی، تاہم اس حالت میں بھی قسطنطنیہ کا وجود بجائے خود نہایت اہم تھا، اور قصرِ سلطنت کی پہلی اور آخری اینٹ ہنوز اپنی جگہ پر قائم تھی، ترکوں نے جس وقت یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا اسی وقت سے اس شہر کو فتح کرنے کا حوصلہ اُن کے دلوں میں راسخ ہوتا گیا، جوں جوں فتوحات کا دائرہ بڑھتا جاتا تھا، ان کے ارادہ میں قوت آتی جاتی تھی، اور بالآخر اس کا پہلا عملی اظہار بایزید یلدرم کے عہد میں ہوا، جب کہ اُس نے آبنائے باسفورس کے مشرقی ساحل پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرانے کے بعد قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع کیا، لیکن محاصرہ کو چند ہی روز گذرے تھے کہ تیموری حملہ نے بایزید کو اسے اٹھا لینے پر مجبور کیا، اور جنگِ انگورہ کے بعد کچھ دنوں کے لئے قسطنطنیہ محفوظ و مامون ہو گیا، مراد ثانی اگرچہ شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن خود شہنشاہ کی غداری نے اسے مجبور کیا کہ سلطنت عثمانیہ کی حفاظت کے خیال سے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے ہمیشہ کے لئے اس فتنہ کا استیصال کر دے، مگر سلطنت بازنطینی کے ایام حیات ابھی کچھ اور باقی تھے، اور مراد کو بھی ایشیائے کوچک کی ایک بغاوت کے باعث محاصرہ اٹھا کر شہنشاہ کی اطاعت اور خراج قبول کرنے پر اکتفا کرنا پڑا، تاہم ترکوں کی نظریں اب بھی قسطنطنیہ پر جمی ہوئی تھیں، یہ شہر اپنے موقع کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کا قدرتی پایہ تخت تھا، بحر مارمورا کے دونوں ساحلوں پر عثمانیوں کی حکومت تھی لیکن جب تک قسطنطنیہ عیسائیوں کے قبضہ میں رہتا، سلطان کے ایشیائی اور یورپی صوبوں کا درمیانی تعلق کبھی محفوظ نہیں ہو سکتا تھا، لہذا علاوہ اُس عظمت و شان کے جو اس تباہی و بربادی کی حالت میں بھی سلطنت بازنطینی

کے پایہ تخت سے وابستہ تھی، خود اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے بھی قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا سلطان کے لئے ناگزیر تھا، یہ مصالح بجائے خود محمد ثانی جیسے سلطان کو اس مہم پر آمادہ کرنے کے لئے کافی تھے قسطنطین کی دھمکی نے اُسے اور زیادہ برانگیختہ کر دیا اور اُس نے اپنے دورِ حکومت کے سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامے کیلئے تیاریاں شروع کر دیں،

قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں، اس غرض سے کہ قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران میں اُسے کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہونا پڑے، اُس نے پہلے ایشیائے کوچک کی شورشوں کو فرو کیا، اور امیر کرمانیہ سے صلح کر کے اُس کی لڑکی سے عقد کر لیا، اس کے بعد تین سال کے لئے ہونیاڈے سے بھی صلح کر لی، جس کی وجہ سے شمالی یورپ کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا، پھر اس نے ایک فوج موریا میں بھیج دی تاکہ شہنشاہ کے بھائی جو وہاں حکومت کرتے تھے قسطنطنیہ کی مدد کرنے سے روک دیئے جائیں، ان تدبیروں سے فارغ ہو کر اُس نے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل اور قسطنطنیہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کرانا شروع کیا، یہ قلعہ بایزید یلدرم کے بنوائے ہوئے قلعہ کے جو آبنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر واقع تھا بالکل مقابل تھا، قسطنطین نے اس قلعہ کی تعمیر کے خلاف احتجاج کیا لیکن بے سود، دورانِ تعمیر میں بعض ترکوں نے چند یونانی کاشتکاروں سے کچھ چھیڑ کی جس نے ایک چھوٹی سی لڑائی کی شکل اختیار کر لی، اور اس میں فریقین کے چند سپاہی مارے گئے، قسطنطین سمجھ چکا تھا کہ یہ تمام تیاریاں دراصل قسطنطنیہ پر حملہ کے لئے ہو رہی ہیں، اُس نے خوفزدہ ہو کر شہر کا پھاٹک بند کرا دیا، اور ایک وفد کے ذریعہ سے محمد ثانی کی خدمت میں ترک سپاہیوں کے طرزِ عمل کی شکایت کی، محمد نے اس شکایت کا جواب اعلانِ جنگ سے دیا، اب سلطنت بازنطینی کی موت و زیست کا مسئلہ آخری فیصلہ کا منتظر تھا،

جدید قلعہ ۸۵۶ھ (۱۴۵۲ء) کے موسم سرما سے قبل تیار ہو گیا، آبنائے باسفورس اب تمام تر ترکوں کے قبضہ میں تھی، کوئی جہاز بغیر ان کی اجازت کے اسے عبور نہیں کر سکتا تھا، اس قلعہ کی تعمیر کے بعد محمد جنگ کی دوسری تیاریوں میں مصروف ہوا، اس نے اور تین ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کی لیکن قسطنطنیہ کی فتح کے لئے محض سپاہیوں کی تعداد کافی نہ تھی خواہ وہ کتنی ہی زیادہ رہی ہو، یہ شہر مثلث نما تھا جس کے دو حصے پانی سے گھرے ہوئے تھے، شمال میں شاخ زریں اور جنوب میں بحر مارمورا تھا، بڑی فوجیں صرف تیسرے حصّے سے حملہ کر سکتی تھیں، جو مغرب کی جانب واقع تھا، لیکن اس کی حفاظت یکے بعد دیگرے تین زبردست دیواریں کر رہی تھیں، جو توپوں کی ایجاد سے قبل ہر طرح کے حملہ سے محفوظ خیال کی جاتی تھیں، اندر کی دونوں دیواریں بہت موٹی تھیں اور ان پر ایک سو ستر فٹ کے فاصلہ سے مضبوط برج بنے ہوئے تھے، ان دیواروں کے درمیان ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا، باہر کی جانب دوسری اور تیسری دیوار کے بیچ میں ساٹھ فٹ چوڑی ایک خندق تھی، جو سو فٹ گہری تھی، یہ دیواریں پانچویں صدی عیسوی میں شہنشاہ تھیوڈوسیس ثانی (Theodosius II) نے تعمیر کرائی تھیں، اور اب تک اکیس[21] محاصروں میں قسطنطنیہ کو دشمنوں کی قدم سے محفوظ رکھ چکی تھیں، قسطنطنیہ کی فتح کے لئے ضروری تھا کہ ان دیواروں پر کامیابی کے ساتھ گولہ باری کی جائے، کچھ عرصہ سے ترکوں اور عیسائیوں نے جنگ میں توپوں کا استعمال شروع کر دیا تھا، لیکن محمد نے مروجہ توپوں کو ناکافی خیال کر کے نہایت عظیم الشان توپیں بنوائیں، جو اپنی جسامت اور طاقت کے لحاظ سے بے نظیر تھیں، اُربان (Urban) نامی ایک عیسائی انجنیئر نے جو ہنگری کا رہنے والا تھا، اور بازنطینیوں

کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر سلطان کی خدمت میں چلا آیا تھا ایک نہایت زبردست توپ ڈھالی جس کے سنگی گولوں کا قطر ڈھائی فٹ تھا۔ اسکے علاوہ اُس نے اور بھی توپیں بنائیں جو نسبتہً چھوٹی تھیں لیکن زیادہ تیزی کے ساتھ گولے برسا سکتی تھیں۔ محمد نے قسطنطنیہ کے محاصرہ کے لئے ایک سو اسّی جہازوں کا ایک بیڑا بھی تیار کرایا۔ وہ محاصرہ کی تیاریوں میں حد درجہ منہمک تھا، اور اس کے لئے تمام سامان اپنی ذاتی نگرانی میں فراہم کر رہا تھا۔

مدافعت کی تیاریاں

اُدھر قسطنطین بھی مدافعت کی تیاریوں میں اسی قدر مصروف تھا، اُس نے شہر کی دیواروں کی مرمت کرائی، اور جو کچھ رسد ممکن تھی بہم پہونچائی، اس کے بعد اُس نے مغربی یورپ کے فرماں رواؤں سے مدد کی درخواست کی اور پوپ کی پوری اعانت اور ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کلیسائے رومہ کے تمام مطالبات کو منظور کر کے یونانی کلیسا کو اس سے ملحق کر دیا۔ سینٹ صوفیا میں پوپ کے نمائندہ کارڈینل اسیڈور (Cardinal Isidore.) کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد ہوئی، جسمیں شہنشاہ اس کے درباری اور قسطنطنیہ کے تمام ملکی اور مذہبی عہدہ دار شریک ہوئے اور کلیسائے قسطنطنیہ کو کلیسائے رومہ سے متحد کرنے کی تجویز کثرت رائے سے منظور کر لی گئی، اس فیصلہ نے یونانی پادریوں کو بہت برافروختہ کیا، اور شہر کی آبادی کے بڑے حصہ نے اس سے اپنی بیزاری کا علانیہ اظہار کیا، دونوں کلیساؤں کے درمیان جو قدیم عناد چلا آتا تھا وہ اس نازک موقع پر بھی قائم رہا، اور شہنشاہ کے اس فعل نے خود اس کی رعایا کی ایک کثیر تعداد کو اس سے برگشتہ کر دیا، گرانڈ ڈیوک نوٹاراس (Notaras) جو تمام افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اور قسطنطین کے بعد سلطنت کی سب سے بڑی شخصیت تھا، اس قدر برہم تھا کہ اُس نے صاف لفظوں میں یہ کہا کہ

کارڈینل کی ٹوپی کے مقابلہ میں قسطنطنیہ میں ترکوں کے عمامے دیکھنا مجھے زیادہ گوارا ہے"
نتیجہ یہ ہوا کہ خود یونانیوں میں دو جماعتیں ہوگئیں، ایک وہ جو کلیسائے روما کی طرفدار
اور اس نازک وقت میں اس کی مدد کی خواستگار تھی، دوسری وہ جو اس حالت میں
بھی کلیسائے روما سے اتحاد کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھی، دوسری جماعت پہلی سے
بڑی تھی، چنانچہ اس جماعت کے گرجاؤں نے شہنشاہ کو مالی مدد دینے سے انکار
کردیا، اور اس میں سے جو لوگ جنگ میں شریک ہوسکتے تھے، اُن کی ایک بہت قلیل
تعداد نے شہر کی محافظت کے لئے آمادگی ظاہر کی، قسطنطنیہ کی آبادی باوجود بہت کچھ
کم ہوجانے کے ایک لاکھ کے قریب تھی، لیکن ترکوں کے مقابلہ میں قسطنطین کی حمایت
کے لئے صرف چھ ہزار یونانیوں نے اپنی خدمات پیش کیں[1]"

مغربی یورپ کی سرد مہری

قسطنطین نے مغربی یورپ سے مدد کی جو درخواست کی تھی وہ
بھی بہت ناکافی حد تک پوری ہوئی، پوپ نے آزمودہ کار سپاہیوں کی ایک
تعداد اور کچھ مالی مدد کارڈینل اسیڈور کے ساتھ روانہ کی، اٹلی اور اسپین کے بعض شہروں
نے جو قسطنطنیہ سے تجارتی کاروبار رکھتے تھے چند فوجی دستے بھیجے، وینس اور
اسپین کے صوبہ کٹالونیا، اور اراگن نے کچھ مدد کی، لیکن ان سب سے زیادہ قیمتی مدد اہل جنیوا
کی طرف سے آئی، مشہور جنوی کمانڈر جان جسٹینانی John Giustiniani
دو جنگی جہازوں اور سات سو منتخب بہادروں کے ساتھ محاصرہ شروع ہونے سے
تھوڑی ہی مدت قبل آ پہنچا، یہ شخص اپنی شجاعت اور اعلیٰ فوجی قابلیت کے لحاظ سے تنہا
ایک فوج کے برابر تھا، دوران محاصرہ میں اور خاص کر آخری حملہ کے روز اس نے

[1] کریسی جلد ۱ صفحہ ۱۲۵،

ایسی جانبازی کا ثبوت دیا کہ خود محمد ثانی کی زبان سے بے اختیار اُس کی تحسین نکل گئی اور اس نے کہا کاش یہ شخص میرے فوجی سرداروں میں ہوتا، بہر حال مغربی یورپ سے مختلف حکومتوں نے جو فوج بھیجی تھی اس کی مجموعی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی، اور انکو شامل کرنے کے بعد قسطنطین کی تمام فوج صرف نو ہزار تک پہنچتی تھی، تعجب یہ ہے کہ قسطنطین کی درخواست کا کوئی اثر فرانس، جرمنی، ہنگری، اور پولینڈ پر نہ ہوا، اور یہ سلطنتیں جو بار بار ایک عظیم الشان مسیحی اتحاد قائم کر کے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کے لئے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھتی تھیں قسطنطنیہ کے اس آخری لمحہ حیات میں جب کہ ان ہی ترکوں کے ہاتھوں سلطنت بازنطینی کا خاتمہ ہو رہا تھا کامل بے حسی اور بے پروائی کے ساتھ اپنے اپنے مقام سے اس منظر کو دیکھتی رہیں، بعض مورخین کا خیال ہے کہ قسطنطین کے معاملہ سے یورپ کو زیادہ دلچسپی نہ تھی، مگر ہمارے نزدیک عیسائی سلطنتوں کے اس طرز عمل کا باعث کچھ اور ہی تھا، گذشتہ (۶۵) سال کے اندر ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کی غرض سے انھوں نے چار مرتبہ مذہبی اتحاد کے ذریعہ اپنی تمام قوتوں کو یکجا کیا، لیکن ہر بار انھیں ہزیمت اٹھانی پڑی اور مسیحی اتحاد کا شیرازہ بندھ بندھ کر منتشر ہوتا گیا، کسووا (۱۳۸۹ء) نائکوپولس (۱۳۹۶ء) وارنا (۱۴۴۴ء) اور کسووا (۱۴۴۸ء) کی تباہ کن شکستیں اتنی تازہ تھیں کہ یورپ اس قسم کے کسی مزید تجربہ کے لئے تیار نہ تھا، اور باوجود اس کے کہ قسطنطین نے اپنا اور اپنی سلطنت کا مذہب تبدیل کر کے کلیسائے روم کی اطاعت قبول کر لی، اور وہ کر ڈالا جو صدیوں کی کوشش کے بعد بھی مغربی یورپ کی تمام قوتیں انجام نہ دے سکی تھیں، یورپ کے جمود میں کوئی محسوس حرکت پیدا نہ ہوئی اور قسطنطنیہ کی دیواروں کو آخر کار محمد فاتح کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا،

محاصرہ ۲۶ ربیع الاول ۸۵۷ھ (۶ اپریل ۱۴۵۳ء) کو محاصرہ شروع ہوا، دوران محاصرہ میں یونانیوں نے غیر متوقع شجاعت اور استقلال کا ثبوت دیا، جسٹینیانی کی فوجی مہارت خاص طور پر نمایاں تھی، اور وہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھا کر بار بار سلطان سے خراج تحسین وصول کر رہا تھا، برّی فوج کے حملہ کا ابھی کوئی معمولی اثر بھی ظاہر نہ ہونے پایا تھا کہ وسط اپریل میں ایک مختصر سی بحری جنگ پیش آگئی، ایک یونانی اور چار جنوی جہاز اہل قسطنطنیہ کے لئے سامانِ رسد لا رہے تھے، بحر مارمورا کو عبور کرنے کے بعد جب وہ آبنائے باسفورس میں بمشکل داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ (۱۴۰) عثمانی کشتیاں اُن کی راہ میں حائل ہیں، جس وقت یہ جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچے ترکی بیڑے نے حملہ کر دیا، لیکن جنوی جہاز عثمانی کشتیوں کے مقابلہ میں بہت اونچے اور طاقتور تھے، انھوں نے عثمانی کشتیوں پر پتھر اور آگ برسانا شروع کر دیا، جس سے ان میں انتشار پیدا ہو گیا، اور یہ انتشار ان کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے اور بھی بڑھ گیا، سلطان ساحل پر کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس سے ضبط نہ ہو سکا اور اُس نے بے اختیار اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا، لیکن ترکی بیڑا اس وقت تک اس قدر منتشر ہو چکا تھا کہ عیسائی جہازوں کو نکل جانے کا راستہ مل گیا، اور وہ اہل قسطنطنیہ کے نعرہائے مسرت کے ساتھ بحفاظت بندرگاہ میں پہونچ گئے،

جنوی جہازوں کی اس شاندار فتح کا اخلاقی اثر محصورین پر بہت اچھا پڑا، انہیں جرأت و استقلال کی ایک نئی روح پیدا ہو گئی، تاہم صرف اس روح کا پیدا ہو جانا ہی مدافعت کے لئے کافی نہ تھا، جنوی رسد کے بعد پھر کوئی رسد اُنھیں باہر سے نہ مل سکی، دوسری طرف محمد نے بھی اپنی پہلی بحری شکست کے بعد محاصرہ کی سختی کے لئے ایک زیادہ موثر تدبیر سوچی، اُسے اندازہ ہو چکا تھا کہ آبنائے باسفورس کے اس

حصہ میں جہاں پانی زیادہ گہرا تھا ترکی بیڑا عیسائیوں کے طاقتور جہازوں کے مقابلہ میں مشکل سے کامیاب ہو سکتا تھا، لہذا اُس نے اپنی کشتیوں کی ایک بڑی تعداد بندرگاہ کے بالائی حصہ میں منتقل کر دینا چاہی جہاں پانی تنگ اور چھچھلا تھا، اور جسمیں یونانی اور جنوبی جہاز اپنے قد و قامت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکتے تھے، سمندر کے راستہ سے بندرگاہ کے اس حصہ تک پہنچنا ممکن نہ تھا اس لئے محمد نے ایک ایسی صورت اختیار کی، جو اُس کی ذہانت اور آہنی عزم و استقلال کی ایک غیر فانی مثال ہے، باسفورس اور بندرگاہ قسطنطینہ کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ ہے، اُس نے اس درمیانی پہاڑی زمین پر لکڑی کے تختوں کی ایک سڑک بنوائی، اور ان تختوں کو چربی سے خوب چکنا کرا دیا، اور ایک رات کے اندر اُسی کشتیاں بیلوں سے کھنچوا کر بندرگاہ کے اس حصہ میں پہنچا دیں قسطنطینہ کا یہ حصہ اب تک بالکل محفوظ تھا ترکی کشتیوں کے پہونچ جانے سے اب یہ بھی حملہ کی زد میں آ گیا اور قسطنطین کو مجبوراً سپاہیوں کا ایک دستہ شہر کے دوسرے حصہ سے ہٹا کر اس حصہ میں متعین کرنا پڑا۔

اس درمیان میں شہر کی دوسری سمتوں میں برابر حملے ہوتے تھے لیکن ان زبردست دیواروں پر جو ایک ہزار سال سے دشمنوں کا مقابلہ کر رہی تھیں ہنوز ان حملوں کا کوئی اثر ظاہر نہ تھا، بالآخر سات ہفتوں کی متواتر گولہ باری کے بعد دیواروں میں تین مقامات پر شگاف نمودار ہوئے، اور محمد کو آخری حملہ کی کامیابی کا یقین ہو گیا، ۱۵ جمادی الاول ۸۵۷ھ (۲۴ مئی ۱۴۵۳ء) کو اُس نے قسطنطین کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ شہر کو سپرد کر دے تو رعایا کی جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور موریا کی حکومت اسے دیدی جائے گی، لیکن قسطنطین نے اسے منظور نہ کیا، اس کے بعد محمد نے فوج میں اعلان کرا دیا کہ ۲۰ جمادی الاول (۲۹ مئی) کو آخری حملہ ہو گا،

سقوطِ قسطنطنیہ

۲۰ جمادی الاول ۸۵۷ھ (۲۹ مئی ۱۴۵۳ء) کی رات ترکوں نے تسبیح و تہلیل میں گذاری، فریضۂ فجر ادا کرنے کے بعد حملہ شروع ہوا، حملہ مختلف سمتوں میں ہو رہا تھا لیکن سب سے زیادہ زور اس حصہ پر تھا، جو دروازہ سینٹ رومانس کے قریب تھا، وہاں کی دیوار ترکی توپوں کی گولہ باری سے بہت کچھ مجروح ہو چکی تھی، عثمانی اور یونانی سپاہیوں کی تعداد میں کوئی مناسبت نہ تھی لیکن دوپہر سے پہلے تک انتہائی کوشش اور فتح کی پوری امید کے باوجود عثمانی فوج کا ایک سپاہی بھی شہر میں داخل نہ ہو سکا، قسطنطین اور اس کے ساتھیوں نے اس روز حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا، اور ترکوں کی باڑھ کو بجہد پامردی سے رد کرتے رہے لیکن محمد بھی عزم و استقلال کا مجسمہ تھا، وہ ابتدائی ناکامیوں سے متاثر نہ ہوا، اور اب خود اپنی ینی چری دستوں کو لیکر آگے بڑھا، یونانی اس وقت تک بالکل خستہ ہو چکے تھے، اُن میں اس تازہ حملہ کی تاب نہ تھی، اسی درمیان میں جسٹنیانی کو جو گویا مدافعت کی روح تھا، ایک کاری زخم لگا، جس سے وہ کچھ ایسا خائف ہوا کہ جنگ سے بالکل کنارہ کش ہو گیا، ایسے نازک وقت میں جب محمد اپنی پوری قوت کیساتھ حملہ کر رہا تھا، جسٹنیانی کا اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلا جانا گویا شہر کو دشمن کے سپرد کر دینا تھا لیکن قسطنطین کے شدید اصرار کے باوجود وہ کچھ دیر بھی نہ ٹھہرا اور فوراً بندرگاہ میں چلا گیا، اُس کے ہٹتے ہی عیسائیوں میں کمزوری کے آثار نمایاں ہونے لگے، قسطنطین نے خود موقع پر پہنچکر کمان اپنے ہاتھ میں لی، مگر ینی چری کا حملہ اتنا سخت تھا کہ شہنشاہ اور اس کے بہادر سپاہیوں کی جانبازی زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکی، ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس ہمراہیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا، اور اگرچہ حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھی فوراً مار کر گرا دیئے گئے، تاہم باقی کامیاب رہے اور اسکے بعد ہی اور ترکی دستے بھی یکے بعد دیگرے پہنچتے گئے، یونانیوں کیلئے اب کوئی امید باقی نہ رہی،

قسطنطین نے اپنی سرخ عبا جو قیاصرہ کی امتیازی پوشاک تھی اتار کر پھینک دی اور ترکی فوج کے بڑھتے ہوئے طوفان میں گھس کر ایک جانباز اور سرفروش سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا،

فاتح کا داخلہ

چند لمحوں کے اندر قسطنطنیہ فاتحوں کے پے درپے دستوں سے بھر گیا، پہلے تو انھوں نے فتح کے ابتدائی جوش میں قتل عام شروع کر دیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب یہ جوش کسی قدر ٹھنڈا ہوا اور نیز یہ دیکھکر کہ شہر والوں کی طرف سے مزاحمت نہیں ہوتی انھوں نے اپنی تلواریں نیام میں کرلیں اور مال غنیمت کے حاصل کرنے میں مصروف ہوگئے، ظہر کے قریب سلطان محمد فاتح اپنے وزرا اور امرائے سلطنت کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، سینٹ صوفیا کے گرجے کے پاس پہنچکر وہ گھوڑے سے اترا، اور اُس عالیشان معبد میں داخل ہو کر جس میں گیارہ سو برس سے تین خداؤں کی پرستش ہوتی آئی تھی خدائے واحد کی تسبیح و تقدیس کے لئے سربسجدہ ہوا اور موذن کو حکم دیا کہ اللہ کے بندوں کو اُس کی عبادت کے لئے آواز دے، فتح کے دوسرے روز محمد نے شہر کا جائزہ لیا، جب قیاصرہ کے شاہی محل میں پہنچا اور اس کے ویران اور اجڑے ہوئے ایوانوں پر نظر پڑی تو بے اختیار اس کی زبان پر یہ شعر آگیا، ؎

پردہ داری می کند در قصر قیصر عنکبوت بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے بعد ترکوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا، قرون وسطیٰ کے دستور جنگ میں مفتوحین کی جان و مال تمام تر فاتح کی ملک ہوتی تھی، جس پر اسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہوتا تھا یورپ کی سلطنتوں نے اس اختیار کے استعمال میں کبھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور ظلم و تعدی کی ایسی ہولناک مثالیں

پیش کیں، جو تخیل میں بھی مشکل آ سکتی ہیں، جب کبھی اُنھوں نے مسلمانوں پر فتح پائی وہ سب کچھ کر ڈالا جو تاریخِ مظالم کے روشن ترین کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے، اس کے مقابلہ میں ترکوں نے قسطنطنیہ میں داخل ہو کر جو کچھ کیا وہ حقیقۃً کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا، بلا شبہہ شروع شروع جو بھی سامنے آیا، اُس کو قتل کر دیا لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مدافعت کی قوت اُن میں باقی نہیں رہی، تو فوراً ہی اپنی تلواریں نیام میں کر لیں، اور مالِ غنیمت کے جمع کرنے میں مصروف ہو گئے، یہ سلسلہ تین روز تک جاری رہا، چوتھے روز سلطان نے امنِ عام کا اعلان کیا، اور سپاہیوں کے ہاتھ دفعۃً رک گئے اس موقع پر ایورسلے لکھتا ہے :" اگرچہ سلطان اور اُس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کئے، اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فتحِ قسطنطنیہ کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھیں، جب کہ مجاہدینِ صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتلِ عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی، اور وہ اسمیں کامیاب رہا"[1]

عیسائیوں کی مذہبی اور ملی آزادی یکم جون ۱۴۵۳ء کو سلطان نے امنِ عام کا اعلان کیا، اور اُن تمام عیسائیوں کو جو قسطنطنیہ سے بھاگ گئے تھے واپس آنے کی دعوت دی، اس نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا، اور انھیں آمادہ کیا کہ اگر اپنے پیشوں اور کاروبار میں پھر بدستور مشغول ہو جائیں، اس کے بعد اُس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو از سرِ نو اُس کے عہدہ پر مامور کیا، اور کلیسا کی سرپرستی خود قبول کی، ایک خاص فرمان کے ذریعہ

[1] لارڈ ایورسلے صفحہ ۸۳،

یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی، وہ اور نیز اُس کے کلیسا کے دوسرے عہدہ دار تمام ٹیکسوں سے بری کر دیئے گئے، اسی فرمان کے ذریعہ یونانیوں کے نصف گرجے انھیں واپس کر دیئے گئے، اور اُن کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دیدی گئی اس فرمان میں سلطان نے انھیں اس امر کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے قومی معاملات اپنی ملی عدالتوں میں طے کر لیا کریں، ان عدالتوں کا صدر کلیسا کے بطریق جارج گنادیس (Gennadius) کو مقرر کیا جو خود یونانیوں کا منتخب کردہ تھا، سلطان نے یونانیوں کے قانون نکاح اور قانونِ وراثت کو بدستور قائم رکھا، اور ان کا نفاذ بطریقن اور مذہبی عدالتوں کے سپرد کیا، پروفیسر آرنلڈ اپنی مشہور کتاب "دعوت اسلام" میں سلطان محمد فاتح کی اس رواداری کے متعلق لکھتے ہیں:-

سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن ہونے کے بعد پہلا انتظام یہ کیا کہ یونانی کلیسا کا حامی اور سرپرست بنا تاکہ عیسائی اس کی اطاعت قبول کریں، عیسائیوں پر سختی ہونے کی ممانعت کر دی، اور ایک فرمان جاری کیا جس کے بموجب قسطنطنیہ کے نئے بطریق کو اور اس کے جانشینوں اور ماتحت اسقفوں کو قدیم اختیارات جو حکومت سابقہ میں ان کو حاصل تھے دیئے گئے، اور جو ذریعے ان کی آمدنی کے تھے وہ بحال ہوئے، اور جن قواعد سے وہ مستثنیٰ تھے ان سے بدستور مستثنیٰ کیے گئے، گنادیوس کو جو ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریق ہوا سلطان نے اپنے ہاتھ سے وہ عصا عنایت فرمایا جو اس کے منصب کا نشان تھا، اور ایک خریطہ جسمیں ایک ہزار اشرفیاں تھیں اور ایک گھوڑا جس پر بہت تکلف کا سامان تھا اس کو دیا، اور اجازت دی کہ وہ اپنے قدیم سامان جلوس کے ساتھ شہر میں سوار ہو کر دورہ کرے، ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا

کہ کلیسا کے سب سے بڑے افسر کی وہی عزت اور وقعت قائم رکھی جو اُس کو عیسائی شہنشاہانِ روم کے وقت میں حاصل تھی بلکہ عدالت کے وسیع اختیارات بھی اس کو دیئے گئے، بطریق قسطنطینہ کی عدالت ایسے کل مقدمات کا جسمیں فریقین مسیحی المذہب ہوں فیصلہ کرتی تھی، جرمانہ کرنے اور مجرموں کو قید کی سزا دینے کے اختیارات جس کے لئے علیحدہ قیدخانے بنے ہوئے تھے، اور خاص صورتوں میں سزائے موت کے حکم دینے کا بھی اختیار اسکو حاصل تھا، وزرائے سلطنت اور ترکی حکام کو ہدایت تھی کہ اس عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کریں، سابق کی عیسوی سلطنت نے رعایا کے مذہبی امور میں طرح طرح کی دست اندازیاں کی تھیں، لیکن ترکوں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا، بطریق اور اسکی مذہبی مجلس کو پورے اختیارات مذہب اور مذہبی انتظام کے بارہ میں حاصل ہوئے، بطریق مجاز تھا کہ مذہبی مشوروں کی مجلس کو جب چاہے جمع کرے، اور اس کے ذریعہ سے عیسوی فقہ اور اصول کے تمام مسائل کو بغیر سلطنت کی مداخلت کے طے کرے، اور چونکہ ایک حیثیت سے وہ سلطانی عہدہ دار بھی تھا اس لئے اس کے اختیار میں تھا کہ مصیبت زدہ عیسائیوں کی حالت کی اصلاح اس طرح کرے کہ ناانصاف ترکی گورنروں کے کاموں سے سلطان کو اطلاع کردے، یونانی اسقف جو اضلاع میں تھے، ان کی بھی بہت عزت تھی، اور عدالت کے اختیارات ان کو اس قدر دیئے گئے تھے کہ موجودہ زمانہ تک انھوں نے اپنے علاقوں میں عیسائیوں پر ترکی حاکموں کیطرح حکومت رکھی[1]۔"

لارڈ ایورسلے کو بھی تسلیم ہے کہ محمدؐ کی یہ عظیم الشان رواداری اُس عہد کی مسیحی

---

[1] "دعوت اسلام" (ترجمہ اردو) ص ۱۶۴-۱۶۵،

یوروپین حکومتوں کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہلِ اسپین نے ان مسلمان مورس کو جنھوں نے اپنے گرفتار کرنے والوں (عیسائیوں) کا مذہب اختیار کرنے سے انکار کردیا تھا ان کے ملک سے نکالتے وقت اسکے نمونہ پر عمل نہیں کیا...... یونانیوں یا قسطنطنیہ کے دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی"[1]

قسطنطنیہ کی جدید آبادی عیسائیوں کو مذہبی آزادی کا پروانہ عطا کرنے کے بعد محمد قسطنطنیہ کو از سرِ نو آباد کرنے کی طرف متوجہ ہوا، عرصہ سے قسطنطنیہ کی آبادی برابر کم ہوتی جارہی تھی سلطان کی ترغیب اور حوصلہ افزائی سے شہر کے اکثر باشندے جو بھاگ گئے تھے واپس آگئے، سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں سے بھی بہت سے یونانی، یہودی اور ترک خاندانوں کو منتقل کرکے قسطنطنیہ میں آباد کیا گیا، اس کے علاوہ ہر نئی فتح کے بعد محمد نے مفتوحہ ممالک کے ہزاروں باشندوں کو وہاں لاکر بسایا، اس کے عہدِ حکومت کے خاتمہ پر قسطنطنیہ اپنے آخری یونانی فرماں روا کے زمانہ سے بہت زیادہ آباد اور خوش حال تھا، لیکن اب اس شہر کی خالص یونانی حیثیت فنا ہوچکی تھی اور یونانیوں کے ساتھ ترکی، البانی، بلغاری اور سروی عنصر بھی بکثرت اس کی آبادی میں شامل ہوگیا تھا،

دارالسلطنت قسطنطنیہ کی فتح عثمان کے خواب کی تعبیر تھی، یہی شہر اُس انگشتری کا نگینہ تھا، جسے عثمان اپنی انگلی میں پہننا چاہتا تھا، لیکن جو ازل سے محمد فاتح کے لئے مقدر ہوچکی تھی، محمد نے قسطنطنیہ کو سلطنت عثمانیہ کا پایہ تخت بنالیا، کسی نے اس فتح مبین کی تاریخ "بلدۂ طیبہ" (۸۵۷ھ) سے نکالی جو قرآن پاک کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔

قسطنطنیہ کے سابق محاصرے قسطنطنیہ کی بنیاد بائزنطیم (Byzantium)

---

[1] ایورسلے، ص ۸۹،

کے نام سے سنہ ۶۵۸ قبل مسیح میں پڑی تھی، اُس وقت سے لے کر اس فتح تک اُنتیس بار اس شہر کا محاصرہ ہو چکا تھا، لیکن صرف آٹھ مرتبہ دشمن کی فوج اس کے اندر داخل ہو سکی، فان ہیمر (Von Hammer) نے اپنی مستند اور ضخیم تاریخ دولت عثمانیہ میں ان تمام محاصروں کا ذکر کیا ہے[۱]، مسلمانوں نے بھی اس سے پہلے آنحضرت صلعم کی پیشین گوئی کے یقین پر گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تھا، مسند امام حنبل کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا "تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کر لو گے اور وہ فوج بھی خوب ہے اور اس کا امیر بھی خوب ہے"۔ نیز بخاری، مسلم اور مسند ابن حنبل میں مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "میری اُمت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہو گی اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا ہے"۔ چنانچہ اس سعادت اور مغفرت کے حصول کے لئے سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے سنہ ۴۸ھ (۶۶۸ء) میں ایک لشکر قسطنطنیہ کی فتح کے لئے روانہ کیا، اس مہم میں بہت سے صحابۂ کرامؓ نے بھی شرکت فرمائی، مثلاً حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت ابو الدرداءؓ وغیرہ، بعض روایتوں میں ہے کہ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت سفیان بن عوفؓ تھے، بعض کے نزدیک اس کی قیادت یزید بن معاویہؓ کے ہاتھ میں تھی، محمد فرید بک نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے سنہ ۳۴ھ (۶۵۴ء) میں حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت اور امیر معاویہؓ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا[۲]، فان ہیمر نے بھی تصریح کی ہے کہ عربوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ پہلی مرتبہ سنہ ۶۵۴ء (۳۴ھ) میں کیا اور اس فوج کے سپہ سالار امیر معاویہؓ تھے، لیکن اور تاریخوں سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی، بظاہر فرید بک کی روایت فان ہیمر ہی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، فان ہیمر نے مسلمانوں کے دوسرے

---

[۱] کریسی جلد ۱ ص ۱۲۶-۱۲۷، فٹ نوٹ، [۲] تاریخ دولت علیہ عثمانیہ ص ۶۱،

محاصرہ کی تاریخ ۶۶۶ء (۴۷ھ) درج کی ہے اور یزید بن معاویہؓ کو سالارِ عسکر لکھا ہے، فرید بک نے بھی یہی نقل کیا ہے، لیکن وہ اسے حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ بتاتے ہیں حالانکہ آپ اس محاصرہ سے سات سال قبل ۴۰ھ میں شہید ہو چکے تھے، بہرحال تیسرا محاصرہ فان ہیمر اور فرید بک کی روایت کے رو سے ۵۲ھ (۶۷۲ء) میں ہوا امیر معاویہؓ نے حضرت سفیان بن عوفؓ کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا، اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ خلافت میں مسلمہ نے ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا، پھر پانچواں حملہ خلیفہ ہشام کے عہد میں ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) ہوا، چھٹا مہدی عباسی کے زمانہ میں ۱۶۴ھ (۷۸۰ء) میں ہارون الرشید کے زیر قیادت ہوا، اور ساتواں ہارون الرشید کے سپہ سالار عبد الملک نے ۱۸۲ھ (۷۹۸ء) میں کیا، عربوں کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی اور سلطان بایزید یلدرم نے دو بار محاصرہ کیا، اور اگر تیمور اور بایزید کے درمیان تصادم نہ ہو گیا ہوتا تو ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) میں قسطنطنیہ کا ترکوں کے ہاتھ میں آجانا بظاہر یقینی تھا، بایزید کی وفات کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ موسیٰ نے یہ حوصلہ پورا کرنا چاہا لیکن شہزادہ محمد کی مصلحت بینی اور بھائیوں کی باہمی جنگ نے قسطنطنیہ کے لئے سپر کا کام دیا، آخری بار سلطان مراد ثانی نے ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کی فتح کا عزم کیا، مگر وہ شہنشاہ کی ندامت اور اظہار اطاعت سے متاثر ہو گیا، اور محاصرہ اٹھا لیا گیا،

غرض سلطان محمد ثانی سے پہلے مجاہدین اسلام گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکے تھے، لیکن کامیابی کا سہرا اسی فاتح کا منتظر تھا، اور صحابہ کرامؓ کے مقدس خون نے جس چمن زار امید کی آبیاری کی تھی اُس کے پھولوں کا تاج اسی فیروز بخت کیلئے

تیار ہو رہا تھا،

جامع ایوبؓ | فتح کے تیسرے روز حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار کا انکشاف ہوا، آپ نے ۴۸ھ کے محاصرہ کے دوران میں وفات پائی تھی اور قسطنطنیہ کی فصیل سے متصل دفن ہوئے تھے، سلطان نے وہاں ایک مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام جامع ایوبؓ ہے، اور اُس وقت سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ تخت نشینی کے موقع پر ہر سلطان اسی مسجد میں جا کر عثمان اول کی تلوار حمائل کرتا تھا، اور یہ تقریب رسم تاج پوشی کی قائم مقام سمجھی جاتی تھی،

دیگر فتوحات | اگرچہ قسطنطنیہ کی فتح محمد کا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ ہے، اور اسی بنا پر وہ فاتح کے لقب سے مشہور ہوا تاہم یہ اس کے سلسلۂ فتوحات کی محض پہلی کڑی تھی، اس کا سی سالہ عہد حکومت تمام تر ملک گیری اور توسیع سلطنت ہی میں گذرا، یہ طویل مدت اُس نے تقریباً مسلسل میدان جنگ میں صرف کی اور شاذ ہی کوئی مہم ایسی پیش آئی جس کے بعد اس کے یورپی یا ایشیائی مقبوضات میں کوئی نیا علاقہ شامل نہ ہوا،

یونان | ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں محمد نے یونان کا رخ کیا، وہاں قسطنطین کے دو بھائی دمتریس اور طامس دولت عثمانیہ کے باج گذار کی حیثیت سے علیحدہ علیحدہ حصوں پر حکمراں تھے، انھوں نے سلطان کے پہنچنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ اُس کی خدمت میں اپنے سفیر بھیج کر فرماں برداری کا عہد کیا، اور بارہ ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا،

سرویا | اس کے بعد ۸۵۸ھ ہی میں محمد سرویا کی طرف متوجہ ہوا، اور سب سے پہلے سمندریا پر حملہ کیا، جو شاہ سرویا، جارج برنیکوویچ کی قیام گاہ تھا، چند ہی دنوں میں عثمانی توپوں کی گولہ باری نے اس شہر کو کھنڈر بنا دیا، اور جارج برنیکوویچ کو بھاگنا پڑا، ہونیاڈے

یہ خبر سن کر فوراً سرویا کی مدد کے لئے روانہ ہوا، اور اُس نے ترکوں کے مقدمۃ الجیش کو جو فیروز بے کی سرکردگی میں تھا شکست دی، لیکن اہل سرویا اپنے ملک میں ہنگری کے اقتدار کو ناپسند کرتے تھے، کلیسائے رومہ کی مذہبی تعدیوں نے سرویا کے باشندوں کو اس قدر برگشتہ کر دیا تھا کہ وہ علانیہ مسلمان ترکوں کو کیتھولک عیسائیوں پر ترجیح دیتے تھے اور عثمانی تسلط کو ہنگری کے اقتدار سے بدرجہا بہتر خیال کرتے تھے، چنانچہ اسی وجہ سے برینکو ویچ نے تیس ہزار دوکات سالانہ خراج کے وعدہ پر سلطان سے صلح کر لی،

محاصرۂ بلغراد

دوسرے سال محمد پھر سرویا میں داخل ہوا، اور جنوب کی طرف سے بڑھتا ہوا بغیر کسی مزاحمت کے بلغراد تک پہنچ گیا، اس کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر، اور تین سو توپیں تھیں، یہ مہم دراصل بلغراد کی فتح کے لئے تھی، جو اگرچہ سرویا کی شمالی سرحد پر واقع تھا، لیکن اُس وقت ہنگری کے قبضہ میں تھا، اور گویا ہنگری کا دروازہ تھا، اس کی فتح سے ہنگری کی فتح کا راستہ کھل جاتا، اور پھر آسٹریا تک عثمانیوں کو روکنا مشکل ہو جاتا، محمد نے بلغراد پہنچکر فوراً اُس کا محاصرہ کر لیا، بری فوج کے علاوہ شہر کی شمالی سمت میں عثمانی بیڑا دریائے ڈینوب پر قابض تھا، قسطنطنیہ کی فتح نے سارے یورپ کو خوفزدہ کر دیا تھا، جب محمد نے بلغراد کا محاصرہ کیا تو یورپ کے تمام ملکوں میں ایک ہلچل مچ گئی، اور پوپ نے صلیبی جنگ کا اعلان کر کے اپنے نمائندہ جان کاپسٹران (John Capistran) کو ساٹھ ہزار پرجوش مسیحی مجاہدوں کے ساتھ ہنگری کی مدد کے لئے روانہ کیا، ہونیاڈے نے مدافعت میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، آٹھ روز کی گولہ باری کے بعد ۲۱ جولائی ۱۴۵۶ء کو سلطان نے ایک

عام حملہ کا حکم دیا، اور ترک شہر کے ایک حصہ میں داخل ہو گئے، لیکن ابھی وہ اس پر پوری طرح قابض نہ ہو سکے تھے کہ عیسائیوں کے ایک زبردست حملہ نے اُن کو پیچھے ہٹا دیا اور پھر دوسرے حملہ میں عثمانی دستے بالکل منتشر ہو گئے، یہ حال دیکھ کر محمد خود دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا، لیکن اسکی حیرت انگیز شجاعت اُس روز ترکوں کے قدم کو نہ روک سکی، اور اُسے بھی زخمی ہو کر میدانِ جنگ چھوڑنا پڑا، اس معرکہ میں پچیس ہزار ترک کام آئے اور ان کے پورے توپ خانہ پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا، محاصرہ اٹھا لیا گیا، اور بلغراد کی فتح جو ہنگری اور ویانا کے حملوں کا مقدمہ تھی، پچاس سال کے لئے ملتوی ہو گئی، ہونیاڈے اس جنگ میں اس قدر زخمی ہو گیا تھا کہ بیس ہی روز کے بعد مر گیا، سلطان کو جب اس کی وفات کی اطلاع ہوئی تو اُس نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ یورپ کا سب سے بڑا سپہ سالار جاتا رہا، دو مہینے بعد جان کاپسٹران کا بھی جس کی عمر ستر سال کی ہو چکی تھی انتقال ہو گیا،

سرویا پر مکمل قبضہ بلغراد کا محاصرہ اٹھا لینے کے بعد محمد ادرنہ کو واپس گیا اور جارج برنکووچ پھر سرویا پر قابض ہوا، لیکن اسکی عمر نوّے سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اور تھوڑے ہی دنوں بعد ۸۶۱ھ (۱۴۵۷ء) میں اس کا انتقال ہو گیا، سرویا کی آزادی بھی اس کے بعد ڈیڑھ ہی دو سال قائم رہی، ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں یہ ملک باقاعدہ طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، ہونیاڈے کی وفات کے بعد صدر اعظم محمود پاشا نے سرویا میں داخل ہو کر دو سال کے اندر پورے ملک کو فتح کر لیا تاہم یہ ممکن تھا کہ سلطان پھر خراج قبول کر کے سرویا کی خود مختاری بدستور قائم رہنے دیتا، لیکن جارج برنکووچ کے مرنے پر جو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اُن سے ملک کی آزادی کا ہمیشہ کے لئے

خاتمہ ہوگیا، جارج نے حکومت کا انتظام مشترکہ طور پر اپنی بیوہ اور تین لڑکوں کے سپرد کیا تھا، ان میں بہت جلد جھگڑے شروع ہوگئے، سب سے چھوٹے لڑکے لازار نے اپنی ماں کو زہر دیدیا، اور بھائیوں کو حکومت سے نکال دیا، اب وہ سرویا کا تنہا فرمانروا تھا، اُس نے بیس ہزار طلائی سکے سالانہ خراج کا وعدہ کرکے سلطان کی سرپرستی بھی حاصل کرلی لیکن دوسرے ہی سال اس کا انتقال ہوگیا، اب محمد نے یہ طے کرلیا کہ سرویا کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنالے، ہونیاڈے مرچکا تھا، اہل سرویا میں مزاحمت کی ہمت نہ تھی، پچھلے ستر سال کی لڑائیوں کے بعد وہ ہر دام پر امن وصلح کے لئے تیار تھے، لازار کی بیوہ ہیلینا نے اپنے ملک کی سیاسی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے اسے کلیسائے رومہ سے وابستہ کردینا چاہا، لیکن سرویا والوں نے سخت مخالفت کی اور علانیہ کہدیا کہ وہ ترکوں کو رومن کیتھولک عیسائیوں پر ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ امرائے سرویا نے صدر اعظم محمود پاشا کے بھائی کو بلاکر اپنا سردار مقرر کیا، اور جب ہیلینا نے اسے قید میں ڈالدیا تو انھوں نے سلطان سے مدد کی درخواست کی، سمندریا نے اپنے پھاٹک عثمانی فوجوں کے لئے کھول دیئے، جس کی تقلید اور شہروں نے بھی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں سرویا کا وجود بحیثیت ایک مستقل مملکت کے فنا ہوگیا۔[1]

بوسنیا کی فتح کلیسائے رومہ کے مظالم سے بوسنیا کے باشندے اہل سرویا سے بھی زیادہ عاجز تھے، اُنھوں نے بھی ترکوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھا، صدیوں سے وہاں لاطینی اور یونانی کلیساؤں کے معرکے گرم تھے، جن سے پریشان ہوکر

۱؎ "بلقان" از ملر ص ۲۹۶۔

بہت سے لوگ ان دونوں مسلکوں سے علٰحدہ ہوگئے تھے، اور اپنی عافیت کے لئے ایک نیا مذہب اختیار کر لیا تھا، جو "بدعت بوگومل" (Bogumil Heresy) کے نام سے مشہور ہے لیکن اب اس جدید فرقہ کے لوگوں پر دوہرے مظالم ہونے لگے وہ کبھی یونانی کلیسا کی شدید تعدیوں کا شکار ہوتے اور کبھی لاطینی کلیسا کی، یہ مظالم دیکھ کر اکثر اہل بوسنیا کو اسلام ہی کے دامن رحمت میں پناہ نظر آئی[1]، محمود پاشا کی فوج شاہ بوسنیا کی تنبیہ کے لئے جس نے خراج دینا روک دیا تھا، فاتحانہ بڑھتی آرہی تھی، بہت سے قلعوں نے ترکوں کا خیر مقدم کیا، بادشاہ میں جب مقابلہ کی طاقت نہ رہی تو اس نے جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیئے، مگر محمد نے خلاف معاہدہ اس کو اور اس کے لڑکے کو قتل کرادیا، یوں بوسنیا بھی ۸۶۷ھ (۱۴۶۲ء) میں سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بن گیا، اس کے نوجوانوں میں سے تیس ہزار ینی چری فوج کے لئے چن لئے گئے اور اس کے اکثر امرار مشرف باسلام ہوئے،

موریا پر قبضہ موریا میں خاندان پلیولوگس کی حکومت کا بھی بتدریج خاتمہ ہو رہا تھا، طامس اور دمتریس نے خراج کے وعدہ پر اپنی خودمختاری قائم رکھی تھی لیکن جب بلغراد کی مہم میں سلطان کو ناکامی ہوئی اور یورپ کے مذہبی جوش نے ترکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو ایک لمحہ کے لئے روک دیا تو موریا کے فرماں رواؤں کو بھی دولت عثمانیہ کی سیادت کا بار محسوس ہونے لگا، پوپ نے بھی ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا چنانچہ جب پوپ کا جنگی بیڑا بحر ایجین میں نمودار ہوا تو طامس نے ہمت کرکے خراج کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا، اس سے قبل بھی تین سال سے باوجود متعدد تقاضوں کے سلطان کو موریا سے خراج کی کوئی رقم وصول نہیں ہوئی تھی لیکن ابھی تک علانیہ

[1] [illegible] مطبوعہ لندن (۱۹۳۱ء) ص ۲۶۲،

انکار کی نوبت نہیں آئی تھی، اسی لئے محمد نے کسی قسم کی سختی بھی نہیں کی تھی، اب یہ انکار گویا بغاوت کا اعلان تھا، چنانچہ وہ ۸۶۲ھ (مئی ۱۴۵۸ء) میں ایک بڑی فوج لے کر خود موریا آیا، اور متعدد قلعوں کو فتح کرتا ہوا پتراس پہونچا جو طامس کا مستقر تھا، پتراس کے باشندے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، قلعہ کے فوجی دستے نے بھی مزاحمت کی جرأت نہ کی، محمد نے پتراس کے باشندوں کے ساتھ بڑی فیاضی اور کشادہ دلی کا برتاؤ کیا، اس کے بعد کورنتھ فتح ہوا، کورنتھ کے باشندوں کے ساتھ بھی اُس نے ویسی ہی مراعات کی اور انھیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا، لیکن وہاں کے بہت سے لوگوں کو اس نے قسطنطنیہ اور اس کے مضافات میں لیجا کر آباد کیا، یہ لوگ کاریگر اور کاشتکار تھے، طامس اور دمتریس کو اب صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، محمد نے ان کی درخواست قبول کی، اور صلحنامہ کے تکملہ کے بعد وہ موریا سے چلا گیا، لیکن اُس کے جاتے ہی ان بھائیوں نے پھر شورش برپا کرنی شروع کی[۱]، محمد کو مجبوراً لوٹنا پڑا، اب کی بار اُس نے تہیہ کر لیا کہ موریا کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنا کر رہے گا، دمتریس نے اپنے کو مسترا (Maystra) کے قلعہ میں بند کر لیا، اور مدافعت کی کوشش کی، مگر بہت جلد اسے ہتھیار ڈال کر قلعہ ترکوں کے سپرد کر دینا پڑا، محمد نے اس کے اخراجات کے لئے تھریس کا ایک شہر اور اس کے قریب امبروس (Imbros) لمنوس (Lemnos) اور ساموتھریس (Samothrace) کے جزیرے دیکر اُسے اور نہ بھیجدیا، کچھ دنوں کے بعد یہ جاگیریں بھی ضبط کر لی گئیں اور محمد نے ان کے بجائے پچاس ہزار ایسپر (Asper) بطور پنشن کے مقرر کر دیئے[۲] لیکن دمتریس نے آخر میں

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مقالہ موریا، ص ۵۷۳ [۲] گبن جلد ۷ ص ۵۰۴۔

رہبانیت اختیار کر لی اور ۸۷۵ھ (۱۴۷۰ء) میں اُس کا انتقال ہوا، دمتریس کے بعد محمد طامس کی طرف متوجہ ہوا اور اُس کے علاقہ کے شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرنا شروع کیا، طامس نے اپنے مقبوضات کو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی اور اپنے خاندان کیساتھ جہاز پر سوار ہو کر کارفو چلا گیا، لیکن تین ہی مہینے کے بعد اُس نے کارفو کو بھی خیر باد کہا، اور رومہ پہونچ کر پوپ کے دامن میں پناہ لی، وہیں ۸۷۰ھ (۱۲ مئی ۱۴۶۵ء) میں اس کا انتقال ہو گیا، محمد نے موریا کے تمام علاقوں کو فتح کر کے ان پر قبضہ کر لیا، ۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) میں موریا بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ ہو گیا،

کرمانیہ اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک کے بعض حصوں پر بھی جو ابھی تک سلطنت عثمانیہ میں شامل نہ تھے قبضہ کیا جا رہا تھا، کرمانیہ اور دولت عثمانیہ کی عداوت قدیم سے چلی آ رہی تھی، محمد کی تخت نشینی کے چند دنوں بعد کرمانیہ کے امیر ابراہیم نے خراج ادا کرنے کا معاہدہ کر کے سلطان سے صلح کر لی تھی، اور وہ آخر دم تک اس معاہدہ پر قائم رہا، اسکے انتقال کے بعد اُس کے لڑکوں میں ریاست کے لئے جنگ چھڑ گئی، محمد نے ان سب کو برطرف کر کے خود کرمانیہ پر قبضہ کر لیا، اور اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا،

طرابزون اور سینوپ ایشیائے کوچک میں سینوپ اور طرابزون پر اب تک دولت عثمانیہ کا قبضہ نہ ہوا تھا، محمد نے پہلے سینوپ کے مضبوط شہر پر حملہ کیا، اسمٰعیل بیگ امیر سینوپ کی چار سو توپیں اور دس بارہ ہزار سپاہی کچھ دیر بھی مقابلہ نہ کر سکے، اور اس نے شہر سلطان کے حوالہ کر دیا، اس کے بعد محمد طرابزون کی طرف متوجہ ہوا، طرابزون کا شہر اور ملحق علاقے قدیم بازنطینی سلطنت کا جزو تھے، ۶۰۱ھ (۱۲۰۴ء) کے بعد سے جب کہ قسطنطنیہ پر مجاہدین صلیبی کا قبضہ ہو گیا طرابزون نے ایک جداگانہ مملکت کی شکل اختیار

کر لی تھی، ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں محمد نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اب ایشیائے کوچک کے تمام علاقے سلطنت عثمانیہ کے دائرے میں آگئے، بحر اسود کے ساحل پر جنوا کے جو مقبوضات تھے وہ بھی فتح کر لئے گئے،

یونانی مجمع الجزائر محمد نے یونانی مجمع الجزائر کے بہت سے جزیروں پر بھی جو وینس اور جنوا کے زیر حکومت تھے حملہ کر کے انھیں فتح کر لیا، ان میں سے لسبوس (Lesbos) لمنوس (Lemnos) اور سیفالونیا (Cephalonia) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جزیرہ یوبیا (Euboea) کا بھی یہی حشر ہوا، یہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا جس کے اور مقبوضات بھی جو موریا کے ساحل پر واقع تھے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لئے گئے،

کریمیا قسطنطنیہ کے بعد محمد کا سب سے اہم کارنامہ کریمیا کی فتح تھی جس کا سہرا دولت عثمانیہ کے مشہور سپہ سالار صدر اعظم احمد کدک پاشا کے سر ہے، کریمیا کے حملہ کے دو خاص اسباب تھے، ایک سبب تو یہ تھا کہ اس زمانہ میں جنوا سے دولت علیہ کے تعلقات بہت خراب ہو گئے تھے، اور کریمیا میں کافہ کا مضبوط شہر جنوا کے قبضہ میں تھا، دوسرا سبب یہ ہوا کہ خوو خان کریمیا نے جسے اُس کے باغی بھائیوں نے تخت سے اتار دیا تھا محمد سے مدد کی درخواست کی، لیکن ان اسباب کے علاوہ کریمیا کا محل وقوع بھی قسطنطنیہ کے تخت نشینوں کے لئے حد درجہ اہم تھا، اور محمد جیسے بیدار مغز سلطان کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ عثمانی مقبوضات کے تحفظ کے لئے کریمیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینا کس حد تک ضروری ہے، چنانچہ ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) میں احمد کدک نے جنگی بیڑے اور چالیس ہزار فوج کے ساتھ پہلے کافہ پر حملہ کیا، اس شہر نے جو اپنی دولت اور

مضبوطی کے لحاظ سے قسطنطنیہ کوچک کہلاتا تھا، چار روز میں ہتھیار ڈالدیئے، بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا، چالیس ہزار باشندے قسطنطنیہ کو منتقل کردیئے گئے، اور ڈیڑھ ہزار نوجوان جنوبی امرا ینی چری فوج میں داخل کئے گئے، پھر سرعت کے ساتھ پورے ملک پر ترکوں کا قبضہ ہوگیا اور کریمیا کی آزادی ختم ہوگئی، اس کے بعد تین سو برس تک کریمیا کے خان دولت عثمانیہ کے محکوم رہے ہیں۔

ولاچیا اسی زمانہ میں ولاچیا کے مظلوموں کی دردناک چیخیں قسطنطنیہ پہونچیں، جنگ کسووا (۱۳۸۹ء) کے بعد ولاچیا نے دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کرلی تھی، سلطان محمد ثانی کے وقت میں اس ریاست کا امیر ولاد چہارم (Vlad IV) تھا اس نے سلطان کے خلاف بغاوت کردی اور عثمانی تاجروں کو جو ولاچیا میں سکونت پذیر تھے، سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کرادیا، اس کا دست عقوبت خود اپنے ملک والوں پر بھی دراز تھا، اس کے مظالم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ "ڈراکول" (Drakul) یعنی شیطان کے لقب سے مشہور تھا، اسے لوگوں کے قتل کرنے میں خاص لطف آتا تھا، اور قتل کے عجیب وغریب طریقے ایجاد کرتا رہتا تھا، لیکن سب سے زیادہ لطف اسے جسم میں میخیں ٹھونک کر قتل کرانے میں آتا تھا، اکثر کئی کئی سو آدمیوں کو ایک ساتھ اس طریقہ سے قتل کراتا اور انکی تڑپتی ہوئی لاشوں سے اسکی شیطانی روح کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی تھی، ہسٹوریل لکھتا ہے کہ اس کے معاصر بھی جنمیں سے کسی کا دامن مظالم کے دھبوں سے پاک نہ تھا، اس کی تعذیب کے انوکھے طریقوں سے ہیبت زدہ تھے اور اسکو ولاد امپیلر (Vlad the Impaler) (یعنی میخیں ٹھونکوا کر قتل کرنے والا) کہتے تھے، غرض جب اس کے مظالم کی فریاد قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان ایک زبردست فوج لے کر اسکی تنبیہ کے لئے روانہ ہوا، لیکن قبل اس کے کہ وہ حملہ آور ہو

ولادنے اُس کی خدمت میں ایک وفد بھیجا، اور اُس کی سیادت قبول کر کے دس ہزار دوکات سالانہ خراج ادا کرنے کا عہد کیا، اور یہ درخواست کی کہ سلطان کی جانب سے اس معاہدہ کی از سرِ نو تصدیق کر دی جائے، جو ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں بایزید یلدرم اور امیر ولاچیا کے درمیان ہوا تھا۔ محمد نے اسے منظور کیا، اور واپس چلا آیا، لیکن یہ معاہدہ ولاد کا محض ایک وقتی حیلہ تھا، وہ اس بہانہ سے سلطان کو ٹال کر ہنگری کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا، چنانچہ عثمانی فوجوں کے واپس ہوتے ہی اُس نے ہنگری سے اتحاد کر کے پھر اپنی سابق معاندانہ روش اختیار کر لی، محمد کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اُس نے حالات کی تحقیق کے لئے اپنے نمائندے ولاچیا میں بھیجے، ولاد نے ان نمائندوں کو قتل کرا دیا، اس کے بعد اُس نے بلغاریا کے علاقوں میں جو دولت علیہ کے ماتحت تھے، لوٹ مار شروع کر دی اور بے حد مظالم کئے، وہ بلغاریا کے پچیس ہزار باشندوں کو بھی پکڑ لایا، یہ سن کر محمد نے پھر اُس کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے حدود سے متجاوز نہ ہو، اور ان قیدیوں کو رہا کر دے، ولاد نے اس کے جواب میں سلطانی ایلچیوں کے سروں میں میخیں ٹھونکوا کر انھیں فوراً ہلاک کر دیا، اب محمد کے لئے حملہ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، وہ ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ اس ظالم کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا، ولاچیا کے شہر یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے، یہاں تک کہ پایۂ تخت بخارسٹ پر بھی عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا، لیکن ولاد ہاتھ نہ آیا، اس نے بھاگ کر شاہِ ہنگری کے ہاں پناہ لی، محمد جب بخارسٹ پہونچا، تو اس نے وہاں اُن قیدیوں کی لاشیں دیکھیں، جن کو ولاد بلغاریا سے پکڑ لایا تھا، ان لاشوں کی تعداد بیس ہزار تھی، ان میں بچے اور عورتیں بھی تھیں، بہر حال محمد نے ولاد کو معزول کر کے اس کے بھائی رادول (Radul) کو جو اس کا معتمد علیہ

تھا، اور جسکی تربیت بھی سلطان ہی کے زیرنگرانی ہوئی تھی، ولاچیا کا امیر مقرر کیا، اور ولاد نے خون کی جو نہر جاری کر رکھی تھی وہ کسی طرح خشک ہوئی، ولاچیا پھر سلطنت عثمانیہ کی ایک اطاعت گذار ریاست ہوگئی، محمد نے اسے مکمل طور پر اپنی سلطنت میں ضم کر لینے پر اصرار نہیں کیا، بلکہ صرف اطاعت اور خراج پر قناعت کی،

البانیا اور ہرزیگووینا البانیا ابھی تک زیر نہ ہو سکا تھا، اسکندر بک محمد فاتح کا مقابلہ بھی اسی طرح کرتا رہا جس طرح اس نے مراد ثانی کا کیا تھا، محمد چاہتا تھا کہ اگر اسکندر بک خراج دینا منظور کرے تو لڑائی ختم کر دی جائے، مگر اس نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا، عثمانی فوجیں البانیا پر مکمل قبضہ نہ پا سکیں اور آخر کار ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں سلطان نے اسکندر بک کو البانیا اور اپائرس کا فرماں روا تسلیم کر لیا، چھ سال کے بعد اسکندر بک کا انتقال ہوگیا، اب البانیا کی فتح میں کوئی دشواری باقی نہ رہ گئی تھی، محمد نے آسانی کے ساتھ اسے مسخر کر لیا، اور البانیا اور اپائرس کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، اس کے بعد ہرزیگووینا کا علاقہ بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا،

وینس البانیا کی فتح کے بعد اٹلی ترکوں کی زد میں آیا، جس طرح ہونیاڈے نے شمال میں عثمانی فوجوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو چند دنوں تک روک رکھا تھا، اسی طرح اسکندر بک بھی مغرب میں ان کی راہ روکے ہوئے کھڑا تھا، اس کے مرنے کے بعد ہی اٹلی کا راستہ کھل گیا، اور وینس پر حملہ کا مسئلہ زیر غور آگیا، جمہوریہ وینس نے فتح قسطنطنیہ کے دوسرے ہی سال سلطان سے بہت صلح کی درخواست کی تھی، اور اس صلحنامہ کے ذریعہ محمد نے تقریباً وہ تمام تجارتی مراعات جو وینس کو بازنطینی شہنشاہوں کے عہد میں حاصل تھیں اسے عطا کر دی تھیں، لیکن اسکندر بک کی کامیابیوں نے وینس کے اندر بھی دولت عثمانیہ کے

مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا، اور اس کی نیاز مندی جاتی رہی، وینس کو اپنی بحری طاقت کا غرور تھا، دوسری طرف سلطنتِ عثمانیہ کو بھی بلقانی ریاستوں پر کامل اقتدار رکھنے کے لئے بحر ایڈریاٹک اور بحر ایجین میں اپنے جنگی جہازوں کی تعداد بڑھانی ضروری تھی، البانیا کی تسخیر کے بعد بحر ایڈریاٹک کے تمام ساحلی علاقے اس کے قبضہ میں آگئے تھے، اور اب وینس اور سلطنتِ عثمانیہ کی جنگ ناگزیر ہوگئی تھی، لڑائی سنہ ۸۶۸ھ (سنہ ۱۴۶۳ء) میں شروع ہوئی اور سولہ سال تک جاری رہی، یکے بعد دیگرے وینس کے ساحلی مقبوضات ترکوں کے قبضہ میں آتے گئے، یہاں تک کہ جزیرہ یوبیا (نگروپونٹ) بھی جمہوریہ کے ہاتھ سے نکل گیا، سنہ ۸۸۲ھ (سنہ ۱۴۷۷ء) میں ایک زبردست ترکی فوج فریولی (Friuli) کے علاقہ میں داخل ہوئی جو بحر ایڈریاٹک کی شمالی حد پر واقع تھا، اور اس پر تسلط قائم کرنے کے بعد وینس کی طرف بڑھی، وینس نے مزاحمت کے لئے فوج روانہ کی، لیکن عمر پاشا اسے شکست دیتا ہوا آگے بڑھ گیا، اور دریائے پیاوے (Piave) کے ساحل تک کے تمام زرخیز علاقوں پر قابض ہوگیا، جمہوریہ کے لئے اب صلح کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، اگر اب بھی اسے کچھ تامل ہوتا تو اس کے بقیہ مقبوضات بھی نکل جاتے اور خود وینس کے شہر پر عثمانی علم نصب ہوجاتا، سنہ ۸۸۴ھ (سنہ ۱۴۷۹ء) میں صلحنامہ پر دستخط ہوگئے، وینس نے سالانہ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کیا اور سلطان نے اُسے دوبارہ مشرق میں تجارت کرنے کی اجازت دی،

روڈس کی ناکام مہم

وینس کی بحری قوت ٹوٹ چکی تھی لیکن بحر ایجین میں روڈس کا جزیرہ عثمانی جہازوں کی راہ کا کانٹا تھا، اس جزیرہ پر ڈیڑھ سو برس سے یروشلم کے مبارزین سینٹ جان کی حکومت تھی جو آسانی کے ساتھ عثمانی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، محمد نے روڈس کی فتح کو ضروری خیال کرکے سنہ ۸۸۵ھ (سنہ ۱۴۸۰ء) میں مسیح پاشا کو اس مہم پر

روانہ کیا، مسیح پاشا نے جزیرہ پر اتر کر متعدد مقامات فتح کئے، اور پھر خود شہر روڈس کا محاصرہ کر لیا، عیسائی مدافعت کے لئے پوری طرح تیار تھے اور محاصرہ طول کھینچ گیا، بالآخر ۱۸ ربیع الاول ۸۸۵ھ (۲۸ جولائی ۱۴۸۰ء) کو ترکوں نے ایک عام حملہ کیا، یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ عیسائی اپنی انتہائی شجاعت کے باوجود اسے روک نہ سکے اور بعض ترکوں نے دیوار پر چڑھ کر ہلالی جھنڈا گاڑ دیا، لیکن عین اس وقت جب وہ شہر میں داخل ہوا چاہتے تھے مسیح پاشا کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ تمام مالِ غنیمت سلطان کے حق میں محفوظ سمجھا جائیگا، اس اعلان سے سپاہیوں میں سخت برہمی اور بیزاری پیدا ہو گئی اور جو ابھی تک باہر تھے، انھوں نے اپنی ساتھیوں کی مدد کے لئے جو پہلے پہنچ چکے تھے اندر جانے سے انکار کر دیا، عیسائیوں نے عثمانی فوج کی یہ حالت دیکھ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ جان توڑ حملہ کیا اور اُن ترکوں کو جو شہر میں داخل ہو گئے تھے شکست دیکر باہر نکال دیا، مسیح پاشا کو اپنی غلطی کا احساس اُس وقت ہوا جب کہ اس کی تلافی ناممکن تھی، اُسے محاصرہ اٹھا لینا پڑا اور روڈس کی تسخیر نصف صدی کے لئے ملتوی ہو گئی،

اوٹرانٹو کی فتح

لیکن جس روز مسیح پاشا کو روڈس میں ہزیمت اٹھانی پڑی، اُسی روز احمد کدک پاشا فاتح کریمیا نے سرزمین اٹلی میں قدم رکھا جہاں اُس وقت تک کوئی عثمانی سپاہی نہ پہونچا تھا، اٹلی کی فتح کے لئے اوٹرانٹو پر قبضہ کرنا ضروری تھا، کیونکہ یہ شہر اپنے موقع کے لحاظ سے گویا اٹلی کا دروازہ تھا، احمد پاشا نے فوراً خشکی اور سمندر دونوں جانب سے اس پر حملہ کیا، اہلِ شہر نے مدافعت میں بڑی سرگرمی دکھائی لیکن وہ صرف چند روز مقابلہ کر سکے، ۴ جمادی الثانی ۸۸۵ھ (۱۱ اگست ۱۴۸۰ء) کو عثمانی فوج فاتحانہ اوٹرانٹو میں داخل ہو گئی،

فاتح کی وفات

اٹرانٹو جیسے مضبوط شہر اور بندرگاہ پر قابض ہونے کے بعد محمد کے لئے اٹلی کی فتح کا راستہ کھل گیا، دوسرے سال وہ کسی جدید مہم کے لئے فوجیں اکٹھا کر رہا تھا اور خیال تھا کہ اوٹرانٹو کے بعد غالباً روما پر حملہ ہونے والا ہے لیکن دفعۃً ۴ ربیع الاول ۸۸۶ھ مطابق ۳ مئی ۱۴۸۱ء کو اکیاون سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا، فاتح کی موت سے یورپ کی جان میں جان آئی، تجہیز و تکفین اس مشہور مسجد میں ہوئی جسے اس نے قسطنطنیہ میں تعمیر کرایا تھا، وہ پہلا سلطان تھا جو اس نئے دارالسلطنت میں دفن ہوا۔

فوجی قابلیت

سلطان محمد ثانی کا عہد حکومت شروع سے آخر تک میدان جنگ میں گذرا گیا، روڈس اور اوٹرانٹو کی مہموں کے علاوہ ہر جنگ میں فوج کی کمان اُسی کے ہاتھ میں تھی، اور بلغراد کے علاوہ کسی معرکہ میں اسے شکست نہیں ہوئی، فاتح کا لقب اسے قسطنطنیہ کی فتح پر حاصل ہوگیا تھا لیکن اس کی ہر جنگ اس لقب کی تصدیق کرتی ہے، ایک سپہ سالار کی حیثیت سے وہ مراد ثانی پر بھی فوقیت لیگیا تھا، فوجی قابلیت میں اُس کا کوئی افسر اس کا ہم پلہ نہ تھا، حالانکہ احمد کدک پاشا، محمود پاشا اور بعض دوسرے عثمانی سپہ سالاروں کا شمار اس وقت دنیا کے بہترین جنرلوں میں ہوتا تھا، وہ اپنے ارادوں کو بالکل راز میں رکھتا اور اُس کے کسی کمانڈر کو بھی پہلے سے معلوم نہ ہوتا کہ حملہ کس سمت ہونیوالا ہے ایک بار جب کسی مہم کے لئے فوجیں جمع ہونے لگیں اور اس کے خاص افسروں میں سے ایک نے محمد سے پوچھا کہ دراصل کون سا شہر یا ملک پیش نظر ہے، تو اس نے سختی سے جواب دیا کہ "اگر میری داڑھی کے ایک بال کو بھی اس کی اطلاع ہو جائے تو میں اسے توڑ کر آگ میں ڈال دوں"۔ وہ جنگ کی کامیابی کے لئے رازداری اور سرعت عمل کو ضروری شرطیں خیال کرتا تھا، اور اس نے ہمیشہ اسی اصول کی پابندی کی، جب وہ

کسی حملہ کا عزم کر لیتا تو اسے پوری تیاری اور انتہائی شدت کے ساتھ انجام تک پہنچاتا، اسی وجہ سے عموماً اس کی مہمیں تھوڑے عرصہ میں سر ہو جاتی تھیں، البتہ وینس کے ساتھ لڑائیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ سولہ برس تک قائم رہا، اسی طرح البانیا کی فتح میں بھی کئی برس لگ گئے، لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں،

علوم و فنون کی سرپرستی: محمد کی عظمت فتوحات کے وسیع دائرہ میں محدود نہ تھی، اُسکی خداداد قابلیت کے جوہر رزم و بزم دونوں جگہ یکساں طور پر نمایاں تھے، بہترین اساتذہ کے زیر نگرانی اُس نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ علوم و فنون کی تحصیل کی تھی، اپنی مادری زبان کے علاوہ عربی، فارسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی زبانوں پر بھی قدرت رکھتا تھا، دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ سے اُسے پوری واقفیت تھی، وہ ایک بلند پایہ شاعر اور شعر و سخن کا بہت بڑا سرپرست بھی تھا، اُسکے دربار سے تیس عثمانی شعراء کو وظیفے ملتے تھے، اور وہ ہر سال گراں قدر تحائف خواجہ جہاں (ہندوستان) اور مولانا جامی (ایران) کی خدمت میں بھی بھیجا کرتا تھا[1]، اس کی محفلیں علماء اور اہل کمال سے معمور رہا کرتی تھیں، اُس نے قسطنطنیہ اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں نہایت کثرت سے مسجدیں، ہسپتال، مکاتب اور مدارس قائم کئے، اور ان کے اخراجات کے لئے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیں، اس کے تعلیمی نظام کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ آگے آتا ہے، اُس کی علم دوستی کا اثر اُس کے اعلیٰ عہدہ داروں پر بھی پڑتا تھا، چنانچہ محمود پاشا نے جو شاعر بھی تھا، کئی مدرسے قائم کئے، مشرق و مغرب کے ناموروں کے کارنامے اُسکے اس مطالعہ میں رہا کرتے تھے، گبن آخری بازنطینی مورخ فرانزا (Phranza)

[1] "ترکی" از لین پول ص ۱۰۲،

کے حوالہ سے جو محمد فاتح کا ہمعصر تھا اور فتح قسطنطنیہ میں گرفتار بھی ہو گیا تھا، لکھتا ہو کہ سلطان سکندر، اغسطس قسطنطین اور تھیوڈوسیس کے سوانح حیات اور کارنامے بڑے انہماک سے پڑھا کرتا تھا، اُس کے حکم سے یونانی سوانح نگار پلوٹارک (Plutarch) کی مشہور و معروف تالیف جو مشاہیر یونان و روما کے تذکروں پر مشتمل ہے ترکی زبان میں ترجمہ کی گئی[1]،

اخلاق و سیرت | لیکن علم و مذہب کا جو اثر تہذیب نفس پر پڑنا چاہیئے تھا وہ کما حقہٗ ظاہر ہوا، اور محمد کی بیباک فطرت بعض اخلاقی پابندیوں سے عموماً آزاد رہی، وہی مغربی مورخین جو مراد ثانی کے مکارم اخلاق اور شریفانہ اوصاف کے مداح ہیں اور اُس کے سی سالہ عہد حکومت کے ایک واقعہ کو بھی قابل الزام نہیں ٹھہراتے محمد ثانی کی سنگدلی بے اعتمادی، اور عیاشی کی داستان بے تکلف بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ خفیف سے اشتعال پر وہ قتل کا حکم دیدیتا تھا، یہانتک کہ بڑے بڑے پاشاؤں اور وزیروں کو بھی اپنی جان کی طرف سے کبھی اطمینان نہیں رہتا تھا، چنانچہ اسکے عہد میں دو صدر اعظم بغیر کسی سابق تنبیہ یا اطلاع کے اس کے حکم سے دفعتہً قتل کر دیئے گئے، لین پول کا بیان ہے کہ معاہدوں کے توڑنے میں وہ اہل ہنگری کا حریف تھا، ہتیوپل کہتا ہے کہ اپنے عیسائی ہمعصروں کی طرح محمد اس مفید اصول کا قائل تھا کہ جو عہد کفار کے ساتھ باندھا جائے اس کی پابندی ضروری نہیں، دوسرے مغربی مورخین نے بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کئے ہیں اور ان کی تائید واقعات سے کی ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن معاصرین سے محمد کا سابقہ تھا، اُن کا طرز عمل اس باب میں کیا تھا، لارڈ ایورسلے محمد کی سنگدلی اور نقض عہد کے

---

[1] گبن جلد ۴ صفحہ ۴۷۵، فٹ نوٹ،

متعدد واقعات بیان کرنے بعد آخر میں لکھتا ہے:-

"محمد کے مظالم اور غداریوں پر ایک بلند معیار کے لحاظ سے رائے قائم کرنا شاید قرین انصاف نہیں ہے، اُس کے دشمن یعنی ان ملکوں کے فرماں رواجن پر اُس نے چڑھائی کی اور جنھیں اس نے فتح کیا، ان باتوں میں اکثر اس سے کم نہ تھے، اسکندر بک جس کو البانیا کی وطن پرستانہ مدافعت کے صلہ میں اپنے ملک کے اندر ایک ولی کی شہرت اور تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل ہوا، جب کبھی اُسے موقع ملتا، حد درجہ سفاک و انتقام جو ثابت ہوتا، وہ جنگ کے قیدیوں کو عادۃً قتل کرا دیتا تھا، اس معاملہ میں موریا کے دونوں حکمراں بھی پیچھے نہ تھے، ولاچیا کا فرماں روا جس کا نام ولاد تھا تاریخ کے شدید ترین ظالم اور خونخوار بدمعاشوں میں تھا، وہ "امپیلر" (*Impaler*) یعنی جسم میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے والا مشہور تھا، اُسے ان قیدیوں اور دوسرے مظلوموں کی جنھیں وہ اس ظالمانہ طریقہ سے قتل کراتا مرتے وقت کی اذیت اور تڑپ دیکھنے میں خاص لطف آتا تھا، وہ اس غرض سے اس کی ضیافتوں کی رونق کے لئے محفوظ رکھے جاتے تھے، ایک بار جب کسی مہمان نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ وہ ایسی موت سے مرنے والوں کے جسم کی بو کیسے برداشت کرتا ہے تو اس نے اس مہمان کو فوراً سولی پر چڑھوا دیا اور حکم دیا کہ سولی کا کھمبا دوسروں سے زیادہ بلند رکھا جائے تاکہ جس بو کی مہمان نے شکایت کی ہے اسکی تکلیف اسے نہ پہنچے"[1]

اشتعال یا انتقام کے موقع پر محمد ثانی نے جو کچھ بھی کیا ہو تاہم اُس کی فطرت نرم و لطیف جذبات سے محروم نہ تھی، قسطنطنیہ کی فتح کے روز اُس نے جس رحمدلی اور

---

[1] ایورسلے ص ۹۵۔

رقیق القلبی کا ثبوت دیا، اس کی مثال اسکے کسی ہمعصر نے کبھی پیش نہ کی، ڈیوک نوٹاراس جو افواجِ قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا جب گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا، تو محمد نے اسے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اپنی سرپرستی کا بھی یقین دلایا، اس نے ڈیوک کے ساتھ یہاں تک نوازش کی کہ اسکی بیوی کی عیادت کے لئے گیا جو علالت اور تازہ مصیبت کے غم سے پریشان تھی، اور نہایت نرمی اور احترام کے ساتھ جس طرح کوئی لڑکا اپنی ماں کو سمجھائے اسے تسلی و تشفی دی، ایسی ہی نرمی کا برتاؤ اس نے حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ بھی کیا، اور ان میں سے کئی ایک کا زرفدیہ اس نے خود ادا کیا' چند ہی دنوں میں اس کے عفو و کرم کا دامن تمام باشندگانِ شہر تک دراز ہو گیا۔"[1]

مگر جلد ہی یہ دامن خون کے دھبوں سے داغدار نظر آنے لگا، نوٹاراس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ عیسائی مورخوں نے محمد کے نقضِ عہد، سنگدلی اور نفس پرستی کی ایک بیّن مثال کے طور پر لکھا ہے، اور دل کھول کر اسے برا بھلا کہا ہے لیکن گبن کی تحقیق نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے، اور ایک بازنطینی مورخ کی حق گوئی سے بہتان کی یہ پوری عمارت جو بغض و عناد کی بنیاد پر قائم تھی مسمار ہو گئی ہے عیسائی مورخین ڈیوک اور اس کے لڑکوں کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں، اور قتل کا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ اس نے اپنے لڑکوں کو سلطان کی خلوت عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ یہ قتل ایک سازش کا نتیجہ تھا جو نوٹاراس قسطنطنیہ کی رہائی کے لئے اٹلی سے کر رہا تھا، گبن لکھتا ہے کہ "ایسی باغیانہ سازش قابلِ ستایش ہو سکتی ہے لیکن جو باغی دلیرانہ جرأت کرتا ہے وہ اس کی پاداش میں اپنی جان کے حق سے بجا طور پر محروم ہو جاتا ہے، اور

---

[1] گبن جلد ۴ صفحہ ۱۰۵،

اگر کوئی فاتح اپنے دشمنوں کو قتل کردے جن پر آیندہ وہ اعتبار نہیں کرسکتا تو ہمیں اسکو قابلِ الزام نہ قرار دینا چاہئے"[1]

محمد ثانی ایک مطلق العنان فرماں روا کی طرح حکومت کرنا چاہتا تھا، اور کسی وزیر کی مداخلت کو گوارا نہ کرتا، عثمان سے لیکر مراد ثانی تک تمام سلاطین اپنے وزیروں اور سپہ سالاروں سے مشورے لیا کرتے تھے، اور انھیں شریک دسترخوان بھی کرتے تھے لیکن محمد نے اس دستور کو اٹھادیا، وہ صرف احکام نافذ کرتا اور کسی کو محرم راز نہ بناتا کھانا بھی وہ تنہا کھایا کرتا تھا۔

آئینِ سلطنت ایک واضعِ قانون کی حیثیت سے سلطان محمد ثانی اپنے تمام پیشروؤں سے ممتاز نظر آتا ہے، اورخان کے عہد میں دولت عثمانیہ کے پہلے وزیر علاء الدین نے چند فوجی اصلاحات جاری کی تھیں جن کی تکمیل مراد اول کے زمانہ میں ہوئی لیکن نظام حکومت کے لئے کوئی دستور اس وقت تک مرتب نہ ہوا تھا، محمد ثانی پہلا سلطان ہے جس نے آئینِ سلطنت کو باضابطہ طور پر ترتیب دیا، اس کا "قانون نامہ" سلطنت عثمانیہ کا بنیادی دستور ہے۔

ارکانِ حکومت قانون نامہ میں سلطنت کو ایک خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے، جو چار ستونوں پر قائم ہے یعنی (۱) وزرائے سلطنت، (۲) قضاۃ عسکر (۳) دفتردار (خازن) اور (۴) نشانجی (معتمد سلطنت) اس شاہی خیمہ کا بلند دروازہ باب عالی کے نام سے موسوم ہے جس سے مراد حکومت عثمانیہ ہے،

وزراء حکومت کے سب سے بڑے عہدہ دار تھے، محمد ثانی کے عہد میں ان کی مقررہ تعداد چار تھی، ان کا صدر، وزیر اعظم سلطنت کے تمام عہدہ داروں کا افسر اعلیٰ تھا، اسی کے پاس حکومت کی مہر رہا کرتی تھی جو بلند ترین منصب کا نشان تھا، تفصیلات پر غور و بحث

---

[1] گبن، جلد ۴ صفحہ ۵۰،

کرنے کے لئے اُسے اپنے مکان پر بھی مجلسِ وزرا کے منعقد کرنے کا اختیار حاصل تھا، قضاۃ عسکر کا تقرر علماء کی جماعت سے ہوتا تھا، محمد کے زمانہ میں قاضی عسکر دو تھے، ایک یورپ کی تمام عثمانی عدالتوں کا صدر تھا، دوسرا ایشیا کی، علماء ہی کی جماعت سے تین بڑے عہدہ دار اور مقرر کئے جاتے تھے جن کا مرتبہ اُس وقت قضاۃ عسکر کے بعد تھا،

(۱) خواجہ جو سلطان اور شہزادوں کا اتالیق ہوتا تھا (۲) مفتی۔ اور (۳) قاضی قسطنطنیہ

نشانجی کے سپرد سرکاری دستاویزوں کے تیار کرنے اور ان پر سلطان کا طغرا ثبت کرنے کی خدمت تھی، یہ منصب بعد کو صرف تعظیمی رہ گیا، اس کے تمام متعلقہ فرائض بتدریج رئیس آفندی (چیف سکرٹری) کی طرف منتقل ہو گئے،

دیوان | حکومت کی مجلسِ حل و عقد کا نام دیوان تھا، سلطان کی غیر موجودگی میں وزیر اعظم اس کا صدر ہوتا تھا، دوسرے وزرا، اور قضاۃ عسکر اس کے داہنے بازو پر بیٹھتے تھے دفتر دار اور نشانجی کی جگہیں بائیں جانب تھیں، ضرورت کے وقت دیوان کا خاص اجلاس وزیر اعظم کے مکان پر بھی ہوتا تھا،

آغا | ان عمائدین سلطنت کے علاوہ بڑے بڑے آغا بھی تھے جو سلطنت کے دست و بازو سمجھے جاتے تھے، ان کی دو قسمیں تھیں، خارجی آغا اور داخلی آغا، خارجی آغا کی جماعت سے وہ فوجی حکام منتخب ہوتے تھے جن کے سپرد صوبوں کی حکومت ہوتی تھی، داخلی آغا دربار کے عہدوں پر مامور ہوتے تھے، فوجی آغاؤں میں ینی چری کے آغا اور سپاہی اور دوسرے سوار دستوں کے آغا خاص طور پر ممتاز تھے، ینی چری کا آغا قسطنطنیہ کی پولیس کا افسر اعلیٰ بھی ہوتا تھا، داخلی آغا قصر سلطانی کے اعلیٰ عہدہ دار ہوتے تھے مثلاً قاپو آغا (گورے خواجہ سراؤں کا افسر)، قیزلر آغا (حبشی خواجہ سراؤں کا افسر) بوستانجی باشی (باغبانوں کا افسر) چاؤش باشی

حکومت کے قاصدوں کا افسر) وغیرہ محکمہ دیوانی کے بہت سے عہدوں پر بھی یہ اعلیٰ آغا مقرر کئے جاتے تھے،

سنجق بے محمد فاتح کے عہد میں صوبوں کی حکومت بے اور بیلر بے کے سپرد ہوتی تھی، بے وہ پاشا کہے جاتے تھے جن کے نیزے کے سرے پر ایک گھوڑے کی دم باندھی جاتی تھی، یہ عثمانیوں کا فوجی نشان تھا، بیلر بے وہ پاشا تھے جن کے علم میں دو گھوڑوں کی دُمیں ہوتی تھیں، یہ اُن جاگیرداروں کے سردار تھے جنکو فوجی خدمات کے صلہ میں زمینیں دی گئی تھیں، اور جن کے فرائض میں داخل تھا کہ جنگ کے موقعوں پر مسلح ہو کر حاضر ہو جایا کریں، یہ لوگ ایسے وقتوں میں اپنے سرداروں کے علم کے نیچے جمع ہو جاتے تھے، علم کو ترکی زبان میں سنجق کہتے ہیں، اور چونکہ ہر علاقہ کا سنجق الگ تھا، اس لئے ان علاقوں کا نام ہی سنجق پڑ گیا، اور ان کے سرداروں کو سنجق بے کہنے لگے، پاشا کا لقب جو عموماً صوبوں کے والیوں کو دیا جاتا تھا حقیقۃً کسی حاکمانہ اختیار یا فوجی منصب کا نشان نہ تھا، بلکہ محض ایک اعزازی لقب تھا، ابتداءً عثمانیوں میں پاشا کے لقب کا استعمال صرف اُن افسروں کے لئے نہیں ہوتا تھا جو فوج کی قیادت کرتے تھے یا جن کے ہاتھ میں صوبوں یا شہروں کی حکومت تھی، جن اول پانچ پاشاؤں کا ذکر عثمانی مصنفین نے کیا ہے اُن میں سے تین ادیب تھے[1]، رفتہ رفتہ یہ اعزازی لقب اُن لوگوں کیلئے مخصوص ہو گیا جو سلطان کی طرف سے فوج کے کمانڈر اور علاقوں اور اہم شہروں کے حاکم مقرر کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ پاشا لفظ گورنر کا تقریباً مترادف ہو گیا،

---

[1] فان ہیمر بحوالہ کریسی جلد ۱ صفحہ ۱۶۔

محمد ثانی کے زمانہ میں چھتیس ۳۶ سنجق سلطنت عثمانیہ کے صرف یورپی علاقوں میں تھے، جنمیں سے ہر ایک کے نیچے چار چار سو سوار جمع ہوتے تھے، یورپ اور ایشیا میں سلطنت کے باضابطہ سواروں اور پیادوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، اس میں وہ سوار اور پیادے شامل نہ تھے جو ہر جنگ کے موقع پر بطور خود اپنی خدمات پیش کرتے تھے، اور جن کا معاوضہ صرف مالِ غنیمت تھا، سلطنت کی سالانہ آمدنی بیس لاکھ دوکات سے زیادہ تھی، آمدنی کی مدوں میں مالگذاری کے علاوہ محصول درآمد، معدنیات، جرمانے اور خراج کی رقمیں بھی شامل تھیں،

علمار | قانون نامہ کا نہایت اہم حصہ وہ ہے جسمیں مذہب اور عدالت کے عہدہ داروں کا نظام قائم کیا گیا ہے، چونکہ قضاۃ عسکر کا تقرر علمار کی جماعت سے ہوتا تھا اور وہ خیمہ سلطنت کے چار ستونوں میں سے ایک ستون تھے، اس لئے محمد ثانی نے اس جماعت کی تعلیم و تنظیم پر خاص توجہ کی، کریسی لکھتا ہے :-

"محمد ثانی کے پیشروؤں، خصوصاً اورخاں کو اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے کا بہت شوق تھا، لیکن محمد ان سب سے بڑھ گیا، اسی نے "سلسلہ علما" کو قائم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا، فاتح قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بڑی سلطنت کے پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لئے جو امرد ی اور فوجی مہارت کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ضروری ہیں محمد نے جو خود بھی علوم میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لئے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا، وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظم و نسق جیسا کچھ چاہیے درست رکھنے کے لئے ناگزیر ہے کہ قاضیوں کا احترام قائم کیا جائے، اور ان کا احترام قائم کرنے

کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں، بلکہ سلطنت کے اونچے اور باعزت عہدوں پر مامور بھی کئے جائیں، نیز افلاس کے وسوسوں اور پریشانیوں سے محفوظ کر دیئے جائیں"[۵]

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر محمد ثانی نے تعلیم کا جو نظام مرتب کیا، وہ مذہبی اور علمی حیثیت کے علاوہ سیاسی حیثیت بھی رکھتا تھا، جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے "پچھلے عہد میں تمام مدرسے محض مذہبی مدرسے ہوتے تھے اگرچہ ان میں اور علوم بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن ترکوں کا سررشتہ تعلیم پولیٹکل حیثیت رکھتا تھا، وہ سلطنت کے لئے لائق لائق عہدہ دار پیدا کرتا تھا"[۲] علاوہ مکاتب کے جو ہر قصبہ کے ہر محلہ اور تقریباً تمام بڑے بڑے دیہاتوں میں کھول دیئے گئے تھے محمد نے کثرت سے اونچے درجہ کے مدرسے بھی قائم کئے اور ان پر جائدادیں وقف کیں، یہ مدرسے موجودہ زمانہ کے کالجوں کے برابر تھے ان میں دس مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی یعنی صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات لسانیات، بلاغت، طرز تحریر، فن خطابت، اقلیدس اور ہیئت، جو طلبہ ان تمام مضامین میں پوری دستگاہ حاصل کر لیتے تھے، ان کو دانشمند کی سند ملتی تھی جو موجودہ یونیورسٹیوں کے ایم اے کی سند کے برابر تھی، یہ سند کسی ابتدائی مدرسہ کی اعلیٰ مدرسی کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی، لیکن علماء کی جماعت کا رکن بننے کے لئے دانشمند کی سند حاصل کرنے کے بعد فقہ اور اصول فقہ کا ایک طویل نصاب مکمل کرنا پڑتا تھا، اور مختلف امتحانات پاس کرنے پڑتے تھے، اس جماعت میں وہی لوگ داخل کئے جاتے تھے جو علوم کے بلند ترین

۵۔ کریسی جلد ۱ صفحہ ۱۶۹،

۲۔ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" از مولانا شبلی نعمانی،

مراتب پر فائز ہوتے، اور ایسے لوگوں کو حکومت کی طرف سے بڑے بڑے عہدے اور منصب ملتے تھے، اور انھیں خاص رعایتیں اور حقوق حاصل تھے، مدرسوں (کالجوں) کے اساتذہ جو مدرّس کہے جاتے تھے، علماء ہی کی جماعت سے مقرر ہوتے تھے، اور اسی جماعت سے تمام حکامِ عدالت کا انتخاب بھی ہوتا تھا، مثلاً قصبوں اور دیہاتی علاقوں کے قاضی، مُلّا یعنی بڑے بڑے شہروں کے قاضی، استنبول آفندی یعنی قسطنطنیہ کا قاضی اور ناظرِ اعلیٰ، قضاۃ عسکر یعنی رومیلیا اور اناطولیہ کے قاضی القضاۃ، اور مفتی، یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ علماء کی جماعت کوئی مخصوص مذہبی جماعت نہ تھی بلکہ ایک علمی جماعت تھی، جس سے بڑے بڑے ملکی عہدہ دار، حکام فوجداری اور مدرسوں کے اساتذہ مقرر کئے جاتے تھے، خالص مذہبی جماعت جس میں مسجدوں کے امام، خطیب اور مبلغین شامل تھے، طبقہ علماء کا محض ایک جزو تھی، عام خیال یہ ہے کہ اس مذہبی گروہ کا اثر عثمانی ترکوں پر بہت زیادہ تھا، اور اکثر مغربی مورخین نے بھی دولت عثمانیہ کے زوال کا ایک بڑا سبب علمائے مذہب ہی کو قرار دیا ہے جن کا جمود ترقی کی ہر راہ کا پتھر تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت کا اثر بہت کم تھا، فان ہیمر لکھتا ہے: "نام نہاد مذہبی گروہ یعنی مسجدوں کے اماموں، موذنوں اور خطیبوں کا اثر سلطنت عثمانیہ میں شاید ہر مملکت سے کم ہے، برخلاف اس کے معلمین کی جماعت کا اقتدار اور اہمیت اس قدر ہے کہ اس کی مثال چین کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی"[۱] کریسی جس کی تحقیق فان ہیمر کے علاوہ دوسرے قدیم ماخذوں پر بھی مبنی ہے، اس کی تائید کے ذیل میں لکھتا ہے: "عثمانیوں کے شرف و افتخار کا یہ واقعہ بھی ضبط تحریر میں لانا چاہئے، کہ ان میں مدرسین اور ان تمام اشخاص

---

[۱] "ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ" جلد ۲۴ صفحہ ۳۳۴۔

کا احترام جو خود علمی فضیلت میں ممتاز ہوں یا اس کے حاصل کرنے میں دوسروں کی رہنمائی کا خاص ملکہ رکھتے ہوں، ہر عیسائی قوم سے زیادہ کیا جاتا ہے"[1]

خونین قانون سلطان محمد ثانی نے حکومت کی ابتدا اپنے شیر خوار بھائی کے قتل سے کی تھی، جب اُس نے قانون نامہ کو مرتب کرنا شروع کیا، تو برادر کشی کو بھی سلطنت کے تخت نشین کے لئے ایک قانون بنادیا، اور یہ دفعہ دستورِ حکومت میں درج کر دی:۔

"میرے فقہاء کی اکثریت نے یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ میرے جانشینوں میں سے جو تخت پر بیٹھیں وہ دنیا کے امن و امان کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتے ہیں اُن کا فرض ہوگا کہ اس پر کاربند ہوں"[2]

---

[1] کریسی جلد ۱ ص۱۷۲، [2] فان ہیمر بہ حوالہ کریسی جلد ۱ ص۱۸۲۔

بایزید ثانی

سنہ ۸۸۶ھ تا سنہ ۹۱۸ھ مطابق سنہ ۱۴۸۱ئہ تا سنہ ۱۵۱۲ء

سلطان محمد ثانی نے اپنی وفات پر دو لڑکے چھوڑے، بڑا لڑکا شہزادہ بایزید اماسیا کا حاکم تھا، اور چھوٹا شہزادہ جم (جمشید) کرمانیہ کا، بایزید کا میلان طبع زیادہ تر مذہب اور فلسفہ کی جانب تھا جس کی وجہ سے لوگ اُسے صوفی کہتے تھے، وہ نہایت سادہ مزاج حلیم، نرم خو اور پابند شرع تھا، شاعری سے بھی خاص ذوق رکھتا تھا لیکن ان خصوصیات کے باوجود سپاہیانہ شجاعت میں بھی کم نہ تھا، اور میدان جنگ میں پہونچکر یہ صوفی مجاہد بن جاتا تھا شہزادہ جم میں زیادہ تر سلطان محمد کے اوصاف پائے جاتے تھے، وہ فنون حرب کا ماہر اور شجاعت میں اپنے باپ کا مماثل تھا حکمرانی کا ملکہ اور ملک گیری کی اہلیت اسے خداداد حاصل تھی، اس کے ساتھ شاعری میں بھی اس کا پایہ بلند تھا،

جس وقت سلطان محمد کے انتقال کی خبر قسطنطنیہ میں مشتہر ہوئی ینی چری نے تمام شہر میں لوٹ مار شروع کردی، اور وزیر اعظم کو جس نے سلطان کی وفات کو مخفی رکھنے کی کوشش کی تھی قتل کردیا چونکہ وزیر اعظم کے متعلق معلوم تھا کہ وہ شہزادہ جم کا طرفدار ہے، اس لئے شہزادہ بایزید کے حامیوں نے بہ آسانی ینی چری کی حمایت حاصل کرلی اسکے بعد باقی افواج نے بھی

ینی چری کے تتبع میں بایزید کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، شہزادہ جم کو سلطان کی وفات کی اطلاع دیر میں ہوئی، اس درمیان میں شہزادہ بایزید نے قسطنطنیہ پہنچ کر تخت پر قبضہ کر لیا، ینی چری نے اس کی حمایت کی، لیکن تخت نشینی کے موقع پر اپنی تنخواہوں میں اضافہ اور بخشش کا مطالبہ بھی پیش کیا، اس رسم کی بنا سلطان محمد کی تقریب تاج پوشی میں پڑ چکی تھی، بایزید کو مجبوراً یہ مطالبہ پورا کرنا پڑا، اس کے بعد تین سو برس تک یہ دستور قائم رہا کہ ہر نئے سلطان کی تخت نشینی کے وقت ینی چری کو بڑی بڑی رقمیں بطور انعام کے دی جاتی تھیں، بقول کریسی یہ رسم جس قدر خزانہ شاہی کے لئے بار تھی اسی قدر سلاطین کے لئے باعث شرم تھی،

شہزادہ جم خاندان عثمانی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کا کوئی شہزادہ تاج وتخت سے کم پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا، اسی لئے کسی سلطان کے مرنے پر اس کے لڑکوں میں تخت سلطنت کے لئے جنگ کا شروع ہو جانا لازمی تھا، چنانچہ اس موقع پر بھی اگرچہ بایزید تخت پر قابض ہو چکا تھا، اور تمام فوج اور امرائے دولت نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا، تاہم شہزادہ جم نے علم بغاوت بلند کر دیا اور جنگ چھڑ گئی، وہ جانتا تھا کہ اس کے والد نے جو خونیں قانون دستور سلطنت میں داخل کر دیا ہے، اسکی وجہ سے اس کی جان ہر وقت خطرہ میں ہے، لہذا اطاعت قبول کرنے کے بعد بھی اسے بایزید کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا، اعلان جنگ سے قبل اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم کر دی جائے، یورپ کے صوبے بایزید کی حکومت میں رہیں، اور ایشیا کے صوبوں پر جم کی حکومت تسلیم کر لی جائے، لیکن بایزید نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ۲۰ جون ۱۴۸۱ء کو احمد کدک پاشا

نے جم کو شکست دی اور وہ بھاگ کر سلطانِ مصر کے دربار میں پناہ گزیں ہوا، دوسرے سال مصر کی فوجی مدد کیساتھ وہ پھر واپس ہوا، اور ایشیائے کوچک کے بعض ترکی سردار اس کی حمایت میں کھڑے ہوئے، لیکن اس مرتبہ بھی اُسے شکست کھا کر وطن چھوڑنا پڑا، اب کی بار وہ بجائے مصر کے روڈس پہنچا تاکہ وہاں سے مدد لے کر سلطنت عثمانیہ کے یورپین مقبوضات میں داخل ہو اور از سرِ نو قسمت آزمائی کرے، روڈس مبارزینِ پروشلم کے قبضہ میں تھا، اُن کا سردار ڈی آبوسن (D'Aubusson) ایک نہایت چالاک اور غدار شخص تھا، اُس نے ایک طرف تو شہزادہ جم کو مدد دینے کا وعدہ کیا اور اُس سے یہ معاہدہ کرایا کہ بصورت کامیابی وہ مبارزینِ روڈس کو بعض مخصوص اور اہم مراعات عطا کرے گا، اور دوسری طرف سلطان بایزید سے یہ طے کیا کہ پینتالیس ہزار دوکات سالانہ کے عوض وہ جم کو نظر بند رکھے گا، چنانچہ سات برس تک یہ بدنصیب شہزادہ روڈس اور پھر فرانس کے مختلف مقامات میں جو مبارزینِ روڈس کے قبضہ میں تھے، ظاہری احترام کے باوجود دراصل ایک قیدی کی طرح زندگی بسر کرتا رہا، تمام یورپ کو جم کے معاملہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، اور متعدد بادشاہوں نے شہزادہ کو حاصل کرنے کے لئے ڈی آبوسن سے مراسلت شروع کر دی تھی، وہ چاہتے تھے کہ اسے بایزید کے مقابلہ میں کھڑا کر کے سلطنت عثمانیہ کو نقصان پہنچائیں، لیکن ڈی آبوسن پینتالیس ہزار دوکات سالانہ کی رقم سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا، وہ معاملہ کو عمداً طول دیتا رہا، اس درمیان میں اُس نے شہزادہ جم کی ماں اور بیوی سے بھی، جو اُس وقت قاہرہ میں مقیم تھیں خط و کتابت شروع کر دی تھی، اور انھیں یقین دلایا تھا کہ اگر بیس ہزار دوکات ادا کر دیئے جائیں تو شہزادہ فوراً قاہرہ پہنچا دیا جائیگا، ڈی آبوسن کے وعدہ پر اعتماد

کرکے ان خواتین نے یہ رقم اُس کے پاس بھیجدی تھی، مگر مبارزین یروشلم کا مقدس پیشوا ایفائے عہد کی پابندی سے بالاتر تھا، عیسائی مورخین بھی اس شرمناک فریب پر اظہارِ نفرت کرتے ہیں، بالآخر شاہِ فرانس چارلس ہشتم نے جم کو ڈی آبوسن کے پنجہ سے رہا کرکے پوپ اینوسنٹ ہشتم (Innocent VIII) کے پاس رومہ بھیج دیا، یہاں بھی اسکی حیثیت حقیقۃً ایک قیدی ہی کی تھی، اگرچہ اینوسنٹ نے اُس کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور اُس کو اپنے محل میں عزت و احترام کے ساتھ رکھا، اب پوپ نے چالیس ہزار دوکات سالانہ کی رقم شہزادہ کی نگرانی کے صلہ میں بایزید سے وصول کرنا شروع کی چند سال کے بعد اینوسنٹ مرگیا، اور اُس کا جانشین پوپ اسکندر بورجیا (Alexander Borgia) ہوا جو اپنے ہلاکت پاش جرائم کی وجہ سے عالمگیر شہرت کا مالک ہے، اسکندر بورجیا نے اپنا ایک سفیر سلطان بایزید کی خدمت میں بھیجکر شہزادہ جم کی نظربندی سے متعلق سابق معاہدہ کی تجدید کی، اور اس میں ایک اہم دفعہ کا اضافہ یہ کیا کہ اگر وہ سلطان کو شہزادہ کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مطمئن کردے تو بجائے چالیس ہزار دوکات سالانہ وصول کرنے کے تین لاکھ دوکات یکمشت کا مستحق ہوگا لیکن ابھی سلطان اور سفیرِ پوپ کے درمیان اس معاملہ پر گفتگو ہو رہی تھی کہ چارلس ہشتم نے اٹلی پر حملہ کردیا اور ۳۱ دسمبر ۱۴۹۵ء کو رومہ میں فاتحانہ داخل ہوا، چند روز کے بعد شاہ چارلس اور پوپ اسکندر کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی جس کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ شہزادہ جم چارلس کے ساتھ فرانس جائیگا، اسکندر کو صلح کی خاطر یہ شرط منظور کرنی پڑی، اور شہزادہ فرانسیسی فوج کے سپہ سالار کے ساتھ رومہ سے روانہ ہوگیا، اسکندر بورجیا کو اگرچہ چالیس ہزار دوکات سالانہ سے محروم ہوجانا پڑا تاہم شہزادہ کے قتل سے تین لاکھ دوکات

کی خطیر رقم کا حاصل کرنا اب بھی ممکن تھا، اور وہ اس خونیں تدبیر میں کامیاب ہوا، قتل کے طریقہ میں ترک اور اطالوی مورخین کے بیانات باہم مختلف ہیں، اطالوی مورخین کی روایت ہے کہ اسکندر بورجیا نے شہزادہ کے ایک خدمت گار سے سازش کرکے ایک خاص قسم کا سفید زہر شکر میں ملا کر کھلا دیا، ترک مورخین کا بیان ہے کہ مصطفےٰ نامی ایک نائی نے بورجیا کی تحریک سے شہزادہ کا خط بناتے وقت زہر کے بجھے ہوئے استرہ سے ایک خفیف سا زخم لگا دیا، بہر حال تمام مورخین کو اس امر پر اتفاق ہے کہ شہزادہ جم کا قتل پوپ اسکندر بورجیا ہی کی تحریک سے عمل میں آیا[1] زہر کا اثر فوراً ہی ظاہر نہ ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ نمایاں ہوا، یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد فاتح قسطنطنیہ کا وہ جواں سال وجواں ہمت فرزند جس نے اپنی عمر کے ۳۶ سال بھی ہنوز پورے نہ کئے تھے، اور جو تیرہ سال تک اسیری کی صعوبتیں برداشت کرچکا تھا، بیک وقت قید فرنگ و قید حیات دونوں سے آزاد ہوگیا، آخر وقت تک اُسے بیوی اور بچوں کے دیکھنے کی حسرت تھی، اُس کی آخری دعا یہ تھی: "اے میرے رب اگر دین حق کے دشمن یہ چاہتے ہیں کہ میری ذات کو آلۂ کار بنا کر اُن تجویزوں کو تقویت پہنچائیں جو انھوں نے مسلمانوں کی بربادی کے لئے سوچ رکھی ہیں تو آج کے بعد مجھے زندہ نہ رکھ، بلکہ فوراً میری روح کو اپنی طرف اُٹھا لے۔" سلطان بایزید نے اُس کی نعش یورپ سے منگوالی اور اُسے شاہی تزک و احتشام کے ساتھ بروصہ میں سپرد خاک کردیا،

شہزادہ جم کے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:-

"اس تمام غمناک سرگذشت سے یہ حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا سے مسیحیت میں

---

[1] کریسی جلد ا ص ۱۹۴،

ایک بھی ایمان دار بادشاہ نہ تھا، جو قیدی پر ترس کھاتا، اور نہ کوئی ایسا تھا جو گرینڈ ماسٹر ڈڈی آبوسن، پوپ، اور چارلس ہشتم کی غیر شریفانہ اور ضمیر فروشانہ سازشوں پر نفریں کرتا، ان میں سے ہر ایک غداری اور فضیحت کے انعام کے لئے دوسرے سے سابقت کی کوشش کر رہا تھا، اپنے بھائی کو محفوظ نگرانی میں رکھنے کی خواہش کرنا بایزید کے لئے قابلِ معافی ہو سکتا ہے لیکن مسیحی کلیسا کے پیشوائے اعظم اور رہبانی نائٹوں کی جماعت کے سردار کی مدافعت میں کیا کہا جاسکتا ہے جنھوں نے کافرکی اشرفیوں کے لئے ایک بیکس و مجبور پناہ لینے والے کو دغا دی"۔[1]

اوٹرانٹو بایزید ثانی کا عہدِ حکومت فتوحات اور توسیعِ سلطنت کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، تخت نشینی کے بعد اُس نے احمد کدک پاشا کو شہزادہ جم کی بغاوت فرو کرنے کے لئے اوٹرانٹو سے واپس بلالیا، اور اُس کی جگہ خیر الدین پاشا کو مقرر کیا، خیر الدین پاشا کو حسبِ ضرورت مدد نہ پہونچ سکی، وہ بہت دنوں تک نہایت بہادری کے ساتھ دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرتا رہا، مگر بالآخر شہر ڈیوک آف کلبریا (Calabria) کو سپرد کر دینا پڑا، اوٹرانٹو کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد پھر کبھی ترکوں کا قدم اٹلی کے کسی حصہ میں نہ جم سکا،

ہرزیگووینا ہرزیگووینا اب تک ایک باجگذار حکومت تھی، بایزید نے اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا،

ہنگری ہنگری سے کئی سال تک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس سے کوئی خاص نتیجہ حاصل نہ ہوا، اور آخر میں دونوں سلطنتوں میں صلح ہو گئی،

---

[1] "ترکی" از لین پول صفحہ ۱۵۱،

بحری فتوحات البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ۹۰۴ھ (۱۴۹۸ء) میں چھڑی وہ باعتبار اپنے نتیجہ کے بہت زیادہ اہم تھی، ترکوں نے موریا میں وینس کے تین باقی ماندہ قلعوں یعنی نوارنیو (Navarino) موڈن (Modon) اور کورن (Coron) کو بھی فتح کرلیا، اور اس طرح یونان میں وینس کے اثر کا خاتمہ ہوگیا، ترکی بیڑا محمد فاتح کے عہد ہی میں بحر روم کی تمام بحری طاقتوں پر فوقیت حاصل کر چکا تھا، بایزید ثانی نے اس کو اور زیادہ فروغ دیا، چنانچہ ۹۰۵ھ (۱۴۹۹ء) میں مشہور ترکی امیر البحر کمال رئیس نے وینس کے بیڑے کو زبردست شکست دے کر لیپانٹو (Lepanto) کے بندرگاہ پر قبضہ کرلیا، دوسرے سال وینس، آسٹریا، اسپین اور پوپ کے بیڑوں نے متحدہ طور پر ترکی بیڑے پر حملہ کیا، باوجود اس کے کہ عثمانی جہازوں کی مجموعی تعداد اتحادی بیڑوں سے بہت کم تھی، کمال رئیس نے کامیابی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا، اور پھر آگے بڑھ کر مسلمانانِ غرناطہ کی درخواست پر جو عیسائیوں کے ظلم وستم سے عاجز آچکے تھے، سواحلِ اسپین پر حملے کئے، لیکن مظلومینِ غرناطہ کو ان حملوں سے کوئی فائدہ نہ پہنچا، اور اُن کو آخرکار اپنا وطن چھوڑ کر اسپین سے نکل جانا پڑا،

مصر سے صلح ایشیا میں اب تک سلاطین عثمانی کو جن مخالفین سے سابقہ پڑا تھا وہ صرف ایشیائے کوچک کے امرا تھے، جنھوں نے دولت سلجوقیہ کی تباہی کے بعد خودمختار ریاستیں قائم کرلی تھیں، یہ تمام ریاستیں محمد فاتح کے عہد تک مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلی گئی تھیں، اور سلطان کو اپنے ایشیائی مقبوضات کی طرف سے اطمینان حاصل ہو چکا تھا، لیکن بایزید ثانی کے تخت پر آتے ہی عثمانیوں کو ایک نئے دشمن سے معاملہ کرنا پڑا، حکومت مصریہ اب تک سلطنت عثمانیہ کے معاملات سے بالکل

بے تعلق تھی، شہزادہ جم نے پہلی بار اسکو عثمانی مقبوضات میں قدم رکھنے کی دعوت دی، اگرچہ اس مہم میں مصری فوج کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا، تاہم سلطنت عثمانیہ سے قوت آزمائی کی جرأت پیدا ہو گئی، اور مصریوں نے ایشیائے کوچک کے جنوبی مشرقی علاقوں پر دست درازیاں شروع کر دیں، دولت عثمانیہ اور مصر کے مملوک سلطانوں کے درمیان پہلی جنگ سنہ ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں شروع ہوئی جسمیں ترکوں کو سخت شکست ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرمانیہ نے بغاوت کر دی، عثمانی فوجیں اس بغاوت کے فرو کرنے میں تو کامیاب ہوئیں لیکن مصریوں کے مقابلہ میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا، بالآخر پانچ سال کے بعد اس جنگ کا سلسلہ ختم ہوا، اور بایزید ثانی نے اپنے تین قلعے سلطان مصر و شام کی نذر کرکے صلح کر لی،

سلیم کی بغاوت اور تخت نشینی بایزید کا عہد حکومت جس طرح خانہ جنگی سے شروع ہوا تھا اسی طرح خانہ جنگی پر ختم بھی ہوا، اس کے تینوں لڑکے کرکود، احمد اور سلیم ایشیائے کوچک کے مختلف صوبوں کے حکمراں تھے، کرکود بڑا لڑکا تھا، لیکن اس کا ذوق تمامتر علمی تھا، سلطان بایزید احمد کو جسے وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا، لیکن سلیم باوجود سب سے چھوٹا ہونے کے اپنی شجاعت اور فوجی قابلیت کی وجہ سے تمام فوج خصوصاً ینی چری میں نہایت محبوب تھا، یہ دیکھ کر کہ بایزید اپنی عمر اور خرابی صحت کے باعث امور سلطنت پر کافی توجہ مبذول کرنے سے معذور ہے سلیم کو خطرہ لاحق ہوا کہ ممکن ہے احمد بایزید کی حیات ہی میں تخت پر قابض ہو جائے، لہذا اس نے سلطان کی اجازت کے بغیر طرابزون سے قسطنطنیہ کی طرف کوچ کر دیا، اور ایک منتخب فوج کے ساتھ ادرنہ پہونچ گیا، بایزید نے اسکو طرابزون واپس جانے کا حکم دیا، لیکن سلیم جنگ پر آمادہ ہو گیا، اور بایزید کو مجبوراً اس سے مقابلہ کرنا پڑا، اس جنگ میں سلیم کو شکست ہوئی،

اور وہ بھاگ کر کریمیا پہونچا، کریمیا کا فرماں روا سلیم کا خسر تھا، اُس نے سلیم کی مدد کی،
کچھ دنوں کے بعد وہ پھر قسطنطنیہ کی طرف لوٹا اور اب کی بار تمام فوج نے اس کا ساتھ دیا،
بایزید نے ینی چری کے ایک وفد کو باریاب کیا، اور اُن سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتے
ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ "ہمارا بادشاہ ضعیف العمر اور کمزور ہے، اس لئے ہم چاہتے
ہیں کہ سلیم تخت نشین ہو" یہ دیکھ کر کہ فوج قابو سے باہر ہو چکی ہے، بایزید نے اعلان کیا
کہ "میں اپنے لڑکے سلیم کے حق میں تخت سلطنت سے دست بردار ہوتا ہوں، خدا اُسکو
ایک خوشحال عہدِ حکومت عطا فرمائے" اس کے بعد وہ تخت سے اُتر آیا، وہ چاہتا تھا
کہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام ایشیائے کوچک کے شہر ڈیموٹیکا میں گذار دے، جو اُسکی
جائے پیدائش تھا، لیکن موت نے اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا، اور قسطنطنیہ سے
روانہ ہونے کے تین ہی روز بعد اُس کا انتقال ہوگیا،

پہلا رُوسی سفیر! سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان اب تک سفارتی تعلقات
قائم نہیں ہوئے تھے، ۹۰۰ھ (۱۴۹۵ء) میں پہلا روسی سفیر مائکل پلے شیف
(Michel Plestshiev) قسطنطنیہ آیا اور روسی تاجروں کیلئے
تجارتی مراعات کا خواستگار ہوا، زار ایوان سوم (Ivan III) نے اُسے سختی
کے ساتھ ہدایت کر دی تھی کہ وہ تو سلطان کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو، نہ سلطان کے
علاوہ کسی وزیر سے سفارتی معاملات پر کوئی گفتگو کرے، اور نہ یورپ یا ایشیا کی کسی
مملکت کے سفیر کو اپنے آگے جگہ دے، لامارٹین (A. de Lamartine)
تاریخ ترکی میں لکھتا ہے کہ پلے شیف کی گستاخی اور بدتمیزی اُس کے دربار کے تکبر سے بھی
بڑھ گئی، جو قوم اُس کی مہمان نوازی اور تواضع کر رہی تھی، اُسی کے رسم و رواج

کی اُس نے تحقیر کی، وزیرِ اعظم نے اُس کے استقبال کے لئے جو دعوت کی تھی اُسمیں شریک ہونے سے اُس نے انکار کر دیا، اور دیوان کی طرف سے جو خلعت اور دوسرے تحائف اُسے پیش کئے گئے تھے انھیں واپس کر دیا عثمانی رسم و رواج کی اس توہین پر مغربی حکومتوں کے سفیروں کو بھی غصہ آیا،[۱] اگر یہ روسی سفیر محمد ثانی یا سلیم اوّل کے عہد میں آیا ہوتا تو اُسے اپنی گستاخیوں کا نتیجہ معلوم ہو جاتا، بایزید نے اپنے غیر معمولی تحمل اور بردباری کی وجہ سے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ پلے شیف کو رخصت کر دیا، اور اپنا کوئی سفیر دربار روس میں نہیں بھیجا،

۱ ڈی لا مارٹین، بحوالہ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۲۴ ص ۳۳۷،

سلیم اوّل "Terrible"

سنہ ۹۱۸ھ تا سنہ ۹۲۶ھ مطابق سنہ ۱۵۱۲ء تا سنہ ۱۵۲۰ء

جس وقت سلیم نے بایزید کو تخت سے اُتار کر زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو (۴۷) سال کی پختہ عمر کو پہنچ چکا تھا، اور اُس کی فوجی اور انتظامی قابلیت پوری طرح مسلّم ہو چکی تھی، اُس نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس قلیل مدت میں سلطنتِ عثمانیہ کی وسعت کو دو چند کر دیا، اُس نے یوروپین مقبوضات میں کوئی اضافہ نہیں کیا مگر ایشیا میں دیار بکر، کردستان، شام، مصر، اور عرب کا ایک بڑا حصہ جس میں حرمین شریفین بھی داخل تھے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اُس کی فتوحات کی وسعت اعلیٰ فوجی قابلیت، اور انتظامِ سلطنت کی غیر معمولی اہلیت نے اُسکو سلاطینِ آلِ عثمان کی صفِ اوّل میں ایک ممتاز جگہ دی ہے، ان خصوصیات کے علاوہ علم و فضل میں بھی اُس کا پایہ نہایت بلند تھا، وہ رات کو بہت کم سوتا، اور زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا، اُس کو تاریخ اور فارسی شاعری سے خاص دلچسپی تھی، فارسی زبان میں اُس نے کچھ نظمیں خود بھی لکھیں، محمد فاتح کی طرح وہ بھی سیزر اور سکندر کے کارنامے نہایت شوق سے پڑھا کرتا تھا، اُس کو حرم کی زندگی سے بہت کم دلچسپی تھی، دن میں

سلطنت کے کاموں سے جو وقت بچتا، اُس کا بیشتر حصہ وہ علما کی صحبت میں گذارتا، وہ
اہلِ علم کو بڑے بڑے عہدوں پر بھی مامور کرتا مثلاً جب کردستان کا صوبہ فتح ہوا تو اس نے
مورخ ادریس کو وہاں کا والی مقرر کیا، لیکن علم کا شوق اور علما کی ہم نشینی اُس کے مزاج
میں نرمی پیدا نہ کر سکی، اُسکی طبیعت حد درجہ اشتعال پذیر تھی وہ کسی امر میں خفیف سی
مخالفت بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا، اور جو لوگ اُسکی رائے سے ذرا بھی اختلاف کرنے
کی جرأت کرتے اُن کو فوراً قتل کرا دیتا تھا، اُس کے مختصر عہدِ حکومت میں سات وزیر اعظم
اُس کے حکم سے قتل ہوئے، ان کے علاوہ متعدد فوجی اور ملکی عہدہ داروں کو بھی اُس کی
ناخوشی کی پاداش میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا ، جو لوگ وزیر اعظم کے عہدہ
پر مقرر کئے جاتے تھے، اُن کو اپنے انجام کا اتنا یقین ہوتا تھا کہ وہ اس ہلاکت آفریں
ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھ کر چھوڑ جاتے تھے، اور اکثر
اُن کی پیش بینی صحیح ثابت ہوتی تھی، چنانچہ ایک روز وزیر اعظم پیری پاشا نے سلیم
سے عرض کیا کہ "اے میرے بادشاہ میں جانتا ہوں کہ جلد یا بدیر تجھے اپنے اس وفادار
غلام کو قتل کرنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ مل جائے گا، لہذا التجا ہے کہ قتل سے پہلے مجھے تھوڑی
مہلت عطا فرما تاکہ میں اس دنیا سے متعلق اپنے کاروبار کا انتظام کر لوں، اور تیرے
حکم سے دوسری دنیا میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤں"۔ سلیم اس درخواست پر ہنس پڑا
اور کہنے لگا "میں کچھ دنوں سے تیرے قتل کی نسبت غور کر رہا ہوں لیکن فی الحال تیرا کوئی
جانشین مجھے نظر نہیں آتا، ورنہ تیری یہ درخواست میں بخوشی منظور کر لیتا"۔ لیکن سلیم کی
یہ سختی جو عموماً ظلم سے تعبیر کی جاتی ہے، ایک خاص اصول کے ماتحت تھی، وہ جو کچھ کرتا
تھا سلطنت کے لئے کرتا تھا، وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے باپ کے حلم و لینت نے حکومت

کے تمام شعبوں میں بدنظمی پیدا کردی تھی، فوج میں خودسری آگئی تھی، وزرا اپنے فرائض کو بھولے ہوئے تھے، قاضیوں کے فیصلوں میں جانبداری کی جھلک نمایاں تھی اس حالت کو سدھارنے کے لئے سختی ناگزیر تھی، اور گو بعض اوقات سزا کی شدت جرم کی شدت سے بڑھ جاتی تھی تاہم اس سخت گیری کا عام اثر نہایت مفید ثابت ہوا، اور وہ تمام خرابیاں دور ہوگئیں جو حکومت کی بنیاد کو متزلزل کردینے کے لئے کافی ہیں، مورخین نے سلیم کو ظالم لکھا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان مظالم کے باوجود وہ رعایا میں نہایت مقبول تھا، جو طرزِ عمل افراد کے لئے ظلم کا حکم رکھتا تھا، وہی رعایا کے حق میں رحمت بن گیا تھا،

بھائیوں کی بغاوت سلیم نے جس وقت بایزید کو تخت سے اُتار کر سلطنت پر قبضہ کیا تھا اس کے دونوں بڑے بھائی کرکود اور احمد ایشیاے کوچک کے دو صوبوں کے حاکم تھے ابتدا میں ان دونوں نے اطاعت کا اظہار کیا، لیکن سلیم اُن کی طرف سے مطمئن نہ ہوا اُس کو تخت پر بیٹھے چند ہی روز گذرے تھے کہ شہزادہ احمد نے جو اماسیا کا حاکم تھا علم بغاوت بلند کرکے بروصہ پر قبضہ کرلیا، سلیم فوراً ایشیاے کوچک پہنچا، احمد بروصہ چھوڑ کر بھاگا اور اپنے دو لڑکوں کو شاہ اسمٰعیل کے پاس مدد حاصل کرنے کے لئے ایران روانہ کیا، سلیم نے بروصہ پر قبضہ کرلیا لیکن اُس کی فوج کے بعض افسر شہزادہ احمد سے جا ملے اور لڑائی پھر چھڑ گئی، ابتدا میں احمد کو چند معمولی فتوحات حاصل ہوئیں، لیکن بالآخر اُسے اپنی جان لے کر بھاگنا پڑا، سلیم نے وزیر اعظم مصطفےٰ پاشا کو جو احمد سے مل گیا تھا، پھانسی دیدی اور اُس کے بعد اپنے پانچ بھتیجوں کو جو بروصہ کے بعض امرا کے گھروں میں چھپے ہوئے تھے گرفتار کرکے مروا ڈالا، یہ شہزادے اُس کے مرحوم بھائیوں شہنشاہ، عالم شاہ، اور محمود (جو بایزید کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے) کی اولاد تھے،

شہزادہ کرکود اس وقت تک اپنے علاقہ صاروخان میں خاموش بیٹھا تھا، لیکن ان شہزادوں کے قتل کی خبر سنکر اس نے سمجھ لیا کہ اس کی باری بھی اب آیا چاہتی ہے، اس لئے وہ بھی اب اپنی جان کی حفاظت کا سامان کرنے لگا، اور ینی چری کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش شروع کی، سلیم کو اس کی تیاریوں کی اطلاع ہو گئی، وہ نہایت خاموشی سے شکار کا بہانہ کرکے دس ہزار سواروں کے ساتھ کرکود کی حکومت میں داخل ہوا، اور اسے گرفتار کر لینا چاہا، کرکود بھاگا لیکن جلد پکڑ لیا گیا، سلیم نے سنان نامی ایک افسر کو اس کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ مرنے کے لئے فوراً تیار ہو جاؤ، رات کا وقت تھا، اور کرکود سو رہا تھا، سنان نے اس کو بیدار کرکے سلیم کا حکم سنایا، کرکود نے صرف ایک گھنٹہ کی مہلت مانگی، اس فرصت میں اس نے اپنی بےکسی کی موت پر ایک منظوم خط سلیم کے نام لکھا جس میں اس کی بے دردی کی شکایت کی، اس کے بعد اس نے اپنی گردن جلاد کے حوالہ کر دی، سلیم یہ خط پڑھکر جو حقیقۃً ایک نہایت دردناک مرثیہ تھا، بہت رویا، اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ تین روز تک خود بھی ماتم کرتا رہا اور تمام سلطنت میں بھی ماتم کا حکم دیا، جن ترکمانوں نے کرکود کے چھپنے کی جگہ کا پتہ بتایا تھا اور اب انعام کے لئے حاضر ہوئے تھے، سلیم نے ان سب کو قتل کرا دیا، اس درمیان میں احمد نے پھر ایک فوج اکٹھا کرکے سلیم کا مقابلہ کیا، اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوا، لیکن ۱۷ صفر ۹۱۹ھ (۲۴ اپریل ۱۵۱۳ء) کی جنگ میں اسے شکست ہوئی، اور وہ قید کر لیا گیا، اسے بھی گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا،

ایران سے جنگ

سلیم اب تخت سلطنت کی طرف سے مطمئن ہو گیا، وہ ایشیائے کوچک سے یورپ کو واپس ہوا، اور یورپ کی مختلف حکومتوں سے صلحناموں کی تجدید کرکے

اپنی سلطنت کے مغربی حصہ کو ہر طرح کے بیرونی خطرات سے محفوظ کر لیا، اور پھر مشرق کی جانب متوجہ ہوا، ایران کے تخت پر اس وقت شاہ اسمٰعیل صفوی متمکن تھا، جس نے چند سال قبل عراق عرب، خراسان اور دیار بکر پر قبضہ کر لیا تھا، اور اس کا ایک فوجی افسر بغداد میں بھی داخل ہو گیا تھا، ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں فارستان اور آذربیجان بھی سلطنت ایران میں شامل کر لئے گئے تھے، جو خلیج فارس سے بحر کاسپین اور فرات سے دریائے آموتک پھیلی ہوئی تھی، اس طرح ایران کی سرحد سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے مل گئی تھی، اتفاق یہ کہ دونوں سلطنتوں کے فرماں روا بھی شجاعت، عظمت اور ملک گیری کی ہوس میں ایک دوسرے کے ہم پایہ تھے، ایسی صورت میں دونوں کا تصادم ناگزیر تھا، تصادم کے متعدد اسباب موجود تھے، سب سے بڑا سبب مذہب کا اختلاف تھا شاہ اسمٰعیل ایک غالی شیعہ اور سلیم ایک متشدد سنی تھا، سلطنت عثمانیہ کے ایشیائی مقبوضات میں شیعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، شاہ اسمٰعیل کے گماشتے اناطولیہ میں شیعیت کی تلقین کرتے پھرتے تھے، اور اندر اندر لوگوں کو سلیم کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، سلیم شیعیت کا سخت دشمن تھا، وہ اسے سلطنت کے لئے ایک بڑا فتنہ خیال کرتا تھا، وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کی تخت نشینی سے ایک ہی سال قبل اسمٰعیل کے اعوان میں سے شاہ قلی نامی ایک شخص نے کس طرح تشیع کی تبلیغ کر کے اناطولیہ کے باشندوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا، اور اس فتنہ کے فرو کرنے میں کس قدر دشواری پیش آئی تھی، چنانچہ جب اسے اس قسم کا خطرہ پھر محسوس ہوا تو اس نے اپنی سلطنت سے شیعیت کا استیصال کر دینا چاہا اور جاسوسوں کے ذریعہ سے سلطنت کے تمام شیعوں کو شمار کرایا، ان کی تعداد ستر ہزار نکلی، پھر ایک روز دفعۃً ان میں سے چالیس ہزار

کو قتل کرا دیا، اور باقی تیس ہزار کو جنمیں عورتیں اور بچے شامل تھے قید میں ڈال دیا،
اس واقعہ سے تمام ایران میں ایک آگ سی لگ گئی لیکن سلیم کی قوت وسطوت کے مقابلہ میں اُس وقت شاہ اسمٰعیل کو اقدام کی جرأت نہ ہوئی، بہرحال ایران اور دولت عثمانیہ کی جنگ کا یہی ایک سبب نہ تھا، اس قتل عام سے قبل بھی دونوں سلطنتوں کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے، مثلاً بایزید ثانی کے عہد میں چھوٹی چھوٹی سرحدی لڑائیاں پیش آچکی تھیں جن میں شاہ اسمٰعیل نے بعض ترک سرداروں کو جو ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقوں کے حاکم تھے شکست دی تھی علاوہ بریں اُس نے دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں سلطان مصر سے اتحاد کر لیا تھا وہ سلطنت عثمانیہ کی رفتار ترقی کو روکنا چاہتا تھا، ان میں سے ہر سبب سلیم جیسے تند مزاج سلطان کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے کافی تھا، لیکن جس چیز نے اُس کو سب سے زیادہ برانگیختہ کیا وہ یہ تھی کہ شاہ اسمٰعیل نے مرحوم شہزادہ احمد کے لڑکے شہزادہ مراد کو پناہ دی، اور علانیہ اُس کی حمایت کر رہا تھا، نہ صرف یہ بلکہ سلیم کو تخت سے اتار کر مراد کو اُسکی جگہ بٹھانے کے لئے وہ اب فوجیں بھی جمع کر رہا تھا، سلیم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ایران پر حملہ کا تہیہ کر لیا اور شاہ اسمٰعیل کو میدان جنگ میں مقابلہ کی دعوت دی،

عثمانی فوجیں ینی شہر کے میدان میں جمع ہوئیں اور سلیم ۲۲ صفر ۹۲۰ھ (۲۰ اپریل ۱۵۱۴ء) کو ایک لاکھ چالیس ہزار فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ایران کے پایہ تخت تبریز کی طرف روانہ ہو گیا، ینی شہر سے تبریز کا فاصلہ ایک ہزار میل سے زیادہ تھا، راستہ بھی پہاڑی تھا، اور درمیان میں کوئی سڑک نہ تھی، سب سے بڑی دشواری سامان رسد کی فراہمی کی تھی، جب سلیم ایران کی سرحد پر پہنچا تو شاہ اسمٰعیل نے بجائے مقابلہ کرنے کے تمام علاقے

ویران کرادیئے، اور خود پایہ تخت کی طرف لوٹ گیا، اس سے سلیم کی مشکلات اور بڑھ گئیں، رسد کے ملنے میں سخت دشواری پیش آنے لگی، فوج میں جو لمبے طویل سفر سے بالکل خستہ ہو گئی تھی بے دلی کے آثار نمایاں ہونے لگے، اور اُس نے آگے بڑھنے میں تامل کیا، لیکن سلیم کی مستقل مزاجی بدستور قائم رہی، اور باوجود اس کے کہ رسد کی فراہمی روز بروز زیادہ دشوار ہوتی جاتی تھی اُس کے قدم نہ رکے، بالآخر فوج نے علانیہ طور پر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، سلیم کے لئے یہ موقع نہایت نازک تھا، مگر اُس کی غیر معمولی شجاعت نے فوج کو قابو سے باہر نہ ہونے دیا، وہ دلیری کے ساتھ اس کے سامنے گیا اور یوں کہنے لگا، "کیا اسی طرح تم اپنے سلطان کی خدمت کرتے ہو؟ کیا تمھارا ادعائے وفا محض زبانی تھا؟ جو لوگ واپس جانا چاہتے ہیں وہ فوج سے علٰحدہ ہو جائیں اور چلے جائیں، لیکن میں نے تو اتنی دور کا سفر اس لئے نہیں کیا ہے کہ یہاں سے لوٹ جاؤں، تم میں سے جو بزدل ہیں وہ فوراً اُن بہادروں سے علٰحدہ ہو جائیں جنھوں نے تیغ و تفنگ اور جسم و روح کے ساتھ ہماری مہم کے لئے اپنی جانیں وقف کر دی ہیں" یہ کہہ کر اُس نے دستہ قائم کر کے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، اور کسی ایک سپاہی کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ اپنا دستہ چھوڑ کر علٰحدہ ہو جائے،

ایرانیوں کی شکست عثمانی فوج جب تبریز کے قریب پہنچی تو شاہ اسمٰعیل کو مجبوراً مقابلہ کے لئے نکلنا پڑا، دونوں فوجیں ۲ رجب ۹۲۰ھ (۲۴ اگست ۱۵۱۴ء) کو وادی چالدیران میں صف آرا ہوئیں، ترکی لشکر کی تعداد جس نے بارہ سو میل کی سخت دشوار گذار راہ صرف ایک سو چھبیس ۱۲۶ روز کی قلیل مدت میں طے کی تھی، اب ایک لاکھ چالیس ہزار سے گھٹ کر ایک لاکھ بیس ہزار رہ گئی تھی، جس میں اسی ہزار سوار تھے، ایرانی فوج کی

مجموعی تعداد اسی ہزار تھی، یہ سب سوار تھے اور اپنی شجاعت اور سپہ گری کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھے عثمانی بالکل خستہ ہو رہے تھے، برخلاف اس کے ایرانی سوار تازہ دم تھے، جنگ کی ابتدا ایرانیوں کے موافق ہوئی، ایرانی سواروں کا جو دستہ شاہ اسمٰعیل کی سرکردگی میں تھا، اُس نے اپنے مقابل ترکی دستہ کو پسپا کر دیا، لیکن ترک فوراً ہی سنبھل گئے، اور اُنھوں نے پلٹ کر نہایت دلیری سے مقابلہ کیا، اس درمیان میں عثمانی توپوں نے گولے برسانا شروع کر دیئے، ایرانیوں کے پاس توپ خانے نہ تھے، وہ اس حملہ کی تاب نہ لا سکے اور پچیس ہزار لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگے، شاہ اسمٰعیل بھی زخمی ہو گیا تھا اور بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ سکا،

۱۴ رجب ۹۲۰ھ (۴ ستمبر ۱۵۱۴ء) کو سلیم تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا، وہاں سے اُس نے علاوہ شاہی خزانے کے ایک ہزار بہترین صناع اور کاریگر قسطنطنیہ روانہ کئے قسطنطنیہ میں ان لوگوں کو رہنے کے لئے مکانات اور اپنے پیشوں کے جاری رکھنے کے لئے تمام ضروری سامان دیئے گئے، تبریز میں آٹھ روز قیام کرنے کے بعد وہ شمال میں قرہ باغ کی جانب بڑھا، اُس کا ارادہ تھا کہ موسم سرما آذربیجان کے میدانوں میں گذارنے کے بعد بہار شروع ہونے پر پھر فتوحات کا سلسلہ شروع کرے، لیکن فوج اب بالکل خستہ ہو چکی تھی، اور آگے بڑھنے کے لئے تیار نہ تھی، سلیم کو اندیشہ ہوا کہ سختی کرنے سے ممکن ہے بغاوت برپا ہو جائے، اس لئے مجبوراً وہ قسطنطنیہ کی طرف واپس ہوا، شاہ اسمٰعیل سے کوئی صلحنامہ نہ ہوا، اور دونوں سلطنتوں کی جنگ کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک سلیم کی حیات تک قائم رہا، لیکن چالدیران کی جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیار بکر اور کردستان کے صوبے مکمل طور پر فتح کر لئے گئے اور ایران سے

نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے، سلیم نے ان صوبوں کا حاکم مشہور مورخ ادریس کو مقرر کیا، سلیم کے لئے پورے ایران کو عثمانی مقبوضات میں داخل کر لینا دشوار نہ تھا لیکن کسی مصلحت سے اُس نے ایسا کرنا مناسب نہ خیال کیا، جیساکہ ایورسلے کا خیال ہے شیعیت سے اُسے اس درجہ نفرت تھی کہ ممکن ہو اُسنے ایران کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی بجائے علیحدہ رکھنا ہی بہتر سمجھا ہو، اسی تشدد کے تحت اُس نے ایک فرمان نافذ کر کے ایران سے تجارت کرنا ممنوع قرار دیا، اور جب اُسے معلوم ہوا کہ چند تاجروں نے اس فرمان کی حکم عدولی کی ہے تو اُس نے اُن سب کے قتل کا حکم دیدیا، مفتی جمالی نے بمشکل اُس سے یہ حکم منسوخ کرایا،

شام و مصر ایران کے بعد سلیم شام اور مصر کی طرف متوجہ ہوا، یہ ممالک ڈھائی سو برس سے سلاطینِ مملوک کے زیر حکومت تھے، سلیم کے زمانہ میں اُن کا حکمراں قانصوہ غوری تھا، سلطان مصر کو حجاز کی فرماں روائی بھی حاصل تھی، دولت عثمانیہ اور سلطنت مصر کے تعلقات بایزید ثانی ہی کے وقت سے غیر خوشگوار تھے، جو لڑائیاں ان کے درمیان ہوئی تھیں اُن میں عثمانیوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی تھی، لیکن سلیم کی تخت نشینی کے بعد قانصوہ غوری کو معلوم ہو گیا کہ اب سلطنت عثمانیہ کی عنان حکومت ایک ایسے فرمانروا کے ہاتھ میں ہے، جو بایزید ثانی سے بالکل مختلف ہے، یہی وجہ تھی کہ اُس نے شاہ اسمٰعیل کی دعوت پر دولت عثمانیہ کے خلاف ایران سے اتحاد کر لیا تھا، کردستان اور دیار بکر کی فتح کے بعد عثمانی اور شامی مقبوضات ایک دوسرے سے بالکل قریب ہو گئے تھے، قانصوہ غوری نے ۹۲۲ھ (۱۵۱۶ء) میں ایک زبردست فوج شام کے شمالی علاقہ میں متعین کر دی تاکہ افواج عثمانی کی نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہے، سنان پاشا نے جو ایشیائے کوچک

کے جنوب مشرق میں ترکی لشکر کا سپہ سالار تھا اس واقعہ کی اطلاع سلیم کو دی اور لکھ بھیجا کہ
کہ ایسی صورت میں سلطان کے حسب ہدایت وادی فرات کی طرف کوچ کرنا خطرہ
سے خالی نہ ہوگا سلیم نے قسطنطنیہ میں دیوان منعقد کرکے اس مسئلہ کو غور و بحث کے لئے پیش کیا

دنیائے اسلام کا انتشار

یہ مسئلہ محض سلطنت مملوکیہ اور دولت عثمانیہ کی قوت آزمائی کا نہ تھا
بلکہ حقیقۃً اس کا تعلق دنیائے اسلام کے عام انتشار اور پراگندگی سے تھا، خلافت عباسیہ
کے مصر میں منتقل ہونے کے بعد اسلام کی متحدہ سیاسی قوت پارہ پارہ ہوگئی تھی اور خلیفہ
کا اقتدار صرف مذہبی اور رسمی رہ گیا تھا، سلطان سلیم کے ابتدائے عہد میں دنیائے اسلام
کے ضعف و انتشار کی جو حالت تھی اُس کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندوی کے محققانہ رسالہ
"خلافت عثمانیہ" کے حسب ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے،

"نویں صدی کے اواخر میں دنیائے اسلام کے نقشہ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ
اس عظیم الشان جمہوریت کا قالب بیجان ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے، اس کے دل و دماغ
(خلافت مصر) کی کمزوری اور ضعف کا یہ حال پہونچا ہو کہ وہ دور کے اجزائے بدن کی
تو کیا، آس پاس کے اعضاء کی قوت کا سہارا بھی نہیں رہے ہیں، بڑی بڑی سلطنتیں اور
حکومتیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں، امارتوں اور ٹکریوں میں بٹ گئی ہیں، ہندوستان سے
لے کر اسپین تک تم کو یہی کیفیت اور یہی نقشہ نظر آئیگا، ہندوستان کی طاقت سندھ،
گجرات، مالوہ، احمد نگر، بیجاپور، برہان پور، بیدر، کشمیر، جونپور، بنگال، دہلی وغیرہ صوبہ وار
حکومتوں میں منقسم ہوگئی ہے، ترکستان میں بخارا، بلخ، خوارزم، مرو اور کاشغر میں بیسیوں خان
چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حکمراں ہیں، روس کا علاقہ کریمیا، قازان، استراخان میں بٹ گیا ہے
علاقہ قفقاز میں آذربائیجان، داغستان، گرجستان، سب بکھرے ہوئے اجزا ہیں

افغانستان و خراسان میں مختلف تیموری شہزادے اور ترکمانی امرا ادھر اُدھر قسمت آزمائی کر رہے ہیں، عراق ایک مستقل حکومت ہے مصر و شام میں مملوک سلطانوں کی سلطنت ہے، عرب چھوٹے چھوٹے شیوخ میں بٹا ہوا ہے، یہاں تک کہ یمن میں تو ایک ایک شہر کا الگ الگ امیر ہے، حجاز شرفا کے ایک خاندان کے ماتحت تھا جو کبھی مصر کے زیر اثر بنجاتے تھے، اور جب کبھی موقع ملتا تھا، امام یمن سے ساز باز کر لیتے تھے، امام یمن اور سلطان مصر میں ایک سلسلہ جنگ برپا تھا، مصر کے پار سوڈان، طرابلس، تونس، الجزائر، فاس کتنی ہی ریاستیں تھیں اسپین کی ایک سلطنت کے غرناطہ، قرطبہ، طلیطلہ، شاطبہ، حمص، بطلیوس، کتنے ٹکڑے ہو گئے تھے، جن میں سے اب صرف ایک یا دو باقی تھے، غرض خانوادۂ اسلام کا ایک ایک گھر اجڑ گیا تھا، اور جامۂ خلافت کا تار تار الگ ہو گیا تھا۔"

یہ تو دنیائے اسلام کے انتشار کا نقشہ تھا، اس انتشار سے جو نتائج پیدا ہوئے ان کی تصویر بھی مولانائے موصوف کے قلم نے کھینچ دی ہے:۔

"یورپ کے مسیحی سپاہیوں نے ایک ہی دفعہ اس پر چار گوشوں سے حملہ کیا" ۸۹۳ھ سے روس نے ایشیائے وسطی کے صحرا سے اسلام پر اپنا حملہ شروع کیا، یہ قازان کی اسلامی ریاست تھی، اور ایک طویل سلسلہ جنگ کے بعد ۹۶۳ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا اس کے بعد استراخان اور کریمیا وغیرہ کی باری آئی، یہاں تک کہ اس کے ڈانڈے بحر اسود اور سرحد ایران سے آکر مل گئے، اسپین اور پرتگال ملک اندلس میں اسلام کا ۸۹۷ھ میں خاتمہ کر کے آگے کو بڑھے، اسپین نے دوستی کے پردہ میں تونس و الجزائر پر قبضہ کیا، پرتگال نے پورے افریقہ کو ناپ کر بحر عرب اور بحر ہند میں آکر اپنے ڈیرے ڈالے، اور عرب اور ہندوستان کے اسلامی سواحل پر قتل و غارت گری کا آغاز کیا،

دوسری طرف مراکش کے سواحل پر آ گرو طاسی خاندان پر حملہ آور ہوئے، جو مغرب میں
ایک نئی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال رہا تھا، اور آسفی، ازمورا اور معمورہ پر قبضہ کر لیا،
صلیبی سپاہیوں کی چوتھی کمین گاہ بحر روم کے جزائر تھے، قبرص (سائپرس) روڈس، مالٹا
اور وینس کے صلیبی دستے، مصر و شام کی ناکہ بندی میں مصروف تھے خصوصاً قبرص، روڈس
اور مالٹا تو سینٹ جان کے صلیبی مجاہدین کے بڑے بڑے مستحکم قلعے تھے جو دن رات
صرف مسلمانوں کے خون کے پیاسے رہتے تھے، اور یہی اُن کی زندگی کا مذہبی فرض تھا،
یہ درحقیقت گذشتہ صلیبی سپاہیوں کی یادگار اور فلسطین کی مسیحی نو د سالہ حکومت کی شکست خوردہ
فوج کی نسل تھے، یہ بحر روم کے دربان تھے جن کے سامنے سے کوئی اسلامی جہاز مسلمان
ملکوں کو روانہ نہیں ہو سکتا تھا، قبچاق، کریمیا، اور روم کے مسلمان حج نہیں کر سکتے تھے،
وینس کا بازار مسلمان عورتوں کی ناموس اور مسلمان مردوں کی آزادی کی خرید و فروخت
کی بڑی منڈی بن گئی تھی، جو قیدی کسی حال میں اسلام سے پھرنا گوارا نہیں کرتے تھے
اگر مرد ہوتے تو وہ مصر لا کر بیچ ڈالے جاتے تھے، جہاں وہ مملوک سپاہیوں میں بھرتی
کر لئے جاتے تھے، اور اگر لڑکیاں ہوتیں تو وہ اٹلی کے امرا اور دولتمندوں کے عشرت خانوں
میں بھیج دی جاتی تھیں، اور جب کبھی موقع ملتا، وہ اسکندریہ تک دھاوا کرتے چلے آتے،

اس سے زیادہ بدقسمتی یہ کہ اسی زمانہ میں ۹۰۵ھ میں ایران و خراسان میں صفوی
خاندان کا ظہور ہوا جس نے تنگ نظری سے اسلام کے بجائے شیعیت کو اپنے سیاسی
کارناموں کا مرکز قرار دیا، اہل سنت یا تو اس ملک سے جلاوطن ہونے پر مجبور ہوئے
یا ہنگاموں میں قتل ہوئے، یا وہ شیعہ بنا ڈالے گئے، اس سے بڑھ کر یہ کہ صفویوں نے سلطنت
عثمانیہ کے باغی شہزادوں کو اپنے ہاں پناہ دی، اور سلطان مصر سے خط و کتابت

کرکے سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک متحدہ حملہ کا سامان کیا، اس کا نتیجہ باہمی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں، اور مجموعی حیثیت سے اسلام کی تباہی۔"

دیوان کا فیصلہ دنیائے اسلام کی یہ حالت سلیم سے پوشیدہ نہ تھی، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس ضعف و انتشار کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خلافت اور سلطنت دو علیحدہ علیحدہ شخصیتوں میں تقسیم کر دی گئی ہے، اسلام کے گذشتہ اقتدار کو از سر نو قائم کرنے کے لئے اُس کے نزدیک ان دونوں شخصیتوں کو ایک ہی ہستی میں مدغم کر دینا نہایت ضروری تھا، اور چونکہ دولت عثمانیہ سے زیادہ طاقتور اُس وقت کوئی دوسری اسلامی سلطنت نہ تھی، اور دفاع و جہاد کا فرض جو منصب خلافت کا پہلا مقصد ہے، ڈیڑھ سو برس سے وہی ادا کر رہی تھی، اس لئے دنیائے اسلام کی امامت کا حقدار بھی اُس سے زیادہ کوئی دوسرا نہ تھا، لیکن حجاز و مصر و شام پر جو اسلامی دنیا کے اصلی عناصر تھے، مصر کے مملوک سلاطین کی حکومت تھی، اور ان اجزاء کو شامل کئے بغیر خلافت کا دائرہ اقتدار مکمل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ جب سلیم نے سنان پاشا کی تحریر دیوان کے سامنے پیش کی تو نہ صرف قانصوہ غوری کی معاندانہ روش پر غور کیا گیا جو اسمٰعیل سے ملا ہوا تھا، اور جس نے ایران کی جنگ کے موقع پر سامان رسد کے قافلہ کو عثمانی لشکر میں جانے سے روک دیا تھا[1]، بلکہ خلافت و امامت کے مسئلہ پر بھی مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں بہت دیر تک بحث ہوتی رہی، بالآخر یہ طے پایا کہ حرمین شریفین کی خدمت کا حق سلطان عثمانی سے زیادہ کسی دوسرے مسلمان حکمراں کو نہیں پہنچتا، اور اس کے لئے جنگ ناگزیر ہے، رئیس آفندی محمد پاشا نے اس رائے کی موافقت میں ایک نہایت

[1] "فتوحات اسلامیہ" از مفتی دحلان مکی۔ جلد ۲ صفحہ ۱۲۳، مطبوعہ مصر ۱۳۲۰ھ۔

پرزور تقریر کی، اور کہا کہ دولت علیہ کا فرض ہے کہ اس حق کو بذریعہ فتح حاصل کرے
سلیم محمد پاشا کی تقریر سے اس قدر خوش ہوا کہ اُسی وقت اُس کو وزیر اعظم مقرر کر دیا،
غرض دیوان نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے قانصوہ غوری سے اطاعت کا مطالبہ کرنا چاہئے اور
اگر وہ انکار کرے تو لڑائی شروع کر دیجائے،

شام کی فتح

قانصوہ غوری اُس وقت حلب میں مقیم تھا، سلیم کے ایلچی جب یہ پیغام لیکر اُس کے پاس پہنچے، تو اُس نے برافروختہ ہو کر اُن کو قید میں ڈال دیا، لیکن سلیم لڑائی کا عزم پہلے ہی کر چکا تھا، ایلچیوں کے روانہ کرنے کے فوراً ہی بعد وہ خود بھی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے شام کی طرف روانہ ہو گیا تھا، جب عثمانی لشکر شام کی سرحد میں داخل ہوا، تو قانصوہ غوری کو اپنی غلطی کی اہمیت معلوم ہوئی، اُس نے سلیم کے ایلچیوں کو فوراً رہا کر دیا، اور صلح کی گفتگو شروع کی، مگر سلیم صلح کے لئے قسطنطنیہ سے نہیں روانہ ہوا تھا ۲۵ رجب ۹۲۲ھ (۲۴ اگست ۱۵۱۶ء) کو حلب سے قریب مرج دابق کے میدان میں پہلا معرکہ پیش آیا، جس نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، مملوک نہایت بہادری سے لڑے لیکن آپس کے اختلافات سے ان کی قوت پہلے ہی کمزور ہو گئی تھی، علاوہ بریں قانصوہ غوری کے دو فوجی سرداروں یعنی خیر بے اور غزالی نے لڑائی شروع ہونے سے قبل سلیم سے ساز باز کر لیا تھا، خیر بے حلب کا گورنر تھا، اور غزالی فوج کا ایک بڑا افسر تھا، ان دونوں نے عین موقع پر غداری کی، اور حلبانوں کے دستوں کو لے کر جو جرکسی مملوکوں سے نیچے درجہ کے مملوک تھے اور جرکسوں سے حریفانہ رقابت رکھتے تھے، میدانِ جنگ سے بھاگ گئے، قانصوہ غوری کے پاس توپیں نہ تھیں، عثمانی توپوں کی گولہ باری نے مصری فوج کو جس کی قوت خیر بے اور غزالی کی

غداری سے ٹوٹ چکی تھی، زیادہ دیر تک میدان میں ٹھہرنے نہ دیا، صرف ایک گھنٹہ کے اندر لڑائی ختم ہوگئی، بوڑھا سلطان قانصوہ غوری بھی یہ دیکھکر کہ اب مقابلہ بے سود ہے، بھاگا لیکن شاید اپنے ہی سپاہیوں کی بھیڑ میں دب کر مارا گیا،

حلب کا خیر مقدم | سلیم فاتح کی حیثیت سے حلب میں داخل ہوا، خیر بک نے شہر کی کنجیاں پیش کیں، باشندگان شہر نے حاضر ہوکر وفاداری کا حلف لیا، مفتی دحلان کی لکھتے ہیں کہ حلب کے باشندے اپنے علما اور صلحاء کے ساتھ سروں پر قرآن رکھے ہوئے سلطان کے استقبال کو آئے، فتح کی تہنیت پیش کی اور رحم و درگذر کے خواستگار ہوئے، سلیم ان سب سے مہربانی کے ساتھ پیش آیا، پھر جب وہ جامع مسجد میں گیا تو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، پہلے سلاطین مصر کے القاب میں "خادم الحرمین الشریفین" کا لقب شامل کیا جاتا تھا لیکن حلب کی فتح کے بعد جامع مسجد کا خطیب جب خطبہ دینے کھڑا ہوا تو سلطان سلیم خاں کے نام کے ساتھ اس لقب کا اضافہ کیا، سلیم نے اسے آیندہ کامیابی کی بشارت خیال کیا اور اس قدر خوش ہوا کہ جو حلہ پہنے ہوئے تھا، اتار کر اسی وقت خطیب کو دیدیا[1]

دیگر فتوحات | حلب میں چند دنوں قیام کرنے کے بعد سلیم شام کے دوسرے شہروں کی فتح کے لئے روانہ ہوا، ہر شہر نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے دروازے کھول دیئے، اور وہاں کے لوگوں نے آگے بڑھکر اس کا خیر مقدم کیا، سلیم نے ان کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کیا، اور اپنے الطاف و اکرام سے انھیں بالکل مطمئن کر دیا، چنانچہ دمشق بیت المقدس، حمص اور متعدد دوسرے شہر نہایت آسانی سے فتح ہوگئے، اور ہر جگہ سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، دمشق میں اس نے شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے مزار پر ایک

---

[1] فتوحات اسلامیہ، جلد ۲ صفحہ ۱۲۳،

مقبرہ تعمیر کرنے کا حکم دیا، اور وہاں فقراء کے لئے ایک مطبخ بھی قائم کیا، اور اس کے اخراجات کے لئے کافی جائداد وقف کردی[1]،

طومان بے۔ شام کے اس آسانی سے فتح ہوجانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ قانصوہ غوری کی وفات پر اُس کے جانشین کے انتخاب کے لئے مملوکوں کے تمام بڑے بڑے فوجی سردار فوراً قاہرہ روانہ ہوگئے اور میدان عثمانیوں کے لئے خالی ہوگیا، مملوکوں میں دستور یہ تھا کہ سلطان کا انتخاب چوبیس بلند پایہ امراء کیا کرتے تھے جو فوج و حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور ہوتے تھے، چنانچہ اس موقع پر بھی یہ امراء قاہرہ میں جمع ہوئے اور انھوں نے طومان بے کو جو اپنی حیرت انگیز شجاعت، فوجی قابلیت اور شریفانہ اوصاف و خصائل کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز تھا، سلطان منتخب کیا، طومان بے کے انتخاب سے مملوکوں میں ایک تازہ روح پیدا ہوگئی،

معرکہ ردانیہ۔ شام کی فتح کے بعد سلیم نے مصر کی طرف کوچ کی تیاری کی، اُدھر طومان بے بھی مدافعت کا سامان کر رہا تھا، سب سے پہلے اُس نے ایک فوج غزہ روانہ کی تاکہ عثمانی لشکر کو مصر کی طرف بڑھنے سے روکے، اور خود قاہرہ کے قریب مصری افواج کے بڑے حصہ کو جمع کرنا شروع کیا، غزہ میں مملوکوں اور عثمانیوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا، لیکن صدر اعظم سنان پاشا کی سپہ سالاری اور ترکی توپوں کی گولہ باری نے مملوکوں کے قدم اکھاڑ دیئے، اس کے بعد مصر کی سرحد تک پھر کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور سلیم کی فوج نے دس روز کے اندر ریگستان کو عبور کرلیا، سلیم نے اس مہم کے لئے کئی ہزار اونٹ خرید لئے تھے، ان پر فوج کے لئے پانی کے مشکیزے لدے ہوئے

[1] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام، برحاشیہ خلاصۃ الکلام، صفحہ ۱۸۸، مطبوعہ مصر، ۱۳۰۵ھ،

تھے، مصری فوجیں قاہرہ سے تھوڑے فاصلہ پر ردانیہ میں خیمہ زن تھیں، وہیں ۲۹ ذی الحجہ ۹۲۲ھ (۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء) کو مقابلہ ہوا، اس معرکہ میں بھی اگرچہ پہلی جنگوں کی طرح توپخانوں کی وجہ سے میدان ترکوں کے ہی ہاتھ رہا تاہم مملوکوں نے جیسی غیر معمولی شجاعت اور جانبازی کا ثبوت دیا، اُس کی مثال تاریخ کے صفحات میں کم ملتی ہے، لڑائی کے شروع میں ہی سواروں کا ایک دستہ جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا، عثمانی فوج کے قلب پر جہاں سلطانی علم لہرا رہا تھا حملہ آور ہوا، اس دستہ کی قیادت خود طومان بے اور اس کے دو بہترین افسر الان بے اور قرط بے کر رہے تھے، ان لوگوں نے قسم کھائی تھی کہ یا تو سلیم کو زندہ گرفتار کریں گے یا اُسے قتل کر کے چھوڑیں گے یہ قسم پوری ہو کر رہتی، مگر حسنِ اتفاق سے اس وقت بجائے سلیم کے صدر اعظم سنان پاشا وہاں چند خاص خاص فوجی افسروں کے حلقہ میں کھڑا ہوا تھا، طومان بے نے اُسی کو سلیم سمجھ کر ایک نیزہ ایسا مارا کہ سینہ کے پار ہو گیا، الان بے اور قرط بے نے بھی ایک ایک پاشا کو قتل کیا، اور پھر گھوڑے موڑ کر یہ تینوں بحفاظت اپنی فوج میں واپس آ گئے، البتہ الان بے کو بندوق کی گولی سے ایک زخم لگ گیا تھا، یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے ہو گیا، طومان بے سمجھا تھا کہ سلیم کے قتل کے بعد ترکوں کی ہمت چھوٹ جائے گی۔ دوسرے مملوکوں نے بھی اپنے سرداروں کی طرح سپہ گری اور جانبازی کا حق ادا کر دیا، لیکن اُن کی بے مثل شجاعت اور سرفروشی ترکی توپوں کے مقابلہ میں بے سود ثابت ہوئی پچیس ہزار مملوک سواروں کی لاشیں تحفظ وطن کی قیمت نہ ادا کر سکیں، اور طومان بے کو بالآخر اپنے بقیہ سواروں کے ساتھ میدان چھوڑنا پڑا،

قاہرہ میں قتل عام جنگ ردانیہ کے ایک ہفتہ بعد عثمانی فوج کا ایک دستہ بلا مزاحمت

قاہرہ میں داخل ہوا، لیکن طومان بے نے آکر دفعۃً اس پر چھاپا مارا، اور پورے دستہ کو
تہ تیغ کردیا، اب سلیم نے اپنی بہترین فوجیں قاہرہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے روانہ
کیں، شہر کے گرد باقاعدہ استحکامات نہ تھے لیکن مملوکوں نے گویا ہر سڑک کو میدان جنگ
اور ہر مکان کو قلعہ بنا دیا تھا، عثمانیوں کو ہر ہر قدم پر مزاحمت کا سامنا تھا، تین دن تک
نہایت سخت لڑائی ہوتی رہی، آخر کار خیر بے کے مشورے سے سلیم نے یہ اعلان کرایا
کہ جو مملوک ہتھیار ڈال دیں گے، ان کی جانیں بخش دیجائیں گی، اس اعلان پر اعتبار
کر کے مملوکوں نے لڑائی موقوف کردی، اور ان میں سے آٹھ سو ممتاز آدمیوں نے
اپنے کو سلیم کے حوالہ کردیا، سلیم نے خلاف عہد ان سب کو قتل کرادیا، اس کے بعد اس نے
حکم دیا کہ شہر کے تمام باشندے تہ تیغ کردیئے جائیں، کریسی کا بیان ہے کہ پچاس ہزار آدمی
اس قتل عام میں مارے گئے،

قرطبے قرط بے کچھ دنوں تک قاہرہ میں چھپا رہا، لیکن پھر سلیم کے وعدوں پر
اعتماد کر کے اس نے بھی اپنے کو پیش کردیا، اس موقع پر سلیم اور قرط بے کے درمیان
جو گفتگو ہوئی اسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں، کریسی نے ان دونوں کی ملاقات کا
حال اور ان کی گفتگو فان ہیمر کے حوالہ سے نقل کی ہے، اور فان ہیمر نے منجملہ اور
اسناد کے ایک ایسے شخص کی سند بھی پیش کی ہے، جو طومان بے کے دربار کا ایک
عہدہ دار تھا[1]، قرط بے جب سلیم کے سامنے آیا تو وہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسروں
کے حلقہ میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا، لیکن فاتح سلطان کی یہ شان اس بہادر مملوک کو مطلق
متاثر نہ کرسکی، سلیم نے اس کے بیخوف چہرے پر نظر ڈالی اور پوچھا: "تو ایک نامور
شہسوار تھا، تیری شجاعت اب کہاں ہے؟" قرط بے نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ میرے

[1] کریسی جلد ۱ ص ۲۳۳، فٹ نوٹ،

ساتھ ہے"۔ سلیم نے کہا: - کیا تجھے معلوم ہے کہ تو نے میری فوج کے ساتھ کیا کیا ہے؟"
"مجھے خوب معلوم ہے"۔ یہ جواب بھی پہلے جواب کا سا مختصر اور مسکت تھا، اس کے بعد
سلیم نے اس دلیرانہ حملہ پر اظہار تعجب کیا، جو قرط بے نے روانیہ کے میدان میں طومان
بے اور الان بے کے ساتھ اس پر کرنا چاہا تھا، اور جو سنان پاشا کے لئے اس قدر مہلک
ثابت ہوا، قرط بے اپنی خوش بیانی کے لئے بھی اُسی قدر مشہور تھا جس قدر اپنی بہادری
کے لئے، اُس نے اس کے جواب میں مملوکوں کی شجاعت پر ایک پرزور تقریر کی جس میں
توپ اور بندوق کا ذکر نفرت و حقارت کے ساتھ کیا، کیونکہ اُن کا وار بہادرانہ
نہیں ہوتا، بلکہ وہ بزدلانہ طریقہ پر مارتی ہیں، اُس نے سلیم کو بتایا کہ بندوقیں مصر میں سب سے
پہلے اشرف قانصوہ کے عہد میں لائی گئی تھیں، جبکہ مارنیس کے ایک شخص نے مملوکوں
کو بندوق سے مسلح کر دینے کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی لیکن سلطان اور اس کے فوجی
افسروں نے جنگ میں اس بدعت کے جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ ایک تو
یہ حقیقی شجاعت کے شایانِ شان نہیں، دوسرے آنحضرت صلعم کے طریقہ کے بھی خلاف
ہے، قرط بے نے کہا کہ جب اُس شخص سے انکار کیا گیا تو وہ چلا اُٹھا، اور کہنے لگا کہ "تم
میں سے کچھ لوگ اُس وقت تک زندہ رہیں گے، اور دیکھیں گے کہ یہ سلطنت انہی گولیوں
سے ختم ہو کر رہے گی"۔ یہ بیان کر کے قرط بے نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ افسوس
وہ پیشین گوئی پوری ہوئی، لیکن تمام قدرت اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھوں میں ہے"۔ سلیم نے
پوچھا کہ "اگر تم خدا پر بھروسہ رکھتے ہو تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم نے تمھیں شکست دی
اور تمھارے قلعوں سے تم کو مار بھگایا، اور خود تو اس وقت میرے سامنے ایک قیدی
کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہے؟" قرط بے نے جواب دیا کہ "خدا کی قسم ہمیں شکست اس وجہ

سے نہیں ہوئی کہ تم لڑائی میں ہم سے زیادہ بہادر یا ہم سے بہتر شہ سوار تھے، بلکہ ہم اسلئے
ہارے کہ یہی ہماری تقدیر میں تھا، کیونکہ ہر وہ شے جو ابتدا رکھتی ہے، ایک روز ختم ہو کر
رہے گی، اور سلطنت کی مدت بھی محدود ہے، خلفا یعنی اسلام کے وہ زبردست حامی آج کہاں
ہیں؟ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتور سلطنتیں کہاں ہیں؟ اے آل عثمان تمہارا وقت بھی
آنے والا ہے، اور تمہاری حکومت بھی اپنے وقت پر ختم ہو کر رہے گی، جہاں تک میری
ذات کا تعلق ہے اے سلطان سلیم میں تیرا قیدی نہیں ہوں، بلکہ تیرے وعدوں اور
عہد و پیمان کی بنا پر یہاں آزاد اور بے خطر کھڑا ہوں۔" اس کے بعد قرط بے خیر بے
کی طرف متوجہ ہوا جو سلیم کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا، اور اس پر نہایت سخت لعن طعن
کرنے کے بعد سلیم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ "اس غدار کا سر اڑا دے، ورنہ کہیں
تجھے بھی یہ اپنے ساتھ جہنم میں گھسیٹ نہ لیجائے۔" اس پر سلیم نے غضبناک ہو کر
کہا: "میں نے سوچا تھا کہ تجھے آزاد کر دوں گا، بلکہ اپنے اعلیٰ فوجی عہدہ داروں میں بھی
شامل کر لوں گا، لیکن تو نے بے ادبی کے ساتھ گفتگو کی ہے اور میری موجودگی کا احترام
ملحوظ نہیں رکھا ہے، جو شخص بادشاہوں کے حضور میں خلاف ادب طریقہ اختیار
کرتا ہے، وہ فضیحت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔" قرط بے نے دلیری کے ساتھ جواب
دیا: "خدا مجھے تیرا عہدہ دار ہونے سے بچائے۔" یہ سنکر سلیم کا غصہ ناقابل برداشت
ہو گیا، اور اس نے جلادوں کو طلب کیا، قرط بے نے سلیم سے کہا: "تنہا میرے قتل سے
تجھے کیا فائدہ پہونچے گا، جب کہ بہت سے بہادر خود تیرے سر کی فکر میں ہیں، اور
طومان بے اب بھی اپنی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔" سلیم نے جلادوں
میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا، جلاد نے جوں ہی تلوار اٹھائی، قرط بے نے ایک

پھر خیر بے کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اے غدار میرے خون آلود سر کو لیجا اور اپنی بیوی کی گود میں ڈال دے، خدا غدار کو اُس کے فعل کا ویسا ہی بدلہ دے" یہ آخری الفاظ تھے جو اس بہادر مملوک کی زبان سے ادا ہوئے،

طومان بے کا قتل قاہرہ کے مفتوح ہو جانے کے بعد بھی طومان بے مایوس نہیں ہوا تھا، چونکہ مملوکوں کی بہت بڑی تعداد قتل ہو چکی تھی، اس لئے اُس نے مملوک سلاطین کی سابق روایات کے برخلاف عربوں کو اپنی فوج میں داخل کیا، اور چند دنوں تک کامیابی کے ساتھ عثمانی دستوں کا مقابلہ کرتا رہا، سلیم نے اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لو تو مصر کا تخت تمھارے لئے چھوڑ دیا جائے، لیکن قاہرہ کے غدارانہ قتل عام اور قرطبے کے قتل سے نہ صرف سلیم کے وعدوں کا اعتبار اُٹھ گیا تھا، بلکہ مملوکوں کی آتش غضب بھڑک اُٹھی تھی، چنانچہ جب سلیم کا ایلچی یہ پیغام لے کر طومان بے کے دربار میں پہونچا تو اُنھوں نے اسے اور اُس کے تمام ہمراہیوں کو قتل کر دیا، سلیم نے اس کے جواب میں تین ہزار مملوک قیدیوں کو تہ تیغ کرا دیا، ان واقعات سے یہ صاف ظاہر تھا کہ صلح کی کوئی اُمید نہیں، کچھ عرصہ تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، مگر بدقسمتی سے اسی زمانہ میں جب عثمانی فوج حملے کر رہی تھی، خود عربوں اور مملوکوں میں باہم جھگڑے شروع ہو گئے، جس سے طومان بے کی قوت کو سخت نقصان پہنچا، آخر میں اسکی تمام فوج منتشر ہو گئی، اور اسے بھاگ کر روپوش ہونا پڑا، لیکن بعض ساتھیوں نے اس کے ساتھ دغا کی، اور اسے عثمانیوں کے حوالہ کر دیا، سلیم کو جب اُس کی گرفتاری کی اطلاع ہوئی تو وہ جوشِ مسرت میں چلا اُٹھا کہ "الحمد للہ، مصر اب فتح ہوا" بہرحال اُس نے شروع میں طومان بے کے ساتھ مناسب عزت و احترام کا سلوک کیا، لیکن چند دنوں کے بعد غزالی اور خیر بے نے طومان بے

کے خلاف اس کے کان بھرنا شروع کئے، اور اُسے یقین دلایا کہ طومان بے کو آزاد کرانے کے لئے ایک زبردست سازش کی جارہی ہے، سلیم نے ان غداروں کے فریب میں آکر طومان بے کو قتل کرادیا، سلاطینِ مصر کے مملوکی سلسلہ کی یہ آخری کڑی تھی جو ۱۷ اپریل ۱۵۱۷ء کو ٹوٹ گئی،

مصر کا نظامِ حکومت

مصر فتح ہوگیا لیکن اُس کے نظم ونسق کا مسئلہ بہت مشکل تھا، باوجود اس کے کہ مملوکوں کی قوت ٹوٹ چکی تھی، سلیم کو اُن کی طرف سے اطمینان نہ تھا، اور چونکہ مصر قسطنطنیہ سے بہت زیادہ فاصلہ پر واقع تھا، اس لئے مملوکوں کی بغاوت کا اندیشہ اور بھی زیادہ قوی تھا، اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے سلیم نے مصر کا دستورِ حکومت مرتب کرتے وقت جو چیز خاص طور پر پیش نظر رکھی، وہ یہ تھی کہ حکومت ملک کے مختلف طبقوں میں اس طرح تقسیم کردیجائے کہ دولت عثمانیہ کے خلاف اُن کے باہم متحد ہونے کا امکان کم سے کم رہ جائے، چنانچہ اسی غرض سے اُس نے نہ تو مملوکوں کا بالکل قلع قمع کیا، اور نہ اُن کے سرداروں کو سرکیشیا سے نئے غلام بھرتی کرنے سے روکا، مملوک سلاطین کے عہد میں مصر وشام کی حکومت چوبیس اضلاع میں تقسیم تھی، اور ہر ضلع پر ایک مملوک امیر حاکم تھا، سلیم نے اس نظام کو برقرار رکھا، اور دونوں ملکوں کو بارہ بارہ سنجقوں میں تقسیم کرکے ہر سنجق پر ایک مملوک سردار کو مقرر کیا، مرکزی حکومت کے لئے اُس نے ایک مجلس مقرر کی جو دیوان کبیر کے نام سے موسوم تھی، اس کا صدر پورے ملک کا والی بنایا گیا، سلیم نے اس عہدہ پر خیر بے کو مقرر کیا، لیکن چونکہ وہ اپنے سابق آقا قانصوہ غوری کے ساتھ غداری کرچکا تھا، اس لئے سلیم نے اُس کی بیویوں اور بچوں کو ضمانت کے طور پر یورپ بھیج دیا، اسی طرح غزالی شام کا والی مقرر ہوا، دیوان کبیر کے ارکان کو ہم

اختیار دیا گیا کہ معقول اسباب کی بنا پر والی کے احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں، اور اگر ضرورت سمجھیں تو اسے معزول کر کے دوسرا والی منتخب کر سکتے ہیں لیکن اس انتخاب کے لئے باب عالی کی منظوری لازمی قرار دی گئی، ان اختیارات کے عطا کرنے سے سلیم کا مقصد یہ تھا کہ کوئی والی اتنی قوت حاصل نہ کر سکے کہ آگے چل کر اس کے اندر خود مختاری کا حوصلہ پیدا ہو، والی کو قابو میں رکھنے کے لئے سلیم نے پانچ ہزار سواروں اور پانچ سو ینی چری سپاہیوں کی ایک مستقل فوج بھی قاہرہ میں متعین کر دی، اور آغا خیر الدین کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا، اُسے خاص طور پر حکم تھا کہ کسی حالت میں بھی قلعہ کے باہر نہ جائے تقسیمِ اقتدار کے اسی اُصول کے ماتحت سلیم نے اکثر عدالتی اور مذہبی عہدوں پر عرب شیوخ کو مامور کیا، جن کا اثر مصر کی عربی النسل آبادی پر بہت زیادہ تھا، یہ لوگ مملوکوں سے زیادہ عثمانیوں کی جانب مائل تھے، محاصل کی تحصیل وصول کا کام عموماً قبطیوں اور یہودیوں کے سپرد کیا گیا،

خادم الحرمین الشریفین مصر کی فتح کے بعد حجاز پر بھی جو اس وقت تک مملوک سلاطین کے زیر حکومت تھا، دولت عثمانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا، لیکن شروع میں سلیم کو امید نہ تھی کہ حرمین شریفین کی خدمت کا شرف بغیر جنگ کے حاصل ہو سکے گا، کیونکہ حجاز کی حکومت سابق سلطانِ مصر کے عمال کے ہاتھوں میں تھی، چنانچہ ان عمال کو برطرف کرنے کیلئے اُس نے ایک فوج حجاز میں بھیجنا چاہی لیکن قاضی صلاح الدین کے مشورہ سے جو ایک مشہور عالم تھے اور جنھیں سلیم نے سلطان غوری کی قید سے رہا کیا تھا، اصل مقصد بغیر کسی جنگ کے حاصل ہو گیا، مفتی دحلان لکھتے ہیں کہ قاضی موصوف نے سلطان سلیم کے وزیر کو یہ مشورہ دیا کہ حجاز میں فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ شریف برکات بن حسن بن عجلان جو اس وقت

مکہ معظمہ کے امیر تھے) سلطان کی اطاعت کے لئے آمادہ ہیں، اور اُن کے اثر سے اہل حرمین اور باشندگان حجاز بھی سلطان کی بیعت کے لئے تیار ہو جائیں گے، اس لئے بجائے فوج کے شریف کے نام صرف ایک فرمان بھیج دینا کافی ہوگا، سلیم نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور امیر مصلح بیگ کی معرفت فرمان ہمایونی مع دو بیش قیمت خلعتوں کے ایک خود شریف برکات کے لئے اور دوسرا اُن کے بیٹے ابونمی کے لئے جو مکہ کی امارت میں اپنے باپ کا شریک تھا بھیجا اور دونوں کو بدستور ان کے عہدوں پر قائم رکھا، حج کا زمانہ قریب تھا، اس لئے سلیم نے مصلح بیگ کے ساتھ محمل شریف کو بھی روانہ کیا، چنانچہ جب مصلح بیگ مکہ کے قریب پہنچا تو شریف برکات اپنے بیٹے اور دیگر معززین کو لے کر اُس کے استقبال کے لئے نکلے، باپ بیٹوں نے خلعتِ سلطانی کو پہنا اور مکہ معظمہ واپس آکر لوگوں سے سلطان کی بیعت لی، اور سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا،[۱] "خادم الحرمین الشریفین" کا لقب جو ایک مسلمان فرماں روا کے لئے سب سے زیادہ معزز لقب ہے سلطان سلیم کے نام کے ساتھ شامل کیا گیا، اور اس کا اعلان اس مقدس سرزمین میں ایسے وقت ہوا، جب تمام دنیا کے مسلمان حج کے لئے اکٹھا ہوئے تھے، حرمین شریفین کی خدمت کا شرف سلیم کے بعد اُس کے جانشینوں کو چار سو برس تک حاصل رہا، اس طویل مدت میں اُنھوں نے باشندگانِ حجاز اور خصوصاً اہلِ حرمین کی خدمت کا حق جس طرح ادا کیا، اُس کی تفصیلات سے تاریخ کے صفحات پر ہیں، اور اُس کی یاد اب اُن عربوں کو خون کے آنسو رلا رہی ہے، جنھوں نے جنگ عمومی میں اپنی آزادی کی پیاس ترکوں کے خون سے بجھانی چاہی، مگر طلسمِ فرنگ کے پیدا کردہ

[۱] فتوحات اسلامیہ، جلد ۲ ص ۱۲۵،

سراب سے حقیقی حریت کی موجیں آج تک نہ اُٹھ سکیں،

سلیم کو اہل حرمین کی خدمت کا موقع صرف تین سال کے لئے حاصل ہوا، اس قلیل مدت میں اس نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعات سے ہو سکتا ہے جو مفتی دحلان کی مستند تالیف "فتوحات اسلامیہ" سے ماخوذ ہیں:۔

سلاطین مملوک کی طرف سے شریف مکہ کو جو وظیفہ ملتا تھا سلیم نے اُسیں پانچسو دینار کا اضافہ کر دیا، اُس نے ایک دفتر قائم کیا جس میں حرم محترم کے مجاوروں کے نام لکھے گئے، ان میں سے ہر ایک کا وظیفہ سو دینار مقرر کیا گیا، جو مصر کے خزانہ سے ادا کیا جاتا تھا، اس نے تیس آدمیوں کی ایک جماعت بھی مقرر کی جو روزانہ قرآن پاک کا ایک ختم پڑھتی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بارہ دینار مقرر کی سلاطین مصر ہر سال بدوؤں اور فقرائے مکہ کے لئے غلہ بھیجا کرتے تھے سلیم نے اس دستور کو جاری رکھا اور حکم دیا کہ ہر سال سات ہزار اردب (کم و بیش من) غلہ اہل حرمین کے لئے بھیجا جائے، اس میں سے پانچ ہزار اردب مکہ معظمہ کے لئے اور دو ہزار اردب مدینہ منورہ کے لئے مقرر ہو، مفتی دحلان لکھتے ہیں کہ سلیم کے بعد دوسرے سلاطین عثمانی غلہ کی مقدار میں اضافہ کرتے گئے، یہاں تک کہ مکہ معظمہ کے لئے بارہ ہزار اردب اور مدینہ منورہ کے لئے سات ہزار اردب غلہ آنے لگا، سلیم نے مکہ معظمہ میں مقام حنفی کو از سر نو تعمیر کرایا، اور مدینہ منورہ میں امیر مصلح بیگ کو بھیج کر بہت سے رفاہی کام انجام دیئے، اُس کی داد و دہش اور امور خیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں حرمین شریفین میں فارغ البالی پھیل گئی، شیخ قطبی جو مکہ کے ایک مشہور عالم اور سلیم کے معاصر تھے بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے بچپن میں مطاف کو اکثر خالی پاتا تھا، اور تنہا طواف

کرتا تھا، بازار مصر کو بھی چاشت کے وقت تک سنسان دیکھتا تھا، اور اکثر یہ دیکھتا تھا کہ غلہ فروشوں کے قافلے آئے ہوئے ہیں، مگر خریدنے والے بہت کم ہیں لیکن اب دولت عثمانیہ کے عہد میں لوگوں کی کثرت ہے، رزق وسیع ہے، خوشحالی اور فارغ البالی ہے، اور لوگ اس سلطنت کے زیر سایہ امن و اطمینان میں ہیں، اور اس کے انعام و اکرام کے دریا میں غوطے لگا رہے ہیں[۵]"

خلافت | غرض حرمین شریفین کی خدمت کا شرف جب سلیم کو حاصل ہو گیا تو آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے جو قاہرہ میں سلاطین مملوک کے زیر سایہ ظاہری شان و شوکت کیساتھ مگر حقیقۃً بغیر کسی اختیار و اقتدار کے زندگی بسر کر رہا تھا، خلافت کے تمام حقوق و امتیازات بھی اسے تفویض کر دیئے، اور مقامات مقدسہ و حرمین شریفین کی کنجیاں نیز بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرت صلعم کی تلوار، علم اور چادر بطور سند خلافت اس کے حوالہ کر دیئے اس تاریخ سے سلاطین عثمانی خلیفہ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے، اور خطبوں میں اُن کا ذکر بحیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا، اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت دنیائے اسلام کی خلافت کا حق بھی اُنھی کو پہنچتا تھا، کوئی دوسری اسلامی سلطنت طاقت اور وسعت میں دولت عثمانیہ کے برابر نہ تھی، یہی سلطنت تمام دوسری سلطنتوں سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی تھی، اور قریباً ڈیڑھ صدی سے جہاد کا فرض ادا کر رہی تھی، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب سلطان سلیم کی خلافت کا اعلان کیا گیا تو دنیائے اسلام کے کسی گوشہ سے اُس کی مخالفت نہیں ہوئی، اس منصب کے لئے سلاطین عثمانی کا حق اس قدر مسلّم سمجھا گیا کہ سلیم کے عہد سے لے کر گذشتہ جنگ

---

[۵] "فتوحات اسلامیہ" جلد ۲ صفحہ ۱۳۰-۱۳۶،

عمومی تک پوری چار صدیوں میں ایک مدعی خلافت بھی اُن کے مقابلہ میں نہیں اٹھا

بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں خلافت کے بہت سے دعویدار نظر آتے ہیں لیکن خلفاے عثمانیہ کی پوری تاریخ میں کسی ایک حریف کو بھی سامنے آنے کی جرات نہیں ہوئی ،

منصبِ خلافت پر فائز ہو جانے سے سلطان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا، حکومت کے علاوہ اب اسے اپنی مسلمان رعایا کی مذہبی پیشوائی بھی حاصل ہو گئی، اور اس دینی اقتدار کا دائرہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مسلمان باشندوں تک محدود نہ رہا، بلکہ اس کے اندر تمام دنیاے اسلام کے باشندے آ گئے، خواہ وہ کسی قوم یا ملک کے ہوں، علاوہ ایرانیوں اور بعض دوسری شیعی جماعتوں کے جو بمقابلہ اہلِ سنت والجماعۃ کے تعداد میں بہت کم ہیں،

واپسی | مصر اور حجاز کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر شعبان ۹۲۳ھ (ستمبر ۱۵۱۷ء) میں سلیم شام کی طرف واپس ہوا، ہزار اونٹ سونے اور چاندی سے لدے ہوئے ساتھ تھے، مال غنیمت کا زیادہ قیمتی حصہ جہازوں کے ذریعہ اس سے پہلے قسطنطنیہ بھیجا جا چکا تھا، انہی جہازوں پر قاہرہ کے بہترین صنّاع اور کاریگر بھی روانہ کئے گئے تھے جو قسطنطنیہ لیجا کر آباد کئے گئے، ۲۰ رمضان ۹۲۳ھ کو سلیم دمشق پہنچا اور وہاں ۲۲ صفر ۹۲۴ھ تک قیام کیا، دمشق سے حلب گیا، اور وہاں بھی دو مہینے قیام کیا، اس مدت میں اُس نے شام کی حکومت کے انتظامات کئے، ۱۷ رجب ۹۲۴ھ (۲۵ جولائی ۱۵۱۸ء) کو وہ قسطنطنیہ پہنچا، اس کو وہاں سے روانہ ہوئے صرف دو سال گذرے تھے، اس تھوڑی مدت میں اُس نے شام، مصر، اور حجاز کو فتح کر کے سلطنت مملوکیہ کا

خاتمہ کر دیا، اور سلطنت عثمانیہ کے رقبہ کو تقریباً دوچند کر دیا،

اسپین سے معاہدہ۔ سلیم جب قسطنطنیہ واپس آیا تو اسپین کا سفیر عیسائیوں کے لئے بیت المقدس کی زیارت کی اجازت حاصل کرنے کی غرض سے اس کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اُس کے معاوضہ میں وہ رقم جو پہلے سلاطین مصر کو دیجاتی تھی دولت عثمانیہ کو ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا، سلیم نے اس درخواست کو منظور کر لیا، مگر یہ تصریح کر دی کہ باضابطہ طور پر اس معاہدہ کا تکملہ ہونا چاہئیے،

روڈس پر حملہ کی تیاریاں۔ اس کے بعد سلیم دولت عثمانیہ کی بحری طاقت کو ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوا، اُس نے مختلف سائز کے ڈیڑھ سو نئے جہاز تعمیر کرائے، ان کے علاوہ سو جہاز اور بھی بنوائے اور حکم دیا کہ وہ کسی مہم پر روانہ ہونے کے لئے ہر وقت پوری طرح مسلح اور تیار رکھے جائیں، ساٹھ ہزار فوج بھی مع ایک بڑے توپخانہ کے ایشیائے کوچک میں اکٹھا کی گئی، بعض لوگ خیال کرتے تھے کہ یہ تیاریاں ایران پر حملہ کی غرض سے کیجارہی ہیں، لیکن عام رائے یہ تھی کہ حملہ روڈس پر ہونے والا ہے، جہازوں بندرگاہوں، اور سلاح خانوں کی تعمیر سے اسی رائے کی تائید ہوتی تھی، سلیم نہایت انہماک کے ساتھ ان تیاریوں میں مصروف تھا، اور اس مہم کو اس وقت تک ملتوی رکھنا چاہتا تھا جب تک روڈس جیسے مضبوط قلعہ پر کامیابی کے ساتھ حملہ کرنے کے لئے کافی سامان فراہم نہ ہو جائے، چنانچہ ایک روز اُس نے اپنے وزیروں کو بلا کر کہا کہ تم روڈس کی فتح کے لئے مجھ سے عجلت کرانا چاہتے ہو، مگر تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایسی مہم کے لئے کتنے سامان کی ضرورت ہے؟ تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت کس قدر بارود تمھارے پاس موجود ہے"؟ وزراء اس سوال کے جواب کے لئے تیار نہ تھے

لیکن دوسرے روز انھوں نے آکر سلیم سے کہا کہ "ہمارے پاس چار مہینے کی محاصرہ کے لئے کافی سامان موجود ہی" سلیم یہ سنکر برافروختہ ہوا اور کہنے لگا کہ "چار ماہ کے سامان جنگ سے کیا ہوتا ہی جب کہ اس کی دو چند مقدار بھی کافی نہ ہوگی، کیا تم چاہتے ہو، کہ سلطان محمد ثانی کی سی رسوائی مجھے بھی نصیب ہو، میں اس وقت لڑائی نہیں شروع کروں گا، اور نہ ایسی ناکافی تیاریوں کے ساتھ روڈس کا سفر کروں گا، علاوہ برین میرا خیال ہے کہ اب مجھے صرف ایک ہی سفر اختیار کرنا ہی، یعنی سفر آخرت"

وفات | اُس کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا، وہ ادرنہ کے لئے قسطنطنیہ سے روانہ ہوا مزاج پہلے ہی سے ناساز تھا، مگر اطبار کی ممانعت کے باوجود اُس نے گھوڑے کی سواری نہ چھوڑی، راستہ میں مرض کی شدت اتنی بڑھی کہ اسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اُتر جانا پڑا، اور وہیں ۹ رشوال ۹۲۶ھ (۲۲ ستمبر ۱۵۲۰ء) کو اپنی حکومت کے نویں اور عمر کے چونویں سال میں اُس کا انتقال ہوگیا،

سلیمان اعظم قانونی

۹۲۶ھ تا ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۲۰ئہ تا ۱۵۶۶ئہ

سلیمان اعظم کا عہد حکومت نہ صرف تاریخ عثمانیہ بلکہ تاریخ عالم کا ایک نہایت اہم دور ہے، مغربی یورپ کی سلطنتیں قرون وسطیٰ کے خلفشار سے نکل کر عہد جدید کی معرکہ آرائیوں کے لئے تیار ہو رہی تھیں، سلطنت عثمانیہ اور ان کے درمیان چالیس سال سے کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی تھی، یورپ میں بایزید ثانی کی لڑائیاں چھوٹی چھوٹی مسیحی حکومتوں کے ساتھ محدود تھیں، سلیم کی توجہ تمام تر اسلامی سلطنتوں کی جانب مبذول رہی، اس مدت میں یورپ کی سلطنتوں نے بہت نمایاں طور پر ترقی کر لی تھی، اسپین سے موروں کا اخراج ہو چکا تھا، اور وہاں کی مختلف مسیحی ریاستیں متحد ہو کر ایک فرماں روا کے زیر حکومت آ چکی تھیں، فرانس اپنی خانہ جنگیوں کو ختم کر کے دوسرے ملکوں کی فتوحات کے لئے نکل چکا تھا، انگلستان اور سلطنت آسٹریا میں بھی قوت واستحکام کی علامتیں ظاہر تھیں، منجملہ دیگر فنون کے فن حرب میں خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ ترقی ہو گئی تھی، باقاعدہ تنخواہ دار پیدل فوجیں بڑی تعداد میں رکھی گئی تھیں، آتشیں اسلحوں کا استعمال کثرت سے کیا جا رہا تھا، عیسائی سلطنتوں میں اپنی قوت کی ترقی کا احساس اور مسلمانوں سے تازہ مقابلہ کا حوصلہ شدت سے پیدا تھا، یورپ مذہبی

جوش سے لبریز تھا، اور باہمی عداوتوں کے باوجود تمام مسیحی سلطنتیں دولت عثمانیہ کے مقابلہ کے لئے آمادہ و مستعد تھیں، شہنشاہ چارلس پنجم جس کی وسیع سلطنت یورپ کے نصف سے زیادہ حصہ پر پھیلی ہوئی تھی، خاص طور پر اس مسیحی اتحاد میں پیش پیش تھا، دولت عثمانیہ کے لئے چارلس اور اس کے معاونین سے قوت آزمائی کرنا آسان نہ تھا خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایران کی وسیع سلطنت دشمنی پر آمادہ تھی، اور شام و مصر میں ہر وقت بغاوت کا خطرہ تھا، تاہم وہ نہ صرف ان بیرونی اور اندرونی خطرات سے محفوظ رہی، بلکہ سولھویں صدی کی پوری مدت میں اس کی قوت و سطوت میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اور عیسائی سلطنتوں کے بہتیرے صوبے اس کے مقبوضات میں شامل ہوگئے، اس میں شبہہ نہیں کہ سولھویں صدی میں ترکوں کی عظیم الشان کامیابی کا سبب ان کی زبردست فوجی قوت اور اپنی قومی عظمت کا احساس تھا، لیکن اس کامیابی کا اصلی سبب یہ تھا کہ عنان سلطنت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں تھی جو دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا تاجدار اور اس وقت تمام دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ تھا،

ذاتی اوصاف و اخلاق

سلطان سلیمان چھبیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، بایزید ثانی کے زمانہ میں جب کہ اس کی عمر بہت کم تھی وہ مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا، پھر جب سلیم نے ایران پر حملہ کیا تو سلیمان کو نائب سلطنت کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں چھوڑ گیا، اس کے بعد جنگ مصر کے دوران میں وہ ادرنہ کا حاکم تھا، اور پھر سلیم کے عہد کے آخری دو سالوں میں ولایت صاروخان کا انتظام اسی کے سپرد تھا، چنانچہ جب سلیم کی وفات کے بعد وہ تخت پر آیا تو ایک کامیاب مدبر اور لائق فرماں روا کی شہرت حاصل کر چکا تھا، ذاتی عظمت میں وہ اپنے تمام پیشروؤں سے بڑھا ہوا تھا، اور فتوحات اور وسعت سلطنت کے

لحاظ سے اُن سب پر فوقیت لے گیا، اُس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی انتہائی حد کمال
تک پہونچ گئی، اس کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی، وہ اپنے رحم و کرم کے لئے خاص طور
پر مشہور تھا، انصاف اُس کا مخصوص شیوہ تھا، اور اس کی عدالت میں نسل، رنگ، اور مذہب
کی کوئی تفریق نہ تھی، رعایا کی فلاح و بہبود اس کا مطمحِ نظر تھا، چنانچہ جب وہ تخت نشین ہوا
تو تمام رعایا نے اس نوجوان سلطان کا جو اپنے اخلاق، شجاعت، انصاف، رحمدلی، اور
دانشمندی کی بنا پر حد درجہ ہردلعزیز تھا، نہایت مسرت کے ساتھ استقبال کیا، اپنی حکومت
کے پہلے ہی سال میں اُس نے انصاف اور رحمدلی کی ایسی مثالیں پیش کیں جن سے
اُس کے آیندہ طرزِ عمل سے متعلق نہایت خوش آیند توقعات قائم کی جانے لگیں، سلطان
سلیم نے چھ سو مصریوں کو بجبر مصر سے قسطنطنیہ میں منتقل کر دیا تھا، سلیمان نے اُن سب کو
اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دیدی، سلیم نے بعض تاجروں کا سامان تجارت ایران
سے تجارت کرنے کی پاداش میں ضبط کر لیا تھا، سلیمان نے نقد روپیہ دے کر اُن کے
نقصان کی تلافی کر دی، اُس کے حکم سے سلطنت کے بعض اعلیٰ حکام بد دیانتی اور ظلم کے جرم میں
گرفتار کیے گئے، اور اون کو سخت سزائیں دی گئیں، ان واقعات کی خبریں تمام سلطنت
میں پہونچیں اور رعایا کو اپنی جان و مال کی طرف سے اطمینان ہو گیا، سلیمان نے تمام
صوبہ داروں کے پاس احکام بھیجے کہ رعایا کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی روا نہ رکھی جائے
اور امیر و غریب مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کیا جائے، ان احکام کے
نفاذ سے ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا، البتہ غزالی نے جسے سلطان سلیم نے مصری
حکومت سے غداری کے صلہ میں شام کا حاکم بنایا تھا سرکشی کا اظہار کیا، اور خود مختار ہو جانا
چاہا، سلیمان نے فوراً اُس کی سرکوبی کے لئے ایک فوج روانہ کی، غزالی کو شکست ہوئی

اور وہ قتل کر دیا گیا، اس کے قتل سے نہ صرف شام کا فتنہ فرو ہو گیا، بلکہ شاہ اسمٰعیل کے معاندانہ ارادوں کا خاتمہ بھی ہو گیا، جس نے غزالی کی بغاوت سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے شام کی سرحد پر اپنی فوجیں تیار رکھی تھیں،

بلغراد کی فتح | سلیم کے آخری دورِ حکومت میں سلطنت عثمانیہ اور سلطنت ہنگری کے درمیان آویزش پیدا ہو گئی تھی، اور سرحدی علاقہ میں برابر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، اس خلش کو دور کرنے کے لئے سلیمان کو بلغراد اور زاباکز (Szabacs) کے سرحدی قلعوں کو فتح کر لینا ضروری ہو گیا، ان قلعوں کی فتح سرحد کے استحکام کے لیے بھی ضروری تھی، اور یورپ میں مزید فتوحات حاصل کرنے کے لئے بھی، چنانچہ سلیمان نے ہنگری کے بادشاہ لوئی ثانی کے پاس اپنے سفیر بھیجے، اور اس سے خراج کا مطالبہ کیا، لوئی نے اس مطالبہ کے جواب میں عثمانی سفرا کو قتل کرا دیا[1] سلیمان کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ فوراً ہنگری کی فتح کے لئے روانہ ہو گیا، اس کے فوجی سرداروں نے زاباکز اور دوسرے قلعوں کا محاصرہ کر کے قبضہ کر لیا، اس کے بعد سلیمان خود بلغراد کی طرف بڑھا، اور اس شہر کے گرد جس نے محمد فاتح جیسے سلطان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا، اپنے خیمے نصب کر دیئے، سات روز کی گولہ باری کے بعد ۲۵ رمضان ۹۲۷ھ (۲۹ اگست ۱۵۲۱ء) کو بلغراد فتح ہو گیا، فتح کے بعد نہ تو قلعہ کے فوجی دستہ کا قتل عام ہوا، اور نہ شہر کے باشندے قتل کئے گئے، سلیمان نے وہاں کے سب سے بڑے گرجا میں نماز ادا کی، اور تثلیث کے اس عظیم الشان معبد کو خدائے واحد کی پرستش کے لئے مخصوص کر دیا، اس کے بعد اس نے بلغراد میں ایک ترکی دستہ متعین کیا اور قلعہ کو از سر نو مضبوط و مستحکم کر کے قسطنطنیہ واپس ہوا، بلغراد کے علاوہ سرحد کے دوسرے قلعوں پر بھی عثمانیوں نے قبضہ کر لیا، اور ہنگری میں

[1] کیمبرج ماڈرن ہسٹری جلد اصفحہ ۹۳، ۵۲ و لین پول صفحہ ۱۱۷،

داخل ہونے کے تمام دروازے اُن کے لئے کھل گئے، سلیمان اب ہنگری کے دارالسلطنت بودا کی طرف بڑھ سکتا تھا لیکن روڈس کی فتح اُس کے نزدیک زیادہ ضروری تھی، اور بلغراد کے بعد اُس نے اُسی جانب رخ کیا،

جمہوریہ وینس کا باجگذار ہونا

بلغراد کی فتح کا ایک اثر یہ ہوا کہ جمہوریہ وینس نے از سرنو اپنے کو سلطنت عثمانیہ کا باجگذار تسلیم کر لیا، اور جزائر قبرص (سائپرس) و زانطہ کا خراج دوچند کر دیا،

روڈس کی فتح

روڈس کی فتح مختلف وجوہ سے ضروری تھی، بلغراد اور روڈس ہی دو[2] معرکے تھے جنہیں سلطان محمد فاتح نے شکست کھائی تھی، بلغراد کی فتح نے سلطنت عثمانیہ کے دامن سے ایک شکست کا داغ تو دھو دیا، سلیمان کی عالی حوصلگی دوسرے دھبہ کے دھونے کے لئے بھی بے قرار تھی، علاوہ بریں روڈس کے جہاز بحر روم کے مشرقی حصہ میں اور مجمع الجزائر اور اناطولیہ کے ساحلوں پر لوٹ مار مچاتے رہتے تھے[1]، روڈس کی فتح اس وجہ سے بھی ضروری تھی کہ قسطنطنیہ اور شام و مصر کے درمیان جو تعلقات اب قائم ہو گئے تھے انہیں مبارزین روڈس اپنے جہازوں کے ذریعہ رخنہ انداز ہوتے رہتے تھے، ان اسباب کی بنا پر سلیمان نے اس جزیرہ پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا، اور تین سو جہازوں کا عثمانی بیڑا قسطنطنیہ سے روڈس کی جانب روانہ کیا، ساتھ ہی وہ خود بھی ایک لاکھ فوج لے کر ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کی طرف بڑھا، بحری اور بری فوجوں کے جمع ہونے کی جگہ خلیج مارمرس قرار پائی جو روڈس کے محاذ میں واقع ہے، ۲۸ جولائی ۱۵۲۲ء کو سلیمان روڈس کے ساحل پر اترا، اور یکم اگست ۱۵۲۲ء کو محاصرہ شروع ہوا، جو تقریباً پانچ مہینہ

۱؎ کیمبرج ماڈرن ہسٹری ج ۱ ص ۹۳،

تک جاری رہا، روڈس کے راہب مبارزوں نے نہایت شجاعت کے ساتھ مدافعت کی لیکن محاصرین کی قوت سے مجبور ہو کر بالآخر انھیں ۶ صفر ۹۲۹ھ (۲۵ دسمبر ۱۵۲۲ء) کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، سلیمان نے ان کے ساتھ جو مراعات برتیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن کی شجاعت کا کس درجہ قدردان تھا، اُس نے مبارزین کو اجازت دیدی کہ بارہ روز کے اندر اپنے تمام اسلحوں اور سامانوں کو لے کر اپنے ہی جہازوں پر روڈس سے چلے جائیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو عثمانی جہازوں کو بھی کام میں لائیں، روڈس کے باشندوں کو سلطان کی رعایا بننے کے بعد پوری مذہبی آزادی دیدی گئی، سلیمان نے صراحت کے ساتھ وعدہ کیا کہ ان کے کلیساؤں سے کوئی تعرض نہ کیا جائیگا، اُن کے بچے والدین سے چھینے نہ جائیں گے، اور پانچ سال تک ان سے کسی قسم کے ٹیکس یا محصول کا مطالبہ نہ ہوگا،[1] سلیمان نے اپنی فوجیں قلعہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہٹالیں تاکہ مبارزین امن وسکون کے ساتھ قلعہ سے نکل جائیں لیکن ینی چری باوجود سخت روک تھام کے بے قابو ہو گئے، اور شہر میں داخل ہو کر تھوڑی دیر تک لوٹ مار کرتے رہے تاہم اور تمام شرائط سلیمان کی طرف سے نہایت دیانت داری کے ساتھ پورے کئے گئے، مبارزین روڈس نے وہاں سے نکلنے کے بعد آٹھ سال تک جزیرہ کریٹ میں قیام کیا، اور پھر مستقل طور پر جزیرہ مالٹا میں جاکر آباد ہو گئے،

مصر اور ینی چری کی بغاوت بلغراد اور روڈس کی فتح کے بعد ہنگری، سسلی، اور اٹلی کے راستے سلیمان کے لئے کھل گئے، لیکن مصر کی بغاوت اور ایشیائے کوچک کی شورش کے باعث اسے پہلے مشرق کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور یورپین سلطنتوں کو دو سال کی مہلت مل گئی، احمد پاشا

---

[1] کریسی جلد ا ص ۲۶۲،

نے جو خیر بے کے انتقال کے بعد ۹۲۸ھ (۱۵۲۲ء) میں مصر کا حاکم مقرر ہوا تھا علم بغاوت بلند کیا، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلیمان نے ایک فوج مصر روانہ کی، احمد پاشا کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا، اس کے بعد سلیمان نے صدر اعظم ابراہیم پاشا کو حکومت مصر کے انتظام و استحکام کے لئے مامور کیا، اور خود سلطنت کے داخلی انتظامات کی جانب متوجہ ہوا، ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) کے اوائل سرما میں وہ شکار کی غرض سے قسطنطنیہ سے ادرنہ چلا گیا، روڈس کی فتح کو ڈیڑھ سال کی مدت گذر چکی تھی، اس درمیان میں کوئی دوسری جنگ پیش نہیں آئی تھی، ینی چری کو امن کا یہ زمانہ نہایت گراں گذر رہا تھا، چنانچہ سلیمان کی عدم موجودگی میں اُنھوں نے قسطنطنیہ میں بغاوت برپا کر دی، اور وزرا اور دوسرے بڑے بڑے عہدہ داروں کے مکانات لوٹ لئے، یہ خبر سنکر سلیمان ادرنہ سے قسطنطنیہ کو لوٹا، اور اس شورش کو فرو کرنے کی کوشش کی، اُس نے باغیوں کے بعض سرداروں کو قتل کرا دیا، دو کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، اور پھر عام سپاہیوں کو انعام و اکرام دیکر بغاوت کا خاتمہ کیا،

ہنگری کی فتح وزیر اعظم ابراہیم پاشا اس وقت مصر میں تھا، سلیمان نے اُسے واپس بلا لیا، اور ہنگری کی مہم کی تیاری شروع کر دی، ینی چری کی بغاوت سے اُس کو تجربہ ہو گیا تھا کہ سلطنت کے امن کے لئے اس فوج کو جنگ میں مصروف رکھنا ضروری ہے، بلغراد کی فتح کے بعد سے اگرچہ کوئی بڑی جنگ ہنگری کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی، تاہم چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ قائم تھا، علاوہ بریں فرانسس اول شاہ فرانس نے جسے شہنشاہ چارلس پنجم نے پیویا کی جنگ (۱۵۲۵ء) میں شکست دیکر قید کر لیا تھا، سلیمان سے ہنگری پر حملہ کرنے کی بابت استدعا کی، تاکہ چارلس کو اپنی توجہ فرانس سے ہٹا کر ہنگری کی جانب

معزول کرنی پڑے جس کی سرحد سلطنت آسٹریا سے ملی ہوئی تھی، پھر اسی زمانہ میں شاہ ایران نے شہنشاہ چارلس اور شاہ ہنگری کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی، ان وجوہ سے سلیمان نے ہنگری پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ روانہ ہوا قسطنطنیہ سے روانہ ہونے کے پانچ ماہ بعد ۲۰ ذیقعدہ ۹۳۲ھ (۲۸ اگست ۱۵۲۶ء) کو موہاکز کے میدان میں ہنگری کی فوج سے مقابلہ ہوا عثمانی لشکر کو اپنی کثرت تعداد اور توپخانوں کی بنا پر بہت کچھ فوقیت حاصل تھی، دو گھنٹے سے کم ہی میں جنگ اور ساتھ ہی ہنگری کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو گیا، شاہ لوئی، اس کے آٹھ اسقف، اعیان ہنگری کی ایک بڑی تعداد اور چوبیس ہزار سپاہی مارے گئے، لوئی بھاگتا ہوا دریا میں ڈوب کر مرا، ۳ ذی الحجہ ۹۳۲ھ (۱۰ ستمبر ۱۵۲۶ء) کو سلیمان ہنگری کے پایہ تخت بودا میں پہنچا، باشندگان شہر نے ہتھیار ڈال کر دروازے کھول دیئے، ہنگری کے جو امراء موہاکز کی تباہی سے بچ گئے تھے انھوں نے سلیمان کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت کا حلف لیا، چونکہ شاہ لوئی لاولد مر گیا تھا، اس لئے سلیمان کی تحریک سے ان امراء نے ہنگری کے تخت کے لئے کونٹ زاپولیا (Count Zapolya) کا انتخاب کیا جو ٹرانسلوینیا کا امیر اور ہنگری کے اکابر میں سے تھا، اس کے چند دنوں بعد سلیمان کو اطلاع ملی کہ ایشیائے کوچک میں کچھ بغاوت کی صورتیں رونما ہو رہی ہیں چنانچہ وہ فوراً بودا سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو گیا، ہنگری کے بعض سرحدی قلعوں میں ترکی دستے متعین کر دیئے گئے،

ہنگری میں خانہ جنگی، ہنگری کے تخت کے لئے زاپولیا کا انتخاب خانہ جنگی کا باعث ثابت ہوا، آرک ڈیوک فرڈیننڈ جو شہنشاہ چارلس پنجم کا بھائی تھا، اور جسے چارلس نے آسٹریا کی

آرچ ڈچی منتقل کر دی تھی، ایک صلحنامہ کے روسے جو چارلس اور سابق شاہ لوئی کے درمیان ہو چکا تھا، ہنگری کے تخت کا دعویدار ہوا، دوسری طرف زاپولیا اور اُس کے حامیوں نے اپنی موافقت میں ہنگری کا ایک قدیم قانون پیش کیا جس کے روسے ہنگری کے باشندے کے علاوہ کوئی دوسرا شخص وہاں کا بادشاہ منتخب نہیں ہو سکتا تھا، لیکن باوجود اس قانون کے مغربی ہنگری کے امرا نے فرڈیننڈ کو منتخب کر لیا، اس کے بعد جنگ ناگزیر ہو گئی، فرڈیننڈ کے ساتھ آسٹریا کی مدد شامل تھی، اُس نے زاپولیا کو شکست دیکر ملک کے باہر بھگا دیا، زاپولیا نے پولینڈ میں پناہ لی، اور وہاں سے سلطان کی خدمت میں مدد کی درخواست بھیجی، یہ سنکر فرڈیننڈ نے بھی اپنا ایک سفیر سلیمان کے دربار میں بھیجا، اور نہ صرف ہنگری کے تخت کے لئے حمایت کی استدعا کی، بلکہ بلغراد اور ہنگری کے دوسرے شہروں کی واپسی کا بھی جو سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہو چکے تھے مطالبہ کیا، سلیمان نے فرڈیننڈ کے مطالبہ سے برافروختہ ہو کر اُس کے سفیر کو رخصت کر دیا، اور زاپولیا کے سفیر کو اطمینان دلایا کہ وہ ضرور اُس کی مدد کریگا،

فرڈیننڈ کی شکست ۱۰ رمئی ۱۵۲۹ء کو سلیمان قسطنطنیہ سے روانہ ہوا، اور ڈھائی لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ہنگری میں داخل ہو کر ۳ رستمبر کو پایہ تخت بودا پہنچا، اور اُس کا محاصرہ کر لیا، چھ روز میں بودا فتح ہو گیا، اور زاپولیا دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا، اس کے بعد سلیمان آسٹریا کے مشہور دار السلطنت ویانا کی طرف بڑھا،

ویانا کا محاصرہ آسٹریا کا شہنشاہ چارلس پنجم اُس وقت یورپ کا سب سے بڑا فرماں روا تھا، وہ اسپین، نیدرلینڈ، سسلی اور جرمنی کی مملکتوں کا تنہا مالک تھا، محاصرہ ویانا کے وقت وہ اٹلی میں فرانسس اوّل، شاہِ فرانس سے جنگ میں مصروف تھا، اس لئے

ترکوں کے مقابلہ کے لئے کوئی فوج نہ بھیج سکا، اور آسٹریا کو صرف اپنی ذاتی قوت پر بھروسہ کرنا پڑا، چنانچہ محاصرہ سے قبل ہر دس آدمیوں میں سے ایک آدمی فوج میں بھرتی کیا گیا ہمسایہ ریاستوں نے فوجی دستوں سے مدد کی، پھر بھی یہ فوج ترکوں کے مقابلہ کے لئے بالکل ناکافی تھی، فرڈیننڈ نے مجلس سلطنت سے مدد کی درخواست کی جس نے صرف بارہ ہزار پیدل اور چار ہزار سوار فوج بھیجنا منظور کیا، مجلس کو مشکل یقین دلایا جا سکا کہ سلیمان ویانا کی طرف بڑھتا آرہا ہے، بہرحال جلد ہی یہ معلوم ہوگیا کہ آسٹریا اتنی فوجیں جمع کرنے سے قاصر ہے جو ترکوں کو آگے بڑھنے سے روک سکیں، اس لئے عیسائیوں نے اب صرف دار السلطنت کی حفاظت کی تیاریاں شروع کیں، فرڈیننڈ خود تو سلیمان کے خوف سے ویانا سے بھاگ گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے چند جانباز افسر اور اسپین و جرمنی کے آزمودہ کار دستے محاصرہ کے مکمل ہونے سے قبل شہر میں پہنچ گئے تھے، اور ان کی مدد حد درجہ اہم ثابت ہوئی، ویانا کے فوجی دستوں کا سپہ سالار کونٹ ڈی سام (Count de Salm) تھا، اور مدافعت کی اصلی نگرانی اسی کے ہاتھ میں تھی، ترکوں کے ویانا پہنچنے سے پہلے ہی تمام امکانی تیاریاں کرلی گئی تھیں، شہر کے استحکامات زیادہ تر بوسیدہ حالت میں تھے، فصیل بھی ایک ہی تھی، جو بمشکل چھ فٹ موٹی تھی، چنانچہ وہ تمام مکانات جو فصیل سے بہت قریب واقع تھے، گرا کر زمین کے برابر کر دیئے گئے، شہر کے اندر مٹی کی ایک نئی دھس تیار کی گئی، دریا کے ساحل پر خندق کھود کر لکڑی کے بڑے بڑے مضبوط لٹھوں سے باڑھ لگا دی گئی، آتشزدگی کے خیال سے چوبی کھپریلیں جن سے عام طور پر مکانات چھائے ہوئے تھے شہر کے ہر مکان سے نکال لی گئیں، سڑک کی سنگی پٹریاں بھی اکھاڑ لی گئیں، تاکہ دشمن کے گولوں

کا اثر زائل ہو جائے، سامانِ رسد اور گھوڑوں کے لئے چارہ فراہم کرنے کی غرض سے متعدد ٹولیاں گرد و نواح میں بھیجی گئیں، پھر اس خطرہ سے کہ محاصرہ زیادہ دنوں تک قائم رہ جائے، ایسے تمام لوگوں کو جو مدافعت کے کام کے نہ تھے، بلکہ جن کی ذات پر فوجی نقطۂ نظر سے بیکار صرف ہو رہا تھا مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، اور پادری لوگ، شہر چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کیا گیا[1]، اور جب ترک ویانا کے قریب پہنچ گئے تو نواحِ شہر کو بھی مسمار کر دیا گیا، تاکہ محاصرین اس سے روک اور پناہ کا کام نہ لے سکیں، وہاں کے باشندوں کو ایسے وقت میں بے خانماں ہونا پڑا، جب انھیں بھاگ جانے کا بھی موقع نہ تھا، اُن میں سے اکثر ترکوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے،

۲۷ ستمبر کو سلیمان ویانا پہنچا، اور محاصرہ شروع ہوا، کثرتِ بارش کی وجہ سے سڑکیں اس قدر خراب ہو گئی تھیں کہ ترکوں کو اپنی بڑی بڑی توپیں ہنگری میں چھوڑ دینی پڑی تھیں، اور اب انھیں زیادہ تر سرنگیں کھود کر دیواروں کو گرانے کی کوشش کرنی پڑی، لیکن محصورین بھی ہر مقام پر نگاہ رکھتے تھے، اور ۹ راکتوبر تک ترکوں کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں، بالآخر ۱۰ راکتوبر کو سرنگ کے ذریعہ سے شہر پناہ میں ایک چوڑا رخنہ پیدا ہو گیا، جس کے بعد ترکوں نے فوراً پے در پے تین حملے کئے مگر ہر بار انھیں پسپا ہونا پڑا، اور وہ رخنہ پُر کر دیا گیا، اسی طرح ۱۱ر اور ۱۲ راکتوبر کو بھی ترکوں نے اُن مقامات پر جہاں سرنگوں نے بڑے بڑے رخنے کر دیئے تھے، سخت حملے کئے، لیکن عیسائی ایسی جانبازی سے لڑے کہ ترک شہر کے اندر داخل نہ ہو سکے، سلیمان یہ حالات دیکھ دیکھ کر بہت پیچ و تاب

---

[1] "ترک اور ویانا کے دو محاصرے" از شمر، بحوالہ لین پول، ص۱۸۴،
"Two Sieges of Vienna by the Turks" by Schi-mmer.

کھا رہا تھا، ترک بھی موسم کی شدت، سامان رسد کی قلت اور سب سے بڑھ کر ان مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے روز بروز زیادہ دل شکستہ ہو رہے تھے، آخر کار یہ طے پایا کہ ۱۴ اکتوبر (۲۰ صفر ۹۳۶ھ) کو ایک آخری حملہ کیا جائے، سلیمان نے سپاہیوں کا دل بڑھانے کیلئے بہت فیاضی سے روپیہ تقسیم کیا، اور وعدہ کیا کہ جو شخص سب سے پہلے دیوار پر چڑھ جائیگا، اُسے دولت سے مالامال کر دیا جائیگا، اور ایک بہت بڑا منصب عطا کیا جائے گا، چنانچہ نو بجے صبح کو ینی چری اور عثمانی فوج کے بہترین دستے حملہ کے لئے بڑھے، صدر اعظم ابراہیم پاشا اور فوج کے تمام بڑے بڑے افسر بھی ساتھ تھے لیکن عیسائیوں کی سرفروشی نے ترکوں کے قدم شہر کے اندر نہ آنے دیئے، حالانکہ سہ پہر میں عثمانی انجینیروں نے سرنگوں کے ذریعہ سے شہر پناہ کا ایک بڑا حصہ گرا دیا تھا، مغربی مورخین کا بیان ہو کہ ترکوں کی ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں، یہاں تک کہ ینی چری نے بھی دل برداشتہ ہو کر حملہ کرنے سے انکار کر دیا، برخلاف اس کے عیسائیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، آخر کار مایوس ہو کر سلیمان کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا، اور اُس نے فوج کو واپسی کا حکم دیا، ویانا کو اس کے مدافعین کی سرفروشی نے بچا لیا، لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہو، محاصرہ کی ناکامی میں موسم کی شدت جس کے ایشیائی ترک عادی نہ تھے اور ینی چری کی سرکشی کو بھی بہت زیادہ دخل تھا، وسط یورپ میں عثمانی فتوحات کی موج ویانا کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آگئی،

اسٹائریا کی فتح تین سال کے بعد سلیمان پھر ایک زبردست فوج کے ساتھ ہنگری پر حملہ آور ہوا، اور وہاں سے ویانا کا رُخ کیا، اب کی بار شہنشاہ چارلس نے آسٹریا کی فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لی، لیکن قلعہ گنس (Guns) کی فتح میں جو ت

میں واقع تھا تین ہفتہ کی مدت صرف ہوگئی، اور اُس پر قبضہ کرنے کے بعد سلیمان نے ویانا کی طرف بڑھنے کا ارادہ فسخ کر دیا، بجائے اس کے وہ اسٹائریا کی طرف متوجہ ہوا اور اسے فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ کو لوٹ گیا، چارلس نے بھی سلیمان سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی، اور ویانا کے قریب اپنی فوجیں لئے پڑا رہا،

ہنگری میں ترکی حکومت سلیمان کے قسطنطنیہ لوٹ جانے کے بعد بھی چند سالوں تک زاپولیا اور فرڈیننڈ میں لڑائی کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا، بالآخر ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں ان دونوں کے درمیان ایک صلحنامہ ہوگیا، جس کے رو سے ہنگری کے ۲ حصے کر دیئے گئے، مشرقی حصہ کا بادشاہ زاپولیا کو تسلیم کیا گیا، اور مغربی حصہ فرڈیننڈ کی فرماں روائی میں دیدیا گیا، مگر دوسرے ہی سال زاپولیا کا انتقال ہوگیا، اور اُسکی بیوہ اور فرڈیننڈ کے درمیان جنگ پھر چھڑ گئی، فرڈیننڈ پورے ہنگری کا دعویدار ہوا، اور زاپولیا کی بیوہ نے اپنے بچہ کے لئے سلیمان سے مدد کی درخواست کی، چنانچہ ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) میں سلیمان پھر ہنگری میں داخل ہوا، اور فرڈیننڈ کو شکست دیکر بودا اور دوسرے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا، اور اُن میں ترکی دستے متعین کر دیئے، اگرچہ ساتھ ہی اُس نے اس امر کا بھی اعلان کر دیا کہ زاپولیا کے بچہ کے بالغ ہونے کے بعد وہ اُسے ٹرانسلوینیا اور ہنگری کے تخت پر بٹھا دیگا، بہرحال اس وقت سلیمان نے ہنگری کو سنجقوں میں تقسیم کر دیا، اور اُن میں ترکی گورنر مقرر کر دیئے، اس جنگ میں گو عثمانیوں کو کہیں کہیں شکستیں بھی ہوئیں لیکن مجموعی طور پر سلیمان کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں شہنشاہ چارلس اور فرڈیننڈ نے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور ۹۵۴ھ (۱۵۴۷ء) میں پانچ سال کے لئے صلح کر لی گئی، اس صلحنامہ کے رو سے تقریبًا تمام ہنگری اور ٹرانسلوینیا پر سلیمان کا قبضہ بدستور قائم رہا، اور فرڈیننڈ نے

باب عالی کو تیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا،

سلیمان "صاحبقران" یہ صلحنامہ جس میں شہنشاہ چارلس پنجم، پوپ، جمہوریہ وینس اور شاہ فرانس شریک تھے اس بات کا ثبوت ہے کہ مسیحی یورپ نے سلیمان کا "صاحبقران" ہونا تسلیم کر لیا تھا، آسٹریا کو سلطنت عثمانیہ کے سامنے اس حد تک جھکنا پڑا کہ اس سے قبل صلح کے متعلق جو مراسلت ہوئی تھی، اس میں فرڈیننڈ نے اپنے کو صدر اعظم ابراہیم پاشا کا بھائی لکھنا منظور کیا، اور اس طرح اپنا مرتبہ ایک ترکی وزیر کے مرتبہ کے برابر قرار دیا، فرانسس اول نے بھی کئی بار نہایت ادب اور عاجزی کے ساتھ سلیمان سے مدد کی درخواست کی تھی اور سلیمان نے اُس کی درخواست پر ہنگری اور جرمنی پر حملہ کر کے چارلس کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی فوجیں فرانس سے ہٹالے، نیز فرانس کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لئے اُس نے ایک جنگی بیڑہ بحر روم میں بھی روانہ کیا تھا[1] یورپ کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دوران میں سلیمان کو ایران کی جانب بھی متوجہ ہونا پڑا، اور دولت عثمانیہ کی عسکری قوت دو محاذوں میں تقسیم ہو گئی، فرڈیننڈ کا سفیر بوس بکیس (Busbequius) جو سلیمان کے دربار میں مامور تھا، لکھتا ہے: "ہمارے اور تباہی و بربادی کے درمیان اہل ایران ہی صرف ایک روک ہیں، ترک ہمیں ضرور آدباتے، مگر ایرانی انہیں روکے ہوئے ہیں، ایرانیوں کے ساتھ ترکوں کی اس جنگ سے ہمیں صرف مہلت مل گئی ہے مخلصی اور نجات نہیں حاصل ہوئی ہے[2]"

ایران کی مہم سنہ ۹۴۱ھ (سنہ ۱۵۳۴ء) میں سلیمان ایران کی مہم پر روانہ ہوا، چند ماہ قبل اُس نے ابراہیم پاشا کو ایک بڑی فوج کے ساتھ بھیج دیا تھا، ابراہیم سیدھا تبریز پہنچا، اور اُس

---

[1] کریسی جلد ۱ ص ۲۷۸، [2] ایضاً ص ۲۷۶ (فٹ نوٹ)

بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا، تبریز ہی میں سلیمان بھی اُس سے آکر مل گیا، اور وہ دونوں وہاں سے موصل اور بغداد کی طرف روانہ ہوئے، راستہ اور موسم کی خرابی کی وجہ سے ترکی فوج کو بہت کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا، بالآخر سلیمان بغداد پہنچا اور ۲۴ رجمادی الآخر ۹۴۱ھ (۳۱ دسمبر ۱۵۳۴ء) کو وہاں کے حاکم نے شہر اُس کے حوالہ کر دیا، کیونکہ شاہ طہماسپ نے ترکوں سے مقابلہ کرنے کی زحمت ہی نہیں گوارا کی، اس طرح موصل اور بغداد کے دو بڑے صوبے آسانی کے ساتھ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لئے گئے، پھر ۹۵۵ھ (۱۵۴۸ء) ۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) اور ۹۶۱ھ (۱۵۵۴ء) میں بھی سلیمان نے ایران پر حملے کئے اور اریوان و وان کے مضبوط شہروں کے علاوہ آرمینیا اور میسوپوٹامیا کے بعض بڑے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے، ایرانیوں نے متفرق طور پر ترکی فوج کا مقابلہ کیا، اور ترکوں کو موسم کی سختی اور سامان رسد کی عدم فراہمی کے باعث کافی نقصان پہنچا، لیکن خود شاہ ایران کی طرف سے کوئی مدافعت نہیں ہوئی اور ترک اپنے مفتوحات پر بدستور قابض رہے، ان علاقوں کے علاوہ سلیمان نے اپنی بحری قوت کے زور سے عدن پر بھی مستقل طور پر قبضہ کر لیا، اور سواحل عرب و ایران نیز شمالی مغربی ہند پر اُس کا اثر قائم ہو گیا،

بحری طاقت

برّی قوت کے لحاظ سے ایشیا یا یورپ کی کوئی سلطنت دولت عثمانیہ کی ہمسر نہ تھی، بحری طاقت کے اعتبار سے بھی اُس کی فوقیت تمام دوسری سلطنتوں پر مسلّم تھی، اُس وقت اسپین اور وینس کے بحری بیڑے سارے یورپ پر حاوی تھے لیکن ترکی بیڑے نے متعدد معرکوں میں اون کو شکست دی، بحری قوت کے اعتبار سے اسپین اور سلطنت عثمانیہ میں زیادہ فرق نہ تھا لیکن اسپین کے ساتھ وینس اور پوپ کے بیڑوں کے شامل ہوجانے کے بعد اتحادیوں کے بیڑے جہازوں کی کثرت تعداد اور

سائز کے لحاظ سے ترکی بیڑے سے بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے؛ تاہم دو بڑے معرکوں میں جب کہ یہ زبردست اتحاد اُن کے خلاف تھا ترک کامیاب رہے، اور سلیمان کے عہدِ حکومت میں برابر ترکی بیڑے کا اقتدار بحرِ روم میں قائم رہا جس کی وجہ سے سلیمان نے الجزائر، اوران اور طرابلس کے صوبے اور بحرِ ایجین کے متعدد جزیرے جو وینس کے قبضہ میں تھے، فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے،

بحری قزاق سلیمان کے ابتدائی عہد میں شمالی افریقہ کے مسلمان فرماں روا اس قدر کمزور تھے کہ وہ ساحلی علاقوں کے علاوہ اپنی مملکت کے جنوبی حصوں پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتے تھے، اور خود ساحل کے شہر بھی بحری قزاقوں کی آماجگاہ تھے جن میں سے بعض ان فرماں رواؤں کی اطاعت برائے نام تسلیم کرتے تھے، لیکن اکثر بطورِ خود بحرِ روم میں لوٹ مار مچاتے رہتے تھے، یہ بحری قزاق دس دس اور بیس بیس جہازوں کے بیڑے بنا کر اپنے جری اور نہایت تجربہ کار سرداروں کی قیادت میں مالِ غنیمت کے لئے بحرِ روم میں پھرا کرتے تھے اور اسپین، اٹلی اور فرانس، اور کبھی کبھی انگلینڈ اور آئرلینڈ کے ساحلوں پر بھی حملے کیا کرتے تھے،

سلطان سلیم نے بحری قوت پر خاص توجہ کی تھی اور جہازوں کی تعداد اور سائز میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا، سلیمان نے بھی اس کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھا اور بحری قوت کو پہلے سے بہت زیادہ ترقی دی، لیکن اس کے بحری سردار بے خوفی اور مہارتِ فن میں بحری قزاقوں کے ہم پلہ نہ تھے، یہ دیکھ کر اُس نے اُن قزاقوں کو جو اپنی قابلیت اور تجربہ میں دوسروں سے ممتاز تھے، سلطنتِ عثمانیہ کی خدمت کے لئے مدعو کیا اور انھیں اُن کے جہازوں اور آدمیوں کے ساتھ بلا کر ترکی بیڑے کے اعلیٰ عہدوں

پر مقرر کیا،

خیر الدین پاشا بحری ان میں سب سے پہلا اور اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور بحری سردار خیر الدین باربروسہ (سرخ داڑھی والا) تھا، یہ شخص پہلے چند جہازوں کو ساتھ لے کر بحرِ روم کے تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتا تھا، اور پھر ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہونے لگا، چنانچہ اُس نے بطور خود الجزائر پر حملہ کیا اور شہر اور گرد و نواح کے علاقوں پر قبضہ کر لیا، لیکن یہ دیکھکر کہ وہ اپنی خود مختار حکومت قائم نہ رکھ سکے گا، اُس نے سلطان سلیم کی فرمانروائی قبول کر لی، یہ وہ زمانہ تھا جب اُندلس کے مسلمانوں پر اسپین کی عیسائی حکومت انتہائی مظالم کر رہی تھی، خیر الدین نے ان مظلوموں میں سے ستر ہزار کو اپنے جہازوں کے ذریعہ اندلس سے الجزائر پہنچا دیا، پھر جب سلیمان تخت پر آیا تو اُس نے خیر الدین کو عثمانی بحریہ کا امیرِ اعظم مقرر کیا، چنانچہ سنہ ۹۴۱ھ (سنہ ۱۵۳۴ء) میں اُس نے شہنشاہ چارلس کے زبردست بیڑے پر حملہ کیا، اور کورن، پٹراس اور دوسرے ساحلی شہروں کو جن پر چارلس کے مشہور امیر البحر اینڈریا ڈوریا (Andrea Doria) نے قبضہ کر لیا تھا واپس لے کر سواحلِ اٹلی پر حملہ آور ہوا، اس کے بعد سلیمان کی تحریک سے اُس نے تونس پر قبضہ کر کے اُسے الجزائر کی ریاست میں شامل کر لیا، تونس کے حفصی سلطان حسن نے شہنشاہ چارلس سے فریاد کی، چارلس خود پانچ سو جہازوں کا بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر تونس پر حملہ آور ہوا، خیر الدین کو شکست ہوئی اور اُسے تونس چھوڑنا پڑا، چارلس فاتحانہ طور پر شہر میں داخل ہوا، اور گو وہاں کے باشندوں نے اسپینی حملہ کے خلاف خیر الدین کو کسی طرح کی مدد نہ دی تھی، تاہم چارلس نے اپنے سپاہیوں کو شہر لوٹ لینے کی اجازت دیدی، اس موقع پر ایورسلے کا بیان ہے کہ "مظالم اور غارت گری کا جو منظر پیش آیا وہ ناقابلِ یقین ہے، شہر کے تیس ہزار بے قصور باشندے

قتل کر دیئے گئے، اور دس ہزار غلاموں کے طور پر فروخت کئے گئے، مسجدیں اور تمام خاص خاص عمارتیں جلا کر برباد کر دی گئیں[1]، مسجدیں گرجوں کی شکل میں تبدیل کر دی گئیں، کتب خانے برباد کر دیئے گئے، اتنی کتابیں راستہ میں پڑی ہوئی تھیں کہ ان کے ڈھیروں کو روندے بغیر کوئی جامع مسجد تک پہنچ نہیں سکتا تھا، لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، مسلمانوں کی جائدادیں اور مکانات چھین چھین کر عیسائیوں کو دیئے جانے لگے[2]، بہر حال اس تمام قتل و غارت گری کا نتیجہ یہ ہوا کہ تونس سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل کر پھر سلطان حسن کے زیر حکومت آگیا، لیکن حسن کو سلطنت اسپین کی اطاعت قبول کرنی پڑی، اور اس کی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا، اس کے بعد تونس پر ترکوں کا مستقل قبضہ ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) تک نہ ہو سکا،

فرانس کے ساتھ مخصوص مراعات ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں شہنشاہ چارلس اور فرانس اول میں پھر جنگ چھڑ گئی، اور فرانسس نے سلیمان سے مدد کی درخواست کی، اس درخواست کی بنا پر سلیمان اور فرانسس کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی سطوت و اقتدار یورپ میں کس حد تک تسلیم کر لیا گیا تھا، فرانسیسی مصنف البین (Albin) اس معاہدہ کو "رعایت سلطانی" سے تعبیر کرتا ہے، سلیمان نے اہل فرانس کے لئے سلطنت عثمانیہ کے ہر حصہ میں وہ حقوق عام کر دیئے جو ۱۵۲۸ء میں انہیں مصر میں عطا ہوئے تھے، فرانسیسیوں کو پانچ فیصدی محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت دی گئی، کوئی غیر ملکی جہاز جس پر فرانس کا نشان نہ ہو سلطنت عثمانیہ

[1] "ترکی سلطنت" از لارڈ ایورسلے ص ۱۲۵ [2] المونس فی اخبار افریقہ و تونس لابن ابی دینار بحوالہ خلافت عثمانیہ از مولانا سید سلیمان ندوی،

کے زیر اثر سمندروں میں داخل ہونے کا مجاز نہ تھا، فرانسیسی تاجروں کے مقدمات، دیوانی اور فوجداری دونوں صیغوں کے، خود انہی کے قنصلوں کے سپرد کر دیئے گئے، اور ترکی عہدہ داروں کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ وہ ان قنصلوں کے فیصلوں کی تعمیل کراتے رہیں گے، سلطنت عثمانیہ کے فرانسیسی باشندوں کو انتقال جائداد کے متعلق وصیت کرنے کے مخصوص حقوق عطا کئے گئے، انھیں نہ صرف اپنے لئے کامل مذہبی آزادی بخشی گئی بلکہ مقامات مقدسہ کی نگہبانی بھی تفویض ہوئی، اور اس طرح گویا سلطان کی تمام عیسائی رعایا کی حمایت کا حق انھیں حاصل ہو گیا، یورپ کے تمام فرماں رواؤں میں صرف فرانس کے بادشاہ کو سلطان نے بجائے بے کے پادشاہ کے لقب سے سرفراز کیا، اور اس معاہدہ کے بعد اس کے ساتھ ہمسری کا برتاؤ روا رکھا[1]،

جزائر ایجین پر قبضہ چنانچہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں فرانسیس اور چارلس کے درمیان جو جنگ چھڑی اس میں معاہدۂ مذکور کی بنا پر سلیمان نے فرانس کا ساتھ دیا، بحر روم میں خیر الدین پاشا کا اقتدار بدستور قائم تھا، اس نے جزیرہ مائنر کا پر حملہ کر کے وہاں سے بہت کچھ مال غنیمت حاصل کیا، اور کورن پر دوبارہ قبضہ کر لیا، ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) میں سلیمان نے فرانس کی درخواست پر جمہوریۂ وینس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جو چارلس کی مستقل حلیف تھی، خیر الدین پاشا نے سلیمان کی معیت میں جزیرہ کارفو پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا، لیکن اہل وینس نے جانبازی کے ساتھ مدافعت کی اور سلیمان کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا، تاہم خیر الدین نے موقع پا کر بحر ایجین کے تقریباً تمام جزائر پر جو وینس کے زیر حکومت تھے قبضہ کر لیا، اور یہ سب سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لئے گئے، ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں پوپ اور فرڈیننڈ

[1] "مسئلہ شرقیہ" (The Eastern Question) از جے، اے، آر، میریٹ (J. A. R. Marriott) ص ۹۳-۹۴

شاہ ہنگری نے چارلس اور جمہوریہ وینس سے مل کر ترکوں کے خلاف ایک "اتحاد مقدس" قائم کیا اور ستمبر ۱۵۳۸ء میں اتحادیوں کا زبردست بیڑا جو اپنے جہازوں کی تعداد اور قوت کے لحاظ سے ترکی بیڑے سے کہیں بڑھا ہوا تھا، شہنشاہ چارلس کے مشہور امیر البحر انڈریا ڈوریا کی سرکردگی میں پریویسا (Prevesa) کے سامنے عثمانی بیڑے سے مقابل ہوا، ڈوریا کی شہرت اور اتحادی بیڑے کی مجموعی طاقت عیسائیوں کی فتح کی کافی ضمانت سمجھی جاتی تھی، مگر خیر الدین پاشا نے اتحادیوں کو زبردست شکست دیکر اُنکے شیرازہ کو درہم برہم کردیا، اسی دوران میں فرانس نے نیس کے مقام پر چارلس سے ایک عارضی صلح کرلی پھر ۹۴۶ھ (۱۵۳۹ء) میں جمہوریہ وینس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور تین ماہ کیلئے ایک صلحنامہ مرتب کیا گیا لیکن دوسرے ہی سال مستقل طور پر صلح ہوگئی جمہوریہ وینس نے تین لاکھ دوکات تاوان جنگ دینا منظور کیا، اور وہ ساحل ڈلماشیا کے متعدد مقامات سلطان کے حوالہ کرکے بحر ایجین کے اُن جزائر سے دست بردار ہوگئی جن پر خیر الدین نے قبضہ کرلیا تھا،

چارلس سے جنگ کا سلسلہ لیکن اس صلح کا کوئی اثر سلیمان اور چارلس کی جنگ پر نہ پڑا، الجزائر پر خیر الدین پاشا کا قبضہ چارلس کے اسپینی اور اطالوی مقبوضات کے لئے ایک مستقل خطرہ کا باعث تھا، لہذا ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) میں چارلس نے الجزائر کو فتح کرنے کے لئے ایک بیڑا روانہ کیا، مگر یہ بیڑا اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا، دوسرے سال فرانسس نے صلحنامہ نیس (۱۵۳۸ء) کا خاتمہ کرکے چارلس سے پھر جنگ شروع کردی، اور ترکی بیڑے کی مدد سے شہر نیس پر حملہ کیا، اور اُسے فتح کرلیا، فرانسس نے اپنے حلیف کی مدد کا اعتراف کیا، اور اُس کے معاوضہ میں ٹولون کی بندرگاہ ترکوں کے حوالہ کردی، ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں فرانس اور چارلس کے درمیان پھر صلح ہوگئی (صلحنامہ کریپی)، لیکن سلیمان اور چارلس

کی جنگ بحر روم اور ہنگری میں بدستور جاری رہی، فرانس اگرچہ دولت عثمانیہ کا حلیف تھا اور ۱۵۳۵ء کے معاہدہ کے بعد ہر جنگ میں سلیمان نے پوری وفاداری کے ساتھ فرانس کا ساتھ دیا تھا، مگر فرانس کو جب بھی اپنا فائدہ نظر آیا، اُس نے سلیمان کی اجازت کے بغیر چارلس سے صلح کر لی، چنانچہ صلحنامہ نیس (۱۵۳۸ء) اور صلحنامہ کریسپی (۱۵۴۴ء) کا تکملہ عین اُس حالت میں ہوا جب سلیمان فرانسس کے حلیف کی حیثیت سے چارلس سے جنگ میں مصروف تھا، فرانس کے اس طرز عمل کو میریٹ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں مناسب طریقہ پر واضح کر دیا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"فرانس اور خاندان ہیبس برگ (The Habsburgs) (یعنی فرماں روایان آسٹریا و ہنگری) کے درمیان جنگ کا سلسلہ بہت قلیل تفون کے ساتھ ۱۵۳۵ء سے ۱۵۵۹ء تک قائم رہا، اور مکمل طور پر صلح تو ۱۵۹۸ء تک نہ ہو سکی، اس پوری مدت میں اور اس کے بعد بھی فرانس ترکوں کے وفادارانہ تعاون پر اعتماد کر سکتا تھا، اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ترکوں نے فرانسیسیوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مستقل اور مسلسل طور پر اس اتحاد کے ساتھ وفاداری برتی، برخلاف اس کے مؤخر الذکر کے مقاصد کے لئے یہ اتحاد جب اور جتنے دنوں تک مفید ثابت ہوا انھوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا، لیکن جب اُن کے ذاتی اغراض کا تقاضا یہ ہوا کہ ترکوں کے دشمنوں سے صلح کر لی جائے تو انھوں نے اس میں کوئی تامل نہیں کیا۔[1]

خیرالدین پاشا کی وفات ۹۵۳ھ (۱۵۴۶ء) میں خیرالدین پاشا کا انتقال ہو گیا، اُس نے اپنی حیرت انگیز شجاعت اور قابلیت سے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات میں بہت کچھ اضافہ کیا، بلکہ بحر روم، بحر احمر اور بحر ہند میں اُسکی بحری قوت کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا،

---

[1] میریٹ ص ۹۴،

یہاں تک کہ یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ طاقتور شہنشاہ چارلس پنجم بھی تنہا اُس کے مقابلہ کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، گو وہ محض ایک سپاہی تھا تاہم علوم وفنون کی سرپرستی کا شوق اسے اتنا زیادہ تھا کہ اُس نے اپنی دولت کا بڑا حصہ ایک کالج قائم کرنے میں صرف کر دیا،

طورغوت | خیرالدین پاشا کے علاوہ سلیمان کو اسی قسم کے دو اور مشہور بحری کپتانوں کی خدمات بھی حاصل ہوگئی تھیں جن کی غیر معمولی شجاعت اور قابلیت کا سکہ بحر روم اور اُس کے ساحلی علاقوں پر بیٹھا ہوا تھا، ان میں سے ایک طورغوت اور دوسرا پیالے تھا طورغوت بھی ابتدا میں ایک بحری قزاق رہ چکا تھا چنانچہ ایک بار اُس نے تئیس جہازوں کا بیڑا تیار کر کے جزیرہ کارسیکا پر حملہ کر دیا لیکن ڈوریا نے اُسے شکست دیکر گرفتار کر لیا، اور زنجیروں میں ڈال دیا، آخر کار مہینوں کے بعد خیرالدین باربروسہ کی دھمکی سے کہ اگر طورغوت رہا نہ کیا گیا تو جنوا (ڈوریا کا وطن) برباد کر دیا جائیگا، ڈوریا نے اُسے آزاد کیا، طورغوت اپنی مہارت فن اور شجاعت میں خیرالدین سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا، اٹلی اور اسپین کے ساحلی علاقے اس کے نام سے کانپتے تھے، عثمانی رعایا ہونے کے باوجود اس کو سلطان کے حلیفوں کے جہاز گرفتار کر لینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا، چنانچہ ایک بار اُس نے وینس کے چند تجارتی جہاز گرفتار کر لئے، اور جب سلیمان نے بازپرس کرنے کے لئے اس کو قسطنطنیہ میں طلب کیا تو اُس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا، اور اپنے بیڑے کو لے کر مراکش چلا گیا اور وہاں کے سلطان کی ملازمت اختیار کر لی، پھر خیرالدین پاشا کی وفات کے بعد سلیمان نے معافی اور اعلیٰ منصب کا وعدہ کر کے اسے بلا لیا اور چند دنوں کے بعد طرابلس کی فتح کے لئے روانہ کیا، طرابلس اُس وقت مبارزین مالٹا کا مقبوضہ تھا، طورغوت نے حملہ کر کے اُسے

فتح کرلیا، اور سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر دیا، اس کے بعد وہ طرابلس کا حاکم مقرر ہوا، ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں جب ترکوں نے مالٹا پر حملہ کیا تو وہ بھی اپنا بیڑا لیکر دولتِ عثمانیہ کی مدد کو آیا لیکن اسی معرکہ میں وہ مارا گیا،

پیالے پیالے بھی ایک مدت تک بحری قزاق رہ چکا تھا، پھر اُس نے سلیمان کی ملازمت اختیار کرلی اور رفتہ رفتہ عثمانی بیڑے کا امیر البحر مقرر ہوگیا، ۹۶۷ھ (۱۵۶۰ء) میں دو سو جہازوں کا ایک عظیم الشان عیسائی بیڑا طرابلس کو ترکوں سے واپس لینے کے لئے ڈوریا کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا تھا، پیالے اس کے مقابلہ کے لئے دردانیال سے نکلا، اور عثمانی جزیرہ جربہ کے قریب جس پر عیسائیوں نے اپنی فوجیں اُتار دی تھیں اور ایک قلعہ بھی تعمیر کرلیا تھا، ۱۴ مئی ۱۵۶۰ء کو ڈوریا کے بیڑے پر حملہ آور ہو کر اُسے نہایت سخت شکست دی، عیسائیوں کے تقریبًا پچاس جہاز برباد ہوگئے، اور سات گرفتار کرلئے گئے، جزیرہ پر جو عیسائی فوجیں پہنچ چکی تھیں اُنھیں بھی قلعہ کا محاصرہ کرکے پیالے نے گرفتار کرلیا، اور جربہ پر عثمانی علم پھر لہرانے لگا، اُس کے بعد اُس نے اوران کے صوبہ پر جو الجزائر کے مغرب میں واقع ہے حملہ کرکے اُسے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرلیا، ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں جب مالٹا پر حملہ ہوا تو وہی عثمانی بیڑے کا امیر البحر تھا،

پرتگال سے بحری جنگ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں اسپین کے بعد جس ملک سے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا وہ پرتگال تھا، اُندلس میں جب اسلامی حکومت قائم تھی تو پرتگال بھی اُسی کے زیرِ سایہ تھا، لیکن جب اُس سرزمین میں مسلمانوں کا آفتابِ اقبال غروب ہوا، اور اسپین کی عیسائی حکومت نے اسلام کشی کا عمل شروع کیا تو پرتگال نے بھی اخوتِ دینی کا حق پوری طرح ادا کیا، تفصیل آگے آتی ہے، ہندوستان، چین، سیام، جاوا، سماٹرا

جزائر ہند، سیلون، ملیبار، ممباسہ، زنجبار، حبش، مصر و عرب وغیرہ مشرقی ممالک کی بحری تجارتیں عرب تاجروں کے ہاتھوں میں تھیں، ان کے جہاز بحر ہند، بحر عرب، خلیج فارس اور بحر احمر کے تجارتی راستوں پر قابض تھے، یہ لوگ چین، ہندوستان اور ایران وغیرہ سے مال لیجاکر مصر پہنچاتے تھے، اور وہاں سے وینس اور جنوا کے سوداگر اسے یورپ لیجاتے تھے، پھر اسی طریقہ سے یورپ کا مال عربوں کے جہازوں پر ہندوستان، ایران، اور چین وغیرہ مشرقی ملکوں میں پہنچتا تھا، اس تجارت سے مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کو بہت فائدہ تھا، لیکن جب واسکوڈی گاما نے راس امید کی راہ سے ہندوستان تک پہنچنے کا راستہ دریافت کیا تو پرتگال نے اس بات کی کوشش شروع کی کہ جس طرح ممکن ہو یہ تجارت عربوں کے ہاتھوں سے چھین لیجائے اور مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کے لئے بجائے قدیم راستہ کے وہ جدید راستہ اختیار کیا جائے جس کو واسکوڈی گاما نے دریافت کیا تھا، اس مقصد کے حصول کے لئے پرتگیزوں نے جو طریقہ اختیار کیا، اس کی نوعیت مولانا سید سلیمان ندوی کے مستند رسالہ خلافت عثمانیہ سے واضح ہوتی ہے، مولانا فرماتے ہیں:۔

"اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عرب جہازوں پر تاخت شروع کی، عرب، حبش، ہندوستان اور فارس کے ساحلی مقامات پر حملے کئے، اور نامسلموں کو مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں اور عربوں کے ہاتھ اپنا اسباب تجارت فروخت نہ کریں، ملیبار کے موپلہ تاجروں پر بڑی زیادتیاں کیں، یمن اور حجاز کے ساحلی شہروں پر قبضہ جمایا، اور ہندوستان میں سندھ سے لے کر مدراس و گجرات و بمبئی تک کے بندرگاہوں پر دھاوے کئے، ساحلوں اور جزیروں میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، مسجدیں توڑ توڑ کر کلیسا بنائی جا رہی تھیں، کالی کٹ کے راجہ کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو عرب آنے جانے سے روک دے، کوچین ساحل ہند

پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو قتل کیا اور مسجد کو کلیسا بنا لیا، اور پھر رفتہ رفتہ عرب کے سواحل پر عدن، ہرمز، پریم وغیرہ کو اور ہندوستان کے سواحل میں سے گوا، جیول، دابل، دیپ، دمن مہائم وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا۔ ۹۱۵ھ میں کالی کٹ پر حملہ کر کے شہر کو لوٹ لیا، اور وہاں کی جامع مسجد کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، یہی حال انھوں نے عرب کے ساحلی مقامات کا کر دیا، حج کے بحری مسافران قزاقوں کے ہاتھوں سے بمشکل جانبر ہو سکتے تھے، گوا کا مشہور بندرگاہ سلطنت بیجاپور سے چھین لیا، اور سلطان گجرات کے تمام بندرگاہوں پر غارتگری شروع کر دی، جدّہ اور عدن پر کئی حملے کئے، کبھی کامیابی ہوئی اور کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، انتہا یہ ہے کہ پرتگالی یہ خواب دیکھنے لگے کہ جدّہ پر قبضہ کر کے حجاز پر حملہ کیا جائے اور خاکم بدہن مکہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کو ویران اور حرمین محترمین کو منہدم کر کے اسلام کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔"[۱]

یہ حالات تھے جن کے دفعیہ کی ذمہ داری سلیمان نے تخت پر آنے کے بعد بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے محسوس کی، اور پھر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی حتی الامکان پوری کوشش کی، چنانچہ ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) میں اُس نے ایک بیڑا رئیس سلیمان کی ماتحتی میں عدن کے محاصرہ کے لئے روانہ کیا، جس پر اُس وقت پرتگیزوں کا قبضہ تھا، مگر اس مہم میں ترکوں کو شکست ہوئی، پھر بھی وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، اور بحر ہند میں برابر پرتگال کے جہازوں پر حملے کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ گجرات کے ساحل تک پہنچ گئے، جہاں اُن میں اور پرتگیزوں میں متعدد معرکے پیش آئے، اس کے بعد ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں ایک عظیم الشان ترکی بیڑا سلیمان پاشا والی مصر کی سرکردگی میں سویز سے نکلا، اور عدن پر قبضہ کرتا ہوا گجرات کی طرف روانہ ہوا، دیپ پہنچنے کے بعد گجراتیوں سے مل کر

[۱] ان واقعات کی تفصیل واسناد کے لئے رسالہ مذکور کے صفحات ۲۴ تا ۵۷ ملاحظہ فرمائیں،

اُس نے پرتگیزوں پر حملے شروع کردیئے، سلیمان پاشا نے دیپ کا محاصرہ کرلیا، اور اگر وہ استقلال کے ساتھ محاصرہ کو جاری رکھتا، تو یہ بندرگاہ پرتگال کے قبضہ سے ضرور نکل جاتی لیکن غالباً سلیمان پاشا کی خودرائی اور استبداد نے امرائے گجرات کو آزردہ کردیا تھا جنکی وجہ سے اُنھوں نے سامان رسد کا بھیجنا بند کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز دفعۃً ترکی بیڑے نے لنگر اُٹھاکر کوچ کردیا، اور دیپ پر پرتگیزوں کا قبضہ بدستور قائم رہا، سلیمان کو جب یہ خبر پہنچی تو اُسے بہت غصہ آیا، اُس نے سلیمان پاشاہ کو اپنے دربار میں طلب کیا، اور غضبناک ہوکر کہنے لگا کہ "میں نے تم کو دیپ سے فرنگیوں کو نکالنے کے لئے اور وہاں کے بادشاہ کی مدد کے لئے بھیجا تھا، ہندوستان کے مسلمانوں پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا تھا"[1]

پیری رئیس | ترکوں کی اس ناکامی سے پرتگیزوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ اُنھوں نے عدن پر دوبارہ قبضہ کرلیا، اس لئے ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں سلیمان نے مشہور ترکی امیرالبحر پیری رئیس کے زیر قیادت ایک مضبوط بیڑا بحر ہند میں روانہ کیا، اس بیڑے نے پہلے عدن کو پرتگیزوں کے قبضہ سے چھڑایا، پھر وہ عرب کے ساحلی مقامات سے گذرتا ہوا مسقط پہنچا جہاں اُس نے پرتگالی بیڑے کو غافل پاکر گرفتار کرلیا، لیکن جب خلیج فارس کے ساحل پر پرتگیزوں کو شکست دیکر یہ ہرمز پہنچا، تو وہاں ایک سخت معرکہ پیش آیا جسمیں دشمنوں کو فتح ہوئی اور پیری رئیس صرف دو[2] جہازوں کو لے کر نکل سکا، بقیہ گرفتار ہوگئے، پیری رئیس ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے بھی اسی قدر مشہور ہے، جس قدر ایک امیرالبحر کی حیثیت سے اُس نے بحر ایجین اور بحر روم پر دو کتابیں لکھی ہیں جن میں ذاتی معلومات کی بنا پر ان سمندروں کے دھاروں، گردو پیش کے علاقوں، بندرگاہوں اور ساحل پر اترنے کی مناسب جگہوں کے

---

[1] خلافت عثمانیہ صـ۱۶۱،

حالات بیان کیے ہیں،

سیدی علی پیری رئیس کی شکست کی خبر سنکر سلیمان نے ایک دوسرے امیرالبحر مرادبے کو روانہ کیا تاکہ عثمانی بیڑے کو آزاد کرائے، ہرمز کے سامنے پرتگالی بیڑے سے مقابلہ ہوا جس میں ترکون کو شکست ہوئی، اور اُن کے جہازوں کا بڑا حصہ ڈوب گیا، اس کے بعد سلیمان نے اپنے مشہور امیرالبحر سیدی علی کو اس مہم پر روانہ کیا، یکم شوال ۹۶۱ھ د ۱۵۵۴ء کو وہ بصرہ سے روانہ ہوا اور خلیج فارس کے کنارہ کنارہ ہوتا ہوا جب راس موسندام کے قریب پہنچا، تو پرتگالی بیڑا سامنے نظر آیا، ایک سخت معرکہ کے بعد پرتگیزوں کو شکست ہوئی اور سیدی علی کے لئے آگے کا راستہ صاف ہو گیا، چنانچہ وہ کھلے سمندر میں داخل ہو کر مسقط کے سامنے نمودار ہوا یہاں پرتگیزوں نے پھر مقابلہ کیا اور اس جنگ میں طرفین کو شدید نقصان پہنچا، رات کے وقت جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دفعۃً ہوا اس قدر تیز ہوئی کہ سیدی علی کے جہاز بے قابو ہو گئے، اور وہ بہ کر بلوچستان کے ساحل پر نکل آیا، چند دنوں کے بعد اُس نے پھر بحر احمر کا رُخ کیا، لیکن ایک ناگہانی طوفان اُسے دوبارہ بحر ہند میں بہالے گیا، سیدی علی نے سورت کی بندرگاہ میں آکر جہازوں کو چھوڑ دیا اور خشکی کا راستہ اختیار کیا، وہ افغانستان ایران، اور عراق ہوتا ہوا قسطنطنیہ واپس آگیا، اور یہ مہم ناتمام ہی رہی، اس کے بعد سلیمان کے عہد میں پرتگیزوں سے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں، مگر کوئی بڑا مقابلہ پیش نہیں آیا،

پیری رئیس نے گجرات سے قسطنطنیہ تک کی سیاحت کے حالات ایک سفرنامہ میں قلمبند کیے ہیں، وہ شاعر بھی تھا، اُس نے ریاضیات اور فن جہازرانی پر بھی چند رسالے لکھے ہیں، جو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، خصوصاً اُس کی تصنیف "محیط" جو بحر ہند کی جہازرانی پر ہے، نہایت مستند خیال کیجاتی ہے، جرمن مورخ فان ہیمر کا بیان ہے کہ

بحر ایجین اور بحر روم کے حالات پر جو کتابیں پیری رئیس نے لکھی ہیں، ان کے نسخے برلن اور ڈریسڈن کے شاہی کتب خانوں، نیز روم میں پوپ کے کتب خانہ اور بولونا میں موجود ہیں، سیدی علی کی "محیط" کا واحد معلوم نسخہ نیپلز میں ہے[1]،

مالٹا | مالٹا مبارزین سینٹ جان کا مقبوضہ تھا، جہاں روڈس سے نکلنے کے بعد انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، یہ اور اس کے قریب کا چھوٹا سا جزیرہ غوزا شہنشاہ چارلس نے انھیں دیدیا تھا، مالٹا میں آنے کے بعد انھوں نے اسکو نہایت مستحکم کر لیا تھا، مبارزین کے جہاز اسپین اور دوسری مخالف طاقتوں کے بیڑوں کے ساتھ مل کر عثمانی بیڑوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، اور ترکوں سے اُن کی جنگ برابر جاری رہتی تھی، یہ لوگ سلطنت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں پر بھی حملہ آور ہوتے رہتے تھے، اور بحر روم میں لوٹ مار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، مجبوراً سلیمان کو مالٹا پر حملہ کا تہیہ کرنا پڑا، حملہ کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مالٹا میں ایک کثیر تعداد مسلمان غلاموں کی موجود تھی، جو وہاں کے عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آگئے تھے، علاوہ بریں بحر روم میں یہ جزیرہ اپنے موقع کے لحاظ سے نہایت اہم تھا، چنانچہ یکم اپریل ۱۵۶۵ء کو سلیمان نے (۱۸۱) جہازوں کا ایک زبردست بیڑا تیس ہزار فوج کے ساتھ مصطفیٰ پاشا کی سرکردگی میں قسطنطنیہ سے روانہ کیا، ۱۹ مئی کو یہ بیڑا مالٹا پہنچا اور دوسرے ہی روز حملہ شروع ہوگیا، ۲۳ جون ۱۵۶۵ء کو قلعہ سینٹ ایلمو (St. Elmo) فتح ہوگیا، لیکن ترکوں کی انتہائی کوشش اور شدید نقصان کے باوجود سینٹ انجیلو (St. Angelo) اور سینٹ مائیکل (St. Michel) کے قلعوں پر قبضہ نہ ہوسکا، اور بالآخر چار ماہ کی مسلسل جد و جہد کے بعد ۱۱ ستمبر ۱۵۶۵ء کو

---

[1] کریسی جلد ا صفحہ ۲۸۸ فٹ نوٹ،

مصطفےٰ پاشا نے محاصرہ اُٹھا لیا، اس محاصرہ میں پچیس ہزار ترک اور پانچ ہزار عیسائی مارے گئے،

ہنگری کی مہم اور سلیمان کی وفات

جس وقت محاصرہ اٹھا لینے کی خبر قسطنطنیہ پہنچی سلیمان آسٹریا سے ایک نئی جنگ کی تیاری کر رہا تھا، وجہ یہ تھی کہ ہنگری کی حریف جماعتوں میں پھر نزاع شروع ہو گئی تھی اور میکسی میلین ثانی (Maximilian II) نے جو فرڈیننڈ کے انتقال کے بعد اُس کا جانشین تھا کونٹ زاپولیا کے لڑکے کو تخت سے محروم کر دینے کا عزم کر لیا تھا، چنانچہ اسی سلسلہ میں اُس نے بعض اہم قلعوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا، یہ معلوم کر کے سلیمان نے بذات خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا، اور باوجود اس کے کہ اس کا سن (۷۶) سال کا ہو چکا تھا اور ضعف عمر اور علالت کے باعث وہ گھوڑے پر بیٹھ نہیں سکتا تھا، پالکی میں سوار ہو کر یکم مئی ۱۵۶۶ء کو فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے ہنگری کی طرف روانہ ہوا، اسمیں شبہہ نہیں کہ آسٹریا کی جنگ نے اس سال مبارزین مالٹا کو دوسرے حملہ سے محفوظ کر دیا، جو یقیناً اُن کے لئے مہلک ثابت ہوتا، ۲۷ جون ۱۵۶۶ء کو سلیمان سملین کے مقام پر پہنچا اور وہاں نوجوان سیجمنڈ زاپولیا — Sigismund Zapolya نے جو سلطنت عثمانیہ کے زیر سرپرستی ہنگری اور ٹرانسلوینیا کا بادشاہ تھا اُس کے سامنے نذر اطاعت پیش کی، آگے بڑھنے سے پہلے سلیمان ایرلاؔ (Erlau) اور زیجتھ (Szigeth) کے قلعوں کو فتح کر لینا چاہا تھا چنانچہ ۵ راگست ۱۵۶۶ء کو عثمانی فوجوں نے زیجتھ کے شہر کے گرد اپنے خیمے نصب کر دیئے، پانچ روز میں شہر فتح ہو گیا لیکن وہاں کے حاکم زرینی (Zriny) اور اُس کے باقی ماندہ (۲۳۰۰) آدمیوں نے قلعہ میں پناہ لی اور وہاں سیاہ علم نصب کر کے اس بات کی قسم کھائی کہ جب تک

ایک سپاہی بھی زندہ رہیگا، ہتھیار نہ ڈالیں گے، اگست اور ستمبر میں ترکوں نے اس قلعہ پر تین حملے کئے لیکن ہر بار انھیں پسپا ہونا پڑا، بالآخر انھوں نے قلعہ کے سب سے بڑے برج کے نیچے سرنگ کھود کر بارود بچھادیا اور ۵ ستمبر ۱۵۶۶ء کو علی الصباح بارود میں آگ لگادی، پھر بھی چار روز کی مسلسل گولہ باری کے بعد ۸ ستمبر کو یہ قلعہ فتح ہوا، لیکن ۵ ستمبر کی رات ہی کو سلیمان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی، صدر اعظم صوقوللی نے سلطان کی وفات کی خبر بالکل مخفی رکھی اور اسی کے نام سے تمام احکام جاری کرتا رہا، اس نے پوشیدہ طور پر شہزادہ سلیم کے پاس اس حادثہ کی اطلاع بھیج دی، اس درمیان میں عثمانی فوجیں جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی متعدد مقامات فتح کرتی رہیں، صوقوللی نے سلیمان کی لاش پر مسالہ لگا کر اسے خراب ہونے سے محفوظ کر دیا تھا اور کوچ کے وقت لاش کو پالکی میں رکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لیجاتا تھا، اس نے لشکر میں یہ خبر مشہور کرا دی تھی کہ سلطان علالت کی وجہ سے باہر نکلنے سے معذور ہے، اس تدبیر سے اس نے سات ہفتہ تک اس کی وفات کو پوشیدہ رکھا، اور بالآخر یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ قسطنطنیہ میں شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھ چکا، اس نے ۲۴ اکتوبر ۱۵۶۶ء کو تمام فوج کو جمع کر کے سلیمان کی وفات کا اعلان کر دیا،[۱]

سلطنت عثمانیہ کی وسعت سلیمان کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور خوشحالی کے لحاظ سے حد کمال تک پہنچ گئی تھی، اس کے بعد جزائر سائپرس و کریٹ کے علاوہ اس میں بہت کم اہم اور مستقل اضافے ہوئے، اس وسیع و عریض سلطنت کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل سے زیادہ تھا، یہ بودا سے بصرہ تک اور بحر کاسپین سے بحر روم کے مغربی حصہ تک پھیلی ہوئی تھی، اور یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اس میں شامل تھے، شمال میں ازوف کی دیوار

[۱] کریسی جلد ا صفحہ ۳۱۱،

روس کے مقابل سلطنت عثمانیہ کی سرحد کی حفاظت کرتی تھیں، جنوب میں عدن کی پہاڑی نے سلاطین کی حکومت عرب کے جنوبی ساحل پر مستحکم کر دی تھی، انھیں بحر ہند میں باثر بنا دیا تھا اور بحر احمر پر کامل اختیار دے رکھا تھا...... سلطان کا یہ فخر کوئی بیجا فخر نہ تھا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرماں روا، تین بر اعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک تھا[1]"

سلطنت کی انتظامی تقسیم | سلیمان نے اس عظیم الشان سلطنت کو اکیس ولایتوں اور پھران ولایتوں کو (۲۵۰) سنجقوں میں تقسیم کر دیا تھا، ولایتیں حسب ذیل تھیں:-

(۱) رومیلیا اس میں یورپ کے وہ تمام عثمانی مقبوضات شامل تھے، جو دریائے ڈینوب کے جنوب میں واقع تھے اور جن میں یونان، مقدونیا، تھریس، اپائرس، ایلیریا، دلماشیا، اور بوسنیا کے صوبے بھی داخل تھے،

(۲) مجمع الجزائر بحر روم، یہ ولایت قبودان پاشا (امیر البحر اعظم) کے سپرد تھی،

(۳) الجزائر اور اس کے علاقے،

(۴) طرابلس،

(۵) اوفن، جس میں مغربی ہنگری کے مفتوحہ علاقے شامل تھے،

(۶) تمیسوار بشمول بنات، ٹرانسلونیا و مشرقی ہنگری،

(۷) اناطولیہ، عموماً اس سے تمام ایشیائے کوچک مراد لیتے ہیں، لیکن یہاں اس سے ایشیائے کوچک کا صرف شمالی مغربی حصہ مراد ہے،

(۸) کرمانیہ، (۹) روم جسے ولایت سیواس اور بعض اوقات حکومت اماسیا بھی کہتے تھے (۱۰) سوالقدریہ، اس میں ملاٹیا، سموسٹا، اور البوستان کے شہر اور ملحق علاقے اور کوہ طور

---

[1] فنلے (Finlay) بحوالہ میریٹ ص ۹۹،

کے مشرقی درے شامل تھے،

(۱۱) طرابزون،

(۱۲) دیار بکر (۱۳) وان، ان دو ولایتوں میں آرمینیا اور کردستان کے بیشتر حصے شامل تھے

(۱۴) حلب (۱۵) دمشق ان دونوں میں شام اور فلسطین کی ولایتیں شامل تھیں،

(۱۶) مصر،

(۱۷) مکہ، مدینہ اور حجاز کے علاقے،

(۱۸) یمن و عدن، یہ ولایت جنوبی عرب، خلیج فارس کے ساحلی علاقے اور شمالی مغربی ہند تک پھیلی ہوئی تھی،

(۱۹) بغداد (۲۰) موصل (۲۱) بصرہ، یہ تینوں ولایتیں اُن فتوحات پر مشتمل تھیں جو سلیم اور سلیمان نے مسوپوٹامیا، اور اُس سے ملحق جنوبی علاقوں میں ایرانیوں سے حاصل کی تھیں،

ان ولایتوں کے علاوہ ولاچیا، مولڈیویا، رگوسا، اور کریمیا کی مملکتیں بھی سلیمان کی باجگذار تھیں، ولاچیا اور مولڈیویا سے خراج زیادہ مقدار میں آتا تھا، اور کریمیا عثمانی افواج کے لئے بہادر تاتاریوں کے دستے مہیا کرتا تھا،

آبادی: سلیمان اعظم کی وسیع سلطنت میں بیس[۲] مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے، اُن میں سے عثمانی ترکوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ تھی، ان کا بیشتر حصہ (۴/۵) ایشیا اور خصوصاً ایشیائے کوچک میں آباد تھا، تیس لاکھ یونانی یورپین ترکی کے جنوبی حصہ میں آباد تھے، اور دس لاکھ ایشیائے کوچک میں، آرمینی نسل کے لوگ جن کی تعداد بیس[۲] اور تیس[۳] لاکھ کے درمیان تھی زیادہ تر ایشیا میں تھے، سب سے زیادہ تعداد سلافی نسل کے باشندوں کی تھی، بلغاریا، سرویا، بوسینیا، مونٹی نیگرو

اور ہرزیگووینا میں کثرت تعداد انہی لوگوں کی تھی، مولڈیویا، اور ولاچیا میں بھی اُن کی تعداد زیادہ تھی، اور اُن میں سے کئی ہزار ٹرانسلوینیا اور البانیا میں بھی آباد تھے، اُن کی مجموعی تعداد تخمیناً (۶۵) لاکھ تھی، رومی نسل کے لوگ زیادہ تر ولیچیا اور مولڈیویا میں پائے جاتے تھے اُن کی تعداد چالیس لاکھ تھی، اہلِ البانیا جنھیں ترک ارناؤط (SKIPETARS) کہتے ہیں تقریباً پندرہ لاکھ تھے، تاتاریوں کی تعداد بھی تخمیناً پندرہ لاکھ تھی، عربی نسل کثرت سے شام، عرب، مصر، اور شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی، اور سلیمان کے عہد میں اس کا شمار تقریباً ساٹھ لاکھ تھا، مارونی کالڈی اور دروزی نسل کے لوگ مجموعی طور پر دس لاکھ کے اندر تھے، کردوں کی تعداد بھی غالباً اسی قدر تھی، دیار بکر اور ملحق علاقوں کے ترکمانوں کا شمار ایک لاکھ تھا، ان کے علاوہ ترکی ہنگری کے مگیار اور ٹرانسلوینیا کے جرمن نسل والے، الجیریا اور دوسرے افریقی صوبوں کے بربر، مصر کے قبطی، یہودی، سگانی (Tsiganes) مملوک، اور وہ ہندوستانی جو ترکی گورنروں کے زیر حکومت تھے، یہ سب سلطان سلیمان اعظم کی عظیم الشان سلطنت میں آباد تھے، سلطنت کی مجموعی آبادی کا تخمینہ ساڑھے چار کرور سے پانچ کرور تک کیا جاتا ہے[1]

فوج سلیمان کی سلطنت کی وسعت کا ایک بڑا سبب اُسکی فوجی قوت تھی، (۴۶) سال کی حکومت میں اُس نے عثمانی فوجوں کی تعداد دو چند کر دی تھی، ینی چری کی تعداد اُس نے بیس ہزار تک پہنچا دی، مستقل اور تنخواہ دار فوج کا شمار جسمیں شاہی سوار اور دوسرے دستے شامل تھے، اڑتالیس ہزار تھا، سلیمان کی توجہ سب سے زیادہ ینی چری پر رہتی تھی، کیونکہ یہی فوج اکثر معرکوں میں فتوحات کی ضامن ہوتی، اُس نے اس فوج کا ایک علیحدہ دستہ قائم کیا تھا،

[1] کریسی جلد اول ص ۲۲۰-۲۱،

جن میں وہی سپاہی داخل کئے جاتے تھے جو ایک طویل مدت کی فوجی خدمات کے بعد ضعیف ہو جاتے یا زخموں کے باعث کسی جنگ میں شریک ہونے کے قابل نہ رہ جاتے، سلیمان کی نظر میں ینی چری کی جو اہمیت اور قدر تھی اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اعزازی طور پر وہ خود اس فوج میں داخل ہو گیا تھا، اور جس روز تنخواہ تقسیم کی جاتی تھی ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے خود بھی تنخواہ لینے کے لئے حاضر ہوتا تھا، یہ طریقہ اس کے جانشینوں نے بھی جاری رکھا، جو فوجیں سلطنت کے جاگیردار جمع کرتے تھے یا جو بے ضابطہ طور پر جنگ کے موقعوں پر خود جمع ہو جاتی تھیں اُن کا شمار دو لاکھ سے زیادہ تھا، ان کے علاوہ تین سو توپیں اور تین سو جہاز تھے،

سولھویں صدی کی ابتدا سے یورپ کی مسیحی سلطنتوں کی فوجوں میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہونے لگی تھی لیکن عثمانی فوجیں اپنی تنظیم اور ساز و سامان میں مسیحی فوجوں سے بہت آگے تھیں، توپخانوں کی تعداد اور قوت کے علاوہ قلعہ بندی و قلعہ سازی اور فوجی انجینیرنگ کی تمام شاخوں میں ترک یورپ کی سلطنتوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے تھے، کریسی لکھتا ہے کہ سلیمان اپنی فوجوں کے جسمانی آرام اور اخلاقی نگرانی پر جس قدر توجہ رکھتا تھا، اُس کو اُس بے پروائی سے کوئی مناسبت نہ تھی جو اُس کے حریفوں کے لشکر میں بدنصیب سپاہیوں کے ساتھ برتی جاتی تھی، [1]

محاصل سلطنت محاصلِ سلطنت کے لحاظ سے بھی سلیمان کو اپنے تمام ہمعصر فرمانرواؤں پر فوقیت حاصل تھی اُن کے عہد میں خالصہ کی آمدنی پچاس لاکھ دوکات تھی، عشر، جزیہ محصول درآمد برآمد، اور دوسرے مستقل محصولوں کی آمدنی ملا کر یہ رقم ستر اور اسّی لاکھ دوکات

[1] کریسی جلد ۱ ص ۳۲۴،

تک پہنچ جاتی تھی، رعایا پر محصول کا بار ہلکا تھا، اور صرف دو موقعوں پر ایک بار جب وہ بلغراد اور روڈس کے محاصرہ کی تیاری کر رہا تھا، اور دوسری مرتبہ جب اُسے جنگ موہاکز کیلئے سامان فراہم کرنا تھا سلیمان کو ایک زائد محصول لگانا پڑا جس میں اس کی تمام رعایا بلا امتیاز مذہب وحیثیت شریک کی گئی، لیکن دونوں مرتبہ محصول کی رقم قلیل تھی، اور ان موقعوں کے علاوہ پھر کبھی کسی زائد محصول کی ضرورت پیش نہیں آئی، جنگوں کے اخراجات مال غنیمت سے پورے ہوتے رہتے تھے، ان اخراجات کے علاوہ ہر فتح سے کافی رقم سلطان کو بھی ملتی تھی، ہنگری، ٹرانسلوینیا، رگوسا، مولڈیویا اور ولاچیا سے خراج آتا تھا، آمدنی کا ایک ذریعہ اُن اعلیٰ حکام سلطنت کا ضبط کردہ سامان اور جائدادیں بھی تھیں جو کسی جرم میں سلطان کے حکم سے قتل کر دیئے جاتے تھے،

نظام جاگیری | سلیمان نے ترکی نظام جاگیری کی تنظیم خاص توجہ کے ساتھ کی اور اُن عیوب کو دور کیا جو اس نظام میں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں، اُس نے قانون بنا دیا کہ کوئی تیمار (چھوٹی جاگیر) ایک خاص حد سے نیچے قائم نہ رکھی جائے، متعدد چھوٹی جاگیروں کو ملا کر ایک زعامت (بڑی جاگیر) بنا لینے کی اجازت تھی، لیکن کوئی زعامت تقسیم کر کے تیمار نہیں بنائی جا سکتی تھی، علاوہ اس صورت کے کہ کسی زعامت کا جاگیردار جنگ میں قتل ہو گیا ہو، اور اُس نے ایک سے زیادہ لڑکے چھوڑے ہوں، سلطان کی اجازت سے متعدد اشخاص مل کر کسی جاگیر کو اپنی مشترکہ کاشت میں رکھ سکتے تھے، لیکن یہ جاگیر اُس وقت بھی ایک جاگیر شمار کیجاتی تھی، جاگیر کی کوئی تقسیم جس کے لئے باب عالی سے خاص طور پر اجازت حاصل نہ کر لی گئی ہو سخت سزا کی مستوجب ہوتی، ان قوانین سے اُن برائیوں کا انسداد ہو گیا جو جاگیروں کے ٹکڑے کر دینے سے مسیحی یورپ کے نظام جاگیری میں پھیلی ہوئی تھی، جاگیردا

کو وصیت نامہ یا کسی دوسرے ذریعہ سے جاگیر کے انتقال کا اختیار نہ تھا، اگر کوئی جاگیردار اولاد نرینہ چھوڑے بغیر مرجاتا تو اُس کی جاگیر سلطان کے قبضہ میں چلی جاتی، سلیمان سے پہلے وزرا اور صوبے کے حاکموں کو اجازت تھی کہ وہ اس قسم کی جاگیریں دوسرے اشخاص کو دیدیں، لیکن سلیمان نے اس اختیار کو صرف چھوٹی جاگیروں تک محدود کر دیا، سلطان کے علاوہ کوئی دوسرا کسی ایسی زعامت کو دینے کا اختیار نہ رکھتا تھا، جو سابق جاگیردار کی وفات پر سلطان کے قبضہ میں آچکی ہو، اگر کوئی شخص کسی چھوٹی جاگیر (تیمار) کو سلطان کے علاوہ کسی اور سے بھی پاتا تب بھی اُس کے جاگیری فرائض تمام تر سلطان ہی سے متعلق ہوتے، اور جاگیر کے عطا کرنے والے کو اُس شخص پر کسی قسم کا جاگیری حق حاصل نہ ہوتا، "سپاہی" اس نظام جاگیری میں صرف اپنے سلطان کا تابع تھا،

سلیمان کے عہد میں بڑی جاگیروں (زعامت) کی تعداد (۳۱۹۲) اور چھوٹی جاگیروں (تیمار) کی (۵۰۱۶۰) تھی، سپاہی (یعنی فوجی جاگیردار) کا فرض صرف یہ نہ تھا کہ وہ جنگ کے موقع پر فوجی خدمت کے لئے خود حاضر ہو بلکہ اگر اسکی جاگیر کی قیمت ایک متعین رقم سے زیادہ ہوتی تو اُس زیادتی کی مناسبت سے ایک ایک سے زیادہ مسلح سواروں کو بھی اپنے ساتھ حاضر کرنا پڑتا، سلیمان کے عہد میں فوجی جاگیرداروں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ سوار تھی، یہ سوار بیلربے اور سنجق بے کی طلب پر متعین مقامات پر جمع ہو کر عثمانی فوجوں میں شامل ہو جاتے اور بغیر کسی تنخواہ کے جنگ میں شریک رہتے، مستقل تنخواہ دار فوج کا شمار اڑتالیس ہزار تھا، اُن کے علاوہ تاتاری سواروں کے متعدد دستے تھے جنھیں خان کریمیا ایک نائب حاکم کی حیثیت سے ہر جنگ کے موقع پر بھیجتا، نیز بے ضابطہ سواروں اور پیادوں کا ایک انبوہ کثیر تھا، جو بطور خود آکر ترکی لشکر میں شامل ہو جاتا، اور جسے مال غنیمت

کے سوا اور کچھ نہ ملتا[1]

"قانون رعایا" سلیمان نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لئے جو قوانین وضع کئے تھے وہ اُسکی رواداری روشن خیالی اور تدبر کی ایک نمایاں مثال ہیں، اُس نے لگان اور دیگر خدمات کو جو رعایا پر جاگیردار کی طرف سے عائد ہوتی تھیں تصریح کے ساتھ "قانون رعایا" میں درج کرا دیا تاکہ جاگیردار اپنے حق سے زیادہ مطالبہ نہ کر سکے، "قانون رعایا" کے رو سے مزروعہ زمین کی ملکیت کاشت کار کو حاصل ہوتی تھی، اور اس کے معاوضہ میں اُسے لگان اور بعض محصول ادا کرنے ہوتے تھے، اور اپنے جاگیردار کے لئے چند متعین خدمات انجام دینی ہوتی تھیں سلطنت عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا اور مسیحی یورپ کے زرعی غلاموں (SERFS) کی حالتوں کے فرق کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے، اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور و تعدی پر ترکوں کی نرم حکومت کو ترجیح دیتے تھے، کریسی سلیمان کے ایک ہمعصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے: "میں نے گروہ در گروہ ہنگروی دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنے بیوی بچوں مویشی اور سامان کاشت کو لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے، جہاں وہ جانتے تھے کہ عشر کے علاوہ اُن پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہ کیا جائیگا"

عام قوانین | قانون فوجداری، قانون پولیس، اور دیگر عام قوانین پر بھی سلیمان نے خاص توجہ کی اور اُن سب میں مناسب ترمیم و اصلاح کی، اُس کے زیر نگرانی ملا ابراہیم حلبی نے جو مجموعۂ قوانین تیار کیا تھا، اُس میں سلطنت عثمانیہ کے متعلق تمام ضروری قوانین درج

---

[1] کریسی جلد اصفحہ ۲۶-۳۲۶

ہیں، پہلے بہت سے جرائم کے لئے نہایت سخت سزائیں مقرر تھیں، مثلاً قتل کر دینا اور اعضا کا کاٹ ڈالنا، سلیمان نے ان سزاؤں کی سختی میں تخفیف کر دی، اُس نے مختلف اشیا کی قیمتیں اور اجرت کی شرحیں بھی متعین کر دیں، اہتمام رکھنے والوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اپنے شر کی تلافی کریں، جھوٹی شہادت دینے والوں، جعل بنانے والوں، اور کھوٹے سکے چلانے والوں کی سزا یہ مقرر ہوئی کہ اُن کا داہنا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے، (۱۱) فیصدی سے زیادہ سود لینا خلاف قانون ٹھہرایا گیا، مسلسل تین وقتوں کی نماز یا ایک روزہ قضا کرنے والے کے لئے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی، بار برداری کے جانوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے کی تاکید کی گئی۔[۱]

تجارتی مراعات | سلیمان کا عہد حکومت غیر ملکی تاجروں سے حسن سلوک کے لئے خاص طور پر ممتاز تھا، موجودہ جمہوریہ ترکی کے قیام تک سلطنت عثمانیہ میں وہ تجارتی معاہدے جاری تھے جو سلاطین نے غیر ملکی تاجروں کے ساتھ کر رکھے تھے، اور جن کے رُو سے حکومت عثمانیہ نہ صرف اُن تاجروں کے جان و مال اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ذمہ دار ہو جاتی تھی، بلکہ اُن کے مقدمات کے لئے اُنہی کے ہم قوم افراد کی عدالتیں بھی قائم کر دیتی، ان تجارتی معاہدوں (Capitulations) میں سے سب سے پہلا معاہدہ سلیمان ہی نے ۱۵۳۵ء میں فرانس کے ساتھ کیا تھا، کریسی لکھتا ہے: "غیر ملکی سامان تجارت پر ایک حد درجہ ہلکا محصول در آمد و بر آمد لگایا گیا تھا، محصول تا ہین (Prohibition duties) کا گرانبار اور تکلیف دہ رواج عثمانیوں میں بالکل مفقود رہا ہے۔"[۲]

علم کی سرپرستی | علم کی اشاعت اور علماء کی قدردانی سلاطین آل عثمان کا ایک مخصوص امتیاز

---

[۱] کریسی جلد ۱ صفحہ ۳۳۱-۳۲، [۲] ایضاً صفحہ ۳۳۳۔

تھا، سلیمان اس وصف میں بھی بہت نمایاں تھا، اُس نے بہت سے مدرسے اور دارالعلوم بنوائے اور علماء کی تعلیمی تنظیم اور اُن کے منصب میں بہت سی اصلاحیں کیں، وہ علماء کی قدر و منزلت میں اپنے تمام پیشروؤں سے آگے بڑھ گیا، اور اُن کے لئے سلطنت کے قانون میں بعض ایسی مخصوص رعایتیں کر دیں جو کسی اور جماعت کے لئے نہیں کی گئیں، مثلاً اُس نے علماء کی پوری جماعت کو ہر طرح کے محصول سے بری کر دیا، اور اُن کی جائداد کے لئے یہ قانون بنا دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی ضبط نہ کیجائے گی،

سلیمان نے مکہ معظمہ میں چاروں مذاہب کے لئے چار مدرسے قائم کئے، اُن کی بنیاد ۹۷۲ھ (۱۵۶۴ء) میں رکھی گئی، عمارت کی تکمیل سلیم خان ثانی کے عہد میں ہوئی، اُس نے مدرسین اور طلبہ کے لئے شام کے اوقاف سے وظائف بھی مقرر کئے،

صدقات سلیمان نے صدقہ روپیہ کی مقدار جو اُس کے آبا و اجداد کے زمانہ سے حرمین شریفین کے لئے آتا تھا، بہت بڑھا دی اور اپنے خاص خزانہ سے بہت سی رقمیں اضافہ کیں، غلہ کا صدقہ سلیم اوّل کے وقت سے جاری ہوا تھا، سلیمان نے علاوہ مخصوص اوقاف کے اپنے خاص سے بھی غلہ بھیجنا شروع کیا، اُس نے مصر کے چند گاؤں بیت المال سے خرید کر اُنکے غلہ کو اہل حرمین کے لئے وقف کر دیا، شروع میں مدینہ منورہ کے لئے ڈیڑھ ہزار اردب غلہ بھیجا جاتا تھا، مگر کچھ دنوں کے بعد سلیمان نے دو ہزار اردب مدینہ منورہ کے لئے اور تین ہزار مکہ معظمہ کے لئے مقرر کر دیا، اس کے علاوہ مصر میں اہل ذمہ سے جو رقم لیجاتی تھی سلیمان نے اُسے خزانہ عامرہ سے نکال کر حرمین شریفین اور مصر کے علماء و مشائخ کو دینا شروع کی، خزانہ شاہی اور سلطان کی جیب خاص سے جو رقمیں ان صدقات کے لئے نکالی جاتی تھیں علیحدہ تھیں[1]،

---

[1] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ص ۲۲۴-۲۲۶،

تعمیرات کا ذوق سلیمان کو تعمیرات کا بھی خاص ذوق تھا، اُس نے قسطنطنیہ، بغداد، قونیہ، دمشق اور دوسرے شہروں میں نہایت خوبصورت اور عالی شان عمارتیں بنوائیں، متعدد مسجدیں خود تعمیر کرائیں، اور بہیتری مسجدوں کو ازسرنو درست کرایا، ان کے علاوہ قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑی نہر بنوائی، اور مکہ معظمہ کی پرانی نہروں کی مرمت کرائی، سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اسپتال اور پل تعمیر کرائے،

علمی اور شاعرانہ مذاق سلیمان علم و فضل کا نہایت قدردان تھا، اور خود بھی علمی اور شاعرانہ مذاق رکھتا تھا، اُس کی تصانیف ترکی لٹریچر میں بلند پایہ خیال کیجاتی ہین، یہی حیثیت اسکے شاعرانہ کلام کی بھی ہے، دورانِ جنگ میں وہ روزمرہ کے واقعات قلمبند کرتا جاتا تھا اور اُس کے یہ روزنامچے اپنے اندر نہایت قیمتی تاریخی مواد رکھتے ہیں، ان روزنامچوں سے اُس کے احساس فرض، اور اُس کی جفاکشی کا پتہ چلتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے تمام ملکی اور فوجی معاملات پر کس درجہ توجہ رکھتا تھا،

عدل و انصاف سلیمان کی عظمت اُسکی بری اور بحری فتوحات اور توسیعِ سلطنت ہی میں نمایاں نہ تھی بلکہ سلطنت کے ہر شعبہ میں اُس کی غیر معمولی شخصیت کا اثر پایا جاتا تھا، اُسکی عدالت میں ہر طبقہ اور ہر جماعت کے لوگ برابر تھے، اور سب کے ساتھ یکساں انصاف کیا جاتا تھا، صوبوں کے گورنر یا دوسرے اعلیٰ حکام جو بے انصافی یا ظلم کا ارتکاب کرتے، فوراً برطرف کردیئے جاتے، اور اکثر انھیں اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کی سزا ملتی، سلیمان کو عدل و انصاف کا اس قدر خیال تھا کہ تختِ سلطنت پر آتے ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ بعض حکام کو جو اپنے فرائض کی ادائگی میں بے عنوانیاں کرتے تھے برخاست کردیا، اس امر میں وہ کسی شخص کی رعایت نہ کرتا، خواہ وہ شخص اُس سے کیسا ہی قریبی تعلق رکھتا ہو

چنانچہ فرہاد پاشا کو جو اس کا داماد تھا سلیمان نے ظلم اور رشوت ستانی کے جرم میں ایک صوبہ کی حکومت سے معزول کر دیا، فرہاد پاشا کی بیوی اور سلیمان کی ماں نے بڑی التجاؤں کے بعد اُس کو دوبارہ مقرر کرایا لیکن جب اُس نے اپنی سابق بے عنوانیاں پھر شروع کردیں تو سلیمان نے اُسے دوبارہ معزول کیا، اور اب کی بار اُس کو قتل کرادیا،

خون کے چند دھبے — سلیمان کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی، وہ اپنی طبعی شرافت اور رحمدلی کے لئے مشہور تھا، لیکن خون کے چند بدنما دھبوں نے اُس کے دامن کو بھی داغدار بنادیا، اُس کا سب سے بڑا لڑکا مصطفےٰ ایک نہایت لائق اور ہونہار شہزادہ تھا، سلیمان نے اس کو ایک صوبہ کا حاکم بنادیا تھا جہاں اوس کی غیرمعمولی قابلیت کے جوہر نمایاں ہوچکے تھے، اُس میں سلیمان کے تمام اعلیٰ اوصاف پائے جاتے تھے، وہ فوج کا محبوب اور ملک کا مایۂ اُمید تھا، لیکن یہی ہردلعزیزی اُس کی ہلاکت کا باعث ثابت ہوئی، سلطانہ خرم جو ایک روسی خاتون تھی، سلیمان کی سب سے زیادہ محبوب حرم تھی اور اُس کے مزاج میں حد درجہ دخیل ہوگئی تھی، وہ اپنے لڑکے سلیم کے لئے تخت کو محفوظ کرلینا چاہتی تھی، لیکن سلیم علاوہ اس کے کہ شہزادہ مصطفےٰ سے عمر میں چھوٹا تھا نہایت نالائق اور عیش پسند بھی تھا، اور مصطفےٰ کے مقابلہ میں اُسے تخت پر بٹھانے کا خیال بھی کسی کو نہیں آسکتا تھا، خرم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی، اس لئے اُس نے سلیم کے لئے راستہ صاف کرنے کی کوشش کی، اور مصطفےٰ کے خلاف سلیمان کے کان بھرنا شروع کئے، اُس نے سلیمان کو یقین دلایا کہ مصطفےٰ اُسکی حیات ہی میں تخت پر قبضہ کرنے کی درپردہ کوشش کر رہا ہے، اور چونکہ تمام فوج اُس پر جان دیتی ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے، جس طرح سلطان سلیم اول نے سلطان بایزید ثانی کو معزول کرکے

خود تخت پر قبضہ کر لیا تھا، سلیمان خرم کے بیانات سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے مصطفیٰ کو اپنی صفائی میں ایک حرف بھی کہنے کا موقع نہ دیا، اور ۱۵۵۳ء میں جب ایران کی دوسری لڑائی کے لئے وہ لشکر کے ساتھ کوچ میں تھا مصطفیٰ کو اپنے خیمہ میں طلب کر کے فوراً گلا گھونٹ کر مروا ڈالا، دوسرا لڑکا بایزید بھی خرم کے محبوب فرزند سلیم ہی کی خاطر قتل کیا گیا، لیکن اُس کے قتل کا سبب ایک حد تک معقول تھا، مصطفیٰ کے قتل کے بعد اُس کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ اُس کی جان بھی زیادہ دنوں تک سلامت نہ رہ سکے گی، اُس کے بعض مشیروں نے سازش کر کے اُسے قسمت آزمائی کے لئے آمادہ کیا، اور ۱۵۶۱ء میں سلیم کے خلاف اُس نے جنگ کا اعلان کر دیا، لیکن سلیم کے ساتھ سلیمان کی قوت بھی شامل تھی، اور بایزید کو شکست کھا کر ایران میں پناہ لینی پڑی، شاہ طہماسپ نے نہایت احترام کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا، اور بالتصریح وعدہ کیا کہ اُسے اُس کے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دیگا، لیکن سلیمان نے جنگ کی دھمکی دے کر اور چار لاکھ اشرفیوں کا وعدہ کر کے طہماسپ کو مجبور کیا کہ وہ بایزید اور اُس کے چاروں بیٹوں کو سلیم کے سفیر کے حوالہ کر دے، اس سفیر نے بایزید اور اُس کے سب بیٹوں کو فوراً قتل کرا دیا، بایزید کے قتل کے بعد اب تنہا سلیم ہی تخت کا وارث رہ گیا،

ابراہیم پاشا خون کی جن چھینٹوں سے سلیمان کا دامن داغدار نظر آتا ہے، اُن میں سے ایک اُس کے وزیر ابراہیم کا خون بھی ہے، ابراہیم نسلاً یونانی تھا، لڑکپن میں گرفتار ہو کر وہ فروخت ہو گیا تھا، مغنیسیا کی ایک مسلمان دولت مند بیوہ نے اُسے خرید ا اور اُس کی ذہانت کا اندازہ کر کے اعلیٰ تعلیم دلوائی، ایک بار سلیمان اُس صوبہ میں گیا اور وہاں اُس کی نظر ابراہیم پر پڑی، ابراہیم فن موسیقی کا ماہر تھا، اس کے اس کمال کا اثر سلیمان پر خاص طور

سے پڑا، اور وہ اُسے اپنے ساتھ قسطنطنیہ لیتا آیا، وہاں پہنچکر وہ اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے روز بروز سلیمان کی نظر میں زیادہ محبوب ہوتا گیا، یہاں تک کہ سلیمان نے اپنی بہن کا عقد اُس سے کر دیا، اور ۱۵۲۳ء میں اُسے سلطنت عثمانیہ کا وزیر اعظم مقرر کیا، سلیمان ابراہیم پر حد درجہ اعتماد رکھتا تھا اور اُس سے بیحد محبت کرتا، دونوں ساتھ ہی کھانا کھاتے تمام اُمور سلطنت دونوں کے باہمی مشورہ سے طے پاتے، جن معرکوں میں سلیمان کسی عذر کی وجہ سے خود شرکت نہ کرسکتا اُن میں ابراہیم ہی کو سر عسکر بنا کر بھیجتا، تیرہ سال تک سلیمان کے اعتماد کی یہی کیفیت رہی لیکن پھر اُس کے دل میں ابراہیم کی طرف سے شکوک پیدا ہونے لگے، جو ابراہیم کی بے احتیاطی سے بڑھتے گئے، چونکہ سلیمان نے اُس کو سلطنت کے تمام اختیارات دے رکھے تھے، اس لئے ابراہیم اپنے کو سلطان کا ہم پلہ خیال کرنے لگا، اور یہی خیال اُس کے لئے مہلک ثابت ہوا، اُس کی خود اعتمادی یہاں تک ترقی کر گئی کہ آخر میں اُس نے اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر لیا، یہ دیکھکر سلیمان کے وہ شکوک جو خرم نے ابراہیم کے خلاف اُس کے دل میں پیدا کر دیئے تھے یقین کی حد تک پہنچ گئے، خرم وزیر اعظم کے عہدہ پر اپنے داماد رستم پاشا کو مقرر کرانا چاہتی تھی خرم کی تدبیر کارگر ہو گئی، اور ۱۵۳۵ء میں ایک روز جب ابراہیم حسب دستور کھانا کھانے کے لئے محل شاہی میں داخل ہوا تو پھر اُس میں سے زندہ نہیں نکلا، اور دوسرے روز محل میں اُس کی لاش پائی گئی، ابراہیم کی تمام جائداد اور دولت ضبط کر لی گئی،

زوال سلطنت کی ابتدا

سلیمان نے اپنے طویل عہد حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی عظمت کو حد کمال تک پہنچا دیا تھا، اُس کے بعد ہی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا گو چند سال تک سلطنت کے زوال کے آثار نمایاں نہ ہوئے، ایک ترک مورخ قوچی بے نے ۱۶۲۳ء میں

کے زوال پر ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اُس نے یہ ثابت کیا ہے کہ زوال کی بنیاد سلیمان کے عہد ہی میں پڑ چکی تھی، وہ زوالِ سلطنت کو حسبِ ذیل اسباب کا نتیجہ قرار دیتا ہے:-

(۱) پہلے یہ دستور تھا کہ دیوان کی ہر مجلس میں سلطان خود موجود رہتا تھا اور وزرائے سلطنت سے خود مشورے کرتا تھا، سلیمان نے اس دستور کو موقوف کر دیا، وہ بجائے دیوان میں بیٹھنے کے اُس سے متصل ایک علٰحدہ کمرہ میں بیٹھنے لگا، اور وہیں سے مجلس کی تمام کارروائی کو سنا کرتا تھا، اُس کے جانشینوں نے دوسرے کمرہ میں بیٹھنا بھی موقوف کر دیا، اس طرح سلاطین کی مطلق العنانی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور وزراء کے مشوروں کا اثر کم ہونے لگا، جب تک سلیمان جیسا مدبر اور عالی دماغ سلطان تخت پر تھا، اس تبدیلی کی خرابی ظاہر نہ ہوئی لیکن اُس کے بعد اس کے مضر اثرات نمایاں ہونے لگے، اور وزرائے سلطنت کے بجائے خواتینِ حرم یا دوسرے غیر ذمہ دار اور خود غرض اشخاص اُمورِ سلطنت میں مشورے دینے لگے، سلطان کے فیصلے اکثر انہی مشوروں سے متاثر ہوتے تھے،

(۲) سلیمان نے ایک جدت یہ بھی کی کہ بعض ایسے اشخاص کو جنھوں نے تدریجی فوجی مدارج طے نہیں کئے تھے محض اپنی مردم شناسی کی بنا پر اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر دیا، اسکی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ نمایاں مثال ابراہیم کا واقعہ ہے، سلیمان ابراہیم کی لیاقت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے چند سال کے اندر ہی اُسے سلطنتِ عثمانیہ کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر مقرر کر دیا، ابراہیم کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ اسی طرح اونچی اونچی جگہوں پر مقرر کئے گئے، اس میں شبہہ نہیں کہ سلیمان کو مردم شناسی کا خاص ملکہ حاصل تھا اور اُس نے اپنے انتخاب میں شاید ہی کبھی غلطی کی، لیکن اس کے جانشینوں نے جن کو یہ خداداد ملکہ حاصل نہ تھا اس جدت پر عمل کر کے بیشتر ایسے اشخاص کا انتخاب کیا جو کسی طرح اُن عہدوں

کے اہل نہ تھے، اور جن کا تقرر محض سلطان کے حسن ظن یا حرم کے اثر سے ہوا تھا،

(۳) زوال سلطنت کا تیسرا سبب رشوت ستانی تھی جس کی بنیاد رستم پاشا نے ڈالی یہ شخص سلیمان کا داماد تھا اور پندرہ سال تک وزیر اعظم رہا، وہ شاہی خزانہ کے لئے روپیہ حاصل کرنا خوب جانتا تھا، سلطنت کے انتظامی عہدوں پر جو لوگ مقرر کئے جاتے رستم پاشا اُن کے تقرر کے موقع پر اُن سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا، سلیمان کے عہد میں یہ رقمیں ہر عہدہ کی تنخواہ کی مناسبت سے ایک متعین مقداریں مقرر تھیں، لیکن یہ جدت صرف انتظامی عہدوں تک محدود تھی، اور بحری اور فوجی ملازمتوں میں داخل نہیں کی گئی تھی، سلیمان کے بعد رقم کی متعین مقدار بھی اٹھا دی گئی اور انتظامی عہدوں کی قید بھی باقی نہ رہی، بڑی بڑی رقمیں وصول کیجانے لگیں اور فوجی اور بحری عہدوں پر وہی اشخاص مقرر کئے جانے لگے جو اپنے تقرر کے وقت کثیر رقمیں پیش کرتے، گویا تقریباً تمام ملازمتیں نیلام ہونے لگیں، ان کثیر رقموں کی ادائگی کے لئے صوبہ کے حاکم سے لیکر ادنی عہدہ دار تک سب ہر طرح کے جا و بیجا طریقے استعمال کرتے تھے،

(۴) سلیمان کی عادت یہ تھی کہ جن وزراء سے خوش ہوتا اُن پر بے انتہا انعام اکرام کرتا اور خواہ وہ کسی قدر زر و مال جمع کر لیں اُن سے تعرض نہ کرتا، چنانچہ ابراہیم جو تیرہ سال تک اور رستم پاشا جو پندرہ سال تک سلطنت کا وزیر اعظم رہا، ان دونوں نے بے انتہا دولت جمع کی، انھوں نے ایک ایسی شاہ خرچ اور شاہانہ زندگی کا نمونہ قائم کر دیا جسکی اتباع دوسرے وزراء اور اعلیٰ عہدہ دار بھی کرنے لگے، رستم پاشا نے اپنی وفات پر جو جائداد چھوڑی اُسکی مختصر فہرست حسب ذیل ہے:۔ اناطولیہ اور رومیلیا میں (۸۱۵) مزروعہ زمینیں (۴۷۶) پنچکیاں (۱۷۰۰) غلام (۲۹۰۰) زرہ بکتر (۸۰۰۰) عمامے (۶۰۰) تیغے (۶۰۰) جلدیں

قرآن پاک کی، (۵۰۰۰) دوسری کتابیں اور بیس لاکھ دوکات،

ان اسباب کے علاوہ زوالِ سلطنت کا ایک اور قوی سبب بھی سلیمان ہی کے عہد میں پیدا ہو چلا تھا، یعنی امورِ سلطنت میں خواتینِ حرم کی مداخلت، یہ مداخلت سلیمان کے جانشینوں کے زمانہ، حکومت میں، روزبروز بڑھتی گئی، سلیمان کے عہد میں ابراہیم کا زوال وقتل، شہزادہ مصطفےٰ کا قتل اور شہزادہ بایزید کی بغاوت اور قتل، یہ سب حرم ہی کی سازش کا نتیجہ تھے،

سلیم ثانی

سنہ ۹۷۴ھ تا سنہ ۹۸۲ھ مطابق سنہ ۱۵۶۶ء تا سنہ ۱۵۷۴ء

سلیمان اعظم کے بعد عنانِ سلطنت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں آئی جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا، سلیمان نے سلطنت عثمانیہ کو ہر حیثیت سے پایۂ کمال تک پہنچا دیا تھا، جس سلطنت کی بنیاد تیرہویں صدی عیسوی میں عثمان خاں نے رکھی تھی، اُس کا تکمیلی پتھر سولھویں صدی میں سلیمان کے ہاتھ سے رکھا گیا، تین سو برس کی مدت میں یہ سلطنت جو ابتداءً اناطولیہ کی چند جاگیروں پر مشتمل تھی مکہ معظمہ سے بوداپسٹ اور بغداد سے الجزائر تک پھیل گئی لیکن سلیمان کی وفات کے بعد زوال شروع ہو گیا اور یہ عظیم الشان سلطنت اپنی قوت اور وسعت میں روز بروز گھٹتی گئی، اس زوال کے اسباب خارجی اور داخلی دونوں تھے، پندرھویں صدی سے یورپ کی مسیحی سلطنتوں میں نمایاں ترقی ظاہر ہونے لگی تھی، روس کی سلطنت جو پہلے اپنے دور وحشت کی منزلیں طے کر رہی تھی سولھویں صدی سے مہذب اور طاقتور سلطنتوں میں شمار کی جانے لگی، دولت عثمانیہ کی ہمسایہ سلطنت ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا تصادم ناگزیر تھا، اور سولھویں صدی کے بعد یورپ کی جن حکومتوں

نے سلطنت عثمانیہ پر حملے شروع کر دیئے اُن میں روس سب سے آگے تھا لیکن مسیحی سلطنتوں کا کوئی اتحاد سلطنت عثمانیہ کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا اگر خود نظام سلطنت میں اندرونی طور پر فساد پیدا نہ ہو گیا ہوتا، اور زوال کے اسباب خود سلطان اور امرائے دولت کے ہاتھوں فراہم نہ ہو گئے ہوتے، انحطاط کی بنیاد سلیمان ہی کے عہد میں پڑ چکی تھی، لیکن اُس کی غیر معمولی اور عظیم الشان شخصیت نے اُن خرابیوں کو ظاہر نہ ہونے دیا جو اُس کے جانشینوں کے عہد میں سرعت کے ساتھ بڑھتی گئیں، سلیمان کے بعد جتنے سلطان تخت نشین ہوئے اُن میں سے بہ استثنائے چند کوئی بھی اتنی وسیع سلطنت کی جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس میں تقریباً دو درجن مختلف نسلیں اور قومیں آباد تھیں فرماں روائی کا اہل نہ تھا، نا اہلوں کی اس طویل فہرست میں سب سے پہلا نام سلیم ثانی کا نظر آتا ہے، جس نے اپنے مختصر دورِ حکومت کو بادہ پرستی اور عیش کوشی کی نذر کر دیا اور امورِ سلطنت سے منہ موڑ کر اپنا تمام وقت عیش و عشرت میں ضائع کر دیا، یہ پہلا عثمانی تاجدار تھا جو میدانِ جنگ میں جانے سے گریز کرتا تھا اور جس میں انتظامِ سلطنت کی مطلق اہلیت نہ تھی،

لیکن سلیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی سلطنت کا زوال نمایاں نہیں ہونے لگا، جو سلطنت تین سو برس کی تدریجی ترقی کے بعد سلیمان اعظم کے زمانہ میں اپنے کمالِ عروج تک پہنچی تھی، اس میں دفعۃً انحطاط کا نمودار ہو جانا ممکن نہ تھا، سلیمان کی وفات کے بعد بھی تمام ملکی اور فوجی انتظامات چند سالوں تک استحکام کے ساتھ بدستور قائم رہے، اور متعدد وزراء و عہدہ دارانِ سلطنت جو سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ تھے بدستور سلطنت کی خدمت کرتے رہے، جب تک یہ وزراء اور ملکی و فوجی حکام زندہ رہے، سلطنت کا زوال ظاہر نہ ہو سکا، بلکہ تقریباً بارہ سال تک حدودِ سلطنت میں اضافہ ہی ہوتا گیا،

عہد آخر کے ان وزراء میں محمد صوقوللی ہی سلطنت کا حقیقی فرماں روا تھا،

محمد صوقوللی کی دو اہم تجویزیں | محمد صوقوللی کے پیشِ نظر دو اہم تجویزیں تھیں، وہ خاکنائے سویز میں ایک نہر کھود کر بحرِ احمر اور بحرِ ہند کو ملا دینا چاہتا تھا تاکہ ترکی بیڑا ان دونوں سمندروں میں آسانی کے ساتھ داخل ہو سکے، دوسری تجویز دریائے ڈان اور دریائے والگا کو ایک نہر کے ذریعہ سے ملا دینے کی تھی، یہ دونوں دریا روس سے نکل کر دور تک متوازی خطوط میں بہتے آتے ہیں اور ایک مقام پر ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہو جاتے ہیں کہ درمیانی فاصلہ صرف تیس میل رہجاتا ہے، وہاں پہنچکر پھر وہ علٰحدہ ہو جاتے ہیں، اور ایک بحرِ ازوف میں جاکر شامل ہو جاتا ہے اور دوسرا بحرِ کاسپین میں، ان دریاؤں کو ایک نہر کے ذریعہ سے اُس مقام پر ملا دینے سے جہاں درمیانی فاصلہ صرف تیس میل رہجاتا ہے، ترکی جہازوں کے لئے دریائے ڈان اور دریائے والگا سے گذر کر بحرِ کاسپین میں پہنچ جانا اور وہاں سے صوبہ تبریز پر حملہ آور ہونا جو سلطنتِ ایران کا مقبوضہ تھا، بہت آسان ہو جاتا، علاوہ بریں اس تجویز کی کامیابی سے تجارتی فائدے بھی بہت کچھ حاصل ہو سکتے تھے لیکن اس مقصد کا پورا ہونا اُسی وقت ممکن تھا جب استراخاں پر قبضہ کر لیا جاتا، یہ شہر مملکتِ روس کے قبضہ میں تھا جس کی وسعت و قوت چند سالوں سے برابر ترقی کر رہی تھی،

سنہ ۹۷۶ھ (۱۵۶۸ء) میں صوقوللی نے (۲۵) ہزار ینی چری اور سپاہیوں کو ازف روانہ کیا، وہاں کریمیا کے تیس ہزار تاتاری بھی اُن کے ساتھ ہو گئے اور یہ متحدہ فوج استراخاں پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھی جو دریائے والگا کے دہانہ پر واقع تھا، یہاں پہلی بار روسیوں اور ترکوں کا مقابلہ ہوا، ترکی فوج استراخاں پر قبضہ نہ کر سکی، اور تاتاریوں

کو ہزیمت اُٹھانی پڑی، عثمانی فوجیں مجبوراً ازف کی طرف واپس ہوئیں، لیکن قسطنطنیہ پہونچنے سے پہلے اُن کا بیشتر حصہ بحر اسود میں ایک طوفان سے ضائع ہو گیا، اور صرف سات ہزار سپاہی بخیریت واپس پہنچ سکے اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈان اور والگا کو ملا دینے کی تجویز منسوخ کر دی گئی، روس میں ابھی اتنی قوت نہ تھی کہ وہ خود سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہوتا، زار ائیوان (Czar Iwan) نے ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں اپنا ایک سفیر باب عالی میں بھیجا، اور استراخان کے حملہ کی شکایت کی نیز دونوں سلطنتوں کے درمیان امن و اتحاد قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ ایک صلحنامہ مرتب کیا گیا، اور تقریباً ایک صدی تک روس اور سلطنت عثمانیہ میں پھر کوئی جنگ نہیں ہوئی،

خاکنائے سویز کی تجویز بھی ایک نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کر دی گئی، کیونکہ یمن میں بغاوت چھڑ گئی تھی، اور سنان پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج وہاں روانہ کرنی پڑی سنان پاشا اس بغاوت کے فرو کرنے میں کامیاب ہوا، اور یمن اور عرب کے دوسرے حصے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لئے گئے،

تونس یمن کی دوبارہ فتح کے بعد صوقوللی نے تونس کو ہسپینیوں کے پنجہ سے چھڑانے کے لئے ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں اولوج پاشا کو الجزائر کا حاکم بنا کر اُسکی سرکردگی میں ایک ترکی بیڑا روانہ کیا، اولوج پاشا نے ہسپینیوں کو شکست دیکر شہر پر قبضہ کر لیا لیکن اسپینی فوج قلعہ میں محصور ہو گئی، اور ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) تک اُس پر قابض رہی،

قبرص کی فتح ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں سلیم نے قبرص پر حملہ کرنے کا قصد کیا، یہ جزیرہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا جو سلطنت عثمانیہ کی حلیف تھی، صوقوللی نے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن وہ مصطفےٰ پاشا کے اصرار اور خود سلیم کی خواہش نے اس کی مخالفت کو بے اثر رکھا، اور ایک

حلیف کے مقبوضہ پر حملہ کرنے کے لئے مفتی اعظم نے یہ علت جواز پیش کی کہ قبرص اس سے قبل ایک اسلامی حکومت (مصر) کے زیرنگیں رہ چکا تھا چنانچہ ۱۵۷۰ء میں مصطفےٰ پاشا نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ قبرص پر چڑھائی کی سات ہفتہ کے محاصرہ کے بعد اس کا پایہ تخت نانکوسیا (Nicosia) فتح ہوگیا پھر مصطفےٰ پاشا نے اس جزیرہ کے سب سے مضبوط قلعہ فاماگوستا (Famagosta) کا بھی محاصرہ کیا اور ایک طویل مدت کے بعد اگست ۱۵۷۱ء میں محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے، قلعہ کی سپردگی کے وقت مصطفےٰ پاشا نے قبرص کے سپہ سالار براگاڈینو (Bragadino) کے سامنے نہایت نرم شرائط پیش کئے، اس نے عیسائی فوج اور وہاں کے عیسائی باشندوں کی جان و مال اور مذہب کی حفاظت کا ذمہ لیا، اور وعدہ کیا کہ یہ فوج ترکی جہازوں پر جزیرہ کریٹ پہنچادی جائے گی، اور وہاں آزاد کردیجائیگی لیکن عین اس وقت کہ یہ جہاز روانگی کی تیاری کر رہے تھے مصطفےٰ پاشا اور براگاڈینو میں بعض گذشتہ واقعات سے متعلق تکرار ہوگئی، اور یہ بات یہاں تک بڑھی کہ مصطفےٰ پاشا نے غصہ میں آکر تمام عیسائی فوج کے قتل کا حکم دیدیا، اور اس کے ایک ہفتہ کے بعد براگاڈینو کی زندہ کھال نکلوالی فاماگوستا پر قبضہ پاجانے کے بعد ترکوں نے پورے جزیرہ کو فتح کرلیا، لیکن اس فتح میں ان کے تقریباً پچاس ہزار آدمی کام آئے، تین سو برس تک قبرص سلطنت عثمانیہ کے زیر تسلط رہا ۱۸۷۸ء میں باب عالی نے اسے گورنمنٹ برطانیہ کے حوالہ کردیا،

مسیحی اتحاد قبرص کے حملہ سے یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں نہایت تشویش پیدا ہوئی اور پوپ نے ترکوں کی بحری طاقت کا سدباب کرنے کے لئے بحر روم کی عیسائی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کیا، جس کے خاص ارکان اسپین، وینس اور مبارزین مالٹا تھے، اور اس متحدہ بحری بیڑے کا سالار اعظم ڈان جان (Don John) کو مقرر کیا جو شہنشاہ

چارلس پنجم کا ناجائز لڑکا اور باوجود اپنی نوعمری کے اُس عہد کا نہایت ممتاز کمانڈر تھا، اتحادی بیڑا ۱۶ ستمبر ۱۵۷۱ء کو میسینا (Messina) میں جمع ہوا، لیکن قبرص اس وقت تک فتح ہو چکا تھا ترکی بیڑا جو اپنے جہازوں کی کثرت تعداد میں عیسائی بیڑے سے بڑھا ہوا تھا خلیج لیپانٹو (Lepanto) میں لنگر انداز ہوا، امیر البحر علی پاشا ایک نوعمر سردار تھا، اس کو بحری جنگ کا زیادہ تجربہ نہ تھا، اولوچ پاشا جس کی عمر کے ۴۳ سال بحری جنگوں میں صرف ہو چکے تھے اس بیڑے کا نائب امیر تھا، اُس نے اتحادیوں پر فوراً حملہ کرنے سے اس بنا پر اختلاف کیا کہ تیاری جیسی چاہیئے ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی، لیکن علی پاشا کو بلا توقف حملہ کر دینے پر اصرار تھا اولوچ پاشا کو خاموش ہو جانا پڑا،

جنگ لیپانٹو ۷ اکتوبر ۱۵۷۱ء کو خلیج لیپانٹو کے دہانہ کے قریب دونوں بیڑوں کا مقابلہ ہوا جنگ صرف چند گھنٹوں تک قائم رہی مگر فریقین کو شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے دونوں بیڑے ایک دوسرے سے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ تلوار کی لڑائی ہونے لگی جسمیں امیر البحر علی پاشا مارا گیا، عیسائیوں نے اُس کا سر کاٹ کر جہاز کے مستول پر لٹکا دیا یہ دیکھکر ترکوں کے قدم اکھڑ گئے، اور اولوچ پاشا کی کوشش کے باوجود انھیں بری طرح شکست ہوئی، اولوچ پاشا بمشکل چالیس جہازوں کو لے کر سلامتی کیساتھ وہاں سے نکل سکا، باقی پورا ترکی بیڑا جس کے جہازوں کی تعداد (۲۷۶) تھی عیسائیوں کے قبضہ میں آگیا، ان میں سے کچھ غرق بھی کر دیئے گئے، اس جنگ میں تیس ہزار ترک کام آئے، اور پندرہ ہزار عیسائی غلام آزاد ہوئے،

خیال تھا کہ اتحادی اپنی عظیم الشان کامیابی سے فائدہ اُٹھا کر آگے قدم بڑھائیں گے لیکن اس فتح سے وہ کچھ ایسا مطمئن ہوئے کہ فوراً اپنے اپنے ملک کو روانہ ہو گئے، اور

وہاں پہنچکر خوشیاں منانے لگے،

برخلاف اس کے ترکوں نے فوراً اس نقصان کی تلافی شروع کردی ہلیم نے بھی جو عموماً عیش و عشرت میں سرشار رہتا تھا اپنی جیب خاص سے ایک کثیر رقم عطا کی اور اپنے محل کے باغ کا ایک حصہ نئے جہازوں کی تعمیر کے لئے دیدیا، چنانچہ ایک سو اٹھ جہازوں کی تعمیر فوراً شروع کردی گئی، اور چند مہینوں میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ یہ نیا بیڑا تیار ہو گیا، سنہ ۹۸۰ھ (سنہ ۱۵۷۲ء) میں اتحادی بیڑا پھر بحر روم کے مشرقی حصہ میں جمع ہوا، اولوج پاشا اپنے نئے بیڑے کے ساتھ اُس کے مقابلہ کے لئے نکلا، لیکن چونکہ اُس کے جہازرانوں کو ہنوز کافی تجربہ نہ تھا، اس لئے اُس نے خود حملہ کرنا مناسب نہیں خیال کیا اور اتحادیوں کی پیش قدمی کا انتظار کرتا رہا، اتحادی ترکوں کی اس خلاف توقع تیاری سے بظاہر اس قدر مرعوب ہوئے کہ اُن کی طرف سے بھی کوئی حملہ نہ ہوا، اور اولوج پاشا اپنے پورے بیڑے کیساتھ واپس آگیا،

وینس سے صلح | سنہ ۹۸۱ھ (سنہ ۱۵۷۳ء) میں وینس نے باب عالی سے صلح کی گفتگو شروع کی اور حسب ذیل معاہدہ مرتب ہوا، وینس نے نہ صرف قبرص کی فتح اور اس پر سلطنت عثمانیہ کا قبضہ تسلیم کر لیا، بلکہ اس کے حاصل کرنے میں جو اخراجات دولت علیہ کو برداشت کرنے پڑے تھے اور جن کا تخمینہ تین لاکھ دوکات تھا اُن کی ادائگی بھی منظور کی، جزیرۂ زانطہ کیلئے جمہوریہ وینس ابتک پانچ سو دوکات خراج ادا کرتی تھی، اس معاہدہ کے رو سے خراج کی مقدار ڈیڑھ ہزار دوکات مقرر ہوگئی، البتہ قبرص کا خراج جو آٹھ ہزار دوکات سالانہ آیا کرتا تھا، وہ اب موقوف کر دیا گیا، ڈلماشیا اور البانیا میں فریقین کے جو مقبوضات جنگ لیپانٹو سے قبل تھے وہی برقرار رکھے گئے،

تونس کا الحاق | وینس اور سلطنت عثمانیہ کی صلح کے بعد ڈان جان ایک اسپینی بیڑے کے ساتھ

تونس پر حملہ آور ہوا، اور چونکہ قلعہ پر اسپین کا قبضہ جاری تھا اس لئے آسانی کے ساتھ شہر کو فتح کر لیا، اُس نے تونس میں ایک جدید قلعہ تعمیر کرایا اور اسپینی سپاہیوں کا ایک طاقتور دستہ وہاں چھوڑ کر خود واپس چلا گیا، اس واقعہ کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو صدر اعظم صوقوللی نے اولوج پاشا کو ایک زبردست بیڑے کے ساتھ روانہ کیا، اولوج پاشا نے اسپینیوں کا قلع قمع کر کے شہر، قلعہ، اور تونس کے پورے صوبہ پر قبضہ کر لیا اور اُسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر دیا،

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں سلیم کا انتقال ہو گیا،

مراد ثالث

سنہ ۹۸۲ھ تا سنہ ۱۰۰۴ھ مطابق سنہ ۱۵۷۴ء تا سنہ ۱۵۹۵ء

سلیم کے انتقال کی خبر سنکر اُس کا بڑا لڑکا مراد جو حکومت مغنیسیا پر مامور تھا، ۲۱ دسمبر سنہ ۱۵۷۴ء کو قسطنطنیہ پہنچا اور ۲۸ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، محمد فاتح کے قائم کردہ دستور کے مطابق اُس نے زمامِ سلطنت کے ہاتھ میں لیتے ہی اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کرادیا، اور اسکے بعد سب سے پہلا فرمان شراب کی ممانعت میں صادر کیا، جس کا رواج سابق سلطان کے عہد میں بہت زیادہ ہوگیا تھا،

امورِ مملکت میں حرم کا دخل مراد ثالث کے عہد کے ابتدائی چار برس صوقوللی پاشا کی صدارت کے تھے، پھر بھی سلطان پر حرم کا اثر روز بروز زیادہ ہوتا جارہا تھا، حرم کی چار خاتونوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ اس پر بہت زیادہ تھا، اور امورِ سلطنت کا انصرام حقیقۃً انہی خواتین کے منشا کے مطابق ہوتا تھا، ان میں سے ایک سلطانہ والدہ نور بانو تھی، دوسری مراد کی محبوب سلطانہ صفیہ تھی، جو وینس کے مشہور اور سربرآوردہ خاندان بفو (Baffo) کی رئیس زادی تھی اور اپنے حسنِ صورت اور ذکاوتِ طبع کے باعث مراد پر حد درجہ حاوی تھی، صفیہ کو سلطنت کی جنگ و صلح میں خاص دخل تھا، چنانچہ باوجود اس کے کہ وینس نے ایک سے زائد بار سلطان کو برانگیختہ کیا، محض صفیہ کی کوششوں سے جنگ کی نوبت نہ آئی

تیسری ایک ہنگروی خاتون تھی جس نے کچھ دنوں کے لئے صفیہ کی محبوبیت کو زائل کر دیا تھا اور مراد کی توجہ کا مرکز بنی رہی، چوتھی خاتون جان فدا حرم سلطانی کی خاص مہتمم تھی اور وہ بھی اپنی لیاقت اور سلیقہ شعاری کی وجہ سے مراد کے مزاج میں بہت کچھ دخیل تھی،

یہی چار خواتین سلطان کی خاص مشیر کار، اور انتظام حکومت کی حقیقی نگراں تھیں،

جنگِ ایران | تاہم سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ فوجی اور بحری افسروں میں سے اب بھی کچھ باقی رہ گئے تھے، اور مراد ثالث کے عہد میں جو لڑائیاں پیش آئیں اُن میں عثمانی فوجوں کو اہم اور نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں، اور دولت علیہ کے مقبوضات میں قیمتی اضافے ہوئے، اس عہد کی سب سے بڑی جنگ ایران کی جنگ تھی، جس کا سلسلہ ۹۸۵ھ ۱۵۷۷ء سے ۹۹۸ھ ۱۵۹۰ء تک قائم رہا، ۱۵۷۶ء میں شاہ طہماسپ کا انتقال ہوگیا، اس کی وفات پر تختِ سلطنت کے لئے ایران میں جو اندرونی خلفشار برپا ہوا اس سے دولت عثمانیہ نے فائدہ اُٹھانا چاہا، اور لالہ مصطفےٰ پاشا عثمانی فوجوں کے ساتھ جارجیا پر حملہ آور ہوا جو ایران کی حلیف مملکت تھی، اور اس کے پایہ تخت تفلس کو فتح کرکے پورے جارجیا پر قبضہ کر لیا، جارجیا کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ پر ایک ترکی افسر مقرر کر دیا گیا، عثمان پاشا شروان کا حاکم تھا، چار ایرانی فوجوں نے بیک وقت جارجیا پر حملہ کیا، اور اسے ترکوں کے قبضہ سے چھڑا لینا چاہا، عثمان پاشا نے شہزادہ حمزہ کی فوج کو شکست دی لیکن جب سلطنت ایران کی سب سے بڑی فوج نے حملہ کیا تو اُسے شروان چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا، اور وہ دربند چلا گیا، سائمن لوارسب (Simon Luarseb) سابق امیر جارجیا نے اپنے قدیم پایہ تخت تفلس کا محاصرہ کر لیا مگر ترک محصورین نے نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، یہاں تک کہ حسن پاشا جو محمد صوقوللی پاشا کا لڑکا تھا کمک لے کر پہنچ گیا، اور سائمن کو محاصرہ اُٹھا لینا پڑا،

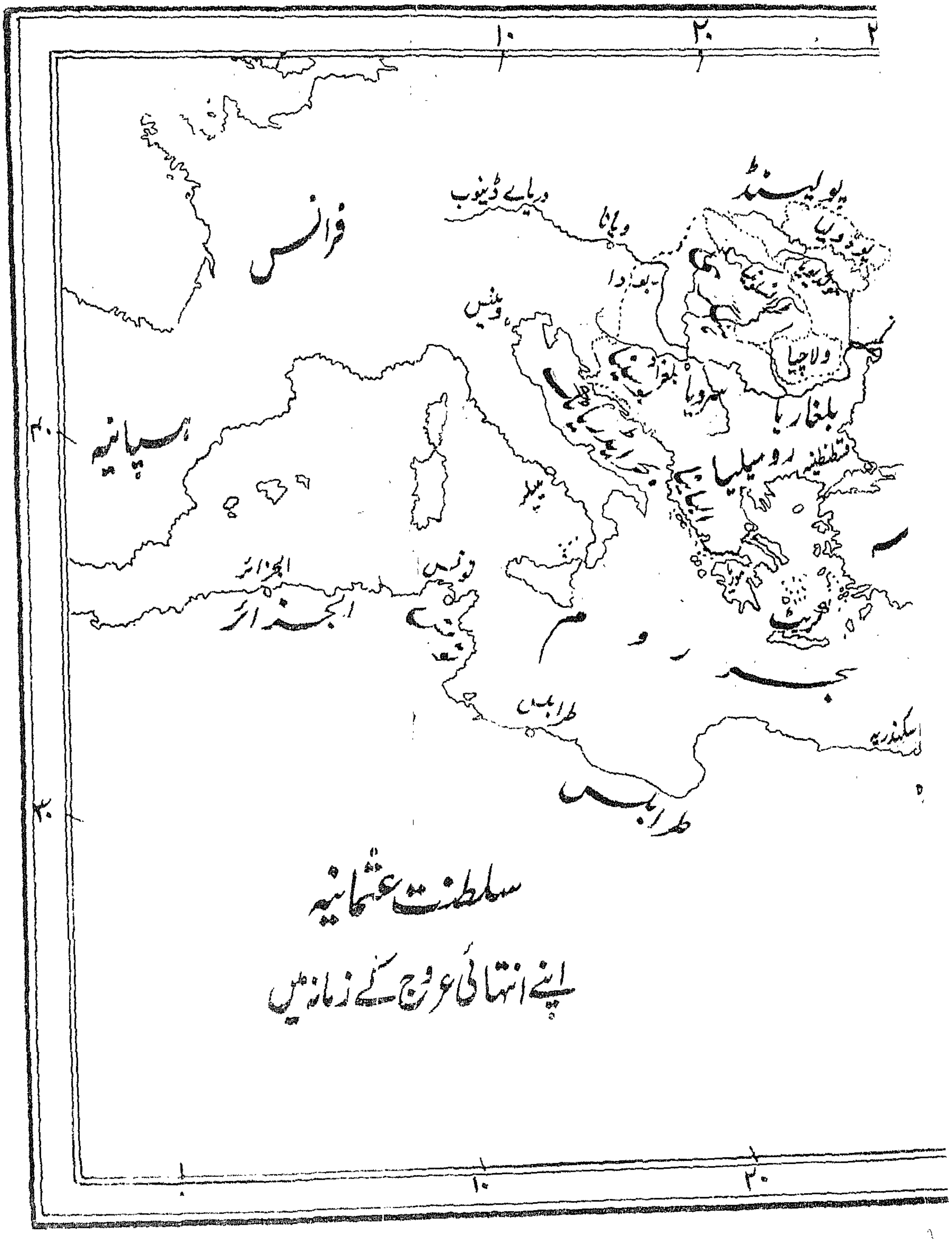
اس کے بعد ۱۵۸۳ء میں عثمان پاشا نے داغستان پر حملہ کیا اور اس پر پوری طرح قبضہ کر کے اس نے عین موسم سرما میں کوہ قاف کو عبور کیا اور کافہ پہنچ گیا، وہ محمد کرائی خان کریمیا کو تخت سے معزول کرنا چاہتا تھا، کیونکہ خان نے عثمانی افواج کو مدد دینے سے انکار کر دیا تھا، محمد کرائی نے یہ اطلاع پا کر علمِ بغاوت بلند کیا اور چالیس ہزار سواروں کو لیکر کافہ میں عثمان پاشا کا محاصرہ کر لیا، سلطان نے محمد کرائی کے بھائی اسلام کرائی کو کریمیا کے تخت پر بٹھا دینے کا وعدہ کیا اور اس کے معاوضہ میں فوجی مدد چاہی، چنانچہ اسلام کرائی اپنے بھائی خان کریمیا کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، اور محمد کرائی ۱۵۸۴ء میں قتل کر دیا گیا، عثمان پاشا اس باغی کا سر لے کر قسطنطنیہ پہنچا جہاں اس کا نہایت شاندار استقبال ہوا، اور سلطان نے اپنی خاص تلوار اور اپنے عمامہ کے بیش بہا جواہرات اسے عطا کئے، اس کے بعد عثمان پاشا ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ تبریز کی طرف بڑھا، شہزادہ حمزہ مرزا نے عثمانی مقدمۃ الجیش کو شکست دی لیکن ایرانی ترکوں کی کثرتِ تعداد کا مقابلہ نہ کر سکے اور بالآخر شکست کھا کر انھیں تبریز خالی کر دینا پڑا، عثمان پاشا صحت کی خرابی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اس کے بعد چھ سال تک مسلسل ایرانی اور عثمانی فوجوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں، اسی درمیان میں عثمان پاشا کا انتقال ہو گیا، ۱۵۹۰ء میں دولت عثمانیہ اور سلطنت ایران کے درمیان صلح ہو گئی جس کے رو سے جارجیا، شروان، لورستان، شہر تبریز اور آذربیجان کا ایک حصہ مراد ثالث کی سلطنت میں شامل ہو گیا، صلحنامہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ آیندہ اہلِ ایران خلفائے ثلثہ کے خلاف تبرا کہنے سے باز رہیں گے،

یوروپین حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات،

مراد کے عہدِ حکومت میں دولت علیہ اور یورپ کی سلطنتوں کے درمیان صلح کے تعلقات عموماً قائم رہے، علاوہ متفرق

چھیڑ چھاڑ کے جو ہنگری کی سرحد پر ترکی پاشاؤں اور عیسائی قلعہ داروں میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی، دوسری یورپین حکومتوں سے سلطنت عثمانیہ کے تعلقات دوستانہ رہے، البتہ مراد کی وفات سے دو سال قبل آسٹریا سے جنگ کی نوبت آگئی، مراد کے عہد میں خصوصاً صدر اعظم صوقوللی پاشا کے مشورہ سے مغربی یورپ کی بیشتر حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم ہوئے، انگلستان نے جو اب تک سلطنت عثمانیہ کے لئے ایک ناآشنا حکومت تھی، اوّل اوّل ۱۵۷۹ء میں اپنے تین تاجروں ولیم ہیر بون (William Harebone) اڈورڈ ایلیس (Edward Ellis) اور رچرڈ اسٹیپل (Richard Staper) کو قسطنطنیہ بھیجا انھوں نے باب عالی سے انگلستان کے لئے وہی تجارتی مراعات حاصل کئے جو یورپ کی دوسری قوموں کو حاصل تھے ۱۵۸۳ء میں ملکہ الزابتھ نے ولیم ہیر بون کو اپنا سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا، اور سلطان سے یہ درخواست کی کہ وہ انگلستان سے متحد ہو کر اسپین کے عیسائی فرماں روا فلپ ثانی پر حملہ آور ہو جو سلطنت عثمانیہ اور حکومت انگلستان دونوں کا یکساں دشمن تھا،

محمد صوقوللی کا قتل اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مراد کے عہد حکومت کے ابتدائی چار سالوں میں عنان سلطنت صدر اعظم محمد صوقوللی پاشا کے ہاتھوں میں تھی، لیکن مراد کے بعض دوسرے درباریوں مثلاً شمسی پاشا، اویس، خواجہ سعد الدین مورخ اور خواجہ سرا غضنفر آغا کا اثر شروع ہی سے بڑھتا گیا، یہ سب محمد صوقوللی کے مخالف تھے، بدقسمتی سے مراد پر حرم کا اثر بھی بہت زیادہ تھا، چنانچہ شمسی پاشا وغیرہ اور حرم کی سازش سے صدر اعظم کا اقتدار روز بروز کم ہوتا گیا، پہلے اُس کے معتمد عہدہ داروں کو پایہ تخت سے علیحدہ کیا گیا اور پھر سازش کی تکمیل کے بعد خود محمد پاشا کو ۱۱ اکتوبر ۱۵۷۹ء کو قتل کر دیا گیا،



فرانس
ہسپانیہ
دریائے ڈینوب
ویانا
پولینڈ
پوڈولیا
ولاچیا
بلغاریہ
قسطنطنیہ
رومیلیا
البانیہ
وینس
الجزائر
الجزائر
تونس
طرابلس
طرابلس
اسکندریہ
بحر روم
سلطنت عثمانیہ
اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں

سلطنت کا انتہائی عروج لارڈ ایورسلے کی رائے ہے کہ سلطنت عثمانیہ اپنے کمال عروج کو سلیمان اعظم کے عہدِ حکومت کے آخری سال میں نہیں بلکہ صدر اعظم محمد پاشا صوقوللی کے عہدِ وزارت کے آخری سال میں پہونچی، کیونکہ سلیمان کے بعد بھی اُس بارہ سال کی مدت میں جب صوقوللی عملاً سلطنت کا فرماں روا تھا، دولت علیہ نے اہم فتوحات حاصل کیں جن میں جزیرہ قبرص، صوبہ تونس، مملکت جارجیا اور سلطنت ایران کے بعض زرخیز صوبے اور یمن شامل تھے، یہی فتوحات سلطنت عثمانیہ کی آخری فتوحات تھیں ان کے بعد صرف کریٹ سنہ ۱۰۸۹ھ (سنہ ۱۶۶۸ء) میں فتح ہوا، ورنہ اور ہر طرف زوال کے آثار نمایاں شروع ہوئے اور عثمانی مقبوضات پر رفتہ رفتہ ہمسایہ حکومتوں کا حملہ اور قبضہ ہونے لگا،

صوقوللی پاشا کے قتل کے وقت سلطنت عثمانیہ شمال میں وسط ہنگری سے لیکر جنوب میں خلیج فارس اور سوڈان تک اور پھر مشرق میں بحر کاسپین اور سرحد ایران سے لیکر مغرب میں افریقہ کے صوبہ اوران تک پھیلی ہوئی تھی، اس میں مراکش کے سوا، بحر روم کا تقریباً تمام جنوبی ساحل اور بحر اسود اور بحر احمر کے تمام ساحل شامل تھے، بحر ایجین کے تمام جزیرے علاوہ کریٹ کے اس کے زیر نگیں تھے، ان ممالک میں بیس مختلف نسل کے لوگ آباد تھے جن کی تعداد کا تخمینہ تین کرور سے زیادہ ہے[1]،

سلطنت کا زوال صوقوللی کے قتل کے بعد ہی سلطنت میں بدنظمی کا دور شروع ہوگیا، یکے بعد دیگرے دس وزراء صدر اعظم کے عہدہ پر مقرر کئے گئے، سنان پاشا تین بار اس عہدہ پر مامور ہوا، عثمان پاشا داغستان سے واپس ہونے پر سنہ ۹۹۳ھ (سنہ ۱۵۸۵ء) میں صدر اعظم مقرر ہوا لیکن آٹھ ہی مہینے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا، صدر اعظم کی ان تبدیلیوں میں حرم

---

[1] "ترکی سلطنت" از لارڈ ایورسلے ص ۱۴۶،

کو بہت کچھ دخل تھا، اور وہی وزراء اس عہدہ کا حوصلہ کر سکتے تھے جنھیں حرم کی سرپرستی حاصل تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور صرف وہ اُمیدوار مقرر کئے جانے لگے جو بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے تھے، رشوت ستانی کی اس مہلک وبا سے حکومت کا کوئی شعبہ محفوظ نہ رہ سکا، یہاں تک کہ فوجی، عدالتی اور انتظامی عہدوں میں بھی اُمیدوار کی ذاتی قابلیت کے بجائے اُسکی پیش کردہ رقم کی سفارش قبول کیجانے لگی، خود سلطان کو بھی اپنے ذاتی مصارف کے لئے روپیہ کی زیادہ ضرورت رہا کرتی تھی، اور آخر میں اُس نے بھی ایسی رقموں میں اپنا حصہ لگانا شروع کیا، یہیں سے سلطنت میں وہ اندرونی اختلال نمایاں ہونے لگا جس نے اُس کی بنیادوں کو بالکل ہلا دیا،

فوج کی بغاوت اور عام بدنظمی

اس خرابی کے اثرات فوج میں بھی ظاہر ہونے شروع ہوئے جس کا سبب صرف یہی نہ تھا کہ نااہل اشخاص بڑے بڑے فوجی عہدوں پر مقرر کئے جانے لگے، بلکہ فوج کے نظامِ جاگیری میں بھی سخت بے عنوانیاں ہونے لگیں اور جو جاگیریں محض فوجی خدمات کے معاوضہ میں دیجاتی تھیں اُن کی خرید و فروخت شروع ہو گئی، ان حالات کے ساتھ ساتھ فوج بھی بے قابو ہونے لگی اور آخر کار ۵۸۹ۃ میں ینی چری نے علانیہ علمِ بغاوت بلند کر دیا، اور قصر سلطانی کے سامنے جمع ہو کر محمد پاشا، بیلربے رومیلیا کے سر کا مطالبہ کیا، اُن کو محمد پاشا سے یہ شکایت تھی، کہ اُسی کی تحریک سے فوج کی تنخواہ میں ایسے سکے تقسیم کئے گئے تھے جن میں چاندی بہت کم تھی، مراد کو اُن کی دھمکی سے دبنا پڑا، اور اُس نے حکم دیدیا کہ محمد پاشا کا سر کاٹ کر ینی چری کے حوالہ کر دیا جائے، مراد کے اس طرح دب جانے سے ینی چری کو اپنی قوت کا اندازہ ہو گیا، اور چار ہی سال کے اندر اُنھوں نے دوبار اور بغاوت کی اور سلطان کو مجبور کیا کہ وہ موجودہ صدرِ اعظم کو معزول کر کے دوسرا صدرِ اعظم مقرر کر دے ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء)

میں اُنھوں نے پھر مراد کو مجبور کرکے مولڈیویا کی باجگذار مملکت کے تخت پر اُس اُمیدوار کو بٹھایا جس نے رشوت کے ذریعہ سے اُن کی حمایت حاصل کر لی تھی، خود قسطنطنیہ میں ینی چری اور سپاہی فوجوں میں باہمی جنگ ہوگئی، صوبوں کی حالت مرکزی حکومت کی بدنظمی کی وجہ سے حد درجہ خراب تھی، رشوت کا بازار اپنے لازمی نتائج کے ساتھ وہاں بھی گرم تھا اور جو حکام رشوت کے ذریعہ سے مقرر ہوئے تھے وہ اپنی رقم کی تلافی اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے رعایا پر مظالم کر رہے تھے، ۱۵۸۹ء سے ۱۵۹۲ء تک ہر قسم کی بدنظمی اور بدامنی سلطنت میں برپا رہی مصر کی رعیت (ملیشیا) اپنے صوبہ دار سے باغی ہوگئی، تبریز کی فوج نے بغاوت کر دی، اور قسطنطنیہ کا تبدیل شدہ سکہ لینے سے انکار کر دیا، بودا کے فوجی دستہ نے جس کی تنخواہ چھ مہینے سے باقی تھی اپنے پاشا کو قتل کر دیا، ایران میں ایک شخص شاہ طہماسپ کا لڑکا بن کر تخت کا دعویدار ہوا، لیکن ارضِ روم کے والی نے اسے گرفتار کرلیا، لبنان (شام) کا دروزی فرقہ وہاں کے حکام کی سخت گیریوں سے عاجز آکر باغی ہوگیا، اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے مراد نے ابراہیم پاشا کو شام بھیجا جس نے دروزیوں کو شکست دیکر اُن کو قابو میں کیا،

ہنگری اور آسٹریا سے جنگ

سب سے زیادہ انتشار ینی چری کی خودسری سے پیدا ہو رہا تھا اتفاق سے اسی زمانہ میں ہنگری اور آسٹریا سے جنگ چھڑ گئی، اور ینی چری کو سلطنت کے باہر بھیجنے کا موقع ہاتھ آگیا، ابتدا میں عثمانی کو کامیابی ہوئی مگر سیسک کے محاصرہ میں حسن پاشا والی بوسنیا کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا اور وہ دریا عبور کرتے ہوئے ڈوب کر ہلاک ہوگیا، یہ خبر سُنکر سنان پاشا فوراً اُدھر روانہ ہوا، اسی درمیان میں بودا کے پاشا کو آسٹریا کی فوجوں سے شکست ہوئی، اور چند عثمانی قلعوں پر آسٹریا کا قبضہ ہوگیا، تاہم فریقین کی فتوحات کے پلے اب تک تقریباً برابر تھے، لیکن ۱۵۹۴ء میں مولڈیویا، ولاچیا، اور ٹرانسلوینیا

نے بغاوت کر کے آسٹریا سے اتحاد کر لیا، اور اپنی مملکتوں کے تمام مسلمان باشندوں کو قتل کر ڈالا، ابھی آسٹریا کی جنگ جاری ہی تھی کہ ایران سے بھی پھر لڑائی چھڑ گئی جس میں ابتداءً عثمانی فوجوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی،

مراد کا انتقال اسی اثنا میں ۱۶ر جنوری ۱۵۹۵ء کو مراد کا انتقال ہو گیا، وہ فطرۃً بہت نیک اور صلح جو تھا، اس کی تخت نشینی کے وقت سلطنت عثمانیہ جس پایۂ کمال کو پہنچ چکی تھی مراد میں اگرچہ اُسے برقرار رکھنے کی صلاحیت نہ تھی اور حرم کی دخل اندازی سے نظامِ سلطنت میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، تاہم ان خرابیوں کی ذمہ دار تنہا اس کی ذات قرار نہیں دی جا سکتی، سلطنت کا انحطاط خود سلیمان کے وقت سے شروع ہو گیا تھا، اور گو صوقوللی پاشا کے تدبر و اقتدار نے اُسے سلیم کے عہد میں نمایاں نہ ہونے دیا، تاہم دبی ہوئی چنگاریاں اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی تھیں، اور مراد کے عہد میں اُنکا بھڑک اُٹھنا ناگزیر تھا،

مراد ایک صوفی مشرب سلطان تھا، اُس کو تصوف سے خاص شغف تھا، اکثر سلاطینِ عثمانیہ کی طرح وہ بھی شاعر تھا، اور مرادی تخلص کرتا تھا، تصوف میں اُسکی ایک مشہور تصنیف فتوحات الصیام ہے[۱]،

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۷۳۱،

محمد ثالث

سنہ ۱۰۰۴ھ تا سنہ ۱۰۱۲ھ مطابق سنہ ۱۵۹۵ء تا سنہ ۱۶۰۳ء

سلطان مراد کی وفات کے وقت اس کا سب سے بڑا لڑکا محمد ایشیائے کوچک میں صوبہ مغنیسیا کا حاکم تھا، اُس کی ماں سلطانہ صفیہ نے مراد کی وفات کو مخفی رکھا یہاں تک کہ محمد قسطنطنیہ پہنچ گیا، ایسا کرنا اس لئے ضروری خیال کیا گیا کہ مراد کے دوسرے لڑکے تخت سلطنت کے دعویدار نہ بن سکیں، لیکن اس تحفظ کی ضرورت آئندہ پھر کبھی پیش نہ آئی کیونکہ سلاطین آل عثمان میں محمد ثالث آخری سلطان تھا جسے شہزادگی کے زمانہ میں کسی صوبہ کی حکومت سپرد کی گئی تھی، اس کے بعد تمام شہزادے محل کے ایک خاص حصہ میں نظر بند رکھے جانے لگے اور سلطنت کا کوئی عہدہ اُنھیں سپرد نہ کیا جاتا، انھیں صرف اُسی وقت آزادی نصیب ہوتی جب تخت نشینی کے لئے اعیانِ سلطنت اُنکو محل سے باہر لاتے، اس جدید نظام کا سبب یہ خطرہ تھا کہ مبادا شہزادے سلطانِ وقت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیں، لیکن اس کا جو اثر فرمانروایانِ سلطنت کی سیرت اور اہلیت پر پڑتا تھا وہ ملک و حکمرانی کے لئے نہایت درجہ مضر تھا،

فوج کی شورش محمد ثالث نے تخت نشین ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائیوں کو فوراً

قتل کرا دیا، اس طرف سے مطمئن ہو کر تخت نشینی کے آٹھویں روز وہ جامع صوفیہ میں جلوس کے ساتھ نماز ادا کرنے گیا، اور فوج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اتنی کثیر مقدار میں انعامات اور بخششیں تقسیم کیں کہ اس سے پہلے کسی سلطان نے نہ کی تھیں، پھر وہ ہنگری میں کمک بھیجنے کی تیاری کرنے لگا لیکن اس تیاری کے دوران ہی میں فوج کے دو دستوں نے جو سلطانی بخشش سے مطمئن نہ تھے اور مزید انعامات کے خواہشمند تھے، صدر اعظم فرہاد پاشا کو گھیر کر اپنے مطالبات کی منظوری کے لئے سخت لہجہ میں اصرار کرنا شروع کیا، فرہاد پاشا نے اُنھیں سرحد پر جانے کا حکم دیا اور وعدہ کیا کہ اُن کے مطالبات وہیں پورے کئے جائیں گے، اس پر اُنھوں نے اور زیادہ برہمی ظاہر کی، اور فرہاد پاشا کو دھمکانے لگے، فرہاد پاشا نے اون کی یہ خودسری دیکھ کر کہا "کیا تم نہیں جانتے کہ جو لوگ اپنے سرداروں کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں وہ کافر ہیں، اور اون کی بیویاں عقیمہ ہیں" اس طنز پر وہ نہایت برافروختہ ہوئے اور مفتی اعظم کے پاس پہنچکر فرہاد پاشا کے خلاف ایک فتویٰ چاہا، مفتی اعظم نے انھیں یہ سمجھا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی کہ فرہاد پاشا کے کہنے سے نہ وہ کافر ہو سکتے اور نہ اون کی بیویاں عقیمہ، لیکن اون کو مفتی اعظم کے جواب سے تشفی نہ ہوئی، اور اُنھوں نے علانیہ بغاوت کر دی، سپاہیوں (قسطنطنیہ کے سوار دستوں) نے بھی اون کی حمایت کی اور سب نے مل کر فرہاد پاشا کے قتل کیلئے غل مچانا شروع کیا، اس شورش میں حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار جنھوں نے باغیوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی زخمی ہوئے، بالآخر ینی چری دستوں کو باغیوں کی سرکوبی کے لئے آمادہ کیا گیا، اور یہ بغاوت کسی طرح فرو ہوئی،

سلسلۂ جنگ | اس درمیان میں سرحد کی جنگ برابر جاری تھی، اور ہنگری اور ولاچیا میں عثمانی فوجوں کو متعدد شکستیں بھی ہوئیں، یہ حالت دیکھ کر مدبرینِ سلطنت نے محمد کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا

کہ وہ خود دشمنوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو کیونکہ عیسائی جس تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے اسے روکنے کی اس سے زیادہ امید افزا کوئی دوسری صورت نہ تھی، محمد کو قسطنطنیہ چھوڑنا منظور نہ تھا، اور سلطانہ صفیہ نے بھی جو اب سلطانہ والدہ تھی اُس کو میدانِ جنگ سے باز رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، محمد ثالث ایک کمزور دل و دماغ کا آدمی تھا سلطنت کے تمام اُمور میں سلطانہ صفیہ ہی کو زیادہ دخل تھا، اور محمد پر اُس کا حد سے زیادہ اثر تھا، وہ خوب سمجھتی تھی کہ قسطنطنیہ سے باہر ہونے کے بعد محمد اس کے قابو سے نکل جائیگا اس لئے اُس نے ہر ممکن کوشش سے اُس کو روکنا چاہا لیکن جنگ کی حالت روز بروز زیادہ انتشار انگیز ہوتی جاتی تھی ۱۵۹۳ء میں ولاچیا اور ٹرانسلوینیا کی حمایت میں آسٹریا اور ہنگری نے بھی بابِ عالی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا، اُن کی فوجیں شہنشاہ میکسی میلین اور ہنگری کے مشہور جنرل کونٹ فلفی ([illegible]) کے زیر کمان تیزی سے عثمانی سرحد کی جانب بڑھ رہی تھیں، اُنھوں نے دریائے ڈینوب تک پہنچنے سے پہلے گران، پیست، بخارسٹ، اور دوسرے متعدد قلعوں کو جن پر ترکوں کا قبضہ تھا فتح کر لیا، اس کے بعد اُنھوں نے ڈینوب کو عبور کر کے وارنا، سیلسٹریا، رسچک اور اکرمان پر قبضہ کر لیا، عثمانی فوجوں کی ان شکستوں کی خبر جس وقت قسطنطنیہ پہنچی تمام شہر میں تہلکہ پڑ گیا، اور ہر شخص نے اسی پر اصرار کرنا شروع کیا کہ سلطان فوج لے کر خود سرحد کی طرف روانہ ہونا چاہیئے، تاکہ جو شکستیں ترکوں کو ہو چکی تھیں اون کی تلافی ہو جائے، اور جن مقامات پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ واپس لے لئے جائیں، مشہور مورخ خواجہ سعد الدین جو محمد کا استاد تھا اور جس کا محمد نہایت احترام کرتا تھا، اُس نے بھی بے حد اصرار کے ساتھ اسی پر زور دیا، آخر میں ینی چری نے بھی یہ دھمکی دی کہ جب تک سلطان خود ان کی قیادت نہ کریگا

وہ دشمن کے مقابلہ کے لیئے نہ بڑھیں گے، محمد نے مفتی اعظم کو بلا کر مشورہ طلب کیا، مفتی اعظم نے اس کے جواب میں اُس عہد کے مشہور شاعر علی چلپی کی ایک نظم اُس کے ہاتھ میں رکھدی، اس نظم میں سلطنت کی زبون حالی اور موجودہ جنگ کی تباہ کاری نہایت واضح اور موثر الفاظ میں بیان کی گئی تھی، ان تمام باتوں کا اثر بالآخر محمد پر بھی پڑا اور اُس نے سلطانہ صیفیہ کی شدید مخالفت کے باوجود سرحد پر جانے کا عزم کر لیا،

جون ۱۵۹۶ء میں سلطان محمد نہایت تزک و احتشام کے ساتھ سرحد کی طرف روانہ ہوا، اس مہم میں علم نبوی پہلی بار نکالا گیا تھا جس کی وجہ سے فوج میں بے انتہا جوش تھا، مورخ سعد الدین سلطان کے ہمرکاب تھا، فوج کی کمان صدر اعظم ابراہیم پاشا، حسن صوقوللی پاشا، اور سیکالا پاشا کے ہاتھ میں تھی، جوں ہی ترکی فوج سرحد پر پہنچی اسٹریا اور ہنگری کی فوجیں بلا مقابلہ پسپا ہو گئیں اور ریلغاریا کے تمام مفتوحہ قلعوں کو خالی کر دیا، سلطان نے ایرلا کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد اسٹریا اور ہنگری کی فوجیں ٹرانسلوینیا سے کمک حاصل کر کے پھر آگے بڑھیں، لیکن ایرلا اس وقت تک فتح ہو چکا تھا، ۲۴ر اکتوبر ۱۵۹۶ء کو فریقین کی فوجیں سیر سٹینز (Cereszties) کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں اور پھر تین دن تک اس ہنگامہ خیز جنگ کا سلسلہ قائم رہا، جس میں ابتداءً ترکوں کو شکست ہوئی، لیکن آخر میں جنگ کے خاتمہ کے قریب انھوں نے عیسائیوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا،

پہلے روز ترکی فوج کا ایک دستہ جو جعفر پاشا کی کمان میں تھا نہایت جانبازی کیساتھ مقابلہ کرتا رہا، لیکن غنیم کی کثرتِ تعداد سے مغلوب ہو کر ایک ہزار ینی چری، ایک سو سپاہی اور تینتالیس توپوں کے نقصان کے ساتھ اُسے پسپا ہونا پڑا، اس ابتدائی شکست

کے بعد سلطان نے فوجی افسروں کو جمع کر کے مشورہ کیا، اور یہ خیال ظاہر کیا کہ جنگ فی الحال موقوف کر دی جائے اور فوج کو واپسی کا حکم دیدیا جائے، مورخ سعد الدین نے اس رائے کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ "یہ بات نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی گئی، کہ عثمانیوں کے کسی بادشاہ نے انتہائی اور ناگزیر مجبوری کے بغیر دشمن کو پیٹھ دکھائی ہو" بعض سرداروں نے یہ مشورہ دیا کہ سلطان کی حفاظت کے خیال سے فوج کی کمان حسن صوقوللی پاشا کے ہاتھ میں دیدی جائے، سعد الدین نے اس کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ "یہ معاملہ پاشاؤں کا نہیں ہے، یہاں خود سلطان کی ذاتی موجودگی قطعی طور پر ضروری ہے"، چنانچہ محض سعد الدین کے عزم و استقلال کی وجہ سے آخر میں یہ طے پایا کہ جنگ جاری رکھی جائے، اور سلطان ہی اس کی قیادت کا فرض انجام دے،

فتح مبین دوسرے روز بھی ترکوں کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی، لیکن تیسرے روز ۲۶ اکتوبر ۱۵۹۶ء کو دونوں فریق نے پوری تیاری کے ساتھ حملہ کیا اور یہی حملہ فیصلہ کن ثابت ہوا، شروع میں عیسائیوں نے مکمل طور پر غلبہ پایا، انھوں نے ترکوں اور تاتاریوں کو میدان سے بھگا کر انکی تمام توپوں پر قبضہ کر لیا، سلطان نے یہ دیکھ کر اب کوئی امید باقی نہیں رہی بھاگنے کا قصد کیا لیکن سعد الدین نے اس موقع پر بھی ثابت قدمی دکھائی، اور قرآنِ پاک کی ایک آیت تلاوت کر کے سلطان کو سمجھایا کہ صبر ہی سے فتح حاصل ہوتی ہے، اور رنج کے بعد خوشی کا آنا ضروری ہے، عین اس وقت جب کہ عیسائی دستے فاتحانہ جوش و خروش میں لوٹ مار میں مصروف تھے، سیکالا پاشا جو اب تک بالکل خاموش کھڑا ہوا تھا، دفعۃً اپنے سواروں کے انبوہ کے ساتھ بجلی کی طرح غنیم پر ٹوٹ پڑا اور اس بے جگری سے انھیں قتل کرنا شروع کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی

میداں میں ٹھہر نہ سکے اور انتہائی سراسیمگی کی حالت میں جان بچانے کے لئے بھاگے لیکن باوجود اس کوشش کے ان کے پچاس ہزار سپاہی دلدل میں پھنس کر اور ترکوں کی تلواروں سے ہلاک ہوگئے، ان کی پنچانوے توپیں اور آرچ ڈیوک میکسی میلین (Maximilian) کا جو عیسائی فوجوں کا سپہ سالار اعظم تھا، تمام زر و جواہر اور فوجی سامان ترکوں کے قبضہ میں آگیا، ترکوں کی یہ فتح اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے تاریخ آل عثمان کی نمایاں ترین فتوحات میں تھی،

اس غیر متوقع فتح کے بعد جس کا سہرا حقیقتہً سعد الدین پاشا اور سیکالا پاشا کے سر تھا، سلطان محمد بڑے فخر و مسرت کے ساتھ قسطنطنیہ کو واپس ہوا، اور پھر اپنی عیش و عشرت کی زندگی میں مصروف ہوگیا، ہنگری کے ساتھ جنگ کا سلسلہ کم و بیش برابر جاری رہا، یہاں تک کہ اس کے جانشین سلطان احمد اول کے عہد میں صلحنامہ سیتوا تورک (Sitvatorok) کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہوا،

فراری | قسطنطنیہ پہنچکر سلطان محمد نے فوراً ہی سیکالا پاشا کو اس کی شجاعت اور کامیابی کے صلہ میں سلطنت کا صدر اعظم مقرر کیا، لیکن یہ انتخاب نتائج کے اعتبار سے نہایت افسوسناک ثابت ہوا، اور چند ہی دنوں کے بعد سیکالا پاشا اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا، ایک فوجی افسر کی حیثیت سے اس کی بےمثل شجاعت اور جانبازی مسلم تھی، تاہم انتظام سلطنت کے لئے جس تدبر اور مصلحت بینی کی ضرورت تھی، اس سے وہ بڑی حد تک محروم تھا، جنگ کیرسٹیز کے موقع پر جب عیسائیوں نے غلبہ پایا تو عثمانی فوج کے بیشتر دستوں کے قدم اکھڑ گئے تھے، سیکالا پاشا کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان بھاگنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی، جس میں زیادہ تر ایشیا کے جاگیری دستے تھے، اس نے

ان سب کو "فراری" کے لقب سے موسوم کرکے اُن کی تنخواہیں روک دیں اور ان کی جاگیریں ضبط کرلیں، بہتیروں کو اُس نے علانیہ قتل کرادیا، ایک بڑی تعداد ایشیائے کوچک کو واپس چلی گئی اور سیدکالا پاشا اور سلطنت کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کرنے لگی، چنانچہ ایشیائے کوچک میں تھوڑے ہی دنوں کے بعد جو بغاوت برپا ہوئی اور جس کا سلسلہ کئی سال تک قائم رہا، اس میں نمایاں حصہ انہی "فراریوں" کا تھا،

قرہ یازیجی | سلطان محمد کے بقیہ عہدِ حکومت میں فوج کی خودسری اور صوبہ داروں کی تعدی اور سخت گیری روزبروز زیادہ ہوتی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے خلاف ایک عام بیزاری پھیل گئی اور ہر طرف بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے چنانچہ ۱۵۹۹ء میں ایشیائے کوچک کے فوجی جاگیرداروں کا ایک سردار عبدالحمید جو "قرہ یازیجی" کے لقب سے مشہور تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے کھڑا ہوگیا، اور سلطان کے خلاف عام بغاوت برپا کرکے خود ایک خودمختار فرماں روا بن جانا چاہا، اس نے کردوں، ترکمانوں، اور جنگ سیرسٹیز کے "فراریوں" کی ایک فوج تیار کی، اور اپنے بھائی دلی حسن والی بغداد کی مدد سے عثمانی لشکر کو متعدد شکستیں دیں، اسکے بعد حسن صوقوللی پاشا باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا، اُس نے عبدالحمید کو شکست دے کر بھگادیا، عبدالحمید کو لڑائی میں ایک کاری زخم لگا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکا لیکن مرنے سے پہلے اُس نے اپنے بھائی دلی حسن کو اپنی موت کا بدلہ لینے پر مامور کردیا تھا، چنانچہ دلی حسن نے جنگ جاری رکھی اور بالآخر حسن پاشا کو قتل کردیا، اُس کی طاقت روزبروز بڑھتی گئی یہاں تک کہ سلطان کو ۱۶۰۰ء میں مجبوراً اس سے صلح کرنی پڑی، سلطان نے اسے بوسینا کا حاکم مقرر کردیا، جس کے معاوضہ میں دلی حسن نے آئندہ مطیع اور وفادار

رہنے کا عہد کیا،

ایران سے جنگ اس بغاوت کے دوران ہی میں شاہ عباس نے اپنے قدیم دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۱۶۰۱ء میں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا، اور گذشتہ عہد میں جو صوبے سلطنت ایران سے نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے تھے انھیں واپس لے لیا،

وفات جون ۱۶۰۳ء میں سلطان محمد نے اپنے سب سے بڑے لڑکے محمود کو جس کی شجاعت اور لیاقت کے جوہر ابتدا ہی سے نمایاں تھے، اور جس نے باغیوں کو سر کرنے کیلئے ایشیائے کوچک کی سپہ سالاری کی درخواست سلطان سے کی تھی محض اس شبہہ کی بنا پر قتل کرا دیا کہ وہ اس بہانہ سے خود تختِ سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، اس شبہہ کو کسی درویش کی پیشین گوئی سے کہ جلد ایک نیا سلطان تخت پر بیٹھے گا اور بھی تقویت پہنچی، سلطان نے اس پیشین گوئی کے خوف سے محمود کو تو قتل کرا دیا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۲۲ اکتوبر ۱۶۰۳ء کو وہ خود بھی ختم ہو گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک درویش نے اُس سے کہا تھا کہ پچپن روز کے اندر اُس پر کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے، اس پیشین گوئی کا اثر یہ ہوا کہ وہ روز بروز مغموم و ضعیف ہوتا گیا یہاں تک کہ ٹھیک پچپنویں روز اس کا انتقال ہو گیا،

احمد اوّل

سنہ ۱۰۱۲ھ تا سنہ ۱۰۲۶ھ مطابق سنہ ۱۶۰۳ء تا سنہ ۱۶۱۷ء

سلطان محمد ثالث کے بعد اس کا بڑا لڑکا احمد اول چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، ابتداءً اس نے انتظامِ سلطنت میں جس قوت اور استقلال کا ثبوت دیا اُس سے توقع کی جاتی تھی کہ اس کا عہدِ حکومت پچھلے عہد کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب اور شاندار ثابت ہوگا، مثلاً جب صدرِ اعظم نے جو ہنگری کی جدید مہم پر مامور کیا گیا تھا، ایک کثیر رقم کا مطالبہ کیا اور اس کے پورا ہونے تک آگے قدم بڑھانے سے انکار کر دیا، تو احمد نے اس مطالبہ کے جواب میں صرف یہ پیغام بھیجا کہ "اگر تم کو اپنا سر عزیز ہے تو فوراً روانہ ہو جاؤ" صدرِ اعظم کو اس حکم کی تعمیل بے چون و چرا کرنی پڑی، سلطان سلیم ثانی کے زمانہ سے حرم کو امورِ سلطنت میں بہت کچھ دخل حاصل تھا، اور مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں عنانِ حکومت زیادہ تر خواتینِ حرم ہی کے ہاتھ میں تھی جنہیں سب سے زیادہ اثر سلطانہ صفیہ کا تھا جو مراد ثالث کی محبوب سلطانہ اور محمد ثالث کی والدہ تھی، سلطان احمد نے باوجود نو عمری کے سلطانہ صفیہ اور اس کے معتمد اشخاص کو سلطنت کے معاملات میں دخل دینے سے یک قلم روک دیا، یہ اقدام بالکل خلافِ توقع اور بہت کچھ امید افزا تھا، اس کے

بعد اس نے سیکالا پاشا کو ایران کی طرف روانہ کیا لیکن شاہ عباس کے مقابلہ میں اسے شکست ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۶۰۵ء میں سیکالا پاشا کا انتقال ہوگیا، صدر اعظم لالہ مصطفٰے نے جو ہنگری کی مہم پر روانہ کیا گیا تھا، بودا کو عیسائیوں کے ہاتھوں سے چھڑا لیا مگر موسم کی خرابی اور ینی چری کے آغا کی کم ہمتی کے باعث اسے مجبوراً ایست اور گران کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا، بہرحال چند ہی روز کے بعد اس نے گران کو فتح کر لیا،

صلحنامہ سیتواتوروک ۱۱ نومبر ۱۶۰۶ء کو صلحنامہ سیتواتوروک پر دستخط ہوئے، اس کے رو سے فریقین کے مقبوضات میں کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہوئی، گران ایرلا اور گراڈسکا (Gradiscka) کے قلعے عثمانیوں کے قبضہ میں رہے، اور راآب اور کومورن پر اسٹریا کا قبضہ قائم رہا، ٹرانسلوینیا بھی اس صلحنامہ میں بطور ایک فریق کے شریک کیا گیا، اور یہ صوبہ ایک حد تک سلطنت عثمانیہ کی محکومی سے آزاد ہو گیا، تیس ہزار دوکات سالانہ کی رقم جو آسٹریا بطور خراج دولت عثمانیہ کو ادا کرتا تھا، موقوف کر دی گئی اور اس کے معاوضہ میں باب عالی نے دو لاکھ دوکات یکمشت قبول کر لئے، لیکن اس صلحنامہ کی اصلی اہمیت وہ تبدیلی ہے، جو اس کے بعد دولت عثمانیہ اور یورپ کی عیسائی حکومتوں کے سفارتی تعلقات میں واقع ہوئی، اب تک عیسائی حکومتوں سے جو صلحنامے ہوتے تھے ان کی عبارت سے ظاہر ہوتا تھا کہ صلح سلطان کی طرف سے عطا کیجا رہی ہے، لیکن سیتواتوروک کے صلحنامہ میں باب عالی نے بین الاقوامی قانون کے اصول و آداب کا لحاظ رکھا، نیز شاہ آسٹریا حکمران "ویانا" کے بجائے "شہنشاہ" لکھنا منظور کیا، اب تک سلطان کی طرف سے جو سفرا ویانا بھیجے جاتے تھے، وہ باب عالی کے ادنیٰ ملازمین میں سے منتخب کئے جاتے تھے، اس صلحنامہ کے بعد یہ طے پایا کہ سفرا کم از کم

سنجق بے کے مرتبہ کے ہوں گے،

ضعفِ سلطنت اس صلح نامہ نے واضح کر دیا کہ دولت عثمانیہ کے عروج کا دور ختم ہو چکا اور اب وہ زوال و انحطاط کی جانب مائل ہو گئی ہے، سترھویں صدی کا ابتدائی زمانہ اس کے لئے نہایت خطرناک تھا، سلاطین عموماً کمزور تھے اور غنیم (سلطنت آسٹریا) روز بروز زیادہ طاقت حاصل کرتا جاتا تھا، لیکن ۱۶۱۸ء میں جرمنی میں وہ عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑ گئی جس کا سلسلہ تیس سال تک قائم رہا اور جس نے سلطنت آسٹریا کو ترکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے بوہیمیا، سیکسنی، ڈنمارک، سویڈن اور فرانس سے معرکہ آرائی میں مصروف رکھا، سلطنت اسپین بھی دولت عثمانیہ کی ایک بہت بڑی دشمن تھی، لیکن فلپ ثانی کی وفات (۱۵۹۸ء) کے بعد یہ سلطنت نہایت تیزی کے ساتھ گرنے لگی اور سترھویں صدی کی ابتدا میں اس قابل نہ تھی کہ اپنے سابق حریف کے ساتھ قوت آزمائی کر سکے، فرانس اور انگلستان دولت عثمانیہ سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، علاوہ بریں وہ سترھویں صدی کے نصف اول میں اپنے خانگی جھگڑوں میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں دوسری جانب توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، روس خانہ جنگیوں اور بغاوتوں سے پریشان تھا، اور اس زمانہ میں جب سلطنت عثمانیہ کی کمزوری بہت نمایاں تھی خود ان بغاوتوں کے فرو کرنے اور اہل سویڈن و پولینڈ سے اپنے بعض صوبے واپس لینے کی کوششوں میں مشغول و منہمک تھا، غرض سترھویں صدی کے ابتدائی تیس سالوں میں جو سلطنت عثمانیہ کے لئے نہایت نازک اور تشویشناک دور تھا یورپ کی کوئی بڑی حکومت اس قابل نہ تھی کہ ترکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا سکے، اس زمانہ میں ترکوں کے خاص دشمن پولینڈ اور وینس تھے، پولینڈ اپنے خانگی انتشار کے باعث کوئی نمایاں فتح حاصل نہ کر سکا اور وینس کبھی اس قابل نہ تھی کہ تنہا

سلطنت عثمانیہ کا مقابلہ کر سکے، علاوہ بریں تمام ظاہری نمائش کے باوجود اُس کی قوت خود روز بروز کمزور ہوتی جارہی تھی ستر ہویں صدی کے نصف اول میں ایران سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا دشمن تھا، تاہم اس سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ اُس کی فوجیں مغرب کی جانب اس حد تک بڑھ آئیں گی کہ سلطنت کے اصلی مقبوضات خطرہ میں پڑ جائیں گے،

صلحنامہ سیتوا تورو ک کے بعد سلطان احمد اول نے گیارہ سال حکومت کی، اس مدت میں صدر اعظم مراد پاشا نے ایشیائے کوچک کی بغاوت فرو کرنے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی، لیکن ایران سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا، جس میں زیادہ تر ترکوں ہی کا نقصان ہوا، ۱۶۱۳ء میں قزاقوں نے سینوپ پر جو ایشیائے کوچک کا ایک نہایت دولتمند شہر اور بحر اسود کا بہت مضبوط بندرگاہ تھا حملہ کر کے اسے تخت وتاراج کر ڈالا، ترکی بیڑا موقع سے دور تھا اور شہر کی بربادی کے بعد بھی حملہ آوروں سے انتقام نہ لے سکا،

وفات ۲۳، ذیقعدہ ۱۰۲۶ھ (۲۲، نومبر ۱۶۱۷ء) کو سلطان احمد اول نے اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی،

مصطفیٰ اول و عثمان ثانی

سنہ ۱۰۲۶ھ تا سنہ ۱۰۳۲ھ مطابق سنہ ۱۶۱۷ء تا سنہ ۱۶۲۳ء

سلطان احمد اول نے اپنی وفات کے وقت سات لڑکے چھوڑے جن میں سے تین تخت نشین ہوئے، لیکن اس کا پہلا جانشین اس کا بھائی مصطفیٰ تھا اب تک چودہ پشتوں سے سلطنت عثمانیہ کی وراثت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی آئی تھی، یہ پہلا اتفاق تھا کہ بیٹے کے بجائے سلطان سابق کا بھائی تخت نشین ہوا، فان ہیمر کی روایت کے مطابق[1] خاندان کے سب سے بڑے فرد کو تخت نشین کرنے کا دستور دولت عثمانیہ نے آلِ چنگیز سے لیا تھا، لیکن جب سے سلاطین نے محمد فاتح کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کرنا شروع کیا اور تاج و تخت کی حفاظت کے لئے بھائیوں کا قتل ضروری خیال کیا جانے لگا اُس وقت سے سلطنت کا وارث بھائی کے بجائے بڑا لڑکا ہوتا تھا احمد اول نے چونکہ اپنے بھائی مصطفیٰ کو قتل نہیں کرایا تھا، اور صرف اس کی قید ہی پر اکتفا کیا تھا، اس لئے قانون آل عثمان کے رو سے مصطفیٰ تخت سلطنت پر بٹھایا گیا، لیکن مصطفیٰ کی سادہ لوحی نا اہلیت تین ہی مہینے میں اس درجہ واضح اور نمایاں ہوگئی کہ ارکین سلطنت نے ۲۶ فروری سنہ ۱۶۱۸ء کو سے معزول کر کے سلطان احمد کے چہاردہ سالہ فرزند شہزادہ

---

[1] کریسی جلد ا صفحہ ۳۴۷،

عثمان کو تخت پر بٹھا دیا، فوج سے خطرہ تھا مگر اُس نے بھی اپنے مالی فائدہ کو پیش نظر رکھکر اس تجویز سے بہ خندہ پیشانی اتفاق کیا اور نئے سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر حسب دستور قدیم جدید انعامات کا مطالبہ کیا، جس کی وجہ سے صرف تین ماہ کے اندر خزانہ کو ساٹھ لاکھ دوکات کا بار پھر برداشت کرنا پڑا،

عثمان ثانی سلطان عثمان ثانی کا مختصر عہد حکومت خود اس کے اور سلطنت کے لئے نہایت نامبارک ثابت ہوا، ترکوں کی مسلسل شکستوں سے مجبور ہو کر ایران سے صلح کر نی پڑی (۱۶۱۸ء) اور وہ تمام فتوحات جو مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں حاصل ہوئی تھیں ایرانیوں کو واپس کر دی گئیں، سلطنت عثمانیہ کی مشرقی سرحد پھر اسی خط پر پہنچ گئی جس پر سلطان سلیم ثانی کے زمانہ میں تھی، ادھر سے فارغ ہو کر عثمان سلطنت کے اندرونی دشمنوں یعنی ینی چری و سپاہی دستوں کی جانب متوجہ ہوا، جن کی خودسری اور سرکشی سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ تھی، خصوصاً ینی چری کا تمرد سلطان اور رعایا دونوں کے لئے یکساں طور پر تشویشناک تھا، ۱۶۲۱ء میں عثمان نے پولینڈ سے جنگ چھیڑ دی جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس فوج کی قوت بھی کچھ کمزور ہو جائے، یہ مقصد ایک حد تک پورا تو ہوا اور سلطانی فوجوں کو جزوی کامیابی کے بعد کافی نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا، لیکن اس جنگ کے نتیجہ سے عثمان کے خلاف ایک عام برگشتگی پیدا ہو گئی، بجائے اس کے کہ وہ رعایا کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرتا، اس نے قوانین و ضوابط میں نامناسب تبدیلیاں اور سختیاں نافذ کر کے اور زعماے سلطنت کو اپنے برتاؤ سے ناخوش کر کے ہر طبقہ کے لوگوں کو بیزار کر دیا، ۱۶۲۲ء میں اُس نے سفر حج کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن یہ پوشیدہ نہ تھا کہ اُس کا اصلی مقصد دمشق پہنچکر کردوں اور دوسرے سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کرنا ہے جسے جدید طرز پر منظم

کر کے وہ ینی چری اور سپاہی "کی بیخ کنی کے لے قسطنطینہ لانا چاہتا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا تو سلطنت کی بہتیری خرابیاں دور ہو جاتیں لیکن اس قسم کی مہم کے لئے جیسی رازداری اور قوتِ عمل کی ضرورت تھی عثمان اس سے خالی تھا، ینی چری کو اس کے اصلی مقصد کا علم ہو گیا اور انھوں نے برافروختہ ہو کر سلطان کو اس سفر سے روک دیا اور پھر موجودہ وزیروں کے قتل کا مطالبہ کیا، عثمان کے پاس نہ کوئی ایسی فوج تھی جو ینی چری کے مقابلہ میں اسکی حمایت کرتی اور نہ رعایا میں کوئی طبقہ اس کا ہمدرد تھا جس سے وہ مدد طلب کر سکتا، خود سابق سلطان مصطفیٰ کی والدہ بھی باغیوں کی طرفدار تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر یہ بغاوت فرو ہو گئی تو عثمان اپنی ذات کو محفوظ کرنے کی غرض سے اپنے تمام عزیزوں کو جنمیں مصطفیٰ سب سے پہلے تھا قتل کرا دیگا، فوج کے مطالبات بڑھتے ہی گئے اور باغیوں نے وزرا سے گذر کر خود سلطان کی ذات پر حملہ شروع کیا، چنانچہ انھوں نے عثمان کو گرفتار کر کے قید کر دیا، اور مصطفیٰ کو رہا کر کے دوبارہ تختِ سلطنت پر بیٹھایا، داؤد پاشا جس کو اس بغاوت میں بہت زیادہ دخل تھا صدر اعظم کے عہدہ پر متمکن ہوا لیکن اُسے اندیشہ تھا کہ مبادا کوئی انقلاب پھر پیش آئے، لہذا اس خطرہ کو ہمیشہ کے لئے رفع کرنے کی غرض سے وہ اپنے بعض ساتھیوں کو لے کر عثمان کے قید خانہ میں داخل ہوا اور نہایت بے رحمی اور شقاوت کیساتھ اُسے پھانسی دیکر ختم کر دیا،

عثمان کا خون تھوڑے ہی دنوں کے بعد رنگ لایا اور خود ینی چری میں قاتلوں کے خلاف برہمی پیدا ہوئی، مصطفیٰ نے بھی اس حادثہ پر رنج وغم کا اظہار کیا، اور قاتلوں کی سزا کا حکم نافذ کیا، تاہم حکومت میں جو انتشار پیدا ہو چکا تھا، وہ بدستور قائم رہا اور مصطفیٰ کی نااہلی میں ذرا بھی فرق ظاہر نہ ہوا، اُس کی ماں سلطانہ والدہ اصلی فرماں روا تھی،

سلطنت کے اعلیٰ عہدوں کے لئے ہر امیدوار رشوت کے ذریعہ سے ینی چری اور سپاہی" فوجوں کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا، قسطنطنیہ میں بدامنی اور شورش یہاں تک بڑھی کہ خود فوج پر بھی اس کا اثر پڑا، اور اس نے عاجز آکر وزرائے سلطنت کی یہ خواہش منظور کرلی کہ مصطفیٰ کی معزولی کے بعد نئے سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر وہ اپنے دستوری انعامات کا مطالبہ نہ کریگی، چنانچہ اگست ۱۶۲۳ء میں مصطفیٰ دوسری مرتبہ معزول کیا گیا، اور سلطان عثمان کا بھائی شہزادہ مراد جس کی عمر صرف بارہ سال تھی تخت پر بٹھایا گیا،

مصطفیٰ کے دوسرے عہد حکومت کا قیام ایک سال سے کچھ ہی زائد رہا لیکن یہ قلیل مدت بھی سلطنت کے لئے نہایت مضرت رساں ثابت ہوئی، اسی دوران میں ایران سے جنگ پھر چھڑ گئی تھی اور بغداد و بصرہ دونوں سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گئے، اباظہ پاشا والی ارض روم مقتول سلطان کے خون کا انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، اور تمام ایشیائے کوچک میں بغاوت برپا کردی، وہ ینی چری کا خاص طور پر دشمن تھا اور اس نے اس خود سر فوج کو بھی عاجز کردیا، اس عام خلفشار اور بدنظمی میں سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا، رعایا کا حال حد درجہ خراب تھا، وہ ہر طرح کی سختیوں اور تباہیوں کی شکار تھی، مرکزی حکومت بالکل کمزور ہوگئی تھی، اور رشوت ستانی کا اثر سلطنت کے ہر شعبہ میں نمایاں تھا، اگر اس وقت یورپ کی کوئی مضبوط طاقت حملہ کردیتی تو سلطنت عثمانیہ کے لئے اس کا مقابلہ دشوار ہوجاتا، لیکن یورپ کی حکومتیں خود باہمی جنگ اور خانگی انتشار میں مبتلا تھیں اور ان میں دولت عثمانیہ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی قوت نہ تھی،

پہلا برطانوی سفیر

۱۶۲۲ء میں سر طامس رو برطانیہ کے سب سے پہلے سفیر کی حیثیت سے باب عالی میں آیا، یہ شاہ جیمس اول کا فرستادہ تھا، اور اس کی سفارت کا خاص مقصد ان بحری قزاقوں

کے خلاف احتجاج کرنا تھا، جو الجزائر اور تونس سے برطانوی جہازوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے
وہ پانچ سال تک قسطنطینیہ میں مقیم رہا، اور کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا،
اُس نے اپنے دورانِ قیام میں سلطنت عثمانیہ کے اختلال وزوال سے متعلق جو واقعات
اور حالات قلمبند کئے ہیں ان سے مبالغہ کا حصہ نکال دینے کے بعد بھی اندازہ ہوتا ہے، کہ
سترھویں صدی کے ابتدائی دور میں سلطنت کی زبون حالی کس حد کو پہنچ گئی تھی،

مرادِ رابع

سنہ ۱۰۳۲ھ تا سنہ ۱۰۵۰ھ مطابق سنہ ۱۶۲۳ء تا سنہ ۱۶۴۰ء

سلطان مراد رابع صرف بارہ سال کی عمر میں ۱۰ ستمبر سنہ ۱۶۲۳ء کو تخت نشین ہوا لیکن اس نوعمری میں بھی اُس نے جس قوتِ ارادی کا اظہار کیا اس سے وزراء کو اندازہ ہوگیا کہ عنانِ حکومت ایک ایسے فرماں رواکے ہاتھ میں آئی ہے جو سلطنت کی تمام بدنظمیوں کو اپنی سطوت وجبروت سے دور کر دیگا، ترک مورخ اولیا کا بیان ہے کہ "تخت نشینی کے بعد جب سلطان مراد خزانہ میں داخل ہوا، تو میرا باپ درویش محمد اس کے ساتھ تھا، خزانہ میں طلائی اور نقرئی ظروف میں سے کچھ بھی باقی نہ تھے، صرف تیس ہزار پیاستر[1]، اور الماریوں میں چند مونگے اور چینی کے برتن رہ گئے تھے، بادشاہ نے سجدہ کیا، اور پھر کہا کہ انشاء اللہ میں اس خزانہ کو اُن ہی لوگوں کی جائداد سے پُر کر دوں گا جنھوں نے اسے لوٹا ہے[2]"

سلطان مراد کی نوعمری کے باعث سلطنت کا انتظام ابتداءً اس کی والدہ سلطانہ ماہ پیکر کے ہاتھ میں تھا جو نہایت دانشمند اور مدبر خاتون تھی، سلطانہ والدہ کی قابلیت اس وقت سلطنت کے لئے بے حد اہم اور مفید ثابت ہوئی خطرات اور تباہیوں کے بادل ہر طرف

---

[1] چھوٹے نقرئی سکے [2] کریسی جلد ا صفحہ ۲۹۴،

گھرے ہوئے تھے، سلطنت کے ہر حصہ سے تشویشناک خبریں آرہی تھیں، سرحد پر ایرانی فوجیں فتحیاب تھیں، اباظا پاشا اپنی بغاوت میں کامیاب ہوکر ایشیائے کوچک کا حاکم بنا ہوا تھا، لبنان کے لوگ علانیہ باغی ہوگئے تھے، مصر اور دوسرے صوبوں کے والی بھی اپنی فرمانبرداری میں متزلزل تھے، الجزائر، تونس اور طرابلس کی حکومتیں خود مختار ہوچکی تھیں اور بہ اختیار خود یورپ کی حکومتوں سے معاہدے کر رہی تھیں، روسی قزاقوں کے حملے اور ان کی تباہ کاریاں نہ صرف بحر اسود کے ساحل پر جاری تھیں بلکہ انھوں نے باسفورس میں داخل ہوکر قسطنطنیہ کے ملحق علاقہ میں بھی لوٹ مار شروع کردی تھی، خود پایہ تخت میں خزانہ خالی تھا، سلح خانہ کا سامان تقریباً ختم ہوچکا تھا، رعایا فاقہ کشی میں مبتلا تھی، اور فوج کی سرکشی اور بے راہ روی حد کو پہنچ چکی تھی، ان حالات کے باوجود جب کہ بدامنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، اور خود مراد کی زندگی خطرہ سے خالی نہ تھی سلطانہ والدہ نے اپنے تدبر اور اعلیٰ قابلیت سے سلطنت کو نہ صرف سنبھالے رکھا، بلکہ رفتہ رفتہ فوج اور وزراء پر کچھ قابو بھی حاصل کرلیا، یہاں تک کہ مراد نے تخت نشینی کے نویں سال تمام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی، اور پھر وہ تمام خرابیاں جو سلطنت کو تباہ و برباد کر رہی تھیں، نہایت سرعت کے ساتھ دور ہونے لگیں،

فتنۂ بغداد مراد کی کمسنی کے زمانہ میں عباس صفوی شاہ ایران کو اپنی سلطنت کے وسیع کرنے کا موقع مل گیا، بکیر آغا نے جو بغداد کا کوتوال تھا، وہاں کے والی کو قتل کرکے شہر پر خود قبضہ کرلیا، دولت علیہ نے اس کے مقابلہ میں حافظ پاشا کو روانہ کیا، اور اس نے بغداد کا محاصرہ کرلیا، بکیر آغا نے شاہ عباس کو دعوت دی اور لکھا کہ اگر آپ مجھے یہاں کا والی مقرر کردیں تو شہر آپ کے حوالہ کردوں، شاہ عباس نے یہ شرط منظور کرلی، اور فوراً فوج لے کر روانہ ہوا، اس درمیان میں بکیر آغا نے حافظ پاشا سے بھی یہی گفتگو کی اور حافظ پاشا نے بھی اس کی

یہ شرط منظور کرلی، چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق ترکی فوجیں بغداد میں داخل ہوگئیں، اس کے بعد شاہ عباس نے بغداد پہنچکر شہر کا محاصرہ کرلیا، تین ماہ تک محاصرہ جاری رہا، بکیر آغا نے پھر وہی پہلی شرط شاہ عباس کے سامنے پیش کی، اور شاہ عباس کی منظوری حاصل کرنے کے بعد ترکوں سے غداری کرکے ایرانی لشکر کو شہر کے اندر داخل کردیا، (۱۶۲۳ئ) شاہ عباس نے بغداد پر قبضہ کرلینے کے بعد بکیر آغا کو اس غداری کے صلہ میں قتل کرادیا، (فرید بک ص ۱۲۵)

صدر اعظم کمانکش علی پاشا کے مخالفوں نے بغداد کی شکست کی ذمہ داری اسی کے سر عائد کی اور مراد کو مجبور کرکے اُسے قتل کرادیا، اس کے بعد چرکس محمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، لیکن وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مرگیا، ۱۶۲۴ئ میں یہ عہدہ حافظ احمد پاشا کو تفویض ہوا، اسی سال اُس نے بغداد پر فوجکشی کرکے اس کا محاصرہ کرلیا، جو بہت دنوں تک قائم رہا، لیکن محصورین کے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور ینی چری نے گھبراکر محاصرہ جاری رکھنے سے انکار کردیا، مجبوراً حافظ پاشا محاصرہ اُٹھا کر دیار بکر چلا آیا، یہاں پہنچکر ینی چری نے پھر بغاوت کی جس کی وجہ سے حافظ پاشا معزول کردیا گیا، اور خلیل پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، خلیل پاشا نے اباظا پاشا کو مطیع بنانے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ ناکام رہا، اور اس کے مخالفوں نے دوسرے ہی سال اُسے بھی معزول کرادیا، اس کی جگہ خسرو پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، اُس نے ارض روم پر فوجکشی کرکے اباظا پاشا کو مطیع کیا، اور ۱۶۲۸ئ میں اُسے بوسینا کا والی مقرر کیا، اس درمیان میں قسطنطنیہ کی شورش برابر بڑھتی رہی، دارالسلطنت پر تمام تر سرکش ینی چری اور سپاہی فوجوں کا قبضہ تھا، عہدہ داروں کا تقرر اور معزولی انہی کی مرضی پر تھی، اور وزرائے سلطنت میں سے جو ذرہ بھی ان کی مخالفت کرتا قتل کردیا جاتا،

ایران پر چڑھائی

۱۶۲۸ئ میں شاہ عباس صفوی نے وفات پائی اور اس کا نوعمر لڑکا

شاہ مرزا تخت نشین ہوا، اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر خسرو پاشا نے ایران پر فوج کشی کی اور ۱۶۲۳ء
میں ہمدان میں داخل ہو گیا، ہمدان فتح کرنے کے بعد وہ بغداد کی طرف بڑھا، درمیان میں کئی
بار ایرانیوں نے مقابلہ کیا لیکن خسرو پاشا نے ہر مرتبہ انھیں شکست دی، بغداد پہنچکر اس نے
شہر کا محاصرہ کر لیا، مگر تھوڑے دنوں کے بعد فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا، اور اُسے نومبر ۱۶۳۰ء
میں محاصرہ اُٹھا کر مجبوراً واپس آنا پڑا، محاصرہ اُٹھا لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو پاشا معزول
کر دیا گیا، اور حافظ پاشا دوبارہ صدر اعظم مقرر ہوا،

خون شہید | یوں تو ینی چری اور سپاہی فوجوں کی خودسری بارہا بغاوت کے مناظر پیش کر چکی تھی،
لیکن فروری ۱۶۳۲ء میں اُنھوں نے جس سرکشی کا ثبوت دیا وہ مراد کے لئے جس نے انھی
سال انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لیا تھا، ایک نہایت تلخ تجربہ تھا، ان باغیوں نے بغداد
کی مہم سے ناکام لوٹنے کے بعد رجب پاشا کے بھڑکانے سے ایک روز قصر سلطانی کے سامنے
جمع ہو کر صدر اعظم حافظ پاشا، مفتی اعظم یحیٰی، دفتردار مصطفیٰ اور سلطان کے چند دوسرے معتمد عہدہ داروں
کے قتل کا مطالبہ نہایت گستاخی اور اصرار کے ساتھ پیش کیا، مراد نے انھیں سمجھانے کی بہت
کوشش کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، بلکہ اُنھوں نے اُسے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ
ان کے مطالبات منظور نہ کریگا، تو اس کا نتیجہ خود اُس کے حق میں بہت بُرا ہوگا، آخر کار
مراد نے نہایت مجبور ہو کر حافظ پاشا کو بلایا اور اُس سے باغیوں کے مطالبہ کا ذکر کیا، حافظ پاشا
نے جواب دیا، "میرے پادشاہ! حافظ جیسے ایکہزار غلاموں کی جان تجھپر نثار، میری استدعا صرف
یہ ہے کہ تو مجھے اپنے ہاتھ سے قتل نہ کر بلکہ انہی لوگوں کے سپرد کر دے تاکہ مجھے شہادت حاصل ہو
اور میرے خون کا وبال اُن کے سروں پر آئے "، اس کے بعد بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، کہتا ہوا نہایت دلیری

کے ساتھ وہ باغیوں کی طرف بڑھا، مراد اس منظر کو دیکھکر اپنے آنسو ضبط نہ کرسکا، وزراے سلطنت بھی جو اس موقع پر موجود تھے، اشکبار آنکھوں سے اس خونین تماشہ کو دیکھ رہے تھے، جوں ہی حافظ پاشا آگے بڑھا، باغی خونخوار درندوں کی طرح اُس پر جھپٹے، حافظ پاشا نے پہلے حملہ آور کو ایک ہی وار میں ختم کر دیا، یہ دیکھکر بقیہ سپاہی اس پر ٹوٹ پڑے، اور اُسے خنجروں سے ہلاک کر ڈالا، ایک ینی چری سپاہی نے اس کے سینہ پر چڑھ کر اس کا سر کاٹ ڈالا، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو لئے تو مراد نے کہا، "خدا کی مرضی پوری ہو، لیکن اے خونخوار انسانو! جو وقت اوس نے مقرر کردیا ہے، اس وقت ضرور تم سے اس کا انتقام لیا جائیگا، تمھیں نہ خدا کا خوف ہے نہ رسول کی شریعت کا احترام"، لیکن باغیوں پر اس وقت اس دھمکی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا،

فکر انتقام دو مہینے کے اندر بہت سے دوسرے بے گناہ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، خود مراد کی معزولی کے مسئلہ پر بھی فوج میں علانیہ گفتگو ہوتی تھی، اور مراد کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ اُس کے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ اپنے عزل و قتل کے لئے تیار ہو جائے یا پھر باغیوں کی بیخ کنی کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے، خوش قسمتی سے فوج میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو اپنے ساتھیوں کی سرکشی اور بے راہ روی سے نہایت بیزار تھے، ان لوگوں نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس کی حمایت کا وعدہ کیا، چنانچہ خفیہ طور پر ایک دلیر اور جانباز دستہ جس پر ہر حال میں اعتماد کیا جا سکتا تھا، رفتہ رفتہ تیار کر لیا گیا، ینی چری اور سپاہی دستوں کا باہمی افتراق و حسد بھی سلطان کے مقصد میں بہت کچھ معین ہوا، اور اُس نے ان کی نزاع سے کافی فائدہ اُٹھایا، اُس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اس شورش کے اصلی بانی رجب پاشا کو دفعۃً خفیہ طور پر قتل کرادیا، اُس کے بعد پھر وہ باغیوں کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوا، ۲۹ رمئی ۱۶۳۲ء کو اُس نے ایک دیوان عام منعقد کیا، جس میں مفتی اعظم

وزرائے سلطنت، اکابر علما اور دو فوجی سردار جنھوں نے باغیوں کے خلاف سلطان کی
اطاعت کا حلف لیا تھا، حاضر تھے، سواروں کے چھ دستے بھی جن کی وفاداری پر اعتماد
کیا جا سکتا تھا، مستعد کھڑے تھے، مراد نے پہلے ینی چری دستوں کو اپنے سامنے بلا کر
اُن کی وفاداری پر اطمینان ظاہر کیا اور کہا کہ مجھے امید ہے کہ تم باغیوں کو سزا دینے میں
میرا ساتھ دوگے، ینی چری دستوں نے باآوازِ بلند اعلان کیا کہ بادشاہ کے دشمن ہمارے
دشمن ہیں، اور قرآنِ پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ ہم سلطنت کی کامل اطاعت کریں گے،
اس کے بعد مراد "سپاہیوں" کے وفد کی طرف متوجہ ہوا جو ینی چری فوج کے اس جوش
کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے، اُس نے ان کی سرکشی پر ملامت کی "سپاہیوں" نے
ادب کے ساتھ معذرت پیش کی کہ گو سلطان کی شکایتیں بجا ہیں تاہم وہ خود ذاتی
طور پر دولت علیہ کے مطیع اور وفادار ہیں البتہ اپنے ماتحتوں کی اطاعت پر قابو نہیں
رکھتے، مراد نے جواب دیا کہ اگر تم وفادار ہو تو وہی حلف لو جو تمھارے بھائی ینی چری
دستوں نے ابھی لیا ہے، اور اپنے دستوں سے باغیوں کے سرداروں کو گرفتار کر کے میرے
حوالہ کر دو" "سپاہی" افسروں نے خوفزدہ ہو کر اطاعت کا حلف لے لیا، اس کے بعد
مراد نے قضاۃِ سلطنت کو مخاطب کر کے ان کے فیصلوں کی جانبداری پر انھیں ملامت
کی جس پر ایشیا کے ایک عربی النسل قاضی نے کھڑے ہو کر نہایت بے خوفی کے ساتھ
عرض کیا: "میرے بادشاہ! ان تمام باتوں کا علاج صرف تلوار کی دھار ہے" اس
قاضی کا یہ اعلان لکھ لیا گیا، اور پھر سلطان، وزرائے سلطنت، مفتی اعظم اور تمام حاضرین
نے متفقہ طور پر ایک محضر پر اپنے دستخط کیے، جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ بدامنی اور شورش
کو دور کرنے کی حتی الوسع پوری کوشش کریں گے،

شدتِ انتقام مراد نے اسی روز سے اپنی آزاد حکومت شروع کردی، باغیوں کے تمام سردار اور وہ سب لوگ جن کو مراد اس بغاوت میں شریک سمجھتا تھا قتل کردیئے گئے، قسطنطنیہ کے علاوہ صوبوں میں بھی باغیوں کا استیصال یوں ہی کیا جانے لگا، اور مہینوں تک قتل و خونریزی کا سلسلہ جاری رہا، خفیف سے شبہہ پر بھی بڑے بڑے عہدہ دار فوراً قتل کردیئے جاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر سلطنت کے ہر شعبہ کی تمام خرابیاں دور ہوگئیں، اور فوج کی سرکشی کا خاتمہ ہوگیا، سلطنت کے طول و عرض میں امن و امان قائم ہوگیا، اور عدل و انصاف کی حکومت نظر آنے لگی،

ایشیائے کوچک کی بغاوت ۱۶۳۰ء ہی میں فرو ہوچکی تھی، اور مراد نے اباظا پاشا کی جاں بخشی کرکے اُسے بوسینیا کا والی مقرر کردیا تھا، لیکن ینی چری کو مطیع کرنے کے بعد اُس نے اباظا پاشا کو قسطنطنیہ میں بلاکر اس فوج کا حاکم بنا دیا، کچھ دنوں تک تو اباظا پاشا مراد کے حسب اطمینان کام کرتا رہا، لیکن پھر اپنی کسی بات سے اُس کو ناخوش کردیا جس کی پاداش میں قتل کردیا گیا (۱۶۳۴ء)

مفتی اعظم کا قتل ۱۶۳۳ء میں مراد ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا لیکن وہ نائکومیڈیا سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھا تھا کہ اُس نے وہاں کے قاضی کو کسی جرم میں قتل کرادیا، اس قتل سے دارالسلطنت کے علماء کی جماعت میں بڑی برہمی پیدا ہوئی، اور اس جماعت کے سرداروں نے مراد کے خلاف کہنا سننا شروع کیا، سلطانہ والدہ نے اس کی اطلاع مراد کو دی، وہ فوراً قسطنطنیہ واپس ہوا، اور آتے ہی مفتی اعظم کو قتل کرادیا، تاریخ آلِ عثمان میں سلطان کے حکم سے کسی مفتی اعظم کے قتل کی یہ پہلی اور آخری مثال ہے، اس قتل کے بعد علماء کی شورش بالکل فرو ہوگئی،

اریوان کی فتح

۱۶۳۵ء میں مراد پھر اپنی مہم پر روانہ ہوا، اس مرتبہ اُس کا مقصد صرف ایشیائی صوبوں کا معاینہ کرنا نہ تھا بلکہ اُن مقامات کو فتح کرنا بھی مقصود تھا، جو پہلے عثمانی مقبوضات میں شامل تھے، چنانچہ اسی سال اُس نے اریوان فتح کر لیا، یہ شہر پہلے سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں رہ چکا تھا

بغداد کی فتح

۱۶۳۸ء میں مراد اپنے عہد کی آخری اور سب سے بڑی مہم پر روانہ ہوا، بغداد پندرہ سال سے ایرانیوں کے قبضہ میں تھا، اور باوجود کئی محاصروں کے ترک اُسے واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے، اسے اول اول سلطان سلیمان اعظم نے فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا تھا لیکن مراد کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال جب کہ بغاوتوں اور بدنظمیوں کے باعث سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا، شاہ عباس صفوی نے بکیر آغا کی غداری سے فائدہ اُٹھا کر اس پر قبضہ کر لیا تھا، اب ۱۶۳۸ء میں مراد اس سابق مقبوضہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوا، ۱۵؍ نومبر ۱۶۳۸ء کو عثمانی فوجوں نے بغداد پہنچکر شہر کا محاصرہ کر لیا، محصورین جن کی تعداد تیس ہزار تھی نہایت دلیری اور جانبازی سے مقابلہ کرتے رہے، لیکن ترکوں کی تعداد، ان کی فوجی تنظیم اور سب سے بڑھ کر خود مراد کی غیر معمولی شجاعت وہمت تمام مدافعت پر غالب آئی، دوران محاصرہ میں مراد معمولی سپاہیوں کے دوش بدوش کھائیوں میں کام کرتا تھا اور انکی ہمت قائم رکھنے کے لئے وہ ہر کام میں اُن کا شریک رہتا تھا، جب ایرانیوں نے دیکھا کہ وہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکیں گے تو ایک روز اُنھوں نے اپنے سب سے بڑے پہلوان اور بہادر کو باہر نکال کر ترکوں کو چیلنج دیا کہ وہ بھی دست بدست لڑائی کے لئے اپنی فوج کے سب سے بڑے بہادر کو آگے بڑھائیں، یہ چیلنج سنکر مراد خود اس ایرانی پہلوان کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھا، اور دیر تک شمشیر زنی کے جوہر دکھا کر ایک تیغہ ایسا مارا کہ ایرانی کا سر کٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا، مراد اپنی جسمانی قوت اور

۱۶۳۸ء

حربی قابلیت کے لحاظ سے تمام عثمانی لشکر میں کوئی حریف نہیں رکھتا تھا، بہر حال ۲۲ دسمبر کو ترکی توپوں نے فصیل شہر میں آٹھ سو گز چوڑا ایک رخنہ پیدا کر دیا، اور اس وقت سے دونوں فوجوں کا اصلی مقابلہ شروع ہوا، ترک شہر میں داخل ہونے کے لئے دوڑے لیکن ایرانیوں نے اپنی قابل داد جانبازی سے دو روز تک انہیں اندر قدم رکھنے سے روکے رکھا، بالآخر (۲۵ دسمبر ۱۶۳۸ء) تیسرے روز صدر اعظم طیار محمد پاشا فوج لے کر آگے بڑھا اور گو وہ خود گولی کھا کر گرا تاہم ترک گولیوں کی باڑھ سے بیخوف ہو کر لڑتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے، بارہ سو سواروں کا ایک دستہ بغداد کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر مراد فروری ۱۶۳۹ء میں قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا، اور ۱۰ جون ۱۶۳۹ء کو نہایت شان و شوکت کے ساتھ دار السلطنت میں داخل ہوا، قسطنطنیہ اس سے قبل سلاطین عثمانیہ کی ایسی فاتحانہ واپسی بارہا دیکھ چکا تھا، لیکن سلطان مراد رابع کا یہ داخلہ اس قسم کا آخری داخلہ تھا، اس کے بعد پھر کوئی سلطان فتوحات حاصل کر کے پایہ تخت میں نہیں آیا،

ایران سے صلح ۱۵ ستمبر ۱۶۳۹ء کو ایران اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلحنامہ مرتب ہوا، جس کے رو سے اریوان ایرانیوں کو واپس کر دیا گیا، لیکن بغداد اور اس کے ملحق علاقہ پر عثمانیوں کا قبضہ باقی رہا،

وفات ۹ فروری ۱۶۴۰ء کو مراد نے اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی، بغداد سے واپس آنے کے بعد سب سے پہلے اس نے سلطنت کی بحری قوت کو جو بہت کچھ کمزور ہو گئی تھی درست کرنے کی کوشش کی اور البانیا اور اس کے قریبی اضلاع میں بغاوت کی جو شورش اس کی ایشیائی مہم کے زمانہ میں پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کیا، لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی آیندہ جنگ وینس سے ہوگی، اور اس نے اس جنگ

کے لئے تیاریاں شروع بھی کر دی تھیں لیکن اسی دوران میں وہ بخار میں مبتلا ہو گیا، جس سے جانبر نہ ہو سکا، موت سے پہلے اُس نے اپنے بھائی ابراہیم کے قتل کا حکم دیا، ابراہیم مراد کے بعد سلطنت کا تنہا وارث تھا سلطانہ والدہ نے اس حکم کی تعمیل نہ ہونے دی، اور مراد کے پاس کہلا بھیجا کہ ابراہیم اُس کی خواہش کے مطابق قتل کر دیا گیا، مراد اس وقت حالتِ نزع میں تھا قتل کی اطلاع پاکر وہ مسکرایا اور پھر فوراً ہی ختم ہو گیا،

ذاتی اوصاف سلطان مراد رابع آلِ عثمان کا آخری جنگجو اور فاتح فرماں روا تھا، اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی اور صرف اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پا گیا، لیکن اس قلیل مدت اور نو عمری میں اس نے سلطنت عثمانیہ کو جس کا شیرازہ درہم و برہم ہو چکا تھا اور جو فوج کی بغاوت، صوبیداروں کے تمرد اور ہر شعبہ کے انتشار کے باعث تباہی و بربادی سے بالکل قریب پہنچ گئی تھی تمام خرابیوں اور فسادات سے پاک کر کے از سرِ نو ایک تازہ زندگی بخشدی، وہ حد درجہ متشدد اور سخت گیر تھا لیکن اُس کا تشدد اور اُس کی سخت گیری سلطنت کی بقا کے لئے ضروری تھی، اُس کا احتساب بعض اوقات ظلم کی حد تک پہنچ جاتا تھا اور سینکڑوں بے گناہ محض شبہہ کی بنا پر اُس کے حکم سے قتل کر دیئے گئے، لیکن ایسی حالت میں کہ تمام سلطنت میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی، اور چھوٹے سے لیکر بڑے تک حکومت کا کوئی شعبہ فساد سے پاک نہ تھا، ان بے گناہوں کا خون بھی بہر حال مفید ہی ثابت ہوا، یہ اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ فوج کی باغیانہ سرکشی یک قلم موقوف ہو گئی، عدالتوں میں انصاف ہونے لگا، رعایا کو لگان وصول کرنے والوں کی تعدی کی شکایت باقی نہ رہی اور ملک میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک امن عام اور خوشحالی ہی کے مناظر نظر آنے لگے،

ابراہیم

سنہ ۱۰۴۹ھ تا سنہ ۱۰۵۸ھ مطابق سنہ ۱۶۴۰ء تا سنہ ۱۶۴۸ء

سلطان مراد رابع کے بعد اُس کا بھائی ابراہیم جو سلطنت عثمانیہ کا تنہا وارث رہ گیا تھا، تخت نشین ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں اس نے مراد کے تمام کارناموں پر پانی پھیر دیا، آٹھ سال تک محل میں قید رہنے کی وجہ سے حکومت کی جو تھوڑی بہت اہلیت اس میں پہلے تھی وہ بھی جاتی رہی اور تخت پر بیٹھنے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو صرف عیش پرستی کی نذر کر دیا، قتل و خونریزی میں وہ بھی مراد ہی کی طرح بے باک تھا، لیکن مراد نے اپنے سامنے مفاد سلطنت کا جو مقصد رکھا تھا ابراہیم کے تشدد کو اس سے دور کا تعلق بھی نہ تھا، اُس کی سخت گیری تمامتر اپنے ذاتی اغراض کے لئے تھی، اس نے وہ تمام خزانہ جو مراد نے حسن تدبیر اور کفایت شعاری سے جمع کیا تھا حرم کے تعیشات پر صرف کر ڈالا وہ تمام برائیاں جو سلطنت کو برباد کر رہی تھیں اور جن کا استیصال مراد نے اپنی حکومت کا واحد مقصد قرار دیا تھا، ابراہیم کے عہد میں از سر نو پیدا ہو گئیں، اور نہایت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگیں، امور سلطنت میں حرم کا دخل پھر شروع ہو گیا، کچھ دنوں تک تو صدر اعظم قرہ مصطفےٰ نے ابراہیم کو سنبھالنے کی کوشش کی، اور مالیات کا انتظام درست

رکھنا چاہا لیکن سلطنت کے لئے اس کی خیر خواہی خود اس کے حق میں مہلک ثابت ہوئی اور اس کے مخالفوں نے حرم سلطانی کے ساتھ سازش کرکے ابراہیم کو اس کے قتل پر آمادہ کر دیا، قرہ مصطفیٰ کے قتل کے بعد اس کے جانشین سلطان زادہ پاشا نے ابراہیم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے ہر فعل کو سراہنا شروع کیا اور اسے یقین دلا دیا کہ چونکہ وہ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہے اس کا ہر قول و فعل حقیقۃً الہام ربانی کے مطابق ہوتا ہے، ابراہیم اب پہلے سے بھی زیادہ آزاد ہو گیا، مراد کا جمع کیا ہوا خزانہ جب اس کی ضروریات عیش پوری نہ کر سکا تو اس نے سلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدوں کو جس میں فوجی عہدے بھی شامل تھے فروخت کرنا شروع کیا، اور ان عہدوں پر وہی امیدوار مقرر کئے جانے لگے جو بڑی سے بڑی رقم پیش کر سکتے تھے، قدیم محصولوں کے علاوہ متعدد جدید محصول بھی عائد کئے گئے جنہیں سے بعضوں کے نام ہی سے ان کی مضحکہ خیز ضرورت ظاہر ہوتی ہے، ابراہیم کو خوشبو خصوصاً عنبر کا بہت شوق تھا، اس شوق کو پورا کرنے کے لئے اس نے ایک "عنبر ٹیکس" نافذ کیا، اسی طرح اسے سمور کا بھی بہت شوق تھا اور اس کے لئے بھی اس نے ایک خاص ٹیکس جاری کیا جس کا نام "سمور ٹیکس" تھا، اس نے سلطنت کے تمام والیوں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کے نام احکام جاری کئے کہ ایک معین تعداد سمور کی فراہم کرکے قسطنطنیہ روانہ کیجائے، یہ مطالبہ قاضیوں اور فوجی افسروں سے بھی کیا گیا، ان جدید محصولوں سے تمام سلطنت میں ایک عام برہمی پیدا ہو گئی، حرم کے اخراجات اور تعیشات کے لئے جب یہ رقمیں بھی ناکافی ثابت ہوئیں تو ابراہیم نے مختلف حیلوں سے بعض بڑے بڑے آدمیوں کی موروثی جائدادوں کو ضبط کرکے فروخت کر ڈالا، رعایا کے صبر و تحمل کا پیمانہ اب لبریز ہو رہا تھا، اور وہ

بغاوت کے لئے بالکل آمادہ تھی، ابراہیم نے اپنی بے راہ روی سے ہر طبقہ کو بیزار کر دیا تھا، فوج علمار کی جماعت اور پایہ تخت کا ہر طبقہ بغاوت کے لئے تیار تھا چنانچہ ابراہیم کو معزول کرنے کے لئے ایک جماعت نے جسے اکابر علمار کی حمایت حاصل تھی کوشش شروع کی، اس سازش کے بانیوں میں ینی چری فوج کے سردار پیش پیش تھے، باغیوں نے ابراہیم کے خلاف حسب ذیل فرد جرم قائم کی:-

"بادشاہ نے اپنے جبر و تعدی سے عالم عثمانی کو تباہ کر دیا ہے، عنان سلطنت عورتوں کے ہاتھوں میں ہے، خزانہ ان کے اخراجات پورا کرنے سے قاصر ہے، رعایا برباد ہوگئی ہے، کفار کی فوجیں سرحدی شہروں کا محاصرہ کر رہی ہیں، ان کے بحری بیڑے دردانیال کو روکے ہوئے ہیں"

ابراہیم کی معزولی غرض متفقہ طور پر ابراہیم کو تخت سے اتارنے کا فیصلہ کر لیا گیا، سلطانہ والدہ نے اس کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن بالآخر اسے بھی باغیوں کا مطالبہ منظور کرنا پڑا، چنانچہ ۱۸ رجب ۱۰۵۸ھ (۸ اگست ۱۶۴۸ء) کو فوجی سرداروں اور دارالسلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں نے شہزادہ محمد کو جس کی عمر اس وقت صرف سات سال کی تھی تخت پر بٹھا کر اطاعت کا حلف لیا، اور ابراہیم کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا،

ابراہیم کا قتل ابراہیم کو قید میں صرف دس روز گذرے تھے کہ "سپاہی" فوج میں اس کی حمایت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اس کے معزول کرنے والوں کو اندیشہ ہوا کہ وہ پھر تخت پر بٹھا دیا جائیگا، اس خطرہ کو ہمیشہ کے لئے دفع کرنے کی غرض سے انھوں نے مفتی اعظم سے یہ استفتا کیا:- کیا ایسے فرماں روا کو معزول اور قتل کرنا جائز ہے جو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ان لوگوں کو مامور نہیں کرتا جو ان کے اہل ہیں بلکہ ایسے لوگوں

کو مقرر کرتا ہے جو اُن عہدوں کو قیمتہً خریدتے ہیں، مفتی اعظم نے صرف ایک لفظ "ہاں" میں اس فتوی کا جواب دیا، اور اس کے بعد ابراہیم فوراً قتل کر دیا گیا،

ازف کی مہم | ابراہیم کا مختصر عہد حکومت اندرونی اختلال کے باوجود بیرونی فتوحات کی لحاظ سے اہمیت سے خالی نہ تھا، اس عہد میں دو معرکے پیش آئے اور دونوں میں آخرکار دولت عثمانیہ کو فتح حاصل ہوئی، ان میں سے ایک ازف کی مہم تھی، اور دوسری جزیرہ کریٹ کی، ازف کا شہر جو بحر ازف پر واقع ہے، اور تجارتی اور حربی دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ اہمیت رکھتا ہے ابراہیم کی تخت نشینی سے چار سال قبل روسی قزاقوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا، ابراہیم کے پہلے صدر اعظم قرہ مصطفی نے یہ دیکھکر کہ بحر اسود کے شمالی حصہ میں ترکی قوت کو برقرار رکھنے کی کس قدر ضرورت ہے ۱۶۴۱ء میں ازف کو اُن قزاقوں سے واپس لینے کے لئے ایک فوجی بیڑا روانہ کیا قزاقوں نے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ترکوں کو مجبوراً واپس ہونا پڑا، دوسرے سال پھر ایک فوج روانہ کی گئی، جس کے ساتھ خان کریمیا جو دولت علیہ کا باجگذار تھا، ایک لاکھ تاتاریوں کو لیکر شامل ہوگیا، قزاق اس زبردست فوج کا مقابلہ نہ کرسکے اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن روانہ ہونے سے پہلے اُنھوں نے اُس میں آگ لگادی، ترکوں نے اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ از سر نو تعمیر کیا، اور قلعہ بند کرکے اسلام پاشا کی ماتحتی میں چھبیس ہزار کا ایک دستہ متعین کر دیا،

رُوس سے آویزش | قزاق برابر ترکی علاقوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، جس کے جواب میں تاتاری بھی روسی علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، چونکہ قزاق سلطنت روس کی رعایا سمجھے جاتے تھے، اس لئے ان کے اس طرز عمل سے دولت علیہ اور روس کے درمیان اکثر شکایتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں، زار روس ان قزاقوں کے فعل سے اپنی بریت ظاہر کرتا تھا،

چنانچہ اُس نے ایک خط سلطان کو لکھ کر یہی معذرت پیش کی کہ قزاق اُس کے قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور اپنے جرائم کی سزا سے بچنے کے لئے اتنے دور دراز مقامات میں چلے گئے ہیں کہ حکومت روس کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا[1] مگر اُس کو دولت علیہ سے یہ گلہ تھا کہ وہ روس کے خلاف تاتاریوں کی حمایت کرتی ہے، آخر کار سلطان نے وعدہ کیا کہ اگر زار ان قزاقوں کو قابو میں رکھے گا اور خراج کی رقم حسب دستور قدیم خان کریمیا کو ادا کرتا رہے گا تو ترکی فوج روس کے خلاف تاتاریوں کی حمایت نہ کریگی، لیکن زار اور سلطان کے اس معاہدہ کا کوئی خاص اثر ان کی رعایا پر نہ پڑا، اور ابراہیم کے عہد میں قزاقوں اور تاتاریوں کی سرحدی جنگ کا سلسلہ برابر قائم رہا، سنہ ۱۶۴۶ء میں تاتاری ان قزاقوں کو روس کے جنوبی صوبوں میں دور تک بھگا لے گئے، اور وہاں سے تین ہزار قیدی گرفتار کر لائے، زار نے اس کے جواب میں ازف پر حملہ کرنے کے لئے ایک فوج روانہ کی، لیکن اس فوج کو کئی بار شکست ہوئی اور موسیٰ پاشا نے چار سو قیدی اور آٹھ سو روسیوں کے سر مالِ غنیمت کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیئے،

اسلام گرائی، خان کریمیا، روسیوں کا سخت دشمن تھا، اوائل سنہ ۱۶۴۸ء میں وہ پولینڈ اور روس کے علاقوں پر حملہ کر کے ان ملکوں کی چالیس ہزار رعایا کو گرفتار کر لایا، پولینڈ اور روس نے اپنے سفراء بابِ عالی میں بھیجے، اور خان کریمیا کے اس فعل کا تدارک چاہا، ابراہیم نے اپنے دو افسروں کو خان کے پاس بھیجا اور اُس کو لکھا کہ ان مسیحی قیدیوں کو قسطنطنیہ روانہ کر دو تاکہ وہ سفراء کے حوالہ کر دیئے جائیں، خان نے سلطان کا خط پڑھکر خفگی سے جواب دیا، "میں اور یہاں کے سب لوگ سلطان کے خادم ہیں، لیکن اہل روس محض

---

[1] کریسی جلد ۲ صفحہ ۲۱،

ظاہری طور پر صلح کے خواستگار ہیں، وہ صرف ہماری فتوحات سے دب کر صلح چاہتے ہیں، اگر ہم انھیں مہلت دیئے دیتے ہیں تو وہ اناطولیہ کے ساحلوں کو تاراج کر ڈالیں گے، میں ایک سے زائد بار دیوان عالی سے عرض کر چکا ہوں کہ قریبی علاقہ میں دو مضبوط مقامات ایسے تھے جن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی لیکن جن پر قبضہ کر لینا ہمارے لئے دانشمندی کی بات ہوتی، مگر اب روسیوں نے اُن مقامات پر قبضہ کر لیا ہے، اور اُنھوں نے وہاں بیس سے زیادہ فوجی چوکیاں بنالی ہیں، اگر ہم اس سال بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو وہ اکرمان پر بھی قبضہ کر لیں گے، اور پھر تمام مولڈیویا کو فتح کر لیں گے"۔ یہ جواب دے کر اُس نے سلطان کے قاصدوں کو قسطنطنیہ واپس کر دیا،

کریٹ کی مہم ۱۶۴۵ء میں ابراہیم نے ایک فوج کریٹ کی فتح کے لئے روانہ کی، یہ جزیرہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، وینس اور دولت عثمانیہ کے درمیان اُس وقت کوئی جنگ نہ تھی کریٹ پر حملہ کرنے کا سبب یہ ہوا کہ مالٹا کے چند بحری قزاقوں نے ترکی تجارتی جہازوں کے ایک بیڑے کو جو قسطنطنیہ سے مصر جا رہا تھا گرفتار کر لیا، اور اُسے لے کر کریٹ کے شمالی ساحل پر لنگر انداز ہوئے، ابراہیم اس واقعہ کی خبر پاکر نہایت برہم ہوا، اور اُس نے پہلے مالٹا ہی پر حملہ کرنا چاہا، لیکن اُس کے افسروں نے سمجھایا کہ مالٹا کی مہم جسے سلیمان اعظم جیسا طاقتور سلطان بھی سر نہ کر سکا آسان نہ ہوگی، اس لئے مالٹا کے بجائے کریٹ پر حملہ کرنا زیادہ مناسب ہے، کریٹ چونکہ بحر یونان کے مدخل کے قریب نیز قسطنطنیہ اور مغربی ولایتوں (تونس و الجزائر وغیرہ) کے راستہ پر واقع تھا، اس لئے اپنے موقع کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کے لئے بہ نسبت مالٹا کے زیادہ موزوں بھی تھا، پھر چونکہ مالٹا کے بحری قزاق عثمانی جہازوں کو گرفتار کر کے کریٹ ہی کے بندرگاہوں میں لنگر انداز ہوتے تھے، اس لئے جمہوریہ وینس کی گوشمالی بھی ضروری

تھی، چنانچہ ایک جنگی بیڑا ۳۰ اپریل ۱۶۴۵ء کو دردانیال سے روانہ ہوا، اعلان مالٹا پر حملہ کرنے کا ہوا لیکن امیر البحر کو خفیہ ہدایتیں کریٹ کے متعلق دی گئیں، ۲۴ جون کو یہ بیڑا کریٹ کی مغربی بندرگاہ کانیا (Canea) میں پہنچ گیا جمہوریہ وینس کو سلطان کو اصلی ارادہ کی اطلاع پہلے سے ہو چکی تھی، اس لئے کریٹ کے تمام قلعے مدافعت کے لئے تیار تھے، جزیرہ کی مقامی فوجیں اکٹھا کر لی گئی تھیں، اور وینس سے کمک بھی آگئی تھی، پھر بھی ساحل کی حفاظت کے لئے یہ فوجیں ناکافی ثابت ہوئیں، اور ترکوں نے آسانی کے ساتھ کانیا پر قبضہ کر لیا، دوسرے سال انھوں نے ریٹینو (Retino) کو بھی لے لیا، ان دونوں شہروں پر قبضہ کرنے بعد عثمانی فوج جزیرہ میں داخل ہوئی اور پھر ۱۶۴۸ء میں کریٹ کے پایہ تخت کینڈیا (Candia) کا محاصرہ شروع ہوا، جو تقریباً اکیس سال تک جاری رہا، اہل وینس نے کینڈیا کے بچانے کی حتی المقدور پوری کوشش کی، انتقاماً انھوں نے لیمناس (Lemnos) اور ٹینڈاس (Tenedos) کے جزیروں پر جو عثمانی مقبوضات تھے قبضہ کر لیا اور قسطنطنیہ کے ساحلی علاقوں پر کئی بار چھاپے مارے لیکن ان تمام تدبیروں کے باوجود وہ ترکوں کو کینڈیا کے محاصرہ سے ہٹا نہ سکے، اور سلطان محمد رابع کے عہد میں یہ شہر فتح ہوگیا اور کریٹ کا جزیرہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا،

محمد رابع

۱۰۵۸ھ تا ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۴۸ء تا ۱۶۸۷ء

تخت نشینی کے وقت محمد رابع کی عمر صرف سات سال کی تھی، اُس نے اُنتالیس سال حکومت کی، ابتدائی آٹھ سال سلطنت کے لئے ہر طرح کے اندرونی و بیرونی خطرات سے پُر تھے، سلطان کی نوعمری کے زمانہ میں عنانِ حکومت حرم کے ہاتھ میں تھی، اس سے بڑھکر بدقسمتی یہ تھی کہ خود حرم میں دو جماعتیں ایک دوسرے کی حریف تھیں، ایک کی سردار سابق سلطان ابراہیم کی والدہ تھی، دوسری کی سیادت سلطانِ وقت کی والدہ کو حاصل تھی، سلطنت کا شیرازہ ان حریفوں کی کشمکش سے پراگندہ ہو رہا تھا، فوج میں دونوں جماعتوں کے حامی موجود تھے، اور قسطنطنیہ کی سڑکوں پر اکثر بدامنی اور کشت و خون کے مناظر پیش آتے رہتے تھے، سلطنت کے مختلف صوبوں میں بھی تقریبًا یہی حالت تھی، بغاوت اور سرکشی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، ۱۶۴۹ء میں ایک شخص قاطرجی اوغلی نے ایشیائے کوچک میں علمِ بغاوت بلند کیا، کورجی بنی نامی ایک دوسرا باغی بھی اُس کے ساتھ ہو گیا، اور دونوں نے مل کر احمد پاشا والی اناطولیہ کو شکست دیدی، اس کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے لیکن اثنائے راہ میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا، اور دونوں ایک دوسرے سے علحدہ

ہو گئے، عثمانی فوج نے کورجی بنی کو شکست دیکر اُسے قتل کردیا، قاطرجی اوغلی نے بھی شکست کھائی لیکن سلطان نے اُسے معاف کر کے کرمانیہ کا والی بنادیا، اور یہ بغاوت ختم ہوئی، تاہم سلطنت کے اور حصوں میں جو شورش پیدا ہوگئی تھی وہ بدستور جاری رہی، پایۂ تخت میں یہ صورت بہت زیادہ نمایاں تھی، آخر کار حرم کی سازشیں سابق سلطانہ والدہ کی قتل پر ختم ہوئیں

آسٹریا کے لئے حکومت عثمانیہ کی یہ پراگندگی نہایت مفید تھی اور وہ اس کے اختلال سے فائدہ اُٹھا کر بآسانی ہنگری کو واپس لے سکتی تھی لیکن جنگ سی سالہ نے اس کو اتنا چور کردیا تھا کہ وہ اس اقدام کی جرأت نہ کر سکی، البتہ جمہوریہ وینس سے جنگ کا سلسلہ جس کا آغاز کریٹ کے حملہ سے ہوا تھا، برابر جاری رہا، اور جمہوریہ کے ایک جنگی بیڑے نے دردانیال کے قریب ایک عثمانی بیڑے کو شکست دے کر جزائر لیمناس اور ٹینیڈاس پر قبضہ کرلیا، اس نے دردانیال کے دہانہ کی ناکہ بندی بھی کردی جس کی وجہ سے قسطنطنیہ کے سامان رسد کا راستہ بند ہوگیا اور دارالسلطنت میں سخت گرانی پھیل گئی، ان بیرونی حملوں کے علاوہ سلطنت کے اندرونی حصہ میں ہر طرح کی بے امنی اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، خوش قسمتی سے عین اس وقت جبکہ دولت علیہ ایک نہایت نازک دور سے گذر رہی تھی اور بظاہر اس کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی، سلطانہ والدہ نے صدر اعظم کے عہدہ پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا جس نے پانچ ہی سال کے اندر تمام فوجی اور ملکی شعبوں کی کامل اصلاح کر کے سلطنت کو نہ صرف تباہی سے بچالیا، بلکہ اُس میں ازسرنو وہ طاقت وسطوت بھی پیدا کردی، جسے سلطان مراد رابع کے بعد دولت علیہ تقریباً تمامتر کھو چکی تھی،

محمد کوپریلی صدر اعظم محمد کوپریلی کا آبائی وطن البانیا تھا، مگر اُس کا دادا ایشیائے کوچک کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوپری میں آکر آباد ہو گیا تھا، محمد کو ابتدائی تعلیم بھی نصیب نہ ہوئی

اور ابھی وہ لڑکا ہی تھا کہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے اسے گھر سے نکلنا پڑا، حسنِ اتفاق سے اس کو سلطان کے مطبخ میں نوکری مل گئی، وہاں اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے اس نے بہت جلد ترقی کرلی، اور کچھ عرصہ کے بعد شاہی مطبخ کا خاص باورچی ہوگیا، لیکن حکومت کے بعض اہلِ نظر نے اس نوجوان کی قابلیت کا اندازہ کرکے اسے باورچی خانہ سے نکالا اور زیادہ معزز خدمات اس کو سپرد کیں، ہر جگہ اسنے اپنی غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا، چنانچہ آخر میں وہ یکے بعد دیگرے دمشق، طرابلس اور یروشلم کے صوبوں کا والی مقرر ہوا، اور اُن میں سے ہر صوبہ میں اس نے ایک عادل، مضبوط اور نرم دل حاکم کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، پھر جب سلطان محمد رابع کی تخت نشینی کے بعد سلطنت کے ہر حصہ اور حکومت کے ہر شعبہ میں شورش اور ابتری بڑھنے لگی تو صدارتِ عظمیٰ کی ذمہ داریوں کو تفویض کرنے کے لئے سلطانہ والدہ کی نظر انتخاب بھی محمد کوپریلی ہی پر پڑی، چنانچہ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں محمد کوپریلی نے دولت عثمانیہ کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اُس وقت اس کی عمر ستر سال کی تھی، چونکہ وہ بوڑھا اور لکھنے پڑھنے سے بالکل نابلد تھا، اس لئے علما اور اعیانِ سلطنت نے اس کے تقرر کے خلاف احتجاج کیا، لیکن دمشق، طرابلس اور یروشلم کی ولایت کے زمانہ میں کوپریلی نے اپنی قابلیت کا جو ثبوت دیا تھا وہ سلطانہ والدہ کے انتخاب کی پرزور تائید کررہا تھا، تاہم اس جلیل القدر عہدہ کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے پہلے محمد کوپریلی نے سلطانہ والدہ سے جو نوعمر سلطان کی نمایندہ تھی چند شرطیں بحلف منظور کرالیں، پہلی شرط یہ تھی کہ سلطان اُسکی تمام کارروائیوں کو جو وہ بحیثیت صدر اعظم عمل میں لائیگا، بغیر کسی بحث کے منظور کرلیا کریگا، دوسری یہ تھی کہ اُسے تمام عہدوں کے تقرر اور امتیازات کے عطا کرنے میں پورا اختیار حاصل ہوگا، تیسری شرط یہ تھی کہ سلطان کو اس پر کامل اعتماد رہیگا، اور اُسکے خلاف ہر شکایت کو وہ فوراً مسترد کردیگا،

ان غیر محدود اختیارات کے ساتھ محمد کوپریلی نے سلطنت کی اصلاح کا کام شروع کیا اور ہر شعبہ کی خرابیوں کو اسی سختی کے ساتھ دور کیا جو مراد رابع کے طریق اصلاح کی نمایاں خصوصیت تھی، غیر متدین عہدہ دار، غیر منصف قضاۃ، فوج کے سرکش سردار و سپاہی سب کے سب فوراً قتل کر دیئے گئے، یہی حشر اُن لوگوں کا ہوا جو کوپریلی کے خلاف سازش کرتے ہوئے پائے گئے، یا جن پر سازش کا شبہہ بھی ہوا، قسطنطنیہ میں درویشوں کی ایک جماعت نے شورش برپا کر رکھی تھی، کوپریلی نے اُن سب کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا، اُن میں سے ایک درویش نے جس کا اثر عوام پر بہت زیادہ تھا، کوپریلی کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا چاہا، اُس نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا، اسی طرح اُس نے کلیسائے یونان کے بطریق اعظم کو بھی جو درپردہ امیر ولاچیا کو بغاوت کے لئے اُبھارنا چاہتا تھا، گرفتار کر کے سولی دیدی، اُس کی باریک بیں نگاہ سے کوئی بے عنوانی اور کسی سازش کی خفیہ سے خفیہ تیاری بھی چھپی نہ رہتی، اس کے جاسوس سلطنت کے بعید ترین حصوں میں بھی نہایت سرگرمی سے کام کرتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے اس کی ہیبت صوبیداروں اور فوج کے بڑے سے بڑے عہدہ داروں سے لے کر حکومت کے ادنیٰ ملازموں تک کے دلوں میں یکساں طور پر بیٹھی ہوئی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ اسکی پنجسالہ صدارت میں چھتیس ہزار آدمی اُسکے حکم سے قتل کئے گئے با جالی کے خاص جلاد ذوالفقار کا بیان ہے کہ خود اسکے ہاتھ سے چار ہزار سے زیادہ آدمی پھانسی پاکر باسفورس میں پھینک دیئے گئے۔

محمد کوپریلی کا یہ تشدد بادی النظر میں نہایت ظالمانہ معلوم ہوتا ہے لیکن سلطنت میں جو شورش اور بغاوت پھیلی ہوئی تھی اُس کا تدارک تشدد کے بغیر ممکن ہی نہ تھا، یہ اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ صرف پانچ سال کی مدت میں ہر طرف امن و امان اور عدل و انصاف دکھائی دینے لگا، تمام شورشیں دیکھتے دیکھتے فرو ہوگئیں، فوج کی سرکشی جاتی رہی اور سلطنت کے ہر شعبہ کا نظام درست ہوگیا،

محمد کوپریلی نے نہ صرف سلطنت کے اندرونی نظم و نسق کو درست کیا، بلکہ بیرونی حملوں کو بھی روکا، اس نے عثمانی بیڑے کو از سر نو تعمیر کرایا جس کی وجہ سے بحر ایجین میں دولت علیہ کی سطوت پھر قائم ہو گئی، اس نے وینس کے جہازوں کو شکست دے کر جزائر لیمناس و ٹینڈاس واپس لے لئے، اور کینڈیا کا محاصرہ جو محمد رابع کے ابتدائی عہد میں فوج کی سرکشی کے باعث کسی حد تک کمزور ہو گیا تھا، پھر پوری شدت کے ساتھ جاری کرایا،

۱۰۷۲ھ (۱۶۶۱ء) میں محمد کوپریلی نے وفات پائی، انتقال سے پہلے اُس نے سلطان اور سلطانہ والدہ سے اپنے لڑکے احمد کوپریلی کو اپنا جانشین نامزد کرا لیا تھا، مرتے وقت بھی وہ سلطنت کی بہبودی سے غافل نہ تھا، چنانچہ اُس نے سلطان سے مندرجۂ ذیل چار نصیحتوں کے خاص طور سے کاربند رہنے کی تاکید کی :-

(۱) عورتوں کا مشورہ کبھی نہ سنا جائے (۲) کسی رعیت کو حد سے زیادہ دولتمند نہ ہونے دیا جائے (۳) سلطنت کا خزانہ ہمیشہ پُر رکھا جائے (۴) سلطان خود ہمیشہ گھوڑے کی پیٹھ پر رہے، اور فوج کو ہمیشہ حرکت میں رکھے،

احمد کوپریلی محمد کوپریلی کی وفات کے وقت سلطان محمد رابع بیس سال کا ہو چکا تھا، اور اب وہ عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا لیکن اُسے شکار کا بیحد شوق تھا، اور اسی میں اپنا تمام وقت صرف کرتا تھا، اُس نے سلطنت کا سارا انتظام نئے صدر اعظم احمد کوپریلی کے سپرد کر دیا تھا، اور اس پر پورا اعتماد رکھتا تھا، ۱۶۶۱ء سے لے کر اپنی وفات (۱۶۷۶ء) تک احمد کوپریلی ہی دراصل سلطنت عثمانیہ کا فرماں روا تھا، وہ اپنی لیاقت، اپنے تدبر اور اپنی عظمت کے لحاظ سے دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ممتاز صدر اعظم خیال کیا جاتا ہے، تمام عثمانی اور مسیحی مورخین کو اس کی حیرت انگیز قابلیت پر اتفاق ہے، تقرر کے وقت اُس کی عمر صرف چھبیس سال کی تھی، محمد کوپریلی نے اُسے بہترین تعلیم دلائی تھی،

اور انتظامِ سلطنت کی تعلیم خود اپنی نگرانی میں دی تھی، نیز ایک صوبہ کی ولایت پر مامور کرکے صدارتِ عظمیٰ کی ذمہ داریوں کے لئے بھی اسے پہلے سے تیار کر دیا تھا، ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے بھی احمد کوپریلی نہایت ممدوح تھا، اُس کی خوش خلقی اور منکسر مزاجی خاص طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی، وہ شرعی احکام کی پابندی نہایت سختی سے کرتا اور اُس کی زندگی اسلامی زندگی کا ایک قابلِ تقلید نمونہ تھی، جس کا اثر اس کے ہمعصر وزیروں اور عہدہ داروں پر بھی پڑا، اس کے انہی محاسن کی بنا پر ترک اُسے فاضل احمد کہتے تھے،

احمد کوپریلی بھی اپنے والد کی طرح ایک مضبوط قوتِ ارادی اور پختہ عزم رکھتا تھا، تاہم اس میں وہ تشدد نہ تھا جو محمد کوپریلی کی وزارت کی خصوصیت تھی، احمد فطرۃً زیادہ حلیم اور نرم دل تھا، تقرر کے بعد ایک سال تک تو اُس نے سختی جاری رکھی لیکن پھر اسکی ضرورت باقی نہیں رہی، اور سلطنت کا انتظام بغیر کسی سختی کے ہوتا رہا، اسے رعایا کا بہت زیادہ خیال تھا، اُن کی بہبودی کے لئے اُس نے وہ سب کچھ کیا جو اُس کے امکان میں تھا خصوصاً اُس نے محصولوں کا بار بہت ہلکا کر دیا، سپاہی جاگیرداروں کی سخت گیری اور پاشاؤں نیز مقامی عہدہ داروں کے مظالم سے رعایا بہت پریشان تھی، احمد نے ان مصیبتوں سے بھی اُسے نجات دلائی، کچھ عرصہ سے مسیحی کلیساؤں کی تعمیر پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں، احمد نے ان رکاوٹوں کو بالکل دور کر دیا، باوجود اس کے کہ اُسے مختلف ملکوں سے جنگ کرنی پڑی، اُس نے خزانہ کو ہمیشہ پُر رکھا، اُس کی غیر معمولی قابلیت کا اندازہ فوجی مہمات سے زیادہ اس کے ملکی انتظامات سے ہوتا ہے، اُس کی حربی لیاقت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی، اور اُس نے متعدد اہم فتوحات سے سلطنت کو وسعت دی تاہم اُسے دو بار سخت شکست اُٹھانی پڑی جس سے دولتِ علیہ کی عظمت کو خاصہ صدمہ پہنچا، پہلی

اہم شکست آسٹریا کے مقابلہ میں پیش آئی، اور دوسری پولینڈ کے مقابلہ میں،

آسٹریا سے جنگ

۱۶۶۳ء میں آسٹریا سے لڑائی چھڑ گئی، یہ جنگ اُن مناقشات کا نتیجہ تھی جو ڈیڑھ صدی سے ہنگری اور ٹرانسلونیا میں جاری تھے، دو سال پیشتر سے آسٹریا اور دولت عثمانیہ کے حامیوں کے درمیان ان صوبوں میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہو رہی تھیں جنمیں دونوں سلطنتوں کے فوجی افسر جو سرحدی علاقوں پر متعین تھے حصہ لیتے رہے ۱۶۶۳ء میں احمد کوپریلی ایک زبردست فوج کے ساتھ آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ ہوا، اُس نے بلغراد پہونچ کر دریائے ڈینوب کو عبور کیا، اور پھر شمال میں نوہزل کی طرف بڑھا، یہ قلعہ یورپ کے سنگین ترین قلعوں میں تھا، اور آسٹریا کو اس کی مضبوطی پر پورا بھروسہ تھا لیکن پانچ ہفتہ کے محاصرہ کے بعد ۲۵ صفر ۱۰۷۴ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۶۶۳ء کو محصورین نے ہتھیار ڈالکر قلعہ عثمانیوں کے سپرد کر دیا، نوہزل کی فتح کے بعد احمد کوپریلی نے متعدد دوسرے قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا، اس کے بعد موسم سرما گذارنے کے لئے وہ بلغراد واپس گیا،

دوسرے سال مئی میں وہ پھر نوہزل آیا، اور وہاں سے دریائے مور کو عبور کر کے ۷ جولائی ۱۶۶۴ء کو قلعہ سرینوار فتح کر لیا، ۲۶ جولائی کو وہ کومورن (Komorn) پہنچا جو ہنگری اور اسٹاریا کی سرحد پر دریائے راب کے لب ساحل واقع تھا، اگر وہ اس دریا کو عبور کر لیتا تو ویانا کا راستہ صاف ہو جاتا، لیکن آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں اُس کی راہ میں حائل تھیں، آسٹریا کی مدد کے لئے کاؤنٹ کولینی (Coligny) کی سرکردگی میں فرانس کے مبارزین بھی آ گئے تھے، مسیحی فوج کا سپہ سالار کاؤنٹ مونٹے کوکولی (Montecuculi) تھا جو اپنے وقت کا نہایت ممتاز جنرل تھا، عیسائیوں کی تعداد عثمانیوں سے بہت کم تھی، لیکن جنگ سیرسینز (۱۵۹۶ء) کے بعد سے

جب کہ عثمانیوں نے آسٹریا کو بُری طرح شکست دی تھی، آسٹریا اور ہنگری کی فوجوں نے اپنی تنظیم اور اسلحوں میں بہت زیادہ ترقی کرلی تھی، برخلاف اس کے عثمانیوں کے فوجی نظام میں اندرونی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں، اور وہ اسلحوں کی ترقی میں عیسائی حکومتوں کا ساتھ نہ دے سکے تھے، جنگِ سی سالہ کے دوران میں فن حرب میں بعض اہم اصلاحیں ہوگئی تھیں، جن سے عثمانی فوجیں ناآشنا تھیں، اس لحاظ سے اگرچہ مسیحی فوج کی تعداد عثمانی فوج سے بہت کم تھی، تاہم فنی حیثیت سے وہ اپنے مقابل پر فوقیت رکھتی تھی،

جنگ سینٹ گاتھرڈ

۸ محرم ۱۰۷۵ھ (یکم اگست ۱۶۶۴ء) کو دونوں فوجیں خانقاہ سینٹ گاتھرڈ (St Gotthard) کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، عثمانیوں کو اپنی کثرتِ تعداد کے باوجود شکست ہوئی، اور اون کے دس ہزار آدمی مارے گئے، آسٹریا کی فوجوں کو بھی اتنا کافی نقصان پہنچا کہ وہ ترکوں کا تعاقب نہ کرسکیں، اور احمد کوپریلی اپنی بقیہ فوج کو آسانی کے ساتھ واپس لے آیا،

اس جنگ کی اہمیت

یہ جنگ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ پہلی زبردست شکست تھی، جو عثمانیوں کو آسٹریا کے ہاتھوں پہنچی، جنگ موہاکز ۱۵۲۶ء کے بعد سے اس وقت تک آسٹریا کی فوجوں پر عثمانیوں کی فوقیت مسلم تھی، جنگ سینٹ گاتھرڈ نے دولت علیہ کی اس دیرینہ فوقیت کو صدمہ پہنچایا، اور یورپ کو پہلی بار معلوم ہوا کہ عثمانیوں کی فوجی قوت مائل بہ انحطاط ہے، ترک سپاہیوں کی ذاتی شجاعت میں اب بھی کوئی فرق نہ تھا، لیکن اون کے اسلحے اور جنگ کے طریقے اس وقت بھی وہی تھے جو سلیمان اعظم کے عہد میں رائج تھے، فن حرب میں وہ یورپ کی ترقی یافتہ فوجوں سے پیچھے پڑ گئے تھے، یہی اون کی شکست کا اصلی سبب تھا،

صلحنامہ واسوار

سینٹ گاتھرڈ کی شکست کے باوجود جو صلحنامہ بیس سال کے لئے واسوار میں مرتب ہوا، اس کی دفعات بحیثیت مجموعی دولت علیہ کے موافق تھیں، اور وہ دراصل صلحنامہ سیلواتورک کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، اس صلحنامہ کے رو سے طے پایا کہ اہل آسٹریا اور ترک دونوں ٹرانسلوینیا کو خالی کر دیں اور اپافی (Apafy) کو جس کی حمایت باب عالی نے کی تھی وہاں کا فرماں روا بنایا جائے، اور وہ سلطان کو خراج ادا کرتا رہے، یعنی ٹرانسلوینیا پر سلطان کی سیادت تسلیم کر لی گئی، سرنوار اور نوہزل کے قلعوں پر ترکوں کا قبضہ قائم رکھا گیا، ہنگری کی سات ولایتوں میں سے تین آسٹریا کو دیدی گئیں اور چار سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں، اس کے علاوہ شہنشاہ آسٹریا نے دو لاکھ فلورن تاوان جنگ سلطان کو ادا کرنا منظور کیا،[1] یہ صلحنامہ دولت علیہ کے لئے ہر طرح قابل اطمینان تھا، احمد کوپریلی نے میدان جنگ میں زبردست شکست کھانے کے بعد بھی سلطنت کے مقبوضات میں اضافہ کر دیا،

کینڈیا کی فتح

۱۶۶۶ء میں احمد کوپریلی کینڈیا کی مہم پر روانہ ہوا جس کا محاصرہ بیس سال سے جاری تھا، اہل وینس موروسینی (Morosini) کی قیادت میں جو بعد میں فاتح موریا کے لقب سے مشہور ہوا، نہایت جانبازی کے ساتھ کینڈیا کی مدافعت کر رہے تھے، احمد کوپریلی کے پہنچ جانے کے بعد محاصرہ کی شدت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی، لیکن اسی کے ساتھ محصورین کا جوش و استقلال بھی بڑھتا گیا، تاہم جب انھوں نے یہ دیکھا کہ زیادہ دنوں تک مقابلہ نہ کر سکیں گے تو ایک بہت بڑی رقم احمد کوپریلی کے سامنے پیش کر کے درخواست کی کہ وہ محاصرہ اٹھا کر واپس چلا جائے، صدر اعظم نے جواب دیا "ہم لوگ روپیہ کا کاروبار نہیں کرتے، ہم کینڈیا کو فتح کرنے کی غرض سے جنگ کر رہے ہیں، اور

۱؎ میریٹ ص ۱۱۶

کسی قیمت پر اسے نہ چھوڑیں گے"۔ چنانچہ محاصرہ اسی سختی کے ساتھ جاری رہا، ۱۶۶۹ء میں ایک فرانسیسی جنگی بیڑا جس میں چھ ہزار سپاہی اور فرانس کے طبقہ امراء کے بہترین مبارز تھے، کینڈیا کی مدد کے لئے پہنچا، اس کے بعد ہی پوپ اور مبارزین مالٹا کی کمک بھی آگئی، اس متحدہ بیڑے نے جس میں ستر جہاز تھے عثمانیوں پر سمندر کی جانب سے گولے برسانا شروع کئے، اور محصورین سامنے سے گولہ باری کرتے رہے لیکن اس دوطرفہ حملہ کے باوجود احمد کوپریلی نے کوئی قدم پیچھے نہ ہٹایا، آخر کار مجبور ہو کر موروسینی نے ۶ ستمبر ۱۶۶۹ء کو باعزت شرائط کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے، اور یہ محاصرہ جو تقریباً اکیس[2] سال سے جاری تھا ختم ہوا، کریٹ کے پورے جزیرہ پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا، چند دنوں کے بعد جمہوریہ وینس اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلحنامہ ہو گیا جس کے رو سے وینس نے کریٹ کا سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا جانا تسلیم کر لیا، البتہ ساحل کے تین چھوٹے چھوٹے بندرگاہوں پر تجارتی اغراض کے لئے وینس کا قبضہ باقی رکھا گیا، فتح کے بعد احمد کوپریلی کئی ماہ تک کینڈیا میں مقیم رہا، اور وہاں کی حکومت کا نظم و نسق درست کر کے قسطنطنیہ واپس آیا،

پولینڈ سے جنگ احمد کوپریلی کی تیسری مہم خاص توجہ کی مستحق ہے، کیونکہ اسی سے اس نزاع کی ابتدا ہوتی ہے جس کا سلسلہ دولت عثمانیہ اور روس کے درمیان حال تک قائم رہا، ۱۶۷۰ء میں اوکرین کے قزاقوں نے جو پولینڈ کی رعایا تھے حکومت سے بعض حقوق کا مطالبہ کیا، یہ مطالبہ نامنظور کر دیا گیا، اور ان کو زیر کرنے کے لئے حکومت پولینڈ نے ایک فوج جنرل سوبیسکی (Sobieski) کی سرکردگی میں اوکرین روانہ کی، قزاقوں نے اپنے سردار ڈورسینکو (Dorescenko) کے علم

کے نیچے اس فوج کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا، لیکن آخرکار اُنھوں نے یہ محسوس کیا کہ دولت عثمانیہ کی مدد کے بغیر وہ کامیاب نہ ہو سکیں گے، چنانچہ ڈورسینسکو ۱۶۷۲ء میں قسطنطنیہ آیا اور اپنی قوم کی طرف سے باب عالی میں نذر اطاعت پیش کر کے سرپرستی کی استدعا کی، سلطان نے اس کی درخواست قبول کی، اور اوکرین کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ قرار دیکر اُسے وہاں کا سنجق بے مقرر کر دیا، ساتھ ہی خان کریمیا کو حکم بھیجا کہ قزاقوں کی مدد کرے، اور چھ ہزار کا ایک ترکی دستہ بھی اُن کی مدد کے لئے اوکرین روانہ کیا، باب عالی کی ان کارروائیوں کے خلاف پولینڈ نے احتجاج کیا، زار روس نے بھی سلطان کو دھمکی دی کہ اگر اُس نے قزاقوں کی مدد کی تو روس پولینڈ کی حمایت کریگا، صدر اعظم نے اس دھمکی کی پروانہ کی اور پولینڈ اور روس دونوں کو یہ جواب دیا کہ اوکرین کی نسبت باب عالی کا فیصلہ اپنی جگہ پر قائم رہیگا، احمد کوپریلی نے خود اپنے قلم سے ایک خط سفیر پولینڈ کو لکھا جس میں اوکرین کے قزاقوں کی مظلومیت دکھا کر یہ بتایا کہ جب اُنھوں نے دولت عثمانیہ کے دامن میں پناہ لے لی تو ان کی حمایت کرنا باب عالی پر فرض ہو گیا، غرض ۱۶۷۲ء میں پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس کا سلسلہ چار سال تک قائم رہا،

صلحنامہ بوزاکس اس مہم پر احمد کوپریلی کے ساتھ سلطان محمد رابع خود بھی روانہ ہوا، وہ فوج لیکر پوڈولیا میں داخل ہوا، جو پولینڈ کا ایک صوبہ تھا، احمد کوپریلی نے پوڈولیا کے پایہ تخت کمینیک (Kaminiec) کا محاصرہ کر لیا، اس قلعہ کی تسخیر اس وقت تک ناممکن خیال کی جاتی تھی لیکن صرف نو روز کے محاصرہ کے بعد ۲۶ راگست ۱۶۷۲ء کو ترکوں نے اسے فتح کر لیا، ورستمبر کو دوسرا مشہور اور مضبوط شہر لمبرگ (Lemberg) بھی فتح ہو گیا، ان فتوحات کے بعد مائیکل شاہ پولینڈ نے صلح کی درخواست کی اور صلحنامہ بوزاکس

(Bucsaco) پر دستخط کرکے پوڈولیا اور اوکرین کے صوبے سلطنت عثمانیہ کے حوالے کر دیئے، اور دو لاکھ بیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا، صلح کے بعد محمد رابع ایک فاتح کی حیثیت سے ادرنہ کو واپس ہوا،

تجدید جنگ — لیکن یہ صلح بالکل عارضی ثابت ہوئی، سوبیسکی اور پولینڈ کے دوسرے امراء نے اُسے یک قلم مسترد کر دیا اور از سر نو جنگ کی تیاریاں کرنے لگے، چنانچہ ۱۶۷۳ء میں احمد کوپریلی پولینڈ کی سرکوبی اور زار روس کی تنبیہہ کے لئے جس نے گذشتہ جنگ میں پولینڈ کو مدد پہنچائی تھی، پھر روانہ ہوا لیکن ۱۱ر نومبر ۱۶۷۳ء کو سوبیسکی نے دفعۃً ترکی لشکر پر جو خوزیم (Khoczim) کے قریب خیمہ زن تھا چھاپا مارا اور کوپریلی کو سخت شکست دی، ولاچیا اور مولڈیویا کے فرماں رواؤں نے عین وقت پر غداری کی اور اپنے دستے لے کر سوبیسکی کی فوج سے مل گئے، دوسرے سال باب عالی نے پھر ایک فوج اوکرین کی مہم پر بھیجی لیکن سوبیسکی کے مقابلہ میں جس کی حمایت سلطنت روس اعلانیہ طور پر کر رہی تھی اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی، اور پولینڈ اور روس کی متحدہ فوج کے سامنے اسے پسپا ہونا پڑا، ۱۶۷۴ء میں شاہ مائکل کی وفات پر سوبیسکی پولینڈ کے تخت پر بٹھایا گیا، اور دوسرے ہی سال اُس نے لمبرگ میں ترکوں کو ایک اور زبردست شکست دی مگر اس شکست کے باوجود ترکوں کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا، اور بالآخر سوبیسکی کو زرانہ (Zurawna) میں شکست دیکر انھوں نے پوڈولیا کے پورے صوبہ پر قبضہ کر لیا،

صلحنامہ زرانہ — اب سوبیسکی کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی، صلحنامہ زرانہ (۲۷ راکتوبر ۱۶۷۶ء) میں کمینیک اور پوڈولیا پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا اور تمام اوکرین علاوہ چند مقامات

کے سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت آگیا،

احمد کوپریلی کی وفات اس صلح کے تین ہی روز بعد احمد کوپریلی نے وفات پائی، اگرچہ اسے آسٹریا اور پولینڈ کے مقابلہ میں سینٹ گاتھرڈ اور خوزیم میں فاش شکستیں ہوئی تھیں تاہم اس نے خوش انتظامی اور حسن تدبیر سے ان کی پوری تلافی کردی اور پوڈولیا، کریٹ نوہزل اور سرنلوار (ہنگری) کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کرکے اس کی وسعت میں اہم اضافے کردیئے، ان بیرونی فتوحات کے علاوہ اس نے سلطنت کی اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کو بھی ختم کردیا، جہاں تک سلطنت کے حسن انتظام، عدل و انصاف نیز مالی اور فوجی قوت کا تعلق ہے، کسی وزیر نے اس سے زیادہ کارنامے نہیں دکھائے اور یہ سب کچھ اس نے بغیر کسی ظلم و تشدد کے کیا، اس نے رعایا کے تمام طبقوں کی سرپرستی کی اور ہر مذہب و ملت کے پیروؤں کے ساتھ یکساں طور پر عدل و انصاف برتا، عہد و پیمان کی پابندی اس کا ایک مخصوص وصف تھا، وہ علوم و فنون کا بہت بڑا مربی تھا، اپنی بے نظیر لیاقت اور کارگذاریوں کے لحاظ سے وہ سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا وزیر خیال کیا جاتا ہے،

قرہ مصطفےٰ احمد کوپریلی کی وفات پر توقع کی جاتی تھی کہ سلطان اس کے بھائی مصطفےٰ کوپریلی کو جو مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا، اور جس میں احمد کے بہتیرے اوصاف پائے جاتے تھے صدر اعظم مقرر کریگا، لیکن اس توقع کے خلاف اس نے اپنے داماد قرہ مصطفےٰ کو اس عہدہ پر مامور کیا، یہ انتخاب سلطنت کے لئے حد درجہ مضرت رساں ثابت ہوا، قرہ مصطفےٰ کا نصب العین تمام تر اپنی ذاتی ترقی تھا، اس میں وہ اہلیت مطلق نہ تھی جو دولت عثمانیہ کے وزیر اعظم میں ہونی چاہیئے تھی، بایں ہمہ اس کے حب جاہ اور ہوس عظمت

کی کوئی انتہا نہ تھی، دولت کا وہ بے حد حریص تھا، چنانچہ سلطنت کے بڑے بڑے عہدے اور امتیازات معمولی قیمتوں پر فروخت کر دیتا تھا، اس طرح اُس نے بہت زیادہ دولت جمع کر لی، تھوڑے ہی دنوں میں اس کی سختیوں کی وجہ سے رعایا پریشان ہو گئی، اسی ہوس عظمت کے ماتحت جو اس کے مزاج کی نمایاں خصوصیت تھی وہ آسٹریا پر حملہ کر کے ویانا کی فتح کا حوصلہ رکھتا تھا، کیونکہ ویانا کی فتح کے بعد وہ اپنے لئے دریائے ڈینوب اور دریائے رہائن کے درمیانی علاقوں کی فرماں روائی حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن آسٹریا کی طرف بڑھنے سے پہلے روس سے جنگ چھڑ گئی، جس میں قرہ مصطفےٰ کو ہزیمت اُٹھانی پڑی،

اوکرین قرہ مصطفےٰ کی سختیوں کی وجہ سے اوکرین کے قزاق بہت عاجز آ گئے تھے، یہاں تک کہ مجبور ہو کر اُنھوں نے فروری ۱۶۷۷ء میں علم بغاوت بلند کر دیا، روس نے اُن کی حمایت کی، یہ اطلاع پاکر قرہ مصطفےٰ ایک فوج لے کر اوکرین میں داخل ہوا، وہاں اُسے باغیوں کے علاوہ روس اور پولینڈ کی فوجوں سے بھی مقابلہ پیش آیا، اور اس کو شکست ہوئی، دوسرے سال تازہ فوجوں کے ساتھ وہ پھر لوٹا، اور ۲۱ اگست ۱۶۷۸ء کو اُس نے قلعہ سیزرانم (Cehzrym) فتح کر لیا، تین سال تک مختلف معرکے پیش آئے، جن میں کبھی ایک فریق کو فتح ہوئی، کبھی دوسرے کو، بالآخر ۱۶۸۱ء میں سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان صلح ہو گئی اور باب عالی اوکرین سے دست بردار ہو گیا، پانچ سال بعد روس اور پولینڈ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس کے رو سے پورے اوکرین پر روس کی سیادت تسلیم کر لی گئی،

ویانا کا دوسرا محاصرہ ۱۶۸۲ء میں قرہ مصطفےٰ کو آسٹریا پر حملہ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا، ہنگری کا جو حصہ آسٹریا کے زیر حکومت تھا، اُس نے شہنشاہ لیوپولڈ کی مذہبی تعدیوں سے عاجز

آکر بغاوت کر دی، باغیوں کے سردار توکولی (Tokoli) نے آسٹریا سے آزادی کا اعلان کرکے اپنے کو ہنگری کا فرماں روا قرار دیا اور سلطان کی سیادت قبول کرلی۱؎ قرہ مصطفےٰ کے لئے یہ موقع نہایت غنیمت تھا، اُس نے ایک بہت بڑی فوج جس کا تخمینہ دو لاکھ پچھتر ہزار کیا جاتا ہے اندر نہیں جمع کی اور ۱۶۸۳ء کے اوائل میں ویانا کے قصد سے روانہ ہوگیا، راستہ میں اُسے کوئی مزاحمت پیش نہیں آئی، اور وہ آسانی کے ساتھ ویانا پہنچ گیا، شہنشاہ لیوپولڈ کے پاس اس زبردست فوج کے مقابلہ کے لئے کوئی سامان نہ تھا، اس کے سپاہیوں کی تعداد (۳۵) ہزار سے زیادہ نہ تھی، جن میں سے (۱۱) ہزار ویانا کے اندر متعین تھے، اس نے سوبیسکی سے مدد کی درخواست کی، پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ میں حال ہی میں ایک صلحنامہ ہوچکا تھا، لیکن سوبیسکی نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور شہنشاہ کی مدد کے لئے پچاس ہزار سپاہیوں کو بھیجنے کا وعدہ کر لیا، لیکن سوبیسکی کی فوج ویانا سے فاصلہ پر تھی اور آٹھ ہفتہ سے قبل پہنچ نہیں سکتی تھی، اس میں شبہ نہیں کہ اگر قرہ مصطفےٰ پوری مستعدی سے کام لیتا اور دوران محاصرہ میں پوری قوت سے حملہ کرتا تو ویانا پولینڈ کی کمک آنے سے پیشتر ہی فتح ہو جاتا، لیکن اسے اپنی طاقت اور غنیم کی کمزوری پر حد سے زیادہ بھروسا تھا، اور وہ یقین رکھتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت ویانا کو اس کے پنجہ سے چھڑا نہیں سکتی،

غرض ویانا کا دوسرا محاصرہ ۱۵ر جولائی ۱۶۸۳ء کو شروع ہوا، شہنشاہ لیوپولڈ اپنے خاندان کے ساتھ بھاگ کر یوریا چلا گیا تھا، لیکن محصورین نے کاونٹ اسٹار ہمبرگ (Stakremberg) کی سرکردگی میں نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا،

۱؎ میریٹ ص۱۲۲۔

شہر کے بیس ہزار باشندے بھی سپاہیوں کے دستہ میں شامل ہو گئے تھے، انھوں نے بھی فوج کے ساتھ جانبازی کے جوہر دکھائے، تاہم ترکی توپخانوں نے شہر کی دیواروں کو کئی مقام پر بالکل مسمار کر دیا، اور اگر قرہ مصطفےٰ ایک عام حملہ کا حکم دیدیتا تو شہر کے فتح ہو جانے میں کوئی شبہہ نہ تھا، لیکن اس کی حرص وہوس نے یہ نادر موقع کھو دیا، وہ اس بات کا انتظار کرتا رہا، کہ اہل شہر محاصرہ سے عاجز آکر آخر میں خود ہتھیار ڈالدیں گے، اور پھر شہر کی تمام دولت پر وہ تنہا قبضہ کرے گا جو ایک عام حملہ کی کامیابی میں ممکن نہ تھا کیونکہ اس وقت مال غنیمت تمام فوج کا حق ہو جاتا، اسی توقع اور ہوس نے آخری حملہ کو ملتوی رکھا، اس درمیان میں سوبیسکی تیزی کے ساتھ ویانا کی جانب کوچ کرتا رہا، اور آخر کار شہزادہ چارلس آف لورین (Charles of Lorraine) سے آملا جو آسٹریا کی شاہی فوج کا سپہ سالار تھا، اور ویانا سے کچھ فاصلہ پر اس کا انتظار کر رہا تھا، دونوں سپہ سالاروں نے متحد ہو کر ٹولم (Tulm) کے مقام پر دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور پھر وہ ایک نہایت دشوار گذار راستے سے ہو کر ترکی لشکر کے عقب پر پہنچ گئے، قرہ مصطفےٰ آسانی کے ساتھ سوبیسکی اور شہزادہ چارلس کو دریا عبور کرنے یا یا اُس دشوار گذار راستہ کے طے کرنے سے روک سکتا تھا، لیکن اپنی طاقت پر حد سے بڑھے ہوئے اعتماد نے اُس کو غافل رکھا، اور وہ اس وقت متنبہ ہوا جب غنیم اس کی پشت پر پہنچ چکا تھا،

ترکوں کی شکست

سوبیسکی کو عثمانی لشکر کی ترتیب دیکھ کر اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا اُس نے قرہ مصطفےٰ کی نسبت حقارت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا کہ "اس شخص نے لشکر کی ترتیب غلط طریقہ پر دی ہے، وہ جنگ کے متعلق کچھ نہیں جانتا، ہم ضرور

اسے شکست دیدیں گے"! پھر اُس نے اپنی فوج کو مخاطب کر کے بتایا کہ ویانا تمام مسیحی یورپ کا قلب ہے جس کی مدافعت ایک مقدس فرض ہے، ویانا کو ترکوں سے چھڑا لینا حقیقۃً سارے یورپ کو محفوظ کر لینا ہے، فوج کے دینی جوش کو برانگیختہ کرنے کے بعد اُس نے حملہ کا حکم دیا، حملہ اس قدر شدید تھا کہ عثمانی لشکر اس کی تاب نہ لا سکا، حملہ کی شدت سوبیسکی کی موجودگی کے باعث اور زیادہ محسوس ہو رہی تھی، اس کی فاتحانہ شہرت کا غلغلہ تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا سب سے پہلے تاتاریوں کے قدم اکھڑے اور ان کے بھاگنے سے ترکی فوج کے دوسرے دستوں پر بھی اثر پڑا، اور پوری فوج میں انتشار پیدا ہو گیا، قرہ مصطفیٰ نے ینی چری کو شہر کے سامنے خندقوں میں چھوڑ دیا تھا، اور بقیہ فوج کے ساتھ سوبیسکی اور شہزادہ چارلس کے متحدہ حملہ کا مقابلہ کر رہا تھا، جو اُس کے عقب سے ہوا تھا، تاتاریوں کے پسپا ہو جانے کے بعد سوبیسکی نے ترکی لشکر کے قلب پر حملہ کر دیا، عثمانی فوج باوجود اپنی کثرت کے اس حملہ کا مقابلہ نہ کر سکی، اور اس کے قدم اکھڑ گئے، عیسائیوں نے ترکوں کے تمام خیموں اور سامانوں پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد ینی چری دستوں کی طرف بڑھے، جن پر اب دونوں طرف سے حملہ ہونے لگا، پشت سے سوبیسکی کی فوج حملہ کر رہی تھی، اور سامنے سے آسٹریا کی شاہی فوج گولیاں برسا رہی تھی، ینی چری اپنی بے مثل جانبازی کے ساتھ ان حملوں کا مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا ایک ایک فرد داد شجاعت دیتا ہوا مارا گیا، سوبیسکی کی فتح اب مکمل ہو گئی، تین سو توپیں، نو ہزار گولہ بارود کی گاڑیاں اور پچیس ہزار خیمے مال غنیمت میں ہاتھ آئے،

قرہ مصطفیٰ کا قتل قرہ مصطفیٰ سوبیسکی کے تعاقب سے بچ کر بودا پہنچا اور وہاں عثمانی فوج کے چند بڑے بڑے افسروں کو اس شکست کا ذمہ دار قرار دے کر جو تمام تر اُس کی نااہلیت

اور حرص و ہوس کا نتیجہ تھی قتل کرا دیا، اس کے بعد وہ موسم سرما گذارنے کے لئے بلغراد چلا گیا، وہاں سلطان کے حکم سے وہ خود قتل کر دیا گیا، اور اُس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی،

شکست ویانا کا اثر

ویانا کا یہ دوسرا محاصرہ جس میں ترکوں کو ایسی زبردست شکست ہوئی پہلے محاصرہ سے جو ۱۵۲۹ء میں سلیمان اعظم کی سرکردگی میں ہوا تھا بہت کچھ مختلف تھا، سلیمان سامانِ رسد اور اسلحوں کی عدم فراہمی کی وجہ سے محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور ہو گیا تھا غنیم کو میدانِ جنگ میں اُس سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، اور وہ اپنی پوری فوج کے ساتھ قسطنطنیہ واپس آ گیا، برخلاف اس کے قرہ مصطفےٰ نے ایک ایسی فوج سے جو ترکی لشکر سے تعداد میں بہت کم تھی میدانِ جنگ میں شکست کھائی، اور اس کے ہزاروں سپاہی ہلاک ہو گئے، اس شکست کا اثر دولت عثمانیہ کی عظمت پر بہت بڑا پڑا، دنیا کو معلوم ہو گیا کہ عثمانی فتوحات کا دور اب ختم ہو گیا، اور وسط یورپ کی سلطنتیں جو دو سو برس سے مستقل طور پر ترکی حملوں سے خائف چلی آتی تھیں اب ہمیشہ کیلئے مطمئن ہو گئیں،

مسیحی اتحاد

ویانا میں ترکوں کی شکست سے تمام یورپ میں شادیانے بجنے لگے، اور اُن عیسائی حکومتوں نے جو سلطنت عثمانیہ کی مغربی سرحدوں پر واقع تھیں بیک وقت اس پر حملہ کر دیا، پوپ نے ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ کا اعلان کیا، اور اس کے لئے عیسائی حکومتوں کا ایک مقدس اتحاد ۱۶۸۴ء میں قائم کیا جس میں آسٹریا، پولینڈ، وینس اور مالٹا شریک ہوئے، اور ۱۶۸۶ء میں روس بھی شامل ہو گیا،

مزید شکستیں

جدید صدر اعظم ابراہیم پاشا نے ان حملہ آوروں کے مقابلہ کی حتی المقدور پوری کوشش کی، لیکن ویانا کی شکست میں عثمانی فوجوں اور خصوصاً توپخانوں کا جو نقصان

ہوا تھا، اس کی تلافی فوراً ممکن نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا کی شاہی فوجوں نے جن میں پولینڈ اور جرمنی کے مختلف صوبوں کی فوجیں بھی شامل ہو گئی تھیں، شہزادہ چارلس کی سرکردگی میں گران، نوہزل، اوفن اور زیجیڈین جیسے اہم اور مضبوط مقامات پر قبضہ کر لیا، اور پھر بلغراد کے علاوہ ہنگری کے اُن تمام قلعوں کو فتح کر لیا، جن پر ترک قابض تھے، کروشیا کا صوبہ بھی جو ڈیڑھ سو برس سے سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ تھا اس کے ہاتھ سے نکل گیا،

ادھر وینس نے بوسینا اور البانیا پر حملہ کر دیا، اور موروسینی جمہوریہ کی فوجیں لیکر موریا میں داخل ہوا، اور کورن، نوارینو، کورنتھ، ایتھنز اور دوسرے اہم شہروں پر قبضہ کر لیا، تقریباً پورا یونان وینس کے قبضہ میں آگیا، یونانیوں نے اس حملہ کی مدافعت میں ترکوں کو کسی قسم کی مدد نہیں دی، لیکن جمہوریہ کی فتح کے بعد اُنھیں معلوم ہو گیا کہ اہل وینس کی حکومت ترکوں کے مقابلہ کتنی زیادہ سخت اور ظالمانہ ہے، لارڈ ایورسلے نے بھی بادل ناخواستہ اس کا اعتراف کیا ہے[1]،

۱۸ جون ۱۶۸۶ء کو آسٹریا کی فوجوں نے شہزادہ چارلس کے زیر قیادت بوڈا کا محاصرہ کر لیا، صدر اعظم سلیمان پاشا نے اُسے بچانے کی کوشش کی لیکن تازہ کمک پہونچنے سے قبل شہر فتح ہو گیا، عبدی پاشا اور ترکی دستہ جو قلعہ کی مدافعت کر رہا تھا نہایت جانبازی کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا، یہ شہر ایک سو پینتالیس سال سے ترکوں کے قبضہ میں تھا، اور اس مدت میں اُس نے چھ محاصروں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا لیکن ۱۳ شوال ۱۰۹۷ھ مطابق ۲ ستمبر ۱۶۸۶ء کو یہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اور پھر کبھی سلطنت عثمانیہ کے قبضہ میں نہ آیا،

۳ر شوال ۱۰۹۸ھ (۱۲ر اگست ۱۶۸۷ء) کو موہاکز کا معرکہ پیش آیا، ایک سو ساٹھ برس پہلے اسی مقام پر سلطان سلیمان اعظم نے اہلِ ہنگری کو زبردست شکست دیکر اُن کے نصف ملک پر قبضہ کر لیا تھا، اس مرتبہ ویسی ہی شکست ترکوں کو اٹھانی پڑی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلاوونیا اور کروشیا کے علاقے مستقل طور پر سلطنت آسٹریا میں شامل کر لئے گئے، اپا فی امیر ٹرانسلوینیا نے جو دولت عثمانیہ کا باجگذار تھا، اب آسٹریا کی سیادت قبول کر لی۔

سلطان کی معزولی

ان پیہم شکستوں کی وجہ سے عثمانی فوج میں سخت برہمی پھیلی ہوئی تھی، اس کے افسروں نے متفقہ طور پر سیاوش پاشا کو اپنا سپہ سالار اعظم منتخب کیا، اور صدر اعظم سلیمان پاشا کے قتل کا مطالبہ پیش کیا، سلطان نے فوج کی برہمی اور بغاوت کے آثار دیکھ کر یہ مطالبہ منظور کر لیا، اور سلیمان پاشا کی جگہ سیاوش پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، سلیمان پاشا سلطان کے حکم سے قتل کر دیا گیا، امید تھی کہ اس مطالبہ کے پورے ہونے کے بعد فوج مطمئن ہو جائیگی اور قسطنطنیہ کا رخ نہ کرے گی، لیکن ادرنہ پہونچنے کے بعد وہ دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوئی اور وہاں آکر خود سلطان کی معزولی کا مطالبہ کرنے لگی، سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ داروں نے بھی جو قسطنطنیہ میں موجود تھے متفقہ طور پر اس مطالبہ میں فوج کا ساتھ دیا، چنانچہ مصطفےٰ کوپریلی نے جو اس وقت قائم مقام صدر اعظم تھا، علماء کی ایک مجلس منعقد کر کے سلطان کے عزل کی نسبت استفتا کیا، تمام علماء نے بغیر کسی اختلاف کے معزولی کا فتویٰ دیا، ساتھ ہی انھوں نے اس کے بھائی سلیمان کو اُس کا جانشین منتخب کیا، چنانچہ ۲ر محرم ۱۰۹۹ھ مطابق ۸ر نومبر ۱۶۸۷ء کو محمد رابع تخت سے اُتار کر محل کے اس حصہ میں نظر بند کر دیا گیا، جہاں اب تک اُس نے سلیمان کو نظر بند کر رکھا تھا، اور سلیمان کو وہاں سے لاکر تخت پر بٹھایا گیا، پانچ سال بعد ۲ر ربیع الثانی ۱۱۰۴ھ مطابق ۱۷ر دسمبر ۱۶۹۲ء

کو اُس کا انتقال ہو گیا،

سلطان محمد رابع کو شکار سے بیحد دلچسپی تھی، اور وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ اسی میں گذارتا تھا، اُس نے سلطنت کا سارا انتظام صدر اعظم کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا تھا، سلطنت کی خوش قسمتی سے ۱۶۷۶ء تک عنان حکومت ایسے وزیروں کے ہاتھ میں تھی جو سلطان کے تمام تر اعتماد کے مستحق تھے محمد کوپریلی، اور اس کے بعد احمد کوپریلی نے دولت علیہ کی جو عظیم الشان خدمتیں انجام دیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں لیکن احمد کوپریلی کی وفات پر قرہ مصطفیٰ کے تقرر نے وہ تمام خرابیاں از سر نو پیدا کر دیں جن کو دور کرنا اُس کے ممتاز پیشرووں کا خاص مقصد تھا، قرہ مصطفیٰ کی نااہلیت اور پھر اُس کی غیر معمولی حرص و ہوس مزید تباہیوں کا باعث ہوئی جس کا پیش خیمہ ویانا کی زبردست شکست تھی، اس شکست نے تقریباً تمام یورپ کو بیک وقت سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کر دیا، قرہ مصطفیٰ کے جانشین ابراہیم پاشا اور سلیمان پاشا نے مدافعت کی انتہائی کوششیں کیں، لیکن ویانا کی شکست نے سلطنت کی قوت کو توڑ دیا تھا، اور تقریباً تمام معرکوں میں ترکوں کے قدم اُکھڑتے ہی گئے، ان پے درپے ہزیمتوں سے فوج میں بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے، پہلے تو اُس نے صدر اعظم سلیمان پاشا ہی کو ذمہ دار قرار دیکر قتل کر دینا چاہا لیکن اُس کے قتل کے بعد بھی اس کا غصہ فرو نہ ہوا، اور اُس نے خود سلطان کی معزولی پر اصرار شروع کیا، گو محمد رابع براہ راست ان شکستوں کا ذمہ دار نہ تھا لیکن قرہ مصطفیٰ جیسے نالائق وزیر کا تقرر صرف اسی کے انتخاب سے عمل میں آیا تھا اور یہی تقرر سلطنت کی تمام خرابیوں اور تباہ کاریوں کا سبب ثابت ہوا،

الجزائر و تونس کی آزادی

سلطان محمد رابع کے عہد میں دولت عثمانیہ کو ایک شدید صدمہ

یہ بھی پہنچا کہ الجزائر اور تونس کی حکومتیں آزاد ہوگئیں ان حکومتوں کی آزادی کے لئے کسی خاص سن کی تعیین نہیں کی جاسکتی لیکن مورخین کو اس پر اتفاق ہے کہ یہ آزادی سترھویں صدی کے وسط میں حاصل ہوئی، اس کے اسباب اس صدی کی ابتدا ہی میں پیدا ہوگئے تھے، جب کہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کا تقرر ذاتی لیاقت اور تجربہ کے بجائے سفارش اور رشوت کی بنا پر کیا جانے لگا تھا، اور سلطنت کے دوسرے صوبوں کے حکام کی طرح الجزائر اور تونس کے صوبہ داروں نے بھی بڑی بڑی قیمتیں ادا کرکے اپنے عہدے حاصل کرنا شروع کردیئے تھے کچھ دنوں کے بعد الجزائر اور تونس کے مقامی فوجی دستوں نے اپنے سردار خود ہی منتخب کرنا شروع کئے، ابتداءً یہ انتخاب منظوری کے لئے سلطان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، وہ یا تو منتخب شدہ امیدوار کو مقرر کردیتا تھا یا اُس کے بجائے کسی دوسرے کا تقرر کردیتا تھا، یہ شکل بھی تھوڑے ہی دنوں قائم رہی، اور پھر اس انتخاب کو سلطان کے سامنے پیش کرنے کا رواج بھی جاتا رہا، رفتہ رفتہ ان فوجی سرداروں نے جو ڈے کہلاتے تھے، حکومت کی اصلی قوت اپنے ہاتھوں میں لے لی، اور بالآخر ان پاشاؤں کو برطرف کردیا جو برائے نام صوبہ دار بناکر قسطنطنیہ سے بھیجے جاتے تھے، اس طرح ان دونوں صوبوں نے خودمختاری حاصل کرلی، کبھی کبھی وہ باب عالی کی مدد اپنے جنگی بیڑوں سے کرتے رہتے تھے لیکن دولت عثمانیہ کے محکوم کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اسلامی اخوت کی بنا پر، دونوں حکومتوں کے پاس جنگی جہازوں کے مضبوط بیڑے تھے جو بحر روم میں چکر لگاتے رہتے تھے، اور وہاں سے نکل کر بحر اٹلانٹک کے ساحلی علاقوں پر چھاپا مارا کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ آئس لینڈ اور سکینڈی نیویا بھی پہنچ جاتے تھے، آئرلینڈ پر تو ان کے حملے اکثر ہوتے

رہتے تھے، سلطنت عثمانیہ سے ان حکومتوں کی آزادی کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ دوسری سلطنتیں باب عالی سے جنگ کا اعلان کئے بغیر الجزائر اور تونس کے بحری بیڑوں پر حملے کرتی رہتی تھیں، اور ان حملوں سے اُن کے اور دولت علیہ کے باہمی تعلقات پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑتا تھا، چنانچہ ۱۶۱۷ء میں ایک فرانسیسی بیڑے نے امیر البحر بولو نس (BEAULIEU) کی سرکردگی میں الجزائر کے بیڑے پر حملہ کرکے اُس کے بہت سے جہازوں کو غرق کر دیا، اسی طرح ۱۶۲۰ء میں انگریزی امیر البحر سر رچرڈ مانسل نے الجزائر پر حملہ کیا، کیونکہ گذشتہ پانچ سال کے اندر الجزائر کے جہازوں نے چار سو انگریزی تجارتی جہازوں کو گرفتار کر لیا تھا، لیکن اس حملہ سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، ۱۶۵۵ء میں ایک دوسرے انگریزی بیڑے نے جو امیر البحر بلیک کی قیادت میں تھا، تونس پر گولے برسا کر اس کے جہازوں کی ایک بڑی تعداد جلا ڈالی، اس کے بعد بلیک الجزائر کی طرف بڑھا، وہاں کے ڈے نے بغیر کسی جنگ کے تمام انگریز قیدیوں کو رہا کر دیا، ان دونوں صورتوں میں انگلستان اور دولت علیہ کے درمیان کسی جنگ کا اعلان نہیں ہوا، اور نہ سلطان نے انگلستان کے اس فعل پر کوئی شکایت کی،

۱۶۶۳ء میں انگلستان، الجزائر، اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلحنامہ مرتب ہوا جس کے رو سے انگلستان کو یہ حق دیا گیا کہ اگر الجزائر کی طرف سے معاہدہ شکنی ہو تو انگلستان اس سے انتقام لے سکتا ہے، مگر اس سے انگلستان اور دولت علیہ کے تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوگی، چنانچہ اس عہدنامہ کے مطابق انگلستان کو بارہا الجزائر پر حملہ کرنے کا اتفاق ہوا، لیکن یہ حملے بیشتر بے سود ثابت ہوئے،

غرض سلطنت عثمانیہ سے الجزائر اور تونس کی آزادی ۱۶۵۰ء کے قریب عمل میں

آئی، الجزائر نے تقریباً دو سو برس تک اپنی خود مختاری قائم رکھی لیکن ۱۸۳۰ء میں فرانس نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، تونس کی آزادی نصف صدی سے زائد تک قائم رہی ۱۸۸۱ء میں یہ حکومت بھی سلطنت فرانس میں شامل کر لی گئی،

نظام ینی چری میں تبدیلی، سلطان محمد رابع کے عہد میں ینی چری کے نظام میں ایک اہم ترمیم کی تکمیل ہوئی، ابتدائً یہ فوج تمام تر اُن نوجوانوں پر مشتمل ہوتی تھی جو ہر سال سلطنت کی عیسائی رعایا میں سے منتخب کیے جاتے تھے لیکن سلطان مراد رابع کے وقت سے عیسائی لڑکوں کی قید اٹھا دی گئی، چونکہ یہ فوج تمام افواج عثمانی میں سب سے زیادہ معزز خیال کی جاتی تھی اور اس کے سپاہیوں کو بہت سے ملکی اور فوجی فوائد حاصل تھے، اسلئے ترکی النسل اور مسلمان امیدوار بھی نہایت شوق کے ساتھ اس میں داخل ہونے کے خواستگار ہوئے چنانچہ قدیم دستور میں پہلے یہ ترمیم کی گئی کہ ینی چری سپاہیوں کے بچوں کو بھی اسمیں داخلہ کا حق دیا گیا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد دوسرے مسلمان امیدوار بھی لئے جانے لگے اور عیسائی رعایا سے ہر سال جو مطالبہ ہوا کرتا تھا، اس میں بہت کچھ تخفیف ہو گئی، لیکن ۱۶۷۵ء سے جو صدر اعظم احمد کوپریلی کی وزارت کا آخری سال تھا عیسائی لڑکوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا، اس ترمیم کے مکمل ہو جانے پر ینی چری کی تعداد میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا، ینی چری سپاہیوں کے بڑے بڑے دستے سلطنت کے خاص خاص شہروں میں متعین کر دیئے گئے جہاں وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ مختلف کاروبار میں مشغول ہو گئے، اور صرف جنگ کے موقعوں پر سلطنت کی دوسری فوجوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے، اون کی خالص راہبانہ اور فوجی زندگی کا خاتمہ بہت پہلے ہو چکا تھا،

شکار سے حد درجہ شغف ہونیکے باوجود علوم و فنون کی سرپرستی میں سلطان

محمد رابع اپنے پیشروؤں سے پیچھے نہ تھا، اسے علماء کی صحبت سے خاص دلچسپی تھی، مورخین کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کرتا تھا، وہ انھیں اپنے دربار میں مامور رکھتا، اور ان کی کتابوں کی تصحیح خود اپنے قلم سے کرتا تھا،

سلیمان ثانی

سنہ ۱۰۹۹ھ تا سنہ ۱۱۰۳ھ مطابق سنہ ۱۶۸۷ء تا سنہ ۱۶۹۱ء

فوج کی سرکشی، سلطان سلیمان ثانی بچپن سے محل میں نظر بند رہنے کے بعد پینتالیس سال کی عمر میں تختِ سلطنت پر آیا، اس طویل نظر بندی کے باوجود اُس نے اپنے پیشرو سے کہیں زیادہ تدبر اور بیدار مغزی کا ثبوت دیا اور اس میں شبہہ نہیں کہ اگر اُس کی تخت نشینی چند سال قبل عمل میں آئی ہوتی تو سلطنت کو ان تباہیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو محمد رابع کے عہد کے آخری سالوں میں اس پر ہر طرف سے نازل ہو گئی تھیں، دولت عثمانیہ کو جو صدمہ گذشتہ عہد میں پہنچ چکا تھا، اُس کی تلافی فوراً ممکن نہ تھی، خصوصاً اس صورت میں کہ فوج باغی ہو رہی تھی اور پایہ تخت کے علاوہ مختلف صوبوں میں بھی سرکشی اور بغاوت کے آثار نمایاں تھے، سلیمان پاشا کا قتل اور محمد رابع کا عزل فوج ہی کی بغاوت کا نتیجہ تھا، سلیمان ثانی نے فوج کی برہمی دور کرنے اور اُسے قابو میں لانے کی غرض سے تخت نشینی کے موقع پر بہت کچھ انعام و اکرام تقسیم کیا، اور اُس کی سرکشی پر کوئی مواخذہ نہ کیا لیکن چند ہی روز کے بعد وہ پھر باغی ہو گئی اور قسطنطنیہ میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا، متعدد وزرا محض ان باغیوں کی خواہش پر علیحدہ کر دیئے گئے، آخر میں اُنھوں نے صدر اعظم سیاوش پاشا

کے محل پر بھی حملہ کیا اور اُسے قتل کر کے حرم میں داخل ہو گئے، اور اُس کی بیوی (جو سلطان محمد رابع کی بیٹی تھی) اور بہن اور دوسری خواتین کے ساتھ نہایت گستاخی سے پیش آئے، باغیوں کے ساتھ قسطنطنیہ کے تمام بدمعاش اور اوباش بھی شریک ہو گئے تھے جنہیں عیسائی یہودی اور مسلمان سب ہی شامل تھے، یہاں تک کہ اُن کی شورش اور لوٹ مار نے شہر کے عام باشندوں کو بھی عاجز کر دیا، آخر کار علماء کے اُبھارنے پر عوام اور خود ینی چری فوج کے وہ دستے جو محض فوری جوش سے متاثر ہو کر اس ہنگامہ میں شریک ہو گئے تھے باغیوں کی سرکوبی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بمشکل ان کو قابو میں لائے، اور اُنکے سرداروں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، مفتی اعظم اور تین دوسرے بڑے علماء جو اس شورش میں کسی حد تک ینی چری باغیوں کے زیر اثر تھے، اپنے عہدوں سے برطرف کر دیئے گئے، اور ان کی جگہ زیادہ متدین اور قابلِ اعتماد اشخاص مقرر کئے گئے، اس طرح پایہ تخت میں تھوڑا بہت امن قائم ہو گیا لیکن بغاوت کا خطرہ قطعی طور پر زائل نہ ہوا، اور صوبوں میں شورش و سرکشی کے مظاہرے عرصہ تک جاری رہے، تاہم جون ۱۶۸۸ء میں امن و امان اس حد تک قائم ہو گیا تھا کہ سلطان نے ایک فوج مرتب کر کے ہنگری کی سرحد پر روانہ کی،

ہجوم مصائب آسٹریا کو دولت عثمانیہ کے اس اختلال و انتشار سے فائدہ اٹھانے کا کافی موقع مل گیا تھا، اس عرصہ میں اُس کی تین فوجیں شہزادہ چارلس آف لورین (Charles of Lorraine)، شہزادہ لوئی آف بیڈین (Louis of Baden) اور شہزادہ یوجین آف سوائے (Eugene of Savoy) کی سرکردگی میں جو اپنے وقت میں یورپ کے ممتاز ترین جنرل تھے سلطنت عثمانیہ کے مختلف

حصوں کی طرف بڑھتی رہیں، ۱۴ر دسمبر ۱۶۸۷ء کو انھوں نے قلعہ ایرلا واقع ہنگری کا محاصرہ کرکے اسے فتح کرلیا، اس کے بعد بلغراد کا راستہ کھل گیا، اور انھوں نے اس کا محاصرہ شروع کیا، صرف تین ہفتہ کی گولہ باری کے بعد بلغراد کے ترک کمانڈر کی غداری سے یہ حد درجہ اہم شہر جو ہنگری کا دروازہ تھا ۲۰ر اگست ۱۶۸۸ء کو دولت عثمانیہ کے ہاتھ سے آسانی کیساتھ نکل گیا، شہزادہ لوئی نے تقریباً اسی زمانہ میں بوسنیا پر حملہ کرکے اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا، اُدھر ڈلماشیا بغاوت کرکے عثمانی حکومت سے آزاد ہوگیا، اس کے بعد آسٹریا کی فوجوں نے نیش اور ودین پر بھی قبضہ کرلیا، اور ۱۶۸۹ء میں ہنگری کے صرف دو قلعوں تمیسوار اور وار آڑدین پر ترکوں کا قبضہ باقی رہ گیا، سرویا اور بوسینا کے بیشتر علاقے اُن کے ہاتھ سے نکل چکے تھے،

سلطنت کے جنوبی حصہ میں بھی غنیم کی فتوحات کا یہی حال تھا، مورو سینی نے تمام موریا فتح کرکے اس میں وینس کی حکومت قائم کردی تھی، البتہ پولینڈ اور روس کے مقابلہ میں ترک اور اُن کے حلیف تاتار کامیاب تھے، ۱۶۸۸ء میں کریمیا کی تاتاری فوج نے ایک پولش فوج کو شکست دیکر پولینڈ کے ایک بڑے حصہ کو تاراج کر ڈالا، دوسرے سال روس بھی دولت علیہ کے خلاف اتحادیوں سے مل گیا، اور ایک فوج کریمیا پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی، لیکن ترکوں نے روسی فوج کو مار کر بھگا یا، ترکی فتوحات کا دائرہ وہیں تک پہنچ کر ختم ہوگیا، باقی ہر طرف شکستوں ہی کا سامنا تھا اور سلطنت عثمانیہ کے قدیم مقبوضات پر دشمنوں کا قبضہ دکھائی دے رہا تھا، صوبہ جات بلقان پر آسٹریا کی فوجیں حملہ آور ہو رہی تھیں سرویا اور بوسینا کے بہترین حصے آسٹریا کے زیر حکومت آچکے تھے، تمام یونان اور البانیا پر جمہوریہ وینس کے نمایندہ مورو سینی کا قبضہ

تھا، علاوہ بریں دولت عثمانیہ کا بحری بیڑا وینس، پوپ، بہارزین مالٹا، اور ڈیوک آف ٹسکنی (Duke of Tuscany) کے متحدہ بیڑوں سے شکست کھا کر بہت کچھ کمزور ہو چکا تھا،

مصطفےٰ کوپریلی مصائب کا یہ ہجوم دیکھ کر سلطان نے نومبر ۱۶۸۹ء میں ایک دیوان اندر میں منعقد کیا، اور موجودہ صورت حال کی نسبت ارکان مجلس سے مشورہ کیا، سب نے بالاتفاق یہی رائے دی کہ کوپریلی زادہ مصطفےٰ پاشا صدر اعظم مقرر کیا جائے، چنانچہ احمد کوپریلی کے انتقال کے تیرہ سال بعد جو دولت علیہ کے لئے ہر طرح کی خرابی اور بربادی کا زمانہ تھا خاندان کوپریلی کا یہ تیسرا فرد سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لئے طلب کیا گیا،

تقرر کے وقت مصطفےٰ کوپریلی کی عمر باون ۵۲ سال کی تھی، محمد اور احمد کوپریلی کے دوران وزارت میں وہ مختلف ذمہ دار عہدوں پر کام کر چکا تھا، عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے اُس نے تمام مشاہیر سلطنت کو مدعو کر کے ایک دیوان منعقد کیا اور اُن کے سامنے دولت علیہ کی زبون حالی کا صحیح صحیح نقشہ پیش کیا، اُس نے بتایا کہ اگر ہمارا یہی حال رہا تو آیندہ معرکہ میں غنیم قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے نظر آئیگا، اس کے بعد وہ حکومت کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا، اور بعض ایسے محصول جو اس کے پیشروؤں نے غیر ضروری طور پر عائد کر رکھے تھے جن سے رعایا نہایت پریشان تھی، موقوف کر دئیے اور بجائے اُن کے امرائے دولت اور اعیان حکومت سے جنھوں نے رعایا پر سختی کر کے خوب دولت جمع کی تھی بڑی بڑی رقمیں وصول کیں اور سلطنت کا خزانہ پُر کر دیا، اس نے خود اپنے تمام نقرئی ظروف خزانہ عامرہ میں منتقل کر دئیے، اور اُس کے دسترخوان پر صرف تانبے کے برتن نظر آتے تھے، اس طرح فوج کی فوری ضروریات کے لئے سرمایہ

جمع ہوگیا، اس کے بعد اُس نے فوج کے لئے نئے سپاہی بھرتی کرنا شروع کئے اور اُن تمام آزمودہ کار سپاہیوں اور افسروں کو جو گذشتہ جنگوں کے بعد برطرف کردیے گئے تھے، یا پنشن پا رہے تھے، دوبارہ طلب کرکے اس نئی فوج کے ہر دستہ میں تقسیم کردیا تاکہ نئے سپاہی اُن کے تجربہ سے فائدہ اُٹھا سکیں، اُس نے سلطنت کے اہم صوبوں میں ایسے گورنر مقرر کئے جن پر اسے پورا اعتماد تھا، ترکی بحریہ کی اصلاح اور مضبوطی کیلئے بھی جو گذشتہ معرکوں میں بہت کمزور ہوگیا تھا، اس نے مختلف تدبیریں اختیار کیں اور لایق افسروں کو مقرر کیا، اس نے بہت سی تجارتی پابندیاں بھی جو نامناسب اور غیر ضروری تھیں اُٹھا دیں،

عیسائی رعایا کے ساتھ مخصوص رعایتیں

مصطفیٰ کوپریلی کو تمام رعایا کی فلاح و بہبود کا بے حد خیال تھا، اور وہ سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کرتا تھا، اُس کی عدالت میں مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہ تھی، اس عموم میں سلطنت کی عیسائی رعایا کو ایک خاص خصوص حاصل تھا، مصطفیٰ پاشا ان کے ساتھ خاص رعایتیں کرتا تھا، وہ دیکھتا تھا کہ جو مسیحی حکومتیں ترکی پر حملہ آور ہو رہی ہیں، اُنھیں دولت عثمانیہ کی عیسائی رعایا سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے، چنانچہ البانیا کی عیسائی رعایا دشمن کی فوجوں میں شامل ہو رہی تھی، اور سرویا کے باشندے شہنشاہ آسٹریا کی مدد کے لئے تیار تھے یونان میں موروسینی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی، کہ وہاں کے عیسائیوں نے حملہ آوروں کا استقبال کیا، اور اُن کے لئے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں، ان واقعات کو دیکھ کر مصطفیٰ پاشا نے عیسائیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی، چنانچہ اس نے اپنے تقرر کے بعد فوراً ہی تمام پاشاؤں کے نام احکام جاری کئے،

کہ عیسائی رعایا پر کسی قسم کی سختی نہ کیجائے، اور اُن کو پوری مذہبی آزادی عطا کیجائے ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اُس نے سخت سزائیں دینا شروع کیں، عیسائی رعایا پر مختلف محصول عائد تھے، اُس نے جزیہ کے علاوہ اور تمام محصول معاف کردیئے، جزیہ کی بھی آمدنی کے لحاظ سے تین تقسیمیں کردیں، طبقۂ امرا پر چار دوکات فی شخص مقرر کیئے، متوسط درجہ کے لوگوں پر دو دو کات اور ادنیٰ طبقہ والوں پر ایک دوکات، پہلے عیسائی رعایا کو صرف اپنے قدیم کنیسوں کی مرمت کا حق حاصل تھا، وہ کوئی نیا کنیسہ تعمیر نہیں کرسکتے تھے مصطفےٰ پاشا نے یہ پابندی اُٹھادی اور اُنھیں جدید کنیسوں کی تعمیر کا حق بھی دیدیا، چنانچہ اس کے دورِ وزارت میں بہت سے نئے کنیسے تعمیر کیئے گئے، ان تمام رعایتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی رعایا میں دولت علیہ کے ساتھ ایک عام ہمدردی پیدا ہوگئی خصوصاً اُن عیسائیوں میں جو کلیسائے یونان کے پیرو تھے کیونکہ مغرب کی عیسائی حکومتیں جو کلیسائے رومہ کی تبع تھیں اُن پر قابو پانے کے بعد نہایت ظالمانہ برتاؤ کرتی تھیں اور انھیں پھر اپنے مذہب کا پیرو بنانا چاہتی تھیں، چنانچہ یونان کے عیسائیوں کو موروسینی کی حکومت کا ایسا ہی تلخ تجربہ ہوا اور اُنھوں نے اُس کی تعدیوں سے عاجز آکر بغاوت کردی، مصطفےٰ کوپریلی نے لائبرکس ([illegible]) نامی ایک یونانی کو جو سات سال سے ترکوں کی قید میں تھا آزاد کرکے ایک ترکی فوج کے ساتھ موریا روانہ کیا، باغیوں نے اس فوج کی مدد سے اہل وینس کو اپنے ملک سے نکال کر باہر کیا اور پھر بطیبِ خاطر دولت علیہ کی حمایت میں آگئے کیونکہ یہ اُن کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی تھی۔[۵۱]

---

۵۱ فریدبک ص۱۳۹،

مصطفیٰ کوپریلی کا طرزِ زندگی نہایت سادہ تھا اور نمود و نمائش سے اُسے بالطبع نفرت تھی، ضروری باتوں کے علاوہ وہ گفتگو نہ کرتا تھا، اس کے متعلق مشہور تھا کہ نہ اُس نے کبھی کوئی جرم کیا اور نہ کوئی غیر ضروری لفظ استعمال کیا، لڑائیوں میں دوسرے سپاہیوں کے ساتھ وہ عام طور پر پیدل ہی کوچ کرتا تھا، اس کا خیمہ اپنی سادگی اور بے تکلفی میں ممتاز رہتا تھا، مطالعہ سے اُسے خاص ذوق تھا، اور اس سے کبھی نہ تھکتا، حتیٰ کہ دورانِ جنگ میں بھی جب وہ اپنے خیمہ میں واپس آتا تو کتابیں دیکھا کرتا تھا، اُس کے اوصاف حمیدہ کی بنا پر لوگ اُسے "کوپریلی صالح" کے لقب سے پکارتے تھے،

مقدونیا کی فتح

مصطفیٰ کوپریلی کے تقرر کے وقت آسٹریا کی فوجیں مقدونیا تک پہنچ گئی تھیں اور وہاں کے عیسائی باشندے اپنے بطریق کی قیادت میں اُن کو مدد پہنچا رہے تھے، ایک عیسائی سردار کارپوس (Karpos) نے آسٹریا کی سرپرستی میں آزادی کا اعلان کر کے کرال (Kraal) کا قدیم لقب بھی اختیار کر لیا تھا، چنانچہ اب سلطنت عثمانیہ کے یورپین مقبوضات کے قلب پر حملہ شروع ہو گیا تھا، ان حالات میں کوپریلی نے ایک مجلس جنگ منعقد کی جس میں سلیم گرائی، خان کریمیا، اور ہنگرین سردار تیکلی بھی حاضر تھا، اور مجلس کا فیصلہ حاصل کرنے کے بعد خالد پاشا، سر عسکر موریا کی سرکردگی اور سلیم گرائی کی معیت میں ایک فوج مقدونیا کو روانہ کی، ترکی اور تاتاری فوجوں نے جرمنی آسٹریا اور البانیا کی متحدہ فوجوں کو دو معرکوں میں شکست دی اور کارپوس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، مقدونیا اور اس کے نواح کے وہ تمام اہم مقامات جن پر آسٹریا کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، ترکوں نے واپس لے لئے

مزید عثمانی فتوحات

مقدونیا کی فتوحات کے بعد کوپریلی نے دوسرے حصوں کے تحفظ کا

سامان شروع کیا اور اگست ۱۶۹۰ء میں ایک زبردست فوج کے ساتھ بلغاریا اور سرویا سے ہوتا ہوا آسٹرین فوجوں کے مقابلہ کے لئے بڑھا، صوفیا اور نِش کے درمیان ڈراگومان کے مقام پر دو روز تک سخت معرکہ رہا جس میں بالآخر آسٹرین فوجوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں، اس کے بعد مصطفےٰ کوپریلی نے نِش کا محاصرہ کر لیا اور صرف تین ہفتہ میں اسے فتح کر لیا، اُدھر ٹرانسلونیا میں تکیلی نے جسے ترکوں کی حمایت حاصل تھی تخت پر قبضہ کر کے دولت عثمانیہ کی سیادت کا اعلان کر دیا، نِش کو فتح کرنے کے بعد کوپریلی سمندریا کی طرف بڑھا، اور چار ہی روز میں اسے بھی فتح کر کے ودین پر دوبارہ قبضہ کر لیا، ودین کی فتح کے بعد اُس نے بلغراد کا محاصرہ کیا، اور محاصرہ کے بارہویں روز عثمانی لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا، اس اہم شہر میں ایک فوجی دستہ متعین کرنے کے بعد اور سرویا سے آسٹرین فوجوں کو نکال کر مصطفےٰ کوپریلی فاتح کی حیثیت سے قسطنطنیہ کو واپس ہوا، دار السلطنت میں اسکا استقبال بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا،

سلیمان کی وفات ۱۰ مئی ۱۶۹۱ء کو مصطفےٰ کوپریلی ایک تازہ لشکر کے ساتھ پھر آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ ہوا، لیکن اس جنگ کے ختم ہونے سے قبل ہی سلطان سلیمان ثانی کا انتقال ہو گیا،

احمد ثانی

سنہ ۱۱۰۲ھ تا سنہ ۱۱۰۶ھ مطابق سنہ ۱۶۹۱ء تا سنہ ۱۶۹۵ء

سلطان سلیمان ثانی کی وفات پر اس کا بھائی احمد ثانی ۱۳؍ جولائی سنہ ۱۶۹۱ء کو تخت نشین ہوا، اُس نے مصطفےٰ کوپریلی کو صدرِ اعظم کے عہدہ پر برقرار رکھا اور سلطنت کے تمام معاملات اُنہی کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے، کوپریلی نے عثمانی فوجیں بلغراد میں جمع کیں اور وہاں سے آسٹریا کی شاہی فوجوں کے مقابلہ کے لئے دریائے ڈینوب کے دائیں ساحل سے ہوتا ہوا شمال کی طرف بڑھا، ۱۹؍ اگست سنہ ۱۶۹۱ء کو سلانکیمان (Salankeman) کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، ساتھ ہی عیسائی اور ترکی بیڑوں میں بھی دریائے ڈینوب میں جنگ چھڑ گئی، ترکی بیڑے نے عیسائی بیڑے کو شکست دی لیکن اس فتح سے ترک فائدہ نہ اُٹھا سکے، کیونکہ بری جنگ میں اُنھیں سخت ہزیمت ہوئی، مصطفےٰ کوپریلی نے اپنے آزمودہ کار رفقاء کے مشورہ کے خلاف کمک کا انتظار کئے بغیر آسٹرین فوج پر حملہ کر دیا، جب اُس نے دیکھا کہ ترکوں کے قدم اُکھڑ رہے ہیں، تو خود تلوار لیکر عیسائی فوج کے قلب میں گھس گیا اور تیغ زنی کے جوہر دکھاتا ہوا مارا گیا، عثمانی فوجیں اُس کی شہادت کے بعد میدانِ جنگ میں ٹھہر نہ سکیں، اور بھاگ کھڑی ہوئیں، اس کے بعد آسٹریا کی ایک فوج نے ٹرانسلوینیا

پر حملہ کیا اور تکیلی کو وہاں سے نکال کر اُس علاقہ پر قبضہ کر لیا،

احمد ثانی کی بقیہ مدتِ سلطنت میں جنگ کا سلسلہ کم و بیش برابر جاری رہا، لیکن یہ تمام لڑائیاں چھوٹی تھیں اور اُن کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ہوئی اس میں جزیرہ سافز سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گیا، ان شکستوں اور اندرونی بغاوتوں کے علاوہ اس عہد میں وبا اور قحط کے بھی کئی حملے ہوئے سمرنا میں ایک بڑا زلزلہ آیا جس سے بہت نقصان پہنچا، اور پھر ستمبر ۱۶۹۳ء میں خود قسطنطنیہ میں ایک زبردست آگ لگی، جو اس زلزلہ سے بہت زیادہ بربادکن ثابت ہوئی ۲۲ر جمادی الثانی ۱۱۰۶ھ (۶ر فروری ۱۶۹۵ء) کو احمد ثانی نے انتقال کیا،

مصطفیٰ ثانی

سنہ ۱۱۰۶ھ تا سنہ ۱۱۱۵ھ مطابق سنہ ۱۶۹۵ء تا سنہ ۱۷۰۳ء

احمد ثانی کی وفات پر معزول سلطان محمد رابع کا لڑکا شہزادہ مصطفیٰ تخت نشین ہوا، یہ نہایت شجاع اور اولوالعزم فرماں روا تھا، تخت نشینی کے تیسرے ہی روز اُس نے ایک "خط شریف" جاری کیا جس میں سلطنت کے افسوسناک حالات بیان کرکے اُنھیں اپنے پیشروؤں کی غفلت اور عیش پسندی کا نتیجہ قرار دیا، اور اُن کی اصلاح کے لئے پوری آمادگی اور مستعدی ظاہر کی، اُس وقت آسٹریا، روس، وینس اور پولینڈ سے لڑائی کا سلسلہ کم و بیش جاری تھا، مگر سب سے زیادہ خطرہ آسٹریا کی طرف سے تھا، چنانچہ مصطفیٰ نے دیوان منعقد کرکے اعیانِ حکومت سے یہ دریافت کیا کہ غنیم کے مقابلہ میں فوجوں کا روانہ کردینا کافی ہوگا، یا اُسے خود بھی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں جانا چاہئے، تین دن تک غور و مشورہ کرنے کے بعد دیوان اس فیصلہ پر پہنچا کہ میدان جنگ میں سلطان کا جانا نہ صرف اُس کی ذات کو خطرہ میں ڈالنا ہے، بلکہ اس سے لشکر کے اخراجات میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوجائیگا، چنانچہ دیوان نے متفقہ طور پر یہ گذارش کی کہ ذاتِ سلطانی کو جنگ کے خطرات میں ڈالنا مناسب نہیں فوج کی کمان صدر اعظم کو سپرد کردینا کافی ہوگا، لیکن سلطان نے اس معروضہ کا صرف اس قدر جواب دیا

کہ "مجھے فوج کے ساتھ جانے پر اصرار ہے" چنانچہ اس عزم کے مطابق ۱۶۹۵ء کے موسم گرما میں وہ بلغراد سے تمیسوار کو روانہ ہوا، اور راستہ میں متعدد اہم قلعے جو آسٹریا کے قبضہ میں جاچکے تھے دوبارہ فتح کرلئے، ۲۲ ستمبر ۱۶۹۵ء کو آسٹریا کی فوج سے جو ویٹرانی (Veterani) کے زیر کمان تھی لیوگوس کے قریب مقابلہ ہوا، سلطان کو شاندار فتح ہوئی، اور ویٹرانی اور اُس کی نصف فوج ماری گئی،

جنگ کی تیاری موسم سرما میں جنگ ملتوی ہوگئی، اس فرصت میں مصطفےٰ اپنے وزراء کی مدد سے مالیات کی درستگی اور فوج کے اضافہ و تنظیم میں ہمہ تن مصروف رہا، اس نے تمباکو، حبشی خواجہ سرا، اور دیگر تعیشات پر بڑے بڑے ٹیکس عائد کیے، اکثر عمائدین سلطنت نے بھی وقت کی ضرورت اور سلطان کے جوش سے متاثر ہوکر سلطنت کی مدد میں سرگرمی دکھائی، اور آئندہ جنگ کے لئے فوجیں اکٹھا کیں جن کے مصارف اُنھوں نے خود برداشت کیے، مصطفےٰ نے قسطنطنیہ اور ادرنہ کے شاہی باغبانوں (بوستانجی) میں سے تین ہزار پیدل سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کی تھی جسے اس موقع پر اُس نے تین رسالوں میں تقسیم کرکے خاص اہتمام سے تعلیم دلوائی،

ابتدائی فتوحات ۱۶۹۶ء میں مصطفےٰ ایک زبردست فوج کے ساتھ پھر آگے بڑھا اور تمیسوار کے قریب آسٹرین فوج کو جو ڈیوک ڈی ساکس (Duke de Saxe) کی سرکردگی میں تھی شکست دیکر تمیسوار کو غنیم کے محاصرہ سے چھڑا لیا، اس کے بعد ہنگری کے اُن قلعوں کو جو ابھی دولت عثمانیہ کے قبضہ میں تھے، مزید فوجی دستوں سے مستحکم کرکے ادرنہ واپس آگیا، ان فتوحات سے ترکوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور اُنھیں ایک تازہ جوش پیدا ہوگیا، عثمانی فوجوں نے جو ایک عرصہ سے مدافعانہ جنگ میں بھی

پسپا ہوتی آرہی تھیں، اب فاتحانہ طور پر دشمن کے مقابلہ میں بڑھنا شروع کیا اور توقع کی جانے لگی، کہ مصطفےٰ ثانی کے مبارک عہد میں پچھلے عہدوں کی تلافی ہوجائیگی لیکن دوسرے سال ۱۶۹۷ء میں آسٹریا کے ساتھ جو معرکہ پیش آیا، اُس نے تمام امیدوں کو خاک میں ملادیا، اور سلطنت عثمانیہ کی ہیبت بالآخر یورپ کے دل سے نکل گئی، زنتا کی شکست، ۱۶۹۷ء میں مصطفےٰ ایک تازہ فوج کے ساتھ بلغراد سے روانہ ہوکر ہنگری میں داخل ہوا اور شمال میں دریائے تھائیس کی طرف بڑھا، آسٹریا کی فوجیں اسوقت شہزادہ یوجین (Eugene) کے زیر کمان تھیں جو اپنے عہد کا سب سے زیادہ مشہور جنرل تھا، ا۱ ستمبر کو دونوں فوجوں کا مقابلہ لبِ ساحل زنتا (Zenta) کے مقام پر ہوا، ترکوں نے وہاں ایک پل بنالیا تھا اور سلطان اپنے سواروں اور توپخانہ کے بڑے حصہ کے ساتھ دریا کو عبور کرکے اس کے دوسرے کنارہ پر پہنچ چکا تھا، لیکن پیدل سپاہی ابھی اسی کنارہ پر تھے، شہزادہ یوجین دفعۃً اُن کے سر پر آپہونچا اور اُن سپاہیوں پر جو اس وقت تک دریا کو عبور نہ کرسکے تھے حملہ کردیا، بدقسمتی سے ترکی فوج کے مختلف دستے اس وقت باہمی جھگڑوں میں مبتلا تھے، افسروں میں بھی اختلافات تھے، اور اُن میں سے بعض صدر اعظم الماس محمد پاشا سے بغض وعداوت رکھتے تھے، میدان جنگ ہی میں ینی چری کی ایک بڑی تعداد نے بغاوت کردی، اور خود اپنے افسروں کو قتل کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ترک شہزادہ یوجین کے حملہ کی تاب نہ لاسکے اور انھیں بری طرح شکست ہوئی، اُن کے چھبیس ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گئے اور دس ہزار دریا عبور کرنے کی کوشش میں غرق ہوکر ہلاک ہوگئے، ان کے علاوہ صدر اعظم، چار وزیر اور بہت سے فوجی افسر کام آئے، سلطان جو دریا کے

دوسرے کنارہ سے اس جنگ کو دیکھ رہا تھا، بھاگ کر تمیسوار پہنچا اور وہاں سے بلغراد ہوتا ہوا قسطنطنیہ واپس آگیا، اس کے بعد اُس کی بقیہ فوج بھی بلغراد سے ہو کر ادرنہ چلی آئی اس کے بعد شہزادہ یوجین دریائے ڈینوب کو عبور کرکے بوسنیا میں داخل ہوا، اور اُس کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، زنتا کی شکست ترکوں کی فوجی طاقت کے زوال کا ایک ایسا اعلان تھی جس کی آواز یورپ کے دور دراز گوشوں میں بھی جا پہنچی اور مغربی سلطنتیں آپ اپنے کو عثمانی حملوں سے بالکل محفوظ خیال کرنے لگیں،

حسین کوپریلی، جنگ زنتا کے چھ روز بعد سلطان مصطفےٰ ثانی پھر خاندان کوپریلی کی طرف متوجہ ہوا اور سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لئے اسی خاندان کے ایک فرد حسین کوپریلی کو صدر اعظم مقرر کیا، حسین کوپریلی صدر اعظم محمد کوپریلی کا بھتیجا تھا، اور اس میں انتظامِ سلطنت کا وہ غیر معمولی ملکہ جو کوپریلی خاندان کا نمایاں امتیاز تھا، بہت زیادہ پایا جاتا تھا، محاصرہ ویانا کی ناکامی تک حسین کوپریلی ایک آزاد مزاج نوجوان تھا، اور محض عیش و عشرت سے سروکار رکھتا تھا لیکن ویانا کی عبرتناک شکست کے بعد اُس نے اپنے قومی فرض کو محسوس کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو استعداد عطا فرمائی تھی، اُسے دولت علیہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا صدر اعظم کے عہدہ پر فائز ہونے سے پیشتر وہ مختلف اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکا تھا، اور اپنی لیاقت و اہلیت کا ثبوت دے چکا تھا ۱۶۹۷ء میں صدر اعظم مقرر ہونے کے بعد اُس نے سب سے پہلے سلطنت کی فوجی قوت کو سنبھالنے کی کوشش کی، اور اس سلسلہ میں مالیات کی طرف خاص توجہ کی، گذشتہ جنگ میں خزانہ پر بہت زیادہ بار پڑ چکا تھا، اُس کی تلافی کے لئے اُس نے مختلف تدبیریں اختیار کیں مثلاً پہلے کافی پر محصول لگایا، پھر حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں پر ایک قسم کا

انکم ٹیکس عائد کیا، اور آخر میں جائداد موقوفہ کی آمدنی سے بھی دولت علیہ کی شدید ضروریات کے لئے ایک بڑی رقم حاصل کی، اس طرح اُس نے کافی سرمایہ فراہم کر کے سلطنت کے یوروپین صوبوں کی حفاظت کے لئے پچاس ہزار پیادوں اور اڑتالیس ہزار سواروں کی ایک فوج تیار کر لی، اس کے علاوہ اُس نے ایک بیڑا بحر اسود میں بھیجا اور دوسرا بحر روم میں لیکن دراصل تمام تیاریاں اس نے مدافعت کے لئے کی تھیں، اور اُن سے کوئی جارحانہ اقدام مقصود نہ تھا، کیونکہ وہ سلطنت کی کمزوری سے خوب واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر جنگ پھر شروع ہو گئی تو اُس کا نتیجہ سلطنت کے حق میں مزید تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا، بہرحال ان تیاریوں کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ آسٹریا کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور ترکی فوج کے سپہ سالار دان طبان پاشا نے شہزادہ یوجین کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ اُس نے بوسنیا کو خالی کر دیا،

سقوط ازف اس درمیان میں وینس سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری تھا، اُس کی فوجیں ڈلماشیا میں آگے بڑھتی جا رہی تھیں، یونان میں اہل وینس کے قدم خاکنائے کورنتھ سے آگے پہنچ چکے تھے اگرچہ نگروپونٹ پر وہ قبضہ نہ کر سکے، اور ترکی امیر البحر نے اُنکے بیڑوں کو دو بار شکست دیکر جزیرہ کیوس (Chios) کو واپس لے لیا، پولینڈ سے گو اُس وقت کوئی جنگ نہ تھی، لیکن خان کریمیا کے حملے کو ابھی دو ہی سال گذرے تھے اور اہل پولینڈ دولت علیہ کے خلاف ہر ممکن موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے لیکن سب سے بڑا خطرہ روس کا تھا، پیٹر اعظم اپنی وسیع سلطنت کو روز بروز زیادہ طاقتور بنا رہا تھا، اس نے آسٹروی اور فرانسیسی فوجوں کے نمونہ پر ایک مضبوط فوج تیار کر لی تھی لیکن اصلی زور وہ بحری طاقت پر دے رہا تھا، کیونکہ وہ بحر اسود میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا

اسی مقصد کے لئے وہ دولت عثمانیہ کے خلاف پوری قوت سے جنگ کرنا چاہتا تھا، سب سے پہلے اُس نے ازف پر قبضہ کرنا چاہا اور ۱۶۹۵ء میں ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا، یہ محاصرہ ناکام رہا اور تیس ہزار سپاہیوں کی لاشیں میدان میں چھوڑ کر اُسے پسپا ہونا پڑا، لیکن دوسرے سال اس نے پھر تازہ فوجوں کے ساتھ شہر کا محاصرہ کیا، اور اس کے بحری بیڑے نے ترکی بیڑے کو شکست دی، اب کی بار محاصرہ کامیاب ہوا اور ۲۸ جولائی ۱۶۹۶ء کو ازف نے ہتھیار ڈال دیئے،

صلحنامہ کارلووٹز | غرض زنتا کی شکست کے وقت دولت علیہ ہر طرف دشمنوں سے گھری ہوئی تھی، اور حسین کوپریلی کے حسن انتظام کے باوجود اُس میں بیک وقت تمام دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی، حسین کوپریلی اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھا، چنانچہ جب سفیر برطانیہ لارڈ پیجیٹ (Lord Paget) نے برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت سے صلح کی تحریک کی اور شرطِ صلح یہ قرار دی کہ ہر فریق کا قبضہ اُس کی فتوحات پر قائم رکھا جائے تو حسین کوپریلی نے ایک دیوان منعقد کرکے اس مسئلہ کو ارکانِ حکومت کے مشورہ کے لئے پیش کیا، ذاتی طور پر وہ صلح کا حامی تھا، اور اُسی کی تحریک سے دیوان نے بھی برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت منظور کی، مگر صلح کا مذکورۂ بالا اُصول سلطان مصطفیٰ کے لئے کسی طرح قابلِ قبول نہ تھا، اور اُس نے اس کی منظوری چند اہم ترمیمات پر مشروط کردی، بالآخر یہ طے پایا کہ صلح کا مسئلہ ایک کانگریس کے سپرد کردیا جائے، جس میں دولت عثمانیہ، آسٹریا، روس، پولینڈ، وینس، برطانیہ اور ہالینڈ کے نمائندے شریک ہوں، اس کانگریس کے لئے کارلووٹز کا مقام تجویز ہوا، جو پیٹروارڈین کے قریب واقع تھا، ابتداءً روس کانگریس کی شرکت سے انکار کرتا رہا کیونکہ وہ ازف

کے علاوہ اور مقامات پر بھی قبضہ کرنے کا خواہشمند تھا، اور یہ لارڈ پیجٹ کے پیش کردہ
اصول کی بنا پر ممکن نہ تھا لیکن دوسری سلطنتوں نے مجبور کرکے اُسے بھی کانگرس میں
شریک کیا، بہتر روز کے بحث و مباحثہ کے بعد فی الجملہ لارڈ پیجٹ کے اصول کے مطابق
ایک صلحنامہ ۲۴ رجب ۱۱۱۰ھ (۲۶ جنوری ۱۶۹۹ء) کو مرتب کیا گیا، جو صلحنامہ کارلووٹز
(Carlowitz) کے نام سے مشہور ہے، اس کے رو سے آسٹریا کا قبضہ ٹرانسلوینیا
سلاوونیا اور ہنگری کے ان تمام علاقوں پر جو دریائے مروش کے شمال اور دریائے تھائیس
کے مغرب میں واقع تھے، قائم رکھا گیا، اب ہنگری میں عثمانیوں کے سابق مقبوضات
میں سے صرف ایک ثلث پر اُن کی حکومت باقی رہ گئی، آئندہ کے لئے وہ خراج
بھی موقوف کر دیا گیا جو شہنشاہ آسٹریا، ہنگری اور ٹرانسلوینیا کی طرف سے سلطان
کی خدمت میں پیش کرتا تھا، وینس کا قبضہ موریا اور البانیا پر باقی رکھا گیا، لیکن ابنائے کورنتھ
کے شمال میں جو مقامات اس نے فتح کئے تھے وہ لارڈ پیجٹ کے اصول کے باوجود
دولت عثمانیہ کو واپس دلا دیئے گئے، البتہ جزیرہ زنطہ کا خراج اُسے معاف کر دیا گیا،
پولینڈ کو پوڈولیا اور کامینک واپس مل گئے، روس کا قبضہ شہر ازوف اور بحر ازوف
کے شمالی علاقوں پر قائم رکھا گیا، لیکن پیٹر اعظم کو اس سے سیری نہ ہوئی اور اُس نے
صرف دو سال کے لئے اس صلحنامہ پر دستخط کئے، دوسری حکومتوں نے پچیس سال
کے لئے صلح کا معاہدہ کیا،

صلحنامہ کارلووٹز کی نسبت کریسی آل عثمان کے مشہور جرمن مورخ فان ہیمر
کی رائے نقل کرتا ہے، کہ یہ صلحنامہ نہ صرف اس وجہ سے یادگار رہے گا کہ اُس نے اہم
ملکی تبدیلیوں کو برقرار رکھا، اور نہ محض اس وجہ سے کہ اس کے بعد ہی سلطنت عثمانیہ

کی فاتحانہ طاقت کا رعب دلوں سے زائل ہوگیا، بلکہ اس وجہ سے بھی یادگار رہے گا کہ اس موقع پر باب عالی اور روس نے پہلی بار ایک عام یورپین کانگریس میں شرکت کی اور اس کانگریس میں برطانیہ اور ہالینڈ کے نمایندوں کو داخل کرکے جب کہ ان دونوں میں سے کوئی حکومت بھی جنگ میں شریک نہ تھی، سلطان اور زار روس دونوں نے اس اُصول کو تسلیم کرلیا کہ مفاد عامہ کے لئے یورپ کی حکومتیں دوسری سلطنتوں کے باہمی نزاعات میں دخل دے سکتی ہیں،

ملکی اصلاحات | صلحنامہ کارلووٹز کے تکملہ کے بعد حسین کوپریلی نے سلطنت کے اندرونی معاملات کی جانب توجہ کی، گذشتہ جنگ کے آخری سالوں میں کریمیا، مصر اور عرب میں بغاوت شروع ہوگئی تھی ایران کی سرحد پر بھی بہت شورش تھی حسین کوپریلی نے ان تمام بغاوتوں کا استیصال کرکے سلطنت کے ہر حصہ میں امن وامان قائم کیا، اس کے بعد اُس نے حکومت کے ہر شعبہ کی اصلاح شروع کی، چنانچہ فوج، بحریہ، مالیات، مدارس وجوامع، اوقاف، تمام شعبوں میں اصلاحات جاری کیں، بحریہ کے لئے اُس نے ایک جدید "قانون نامہ" مرتب کیا، کوپریلی کو عیسائی رعایا کی بہبودی کا خاص طور پر خیال رہتا تھا اور وہ اُن کے ساتھ بڑی رعایتیں کرتا تھا چنانچہ اُس نے بوسینا اور بنات کے عیسائیوں کا ایک سال کا جزیہ معاف کردیا، اور روسیلیا کی عیسائی رعایا کے ذمہ جو محصول باقی تھا وہ بھی چھوڑ دیا، اُس نے مسجدیں، مدرسے، بازار اور چھاؤنیاں سلطنت کے ہر حصہ میں بہت کثرت سے تعمیر کرائیں، لیکن ان تمام خدمات کے باوجود بعض دشمنوں نے اُس کے خلاف سلطان کے کان بھرنا شروع کیے، یہ دیکھکر حسین کوپریلی نے ستمبر ۱۷۰۲ء میں اپنے عہدہ سے استعفا دیدیا، چند ہی دنوں کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا

دال طباں پاشا، حسین کوپریلی کی وفات پر سلطان نے دال طباں پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، وہ ایک جنگجو سپاہی تھا اور جنگ کے علاوہ کسی اور بات سے دلچسپی نہ رکھتا تھا، اُس نے معاہدہ کالووٹز کو چاک کر ڈالنا چاہا، لیکن رعایا اور فوج دونوں اُس کی پالیسی کو سلطنت کے لئے مضر خیال کرتے تھے، اور دونوں نے مل کر سلطان سے اُس کی معزولی کی درخواست کی، مفتی فیض اللہ بھی جو ابتداءً اس کا طرفدار تھا بعد میں سخت مخالف ہو گیا، اور اسی کی کوشش سے دال طباں پاشا معزول کر دیا گیا،

مصطفےٰ کی معزولی، دال طباں پاشا کے بعد رامی محمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، وہ حسین کوپریلی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا، چنانچہ اُس نے اُن مفاسد کی اصلاح شروع کی جو کوپریلی کے بعد پھر سلطنت میں رونما ہونے لگے تھے، اس سلسلہ میں بہت سے لوگ جنکو نقصان پہنچ رہا تھا اُس کے مخالف ہو گئے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے، چونکہ وہ کوئی ممتاز فوجی افسر نہ تھا، اس لئے ینی چری بھی اُس سے خوش نہ تھے اور بعض مفسدوں کے اُبھارنے پر اُنھوں نے سلطان سے اُس کی معزولی کا مطالبہ کیا، اس مطالبہ نے جنوری ۱۷۰۳ء میں بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور قسطنطنیہ ینی چری کی شورشوں کا مرکز بن گیا، فوج نے رامی محمد پاشا کے علاوہ مفتی فیض اللہ کی معزولی کا بھی مطالبہ کیا، سلطان اُس وقت ادرنہ میں تھا، اُسنے مفتی فیض اللہ کو تو معزول کر دیا لیکن رامی محمد پاشا کا معاملہ اپنے قسطنطنیہ پہنچنے تک ملتوی رکھا، باغیوں نے اب خود سلطان کے عزل کی تحریک کی اور علما سے اس کے متعلق فتویٰ حاصل کر لیا، سلطان نے اپنا خاص ینی چری دستہ باغیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا، لیکن یہ دستہ بھی انھی میں شامل ہو گیا، یہ دیکھکر مصطفےٰ ۲ ربیع الاول ۱۱۱۵ھ (۱۵ اگست ۱۷۰۳ء) کو تخت سے اتر آیا، اور باغیوں نے اُس کے

بھائی احمد کو تخت پر بٹھایا، اسی سال ۲۲ شعبان (۳۱ دسمبر ۱۷۰۳ء) کو مصطفےٰ کا انتقال ہو گیا

سلطان مصطفےٰ ثانی ایک دانشمند اور بیدار مغز سلطان تھا، ابتدائے عہد میں اُس نے بڑی ہمت اور شجاعت کا ثبوت دیا، اور متعدد اہم فتوحات حاصل کیں، لیکن زنتا کی شکست کے بعد سلطنت کی فوجی قوت اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ آسٹریا سے کامیاب مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا، ایسی حالت میں صلح کے لئے راضی ہو جانا مصلحتِ وقت کے عین مطابق تھا، بعض یوروپین مورخین مصطفےٰ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ معاہدہ کارلووٹز کے بعد اس کی جنگی سرگرمیاں بالکل موقوف ہو گئیں اور وہ عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سلطنت میں جنگ کی طاقت نہ تھی، علاوہ بریں ہر طرف بغاوت برپا تھی، جس کا استیصال نہایت ضروری تھا، نیز حکومت کے تمام شعبے اصلاح کے محتاج تھے، مصطفےٰ نے انہی امور کی طرف اپنی توجہ رکھی اور صدر اعظم حسین کوپریلی کی مدد سے انہی کا تکملہ کیا، جب وہ ان اصلاحات سے فارغ ہوا تو دال طبان پاشا اور رامی محمد پاشا کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے، اور ان کے بعد ہی فوج نے خود اُس کی معزولی کا مطالبہ کیا، ان حالات میں اُس نے جو کچھ سلطنت کے لئے کیا اس سے زیادہ ممکن بھی نہ تھا،

احمد ثالث

۱۱۱۵ھ تا ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء

سلطان احمد ثالث کی تخت نشینی ینی چری کی بغاوت کا نتیجہ تھی، اس لئے تخت پر آنے کے بعد اُس نے بہت کچھ انعام و اکرام دیکر باغیوں کو راضی کیا، اور اُن کے مطالبہ پر مفتی فیض اللہ آفندی کے قتل کی اجازت دیدی، مفتی موصوف کا جرم یہ تھا کہ وہ اس فوج کی خودسری کے مخالف تھے لیکن یہ خون جلد رنگ لایا اور سلطان نے قابو پانے کے بعد ینی چری سے پورا قصاص لیا، اور اُن کے بہت سے افسروں کو قتل کرا دیا، اُس نے احمد پاشا، صدر اعظم کو جو باغیوں کا منتخب کردہ تھا معزول کر دیا، اور اس عہدہ پر اپنے بہنوئی داماد حسن پاشا کو مامور کیا، لیکن سازشوں نے حسن پاشا کی صدارت کو بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہنے دیا، اور وہ بھی معزول کر دیا گیا، اس کے بعد متعدد اشخاص صدر اعظم مقرر ہوئے اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد علیحدہ کر دیئے گئے، چنانچہ اس عہد کے ابتدائی پندرہ سالوں میں بارہ صدر اعظم یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ بیرا عظم کی خارجی پالیسی کی طرف جیسی توجہ کرنی چاہیئے تھی دولت علیہ نہ کر سکی اور روس کی طاقت بڑھتی ہی چلی گئی،

روس سے جدید معاہدہ

۱۷۰۰ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا

پیٹر اس پر دیانتداری کے ساتھ قائم نہ تھا، وہ اپنی مملکت کے جنوبی صوبوں میں جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا، احمد ثالث نے تخت نشینی کے بعد پیٹر کو اس امر کی شکایت لکھ بھیجی لیکن سلطنت کے اندرونی اختلال کی وجہ سے جو ینی چری کی سرکشی کے باعث شروع میں پیدا ہوگیا تھا، وہ کسی جنگی مظاہرہ کے لئے تیار نہ تھا، روس بھی سوئڈن سے طاقت آزمائی کر رہا تھا اور دولت عثمانیہ سے کوئی نئی جنگ چھیڑ دینا اُس کی مصلحت کے بھی خلاف تھا، چنانچہ ۱۷۰۰ء میں دونوں سلطنتوں میں ایک جدید معاہدہ ہوا، اور جنگ کچھ دنوں کیلئے پھر ملتوی ہوگئی، تاہم دولت علیہ روس کی نقل وحرکت سے غافل نہ تھی اور بحر اسود کے ساحل پر پیٹر جو نئے قلعے تعمیر کرا رہا تھا، اون کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی،

چارلس دوازدہم پیٹر کی زیادہ تر توجہ فی الحال سوئڈن کیجانب تھی جس کا فرماں روا چارلس دوازدہم نہایت بہادری کے ساتھ روس کی پوری طاقت کا مقابلہ کر رہا تھا، ترکوں کو چارلس کے ساتھ بہت ہمدردی تھی لیکن روس کے ساتھ جو معاہدہ ہو چکا تھا اُسکی وجہ سے وہ چارلس کی مدد کرنے سے معذور تھے، ۸ جولائی ۱۷۰۹ء کو پلٹوا (Poltava) کے مقام پر چارلس کو سخت شکست ہوئی، اور اُس نے بھاگ کر سلطنت عثمانیہ کے حدود میں پناہ لی، سلطان احمد ثالث نے اُس کا استقبال شاہانہ احترام کے ساتھ کیا، لیکن اُسکی حمایت میں پیٹر سے جنگ شروع کر دینے پر تیار نہ ہوا، البتہ جب پیٹر نے یہ خواہش کی کہ چارلس کو پناہ نہ دیجائے تو سلطان نے صاف جواب دیدیا کہ آئین شرافت کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور پیٹر کی دھمکیوں کی ذرا بھی پروانہ کی،

روس سے اعلان جنگ پلٹوا کے معرکہ کے بعد پیٹر نے لیو و نیا (Livonia) کو فتح کیا جس سے بحر بالٹک میں داخل ہونے کی راہ کھل گئی، اس کے بعد وہ دولت علیہ

کی طرف متوجہ ہوا اور بحر اسود میں دخل حاصل کرنے کے لئے کریمیا پر حملہ کی تیاری کرنے لگا، ازف کے قلعہ اور بحر ازف کے شمالی مشرقی ساحل پر اس کا قبضہ پہلے سے تھا اُس نے تگنروگ (Taganrog) اور دوسرے قلعوں کو جن سے کریمیا پر زد پڑتی تھی مستحکم کر لیا تھا، سلطان پیٹر کی ان جنگی تیاریوں کو دیکھ رہا تھا، دونوں سلطنتوں کے تعلقات چارلس کے قیام کی وجہ سے اور زیادہ کشیدہ ہو گئے تھے، وہ برابر سلطان کو روس سے جنگ کرنے کے لئے ابھار رہا تھا، سلطان پر ابتدا میں اُسکی ترغیبوں کا اثر نہ پڑا، لیکن جب خان کریمیا نے آستانہ میں حاضر ہو کر اُن تمام خطرات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جو پیٹر کی تیاریوں نے پیدا کر دیئے تھے تو بالآخر مجبور ہو کر اُس نے ۲۰ نومبر ۱۷۱۰ء کو روس سے جنگ کا اعلان کر دیا، ۲۵ فروری ۱۷۱۱ء کو پیٹر کی طرف سے بھی ماسکو کے سب سے بڑے کلیسا میں ترکوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا گیا، اُس نے اس جنگ کو ایک مذہبی جنگ قرار دیا، جس کا مقصد یورپ سے ترکوں کو نکال دینا تھا، روسی علم کے ایک جانب صلیب کی تصویر بنی ہوئی تھی، اور دوسری جانب یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:- "خدا اور مسیحیت کے لئے"

مئی ۱۷۱۱ء میں صدر اعظم بلطہ جی محمد پاشا عثمانی فوجوں کے ساتھ مولڈیویا کی طرف روانہ ہوا، جس کا امیر دولت علیہ سے غداری کر کے پیٹر سے مل گیا تھا، اور پیٹر اس کی مدد سے بلقان کی سلافی قوموں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اُبھار رہا تھا[1]، چنانچہ پیٹر بھی اپنی فوج لیکر مولڈیویا میں داخل ہوا، روسی فوجوں کی تعداد عثمانیوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی تاہم پیٹر

[1] سوانح پیٹر اعظم از اسٹیفن گرہیم مطبوعہ لندن ۱۹۲۹ء، ص ۱۹۸۔

اپنے جوش میں آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ دریائے پرتھ کو عبور کرکے اس کے ساحل پر خیمے نصب کر دیئے، وہاں پہنچکر اسے اپنی غلطی معلوم ہوئی کیونکہ اُس کے ایک بازو پر دریائے پرتھ اور دوسرے پر ایک وسیع دلدل تھا، اور سامنے کی پہاڑیوں پر بلطہ جی محمد پاشا اپنی فوجوں کے ساتھ قابض تھا، روسی فوجیں عثمانی توپوں کی زد میں آچکی تھیں جن سے بچ کر دریا کو عبور کرنا ممکن نہ تھا،

زار کا حال زار | پیٹر کو اپنے سپاہیوں کی ہلاکت اور اپنی گرفتاری کا پورا یقین تھا اس موقع پر اُس نے جو خط روسی سینٹ (مجلس قومی) کے نام ماسکو روانہ کیا تھا اس سے اسکی بیچارگی اور مایوسی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"میں تمکو اطلاع دیتا ہوں کہ جھوٹی خبر سے فریب کھا کر اور اپنی کسی غلطی کے بغیر میں اپنے کو اس حالت میں پاتا ہوں کہ ترکی فوج نے مجھے خود میرے لشکر میں بند کر رکھا ہے، ہمارے سامانِ رسد کی فراہمی منقطع کر دی گئی ہے اور ہمیں ہر لحظہ ہلاکت یا قید ہو جانے کا خطرہ ہے، بجز اس کے کہ خدا کسی غیر متوقع طریقہ پر ہماری مدد کر دے، اگر میں ترکوں کے ہاتھ گرفتار ہو جاؤں تو پھر تم مجھے اپنا زار اور فرمانروا نہ سمجھنا، اور نہ میرے کسی حکم کی پروا کرنا جو میری طرف سے تمھارے پاس پہنچایا جائے خواہ تم میرے خط کو پہچان ہی کیوں نہ لو، بلکہ خود میری آمد کے منتظر رہنا، اگر میں یہاں ہلاک ہو جاؤں اور تمھیں میری وفات کی تصدیق شدہ اطلاع ملے تو اُس وقت تم میرا جانشین اُس شخص کو منتخب کر لینا جو تم میں سب سے زیادہ اہل ہو[1]"

صلحنامہ پرتھ | پیٹر اور اُس کی فوج کی حالت ایسی ہی تھی، روسی تمام تر ترکوں کے

---

[1] لارڈ ایورسلے ص ۱۹۳،

رحم وکرم پر تھے اگر ترک چاہتے تو انھیں قتل کر ڈالتے یا گرفتار کر لیتے، ایسے نازک وقت میں جب خود پٹیر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ مایوس ہو کر اپنے خیمہ میں پڑا ہوا تھا اسکی بیوی کیتھرائن نے کمال ذکاوت اور دانشمندی سے ایک ایسی راہ نکالی جس سے پٹیر اور اسکی فوج کو سلامتی کے ساتھ روس واپس چلے جانے کا موقع مل گیا، اُس نے اپنے تمام زیورات اور جو کچھ نقد لشکر میں جمع ہو سکا سب اکٹھا کر کے صدر اعظم کے نائب کے پاس عثمانی لشکر میں بھیجا اور درخواست کی کہ صلح کی گفتگو کے لئے جنگ چند دنوں تک ملتوی کر دیجائے، نائب کی سفارش سے صدر اعظم بلطہ جی محمد پاشا اس گفتگو کے لئے راضی ہو گیا، پٹیر کے حریف چارلس دوازدہم کا نمایندہ کاونٹ پونیا ٹوسکی (Count Poniatowski) اور خان کریمیا عثمانی لشکر میں موجود تھے، اور دونوں نے ایسے نادر موقع پر جب کہ پٹیر اُن کی مٹھی میں آ چکا تھا صلح کرنے کی نہایت شدید مخالفت کی لیکن صدر اعظم نے اُن کی مخالفت کے باوجود ایسے شرائط پر صلح کر لی جو اُسکی دانست میں سلطنت عثمانیہ کے لئے نہایت مفید تھے، چنانچہ ۲۱ر جولائی ۱۷۱۱ء کو صلحنامہ مرتب ہو گیا، صلحنامہ میں دفعات کو درج کرنے سے پہلے یہ الفاظ لکھے گئے "اللہ تعالی کے فضل وکرم سے فتحمند اسلامی فوج نے زار روس کو اُسکی تمام فوجوں کے ساتھ دریائے پرتھ کے قریب گھیر لیا ہے، اور زار نے صلح کی درخواست کی ہے، اور اُسی کی درخواست پر مندرجہ ذیل دفعات مرتب اور منظور کیجاتی ہیں"

(۱) زار نے قلعہ ازف اور اُس کے ملحق علاقوں سے اپنا قبضہ اُٹھا لینا منظور کیا اور اُن کو اسی حالت میں سلطنت عثمانیہ کے حوالہ کر دینے کا وعدہ کیا جس حالت میں اُس نے اُن پر قبضہ کیا تھا،

(۲) زار نے منظور کیا کہ اُس کا نیا شہر تگنروگ جو بحر ازف پر واقع تھا، نیز اُس علاقہ کے بعض دوسرے قلعے جو اُس نے تعمیر کرائے تھے سب مسمار کر دیئے جائیں اور پھر کبھی تعمیر نہ ہوں، علاوہ بریں کمینسکی (Kermienssee) میں اُس نے جو توپیں اور فوجی سامان اکٹھا کئے تھے وہ سب باب عالی کو دیدیئے جائیں،

(۳) زار نے معاہدہ کیا کہ آیندہ وہ اہل پولینڈ یا اُن قزاقوں کے معاملات میں جو پولینڈ یا خان کریمیا کے محکوم ہیں، دخل نہ دیگا، اور ان کے علاقوں سے روسی فوجیں ہٹا لیگا،

(۴) چوتھی دفعہ میں تجارت کو آزاد قرار دیا گیا، لیکن یہ شرط رکھی گئی کہ آیندہ کوئی روسی سفیر قسطنطنیہ میں مقیم نہ ہوگا، کریسی لکھتا ہے کہ اس شرط کی وجہ غالباً وہ سازشیں تھیں جو روس یونانیوں اور دولت عثمانیہ کی دوسری عیسائی رعایا سے کرتا رہتا تھا،

(۵) اہل روس اُن مسلمانوں کو آزاد کردیں جن کو اُنھوں نے دوران جنگ میں یا جنگ سے قبل گرفتار کرلیا ہے،

(۶) شاہ چارلس کو روس سے ہو کر اپنے ملک سوئڈن جانے کی اجازت دیگئی اور زار نے معاہدہ کیا کہ راستہ میں اُس سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کیجائیگی، اس دفعہ میں اس امر کی بھی سفارش کی گئی کہ روس اور سوئڈن باہم صلح کرلیں،

(۷) باب عالی کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ آیندہ وہ اہل روس کو کوئی نقصان نہ پہنچائیگا، اور اسی طرح اہل روس کی طرف سے یہ معاہدہ ہوا کہ وہ سلطان کی رعایا اور ماتحتوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں گے،[1]

جب اس صلحنامہ کی خبر قسطنطنیہ پہنچی اور معلوم ہوا کہ پیٹر اس طرح قبضہ میں آکر

---

[1] کریسی جلد ۲ صفحہ ۱۲۲-۲۳،

صاف نکل گیا تو سلطان سخت برہم ہوا، بلطہ جی محمد پاشا واپسی پر صدارت کے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا، اور اس کے نائب عثمان اور رئیس آفندی عمر کو جن کے متعلق خیال تھا کہ یہ صلح انہی کی کوششوں سے عمل میں آئی ہو سلطان نے قتل کرا دیا۔ اُس نے صلحنامہ کے منظور کرنے سے بھی انکار کر دیا، اور روس سے پھر جنگ کی تیاری شروع کر دی لیکن بعض وزرائے سلطنت اور زیادہ تر سفیر برطانیہ سرسٹن (Sir R. Sutton) کے مشورہ سے سلطان جنگ سے باز رہا، اور دو سال بعد زار روس کے ساتھ ایک دوسرا صلحنامہ مرتب کیا گیا جس میں بلطہ جی محمد پاشا کے صلحنامہ کی تمام دفعات شامل تھیں،

بلطہ جی کا جرم اکثر مورخین نے بلطہ جی کے صلحنامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس پر بد دیانتی کا الزام عائد کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ اُس نے کیتھرائن کی رشوت قبول کر کے دولت علیہ کے مفاد کو نظر انداز کر دیا اور زار روس اور اُس کی پوری فوج پر قابو پانے کے بعد اُن کو یوں ہاتھ سے نکل جانے دیا، لارڈ ایورسلے نے صدر اعظم کی مدافعت میں جو باتیں پیش کی ہیں اُن سے یہ الزام دور ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ جو شخص صدارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہوا اور اُسے دولت پیدا کرنے کے بڑے سے بڑے مواقع حاصل ہوں وہ کیتھرائن کی پیش کردہ نہایت حقیر رقم کے لئے اپنی ذات اور اپنے ملک کو فروخت کر دینے پر آمادہ ہو گیا ہو، یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ زارینہ نے وہ تحائف صدر اعظم کے نائب کی خدمت میں بھیجے ہوں، تا کہ وہ سفارش کر کے صلح کی گفتگو کی اجازت حاصل کر لے، بلطہ جی نے جن شرائط پر صلح کی اُن سے بہتر شرائط اس کے خیال میں ممکن نہ تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ زار روس اور اُسکی فوج کو گرفتار اور ہلاک کر سکتا تھا لیکن اس سے روسیوں میں نہایت سخت اشتعال پیدا ہو جاتا اور

وہ انتقام کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے، یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ سلطان نے عثمان اور رئیس آفندی کو توقتل کرادیا، لیکن بلطہ جی محمد پاشا کو جس کے دستخط سے صلحنامہ کا نفاذ ہوا تھا، صرف معزول کردیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے بلطہ جی کو پہلے ہی سے صلح کے اختیارات دے رکھے تھے، بظاہر سلطان کا قصد علاقہ ازف سے آگے بڑھکر سلطنت روس میں اپنے مقبوضات کا دائرہ بڑھانے کا نہ تھا، پھر جنگ کو جاری رکھنے میں ان سے بہتر کن شرائط پر صلح ہوسکتی تھی؟

بعض مورخین کا خیال ہے کہ بلطہ جی محمد پاشا نے جن شرائط پر صلح کی تھی وہ روس کے لئے اس درجہ باعثِ ننگ تھے، کہ اس عار کو دور کرنے کے لئے روس کی طرف سے جنگ کا پھر چھیڑا جانا لازمی اور ناگزیر تھا، لیکن خود پیٹر کا خیال اس سے مختلف تھا، رہائی کے بعد اُس نے نئی جنگ کے لئے کوئی آمادگی ظاہر نہیں کی، برخلاف اس کے معاہدہ پرتھ کے دو سال بعد اُس نے دولت عثمانیہ کے ساتھ ایک دوسرا معاہدہ بھی کیا جس کی دفعات روس کے لئے ویسی ہی سخت تھیں، اُس نے اپنے عہد کی بقیہ مدت میں کوئی معاہدہ شکنی نہ کی، بلکہ چند سالوں کے بعد سلطنت ایران کے ایک بڑے حصہ کی تقسیم کے لئے دولت علیہ کے ساتھ ایک نئے معاہدہ میں شریک ہوگیا،[1] پچیس سال تک روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان پھر کوئی جنگ پیش نہیں آئی،

موریا کی فتح ۱۱۲۷ھ ۱۷۱۵ء میں صدر اعظم داماد علی پاشا نے موریا پر حملہ کیا جو معاہدہ کارلووٹز کے رو سے سلطنت عثمانیہ سے چھین کر جمہوریہ وینس کو دیدیا گیا تھا، معاہدۂ مذکور کے وقت دولت علیہ اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ وہ اس قدیم مقبوضہ کے تحفظ سے بالکل معذور

[1] ایورسلے ص ۱۹۶-۱۹۵،

تھی، لیکن اب جب کہ اُس کی طاقت بہت کچھ بڑھ چکی تھی، اور خیال تھا کہ سلطنت آسٹریا جس کی حمایت سے جمہوریہ وینس موریا پر قبضہ پانے میں کامیاب ہوئی تھی، اس جنگ میں دخل نہ دیگی، موریا کو واپس لے لینے کا موقع بہت اچھا تھا، معاہدہ کارلووٹز میں جمہوریہ وینس بھی شریک تھی، اس لئے باب عالی بغیر کسی معقول عذر کے اُس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا، اتفاق سے نقضِ عہد خود وینس کی طرف سے پیش آیا، اس نے مونٹی نیگرو کے باشندوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرنے میں مدد پہنچائی، داماد علی پاشا کے لئے جو اپنی جنگجوئی اور شجاعت میں مشہور تھا یہ عذر کافی ہوا اور وہ فوج جو روس کی جنگ کے لئے تیار کی گئی تھی موریا کے محاذ پر بھیجدی گئی، جنگ کی ابتدا محاصرہ کورنتھ سے ہوئی، تین ہفتہ کی مدافعت کے بعد ۵ جولائی ۱۷۱۵ء کو کورنتھ نے ہتھیار ڈال دیئے، اس کے بعد عثمانی فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر پورے موریا میں پھیل گئی، اور جمہوریہ وینس کے تمام قلعوں کو مثلاً موڈن کورن اور نوارینو کے بعد دیگرے فتح کر لیا، صرف ایک سو ایک روز کی مدت میں سارا موریا فتح ہو گیا، وہاں کے یونانی باشندوں نے اہلِ وینس کو بالکل مدد نہ دی، بر خلاف اس کے اُنھوں نے اپنے سابق آقاؤں کے ظلم و تعدی سے بچنے کیلئے ترکوں کا استقبال کیا،[1]

آسٹریا سے جنگ

داماد علی پاشا کا قصد تھا کہ موریا کی فتح کے بعد کارفو اور بحر یونان کے دوسرے جزیروں پر بھی جو وینس کے زیر حکومت تھے قبضہ کر لے مگر اس موقع پر چارلس ششم شہنشاہ آسٹریا، درمیان میں آگیا اور اوائل ۱۷۱۶ء میں اُس نے دولت علیہ کے خلاف جمہوریہ وینس سے اتحاد کر لیا، چارلس کا یہ فعل باب عالی کے لئے سخت اشتعال کا باعث ہوا، اور صدر اعظم داماد علی پاشا نے اسے معاہدہ کارلووٹز کی صریح خلاف ورزی

[1] ایورسلے ص ۱۹۷،

قرار دیکر دیوان سلطنت میں جنگ کی تجویز پیش کی، آسٹریا کے مقابلہ میں سابق شکستوں کی یاد ہنوز اتنی تازہ تھی کہ اس مسئلہ پر بہت زیادہ بحث و مباحثہ ہوا، لیکن بالآخر مفتی اعظم نے صدر اعظم کی تجویز کے موافق رائے دی اور آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا گیا، داماد علی پاشا ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ روانہ ہوکر بلغراد پہنچا، بلغراد سے پوری فوج پیٹرو ارڈین کی طرف روانہ ہوئی اور وہیں ۱۰ اگست ۱۷۱۶ء کو آسٹریا کی فوج سے مقابلہ ہوا جس کا امیر عسکر مشہور سپہ سالار شہزادہ یوجین تھا، ابتدا میں عثمانیوں کو نمایاں کامیابی ہوئی لیکن شہزادہ یوجین کے مخصوص دستہ نے جو اس وقت تک محفوظ رکھا گیا تھا، دفعۃً حملہ آور ہوکر جنگ کا نقشہ بدل دیا اور ترکوں کے قدم اکھڑ گئے، داماد پاشا نے یہ دیکھکر اپنے سرداروں کی ایک جماعت ساتھ لی، اور اس مقام پر جہاں لڑائی گھمسان کی ہورہی تھی ٹوٹ پڑا، لیکن اس کی حیرت انگیز شجاعت اور جانبازی فوج کے اکھڑے ہوئے قدم کو نہ روک سکی، اور وہ خود ایک کاری زخم کھاکر گر گیا اس کے ساتھی اسے اٹھاکر کارلووٹز لے گئے جو پیٹرو ارڈین سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھا لیکن وہ اس زخم سے جانبر نہ ہوسکا، اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا،

داماد پاشا کے زخمی ہونے کے بعد ترکوں کی ہمت پست ہوگئی، اور وہ میدان چھوڑ کر بلغراد کی طرف بھاگے، یوجین نے ان کے خیموں پر قبضہ کرلیا، مال غنیمت میں ایک سو چالیس توپیں بھی ہاتھ آئیں،

اس کے بعد یوجین نے تمیسوار کا رخ کیا، جو ہنگری میں ترکوں کا آخری اہم قلعہ تھا، چنانچہ پیٹرو ارڈین کی لڑائی کے بیس روز بعد اس نے تمیسوار کا محاصرہ کرلیا، پانچ ہفتہ کے محاصرہ کے بعد ۲۵ نومبر ۱۷۱۶ء کو قلعہ نے ہتھیار ڈالدیئے، اس سال آسٹریا سے

پھر کوئی جنگ نہیں ہوئی، اس درمیان میں وینس سے بھی لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، چونکہ عثمانی فوجوں کا بڑا حصہ آسٹریا سے جنگ کرنے میں مصروف تھا، اس لئے وینس کے مقابلہ میں زیادہ کامیابی نہ ہوسکی اور کارفو کا محاصرہ اُٹھا لینا پڑا،

بلغراد دوسرے سال ۱۷۱۷ء میں صدر اعظم خلیل پاشا کے زیر قیادت ایک دوسری زبردست فوج آسٹریا کے مقابلہ میں قسطنطنیہ سے روانہ ہوئی، شہزادہ یوجین نے آگے بڑھکر بلغراد کا محاصرہ کرلیا، تین ہفتہ کے بعد عثمانی فوج نمودار ہوئی، اور اس نے خود محاصرہ کرنے والوں کو گھیر لیا، یوجین کے لئے یہ وقت نہایت نازک تھا، بلغراد کا محفوظ عثمانی دستہ اس کے سامنے تھا، اور خلیل پاشا کی پوری فوج اس کی پشت پر تھی، اس میں شبہہ نہیں کہ اگر خلیل پاشا فوراً ہی حملہ کردیتا تو کامیابی یقینی تھی، لیکن اس نے تاخیر سے کام لیا اور آسٹریا کی فوج کے گرد ایک حصار قائم کرنے کی کوشش کی، یوجین سمجھتا تھا کہ اگر یہ حصار قائم ہوگیا تو سامانِ رسد کا فراہم ہونا محال ہوجائیگا، اور پھر اس کے لئے کچھ عرصہ کے بعد ہتھیار ڈالدینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہجائے گا، اس خطرہ کو پیش نظر رکھ کر اس نے غیر معمولی جرأت سے کام لیا اور ۱۶؍ اگست ۱۷۱۷ء کو خلیل پاشا کی فوج پر دفعۃً خود حملہ کردیا، خلیل پاشا اس غیر متوقع اور اچانک حملہ کے لئے تیار نہ تھا، عثمانیوں کے پیر اکھڑ گئے اور اپنی کثرت کے باوجود انھیں ہزیمت اُٹھانی پڑی، ان کے بیس ہزار سپاہی مقتول اور زخمی ہوئے، ایک سو تیس توپیں اور آلاتِ حرب کا ایک نہایت وافر ذخیرہ دشمنوں کے ہاتھ آیا، دوسرے روز بلغراد اور اس کے فوجی دستہ نے بھی ہتھیار ڈالدئیے اور قلعہ یوجین کے حوالہ کردیا،

بلغراد کی فتح کے بعد آسٹریا کی فوجیں آگے بڑھکر سرویا اور مغربی ولاچیا کے بڑے

حصہ پر قابض ہوگئیں، اُنھوں نے سرویا کے باشندوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کی مگر بارہ ہزار سے زیادہ آدمیوں نے اُن کا ساتھ نہ دیا، کیونکہ سرویا کے لوگ ترکی حکومت کے مقابلہ میں آسٹریا کی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے[1] اسی وجہ سے دریائے ڈینیوب کے جنوبی علاقوں پر آسٹریا کا یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا، بائیس سال کے بعد عثمانیوں نے بلغراد کو پھر فتح کر لیا، اور آسٹریا والوں کو سرویا سے نکال باہر کیا،

معاہدہ پسارووچ

بلغراد کی شکست کی بناء پر خلیل پاشا صدارت کے عہدہ سے علیحدہ کر دیا گیا، اور اس کی جگہ ابراہیم پاشا جو سلطان کا داماد تھا صدر اعظم مقرر ہوا، وہ ارکان سلطنت کی اُس جماعت کا ہمنوا تھا جو آسٹریا سے انتقام لینے کی خواہاں تھی، لیکن انگلستان اور ہالینڈ کے سفیروں نے پھر مصالحت کی گفتگو شروع کر دی، اور اس اُصول پر صلح کرا دینی چاہی، کہ ہر فریق اپنی موجودہ فتوحات پر قابض رہے، یہ شرط آسٹریا کے لئے تو مفید تھی لیکن دولت علیہ کے لیے سخت نقصان دہ تھی، بہرحال بہت کچھ تامل کے بعد سلطان آخر میں راضی ہوگیا، اور صلحنامہ مرتب کرنے کی کارروائی شروع ہوئی، سرویا کے ایک چھوٹے سے گاؤں پسارووچ (Passarowitz) میں ایک کانگریس منعقد کی گئی، اور وہاں ۲۲ شعبان ۱۱۳۰ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۷۱۸ء کو ایک معاہدہ مرتب ہوا، جو معاہدہ پسارووچ کے نام سے مشہور ہے،

اس معاہدہ کی رو سے آسٹریا کو نہ صرف تیمسوار اور اس کا علاقہ مل گیا، اور اس طرح ہنگری کا وہ حصہ بھی جو معاہدہ کارلووٹز کے بعد سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت رہ گیا تھا

---

[1] ایورسلے صفحہ ۲۰۰،

اس کے قبضہ میں آگیا، بلکہ ولاچیا اور سرویا کا ایک بڑا حصہ، بوسینیا کے بعض علاقے نیز بلغراد، سمندریا، رمنک اور بہت سے دوسرے شہر اُس کے ہاتھ آئے لیکن جمہوریہ وینس کو جس کی حمایت میں آسٹریا نے ہتھیار اُٹھائے تھے پورا موریا دولت عثمانیہ کے حوالہ کر دینا پڑا، اور اگرچہ ڈلماشیا کے چند چھوٹے چھوٹے قلعوں پر اس کا قبضہ باقی رکھا گیا، تاہم اُسے ساحل اڈریاٹک کے بعض غیر مفتوحہ علاقوں سے دست بردار ہو جانا پڑا، تاکہ سلطنت عثمانیہ اور جمہوریہ رگوسا کے تعلقات میں روک نہ پیدا ہو، اور دولت علیہ وینس کے دست برد سے رگوسا کا تحفظ کر سکے، کارفو اور بحر یونان کے دوسرے جزیروں پر وینس کا قبضہ قائم رہا، سلطنت عثمانیہ کی طرف سے اس بات کا معاہدہ کیا گیا کہ الجزائر، تونس، طرابلس اور رگوسا کے بحری ڈاکوؤں کا سد باب کر دیا جائیگا، اور ہنگری کے باغیوں کو آسٹریا کی جدید سرحد کے قریب رہنے کی ممانعت کر دیجائے گی،

جنگ ایران ۱۷۲۰ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان "دائمی صلح" کے لئے ایک معاہدہ مرتب ہوا جہاں تک روس کا تعلق ہے یہ معاہدہ اُس اتحاد کا نتیجہ تھا، جو اس کے بعض سابق حلیفوں نے اُس وقت اُس کے خلاف قائم کر لیا تھا، اور جس کی شرکت کی دعوت آسٹریا اور انگلستان کے سفیروں نے باب عالی کو بھی دی تھی، پیٹر نے اس اتحاد کے آئندہ خطرات کا اندازہ کرکے باب عالی کو اس سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی اور صلحنامۂ مذکور کے ذریعہ بظاہر ہمیشہ کے لئے اسے اپنا حلیف بنا لینا چاہا، لیکن یہ "دائمی صلح" دو ہی سال کے بعد معرض خطر میں آگئی اور قریب تھا کہ دونوں فریق سلطنت ایران کے بعض حصوں کی تقسیم پر باہم دست وگریباں ہو جائیں، شاہ عباس صفوی کی وفات کے بعد ہی دولت ایران کا زوال شروع ہو گیا، اور اُس کی حالت روز بروز

زیادہ خراب ہوتی گئی، اُس کی ہمسایہ حکومتیں موقع کی منتظر تھیں، چنانچہ ۱۷۲۲ء میں ایک افغانی سردار امیر محمود نے پچاس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایران پر حملہ کر دیا، اور بہ آسانی اصفہان پر قابض ہوگیا، شاہ حسین کے لڑکے طہماسپ نے تخت و تاج کی واپسی کے لئے زار روس اور باب عالی سے مدد کی درخواست کی، پیٹر نے بحر کاسپین اور بحر اسود کے ساحلی علاقوں کے معاوضہ میں مدد کا وعدہ کیا، اور ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے ایک فوج بھی روانہ کر دی، پیٹر کا یہ اقدام باب عالی کے لئے تشویش اور برہمی کا باعث ہوا اور قریب تھا کہ دونوں سلطنتوں میں جنگ چھڑ جائے، لیکن سفیر فرانس کی وساطت سے جنگ کی نوبت نہ آئی، اور ۱۷۲۳ء میں دونوں کے درمیان ایک صلحنامہ ہوگیا، جس کے رو سے شمالی ایران کا ایک بڑا حصہ فریقین نے باہم تقسیم کر لیا، باب عالی کو جارجیا، اریوان، تبریز اور باکو کے صوبے دیئے گئے اور روس نے شروان اور بحر کاسپین کے بعض ساحلی علاقوں کو اپنے لئے منتخب کیا، روس ان علاقوں پر صلحنامہ کی تحریر سے پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا، دولت علیہ کو اپنے حصہ پر قبضہ کرنے کے لئے ایک فوج روانہ کرنی پڑی، ایرانیوں نے مقابلہ کیا، لیکن ترک مدائن، اریوان، تبریز اور بعض دوسرے علاقوں کو یکے بعد دیگرے فتح کرتے گئے، اور شاہ طہماسپ کو مجبوراً صلح کرنی پڑی، تھوڑے دنوں کے بعد امیر محمود نے شاہ طہماسپ کو شکست دیکر ایران کے تخت پر پھر قبضہ کر لیا، اور سلطنت عثمانیہ کی مخالفت سے بچنے کے لئے مذکورۂ بالا صوبوں پر باب عالی کی سیادت تسلیم کر لی، ۱۷۲۵ء میں امیر محمود کا انتقال ہوگیا، اور اس کا ایک عزیز شاہ اشرف تخت نشین ہوا، ۱۳؍ اکتوبر ۱۷۲۷ء کو شاہ اشرف اور باب عالی کے درمیان ایک جدید صلحنامہ ہوا، لیکن اُسی سال ایک ایرانی سردار نادر قلی خاں نے

شاہ طہماسپ کی حمایت میں اصفہان پر چڑھائی کی، اور متعدد معرکوں میں افغانوں کو شکست دی، شاہ اشرف قتل ہوا، اور شاہ طہماسپ پھر تخت پر بیٹھا، طہماسپ نے تخت پر آتے ہی باب عالی سے ایرانی صوبوں کی واپسی کا مطالبہ کیا، اور سلطان کے انکار پر نادر خاں کی سرکردگی میں سلطنت عثمانیہ کے مقابلہ میں فوجیں روانہ کیں، نادر خاں کے میدان میں آتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا اور عثمانی فوجوں کے قدم اُکھڑنے لگے قسطنطنیہ میں خبر پہنچی کہ ایرانی فوج سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہو رہی ہے، اس خبر سے دفعۃً پایہ تخت میں ہنگامہ برپا ہوگیا، اور ینی چری کے ایک دستہ نے پطرونا خلیل کی سیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا، تھوڑے عرصہ میں یہ وبا تمام فوج میں پھیل گئی،

فوج کی بغاوت اور سلطان کی معزولی

فوج کی بغاوت کا ظاہری سبب تو وہ شکست تھی جو نادر خاں کے مقابلہ میں عثمانیوں کو ہوئی، لیکن ممکن ہے کہ باب عالی کی امن پسند پالیسی بھی ینی چری کی جنگجو طبیعت کے لئے ناقابل برداشت رہی ہو، اگرچہ بعض سرحدی علاقوں میں وقتاً فوقتاً شورشیں ہوتی رہیں، تاہم صدر اعظم ابراہیم پاشا کی وزارت کا دور جو ۱۷۱۸ء سے ۱۷۳۰ء تک قائم رہا، سلطنت کے لئے غیر معمولی طور پر امن و سکون کا زمانہ تھا، شاید یہی امن پسندی ابراہیم پاشا کے قتل اور پھر سلطان کے عزل کا باعث ہوئی، باغیوں نے ابراہیم پاشا، قپودان پاشا (امیر البحر) اور مفتی اعظم کے خلاف یہ الزام قائم کیا کہ یہ لوگ عجمیوں سے صلح کرنا چاہتے ہیں، اور اس جرم کی بنا پر سلطان سے انکے قتل کا مطالبہ کیا، سلطان نے خود اپنی جان کو خطرہ سے خالی نہ دیکھ کر صدر اعظم اور قپودان پاشا کو قتل کرادیا، البتہ مفتی اعظم کے قتل سے انکار کر دیا، لیکن اب باغیوں کی جرأت اور بڑھ گئی، اور انھوں نے سلطان کو بھی تخت چھوڑنے پر مجبور کیا، احمد ثالث اپنے اندر

مقابلہ کی طاقت نہ پاکر خاموشی کے ساتھ تخت سے دست بردار ہوگیا اور اپنے بھتیجے محمود کو محل سے بلاکر اپنی جگہ بٹھادیا اسکے بعد وہ محل کے اس حصہ میں چلا گیا جہاں محمود اب تک نظر بند تھا، اور وہیں چند سال کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا،

سلطان احمد ثالث نے ستائیس سال حکومت کی، اس طویل مدت میں سلطنت عثمانیہ کو آسٹریا، روس، وینس اور ایران سے متعدد معرکے پیش آئے لیکن معاہدہ پساروچ کے رو سے مقبوضات کا جو حصہ ہاتھوں سے نکل گیا تھا، ازف اور موریا کی واپسی اور ایرانی فتوحات نے نہ صرف اُس کی تلافی کر دی بلکہ بحیثیت مجموعی سلطنت کے رقبہ میں اضافہ کر دیا، باوجود متعدد جنگوں کے خزانہ آخر وقت تک پُر تھا، حالانکہ نہ کوئی غیر معمولی ٹیکس جاری کیا گیا، اور نہ رعایا کو جبر و تشدد کی شکایت ہوئی،

پہلا مطبع — احمد خود بھی صاحب علم تھا اور علوم و فنون کی سرپرستی شاہانہ طریقہ پر کرتا تھا چنانچہ اسی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں مطبعوں کا رواج ہوا اور پہلا مطبع قسطنطنیہ میں قائم کیا گیا لیکن مفتی اعظم نے مطبعوں کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی تھی کہ قرآن مجید طبع نہ کیا جائے،

ولاچیا اور مولڈیویا کے یونانی حکام — اسی عہد میں ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتوں میں بھی ایک خاص تبدیلی عمل میں آئی اب تک ان ریاستوں کی حکومت وہیں کے کسی ممتاز امیر کو سپرد کر دیجاتی تھی لیکن چونکہ ۱۷۱۱ء میں مولڈیویا کے امیر نے دولت عثمانیہ سے غداری کرکے پیٹر اعظم کا ساتھ دیا تھا اور پیٹر کی حمایت میں سلافی قوموں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا اسلیئے باب عالی نے اسکے بعد سے ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتوں پر اُن دولتمند یونانی امراء کو مقرر کرنا شروع کیا، جو قسطنطنیہ کے ایک خاص حصہ فنار میں رہا کرتے تھے مگر یہ نظام دولت علیہ کے حق میں بہت مضر ثابت ہوا، اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلطان محمود اول کے عہد میں اس کے نقصانات ظاہر ہونے لگے،

محمود اول

۱۱۴۳ھ تا ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۳۰ء تا ۱۷۵۴ء

احمد ثالث کے تخت سے کنارہ کش ہوجانے کے بعد باغیوں اور اعیانِ سلطنت نے سلطان مصطفےٰ ثانی کے لڑکے محمود کو تخت پر بٹھایا، لیکن چند ہفتوں تک محمود صرف نام کا سلطان تھا اور اصلی حکومت باغیوں کے سردار پطرونا خلیل کے ہاتھ میں تھی، اُس نے سلطنت کے بہت سے اعلیٰ عہدیداروں کو برطرف کرا دیا، اور اُن کی جگہ اپنی جماعت کے آدمیوں کو مقرر کرا یا، ایک یونانی بوچر نیاگی (Yanaki) نے گذشتہ بغاوت میں اُسے کچھ روپیے قرض دیئے تھے، اس احسان کے معاوضہ میں اُس نے دیوان کو مجبور کر کے اسے مولڈیویا کا حاکم مقرر کرایا، لیکن بالآخر پطرونا خلیل اور اُس کے ساتھیوں کی وستدرازیاں ناقابلِ برداشت ہوگئیں، اور سلطان کے وفادار افسروں نے ان سرکشوں کے استیصال کا عزم کرلیا، ینی چری اور دوسرے فوجی دستوں نے بھی جو سلطان احمد ثالث کے معزول کرنے میں شریک تھے، پطرونا خلیل کی مخالفت پر آمادگی ظاہر کی، اور اس شرط کیساتھ کہ اُن سے اُنکی گذشتہ سرکشی اور بغاوت کے متعلق بازپرس نہ کیجائے گی، سلطان محمود کی حمایت کا وعدہ کرلیا، چنانچہ ایک روز پطرونا خلیل اور اُس کے اکیس ساتھی دیوان میں بلائے گئے،

اور وہیں سلطان کے سامنے انھیں قتل کر دیا گیا، تین روز کے اندر اُن کا دوست نیاکی اور اُس کے سات ہزار ساتھی بھی قتل کر دیئے گئے، اور اس طرح تقریباً دو ماہ کی شورش کے بعد یہ بغاوت فرو ہوئی،

جنگ ایران پایہ تخت میں امن قائم ہونے کے بعد ایران سے جنگ چھڑ گئی اور عثمانی فوج شاہ طہماسپ کی فوج پر متعدد معرکوں میں غالب آئی، یہ دیکھکر طہماسپ نے صلح کی درخواست کی اور ۱۰ جنوری ۱۷۳۲ء کو دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک صلحنامہ مرتب ہوا جس کے روسے تبریز، اردھان، ہمدان اور لورستان، ایران کو واپس دیدیئے گئے، اور سلطنت عثمانیہ نے داغستان، جارجیا، ناخ شیوان، اریوان، اور تفلیس کے علاقے پائے لیکن یہ صلح عارضی ثابت ہوئی، نادر خاں نے جو شاہ طہماسپ کی طرف سے سیستان، آذربیجان، مازندران اور خراسان کا حاکم تھا، اس کی شدید مخالفت کی، اُس نے اپنی فوج کے ساتھ اصفہان پر چڑھائی کی اور شاہ طہماسپ کو تخت سے اُتار کر اُس کے لڑکے عباس ثالث کو تخت پر بٹھایا اور عباس کی نابالغی کے زمانہ تک اپنے کو اس کا مدار المہام قرار دیا، مدار المہام کی حیثیت سے اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ صلحنامہ کو مسترد کر دیا، پھر وہ عثمانی علاقہ کی طرف بڑھا، اور بغداد کا محاصرہ کر لیا، صدر اعظم عثمان پاشا بغداد کی مدد کے لئے روانہ ہوا، ۱۹ جولائی ۱۷۳۳ء کو دریائے دجلہ کے کنارے سخت معرکہ ہوا جس میں نادر خاں کو نہایت کاری زخم آیا، اور اُس کے ساتھی اُسے میدان جنگ سے اٹھا لے گئے، بغداد ایرانیوں کے محاصرہ سے آزاد ہو گیا، اسی سال عثمان پاشا ایرانیوں کے مقابلہ کے لئے پھر آگے بڑھا اور انہیں شکست دی، لیکن تیسرے معرکہ میں جو کرکوک کے قریب

نادر خاں سے پیش آیا ترکوں کو فاش شکست ہوئی، اور خود عثمان پاشا ایک جانباز سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا۔ عثمان پاشا کے بعد ترکوں نے نادر خاں کے مقابلہ میں متعدد بار شکست کھائی، بالآخر دولت عثمانیہ کی طرف سے صلح کی گفتگو شروع ہوئی، اسی درمیان میں یکم دسمبر ۱۷۳۵ء کو نادر خاں نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا، اور عباس ثالث کو تخت سے برطرف کر کے خود ایران کا بادشاہ بن بیٹھا، نامہ و پیام کے ایک طویل سلسلہ کے بعد شرائط صلح طے ہو گئے، اور ۱۷ اکتوبر ۱۷۳۶ء کو قسطنطنیہ میں فریقین نے صلحنامہ پر دستخط کر دیئے، دونوں سلطنتوں کے حدود وہی قرار پائے جو ۱۶۳۹ء میں سلطان مراد رابع کے معاہدہ میں قائم کئے گئے تھے، ان حدود کے ماوراء باب عالی نے تمام مفتوحہ علاقے سلطنت ایران کو واپس کر دیئے،

روسی خطرہ دولت عثمانیہ نے ایران کے ساتھ صلح کرنے میں صرف اس وجہ سے عجلت کی تھی کہ روس کی فوجیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں، روس نے دولت علیہ اور ایران کی جنگ کو اپنے مفاد کے موافق سمجھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور بجائے اس کے کہ بحر کاسپین کے ان ایرانی علاقوں پر قبضہ رکھنے کی کوشش کرتا جو پیٹر اعظم اور سلطان احمد ثالث کے معاہدہ کے مطابق ۱۷۲۴ء میں اسے حاصل ہوئے تھے، اپنی پوری توجہ عثمانی علاقوں کی جانب مبذول کرنی چاہی جن کا حصول اسے نسبتہً زیادہ آسان نظر آتا تھا، اسی غرض سے اس نے ۱۷۳۵ء میں نادر خاں سے صلح کر لی، اور بحر کاسپین کے وہ تمام علاقے جو معاہدۂ مذکور کے رو سے اسے حاصل ہوئے تھے، سلطنت ایران کو واپس کر دیئے،

دولت عثمانیہ کے خلاف روس کا جارحانہ اقدام حقیقۃً اس ناعاقبت اندیشانہ

طرزِ عمل کا نتیجہ تھا جو وزرائے سلطنت نے مغربی حکومتوں سے متعلق اختیار کر رکھا تھا، وہ حتی الوسع دوسری حکومتوں کی آویزش سے بچنا چاہتے تھے، لیکن تاریخ کے اس سبق سے چشم پوشی کر رہے تھے کہ جو سلطنت دشمنوں سے گھری رہنے کے باوجود اُن سے کنارہ کش رہنا چاہتی ہو وہ آخرکار اس وقت میدانِ جنگ میں آنے پر مجبور ہوتی ہے جب کامیابی کے اکثر مواقع ہاتھ سے نکل چکتے ہیں، سلطنتِ عثمانیہ کے وزراء، روس اور آسٹریا کی دشمنی سے بے خبر نہ تھے، مگر وہ اپنی طرف سے تصادم پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ جب پولینڈ کی جنگ جانشینی میں بابِ عالی کو گذشتہ معاہدوں کی بنا پر جائز طور پر مداخلت کا حق حاصل ہوا تب بھی غیر جانبداری کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹا،

تقسیمِ پولینڈ

پولینڈ تقریباً ایک صدی سے خلفشار اور بدامنی کا شکار ہو رہا تھا اور روس، آسٹریا اور پرشیا کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں، پِٹر اعظم کی خارجی سیاست کے دو نہایت اہم جزو تھے، پولینڈ اور دولتِ عثمانیہ، وہ ان دونوں کو فتح کرکے روس کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بنا دینا چاہتا تھا، لیکن جہاں تک سلطنتِ عثمانیہ کا تعلق تھا یہ ایک ایسا نصب العین تھا جس کی حقیقت خود اُس کے ذہن میں بھی خواب سے زیادہ نہ تھی، چنانچہ واقعہ پرتھ نے اُس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا، اور ترکوں کے محاصرہ سے زندہ اور سلامت نکل آنا ہی اُسے اپنی سب سے بڑی کامیابی نظر آئی، تاہم وہ آخر وقت تک اپنے مقصد کے حصول کے لئے تیاریاں کرتا رہا، اور اگر ۱۷۲۵ء میں وہ وفات نہ پا گیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ معاہدہ پرتھ کی تنسیخ کے لئے زور آزمائی کرتا پھر بھی اُس نے اپنے جانشینوں کے لئے جو وصیت نامہ چھوڑا، اس میں دولتِ عثمانیہ

اور پولینڈ کی نسبت خصوصیت کے ساتھ تاکید درج کی اور اُس کے بعد اُس کے تمام جانشینوں نے اس وصیت کی تکمیل کو سلطنت کا اہم ترین مقصد قرار دیا، پولینڈ اپنے اندرونی اختلال اور کمزوریوں کی وجہ سے روس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تھا خصوصاً جب کہ آسٹریا اور پرشا بھی اس کے خلاف روس سے متحد ہو گئے تھے، یہ اتحاد ۱۷۳۲ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ عمل میں آیا تھا، جو حقیقۃً روس، آسٹریا، اور پرشا کے درمیان پولینڈ کی تقسیم کا دیباچہ تھا،

۱۷۳۳ء میں پولینڈ کے فرماں روا آگسٹ ثانی کا انتقال ہو گیا، یہ شخص روس کے زیر اثر تھا، اور روس اور آسٹریا نے اسی کے لڑکے آگسٹ ثالث کو تخت پر بٹھانا چاہا، لیکن اہل پولینڈ نے مخالفت کی اور ایک ملکی رئیس اسٹانسلاس کو منتخب کر لیا، اسٹانسلاس کو فرانس کی حمایت حاصل تھی کیونکہ وہ شاہ لوئی پانزدہم کا خسر بھی تھا، علاوہ بریں فرانس کی سیاسی مصلحت اس امر کی مقتضی بھی تھی کہ پولینڈ کو روس اور آسٹریا کی دست برد سے محفوظ رکھا جائے، کیونکہ پولینڈ کی کمزوری سے آسٹریا کو قوت پہنچنے کا اندیشہ تھا، اور آسٹریا کی دشمنی لوئی چہاردہم کے عہد سے فرانس کی سیاست کا ایک ضروری عنصر تھی، اسی بنا پر اسٹانسلاس کے انتخاب کے بعد جب روسی اور آسٹروی فوجیں پولینڈ میں داخل ہوئیں، اور اسٹانسلاس کو مجبوراً تخت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور فرانسیسی سفیر مقیم قسطنطنیہ نے باب عالی سے درخواست کی کہ اس حق صریح کی مدافعت کی غرض سے جو پولینڈ کو اپنے فرماں روا کے انتخاب میں حاصل ہے، نیز اُس ضمانت کی بنا پر جو فاکزن (Falksen) اور قسطنطنیہ کے سابق معاہدوں کے رو سے دولت علیہ

کو پولینڈ کی آزادی اور استقلال کی نسبت سپرد کی گئی ہے، آسٹریا اور روس کی اس بیجا مداخلت کے خلاف احتجاج کے طور پر اس جنگ میں فرانس کا ساتھ دے، سفیر فرانس نے پولینڈ کا استقلال قائم رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ پولینڈ روس اور دولت علیہ کے درمیان بطور ایک آہنی دیوار کے ہے اور اسی سلسلہ میں اُس نے دولت علیہ سے متعلق روس کی سیاست کو بھی واضح طور پر بیان کیا لیکن وزرائے سلطنت نے اُس کی تمام حجتوں کو نظر انداز کر دیا اور بشیر آغا کے زیر اثر جو سلطان محمود اول کا معتمد خاص اور حقیقتہً سلطنت کے تمام حل و عقد کا ذمہ دار تھا، عدم مداخلت کے اُصول پر بدستور قائم رہے،

جنگ روس | اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس نے پولینڈ کی جنگ جانشینی سے فارغ ہو کر خود سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات پر حملہ کر دیا، پیٹر اعظم کی تدبیر یہ تھی کہ ترکی پر پولینڈ کی راہ سے حملہ کیا جائے، اب چونکہ پولینڈ روس کے زیر اثر آچکا تھا، اور باب عالی نے اس اقتدار کو روکنے کی کوئی سعی نہیں کی تھی، اس لئے روسی حملہ کا سد باب ناممکن تھا، روس واقعہ پرتھ کا داغ ذلت مٹانے کے لئے بیتاب تھا، اُس کے جاسوس پیٹر اعظم کے زمانہ ہی میں بلغاریا، سرویا، اور رومانیا میں پہنچ گئے تھے اور عیسائی رعایا کو دولت عثمانیہ کے خلاف اُبھار رہے تھے،

دولت علیہ سے اعلان جنگ کے لئے کسی عذر کی تلاش زیادہ دشوار نہ تھی، جنگ کا فیصلہ اُسی وقت ہو گیا تھا، جب روس کی عنان حکومت ۱۷۳۰ء میں ملکہ اینی کے ہاتھ میں آئی، پانچ سال کی تاخیر صرف مناسب موقع کے انتظار میں گوارا کی گئی، چنانچہ ۱۷۳۵ء میں جب عثمانی فوجیں ایران میں مصروف پیکار تھیں اور تاتاری دستے اُنکی

کمک کے لئے کوہ قاف کے علاقوں سے گذر رہے تھے تو روس نے اُس نزاع کی بنا پر جو کوہ قاف کے شمالی صوبوں سے متعلق دولت علیہ سے چلی آرہی تھی، ان دستوں کی مزاحمت کی اور تاتاری علاقوں پر حملہ کر دیا، باب عالی نے روس کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا، روس نے اس کے جواب میں تاتاری قبائل کی شکایتوں کا دفتر کھول دیا، نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ مئی ۱۷۳۶ء میں قسطنطنیہ میں خبر پہنچی کہ زارینہ اینی کی فوج نے مارشل میونخ (Munnich) کی قیادت میں ازف کے قریب دو قلعوں پر قبضہ کر کے خود ازف کا محاصرہ بھی کر لیا ہے، مجبوراً دولت علیہ نے ۲۸ مئی ۱۷۳۶ء کو روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا،

روسی فوج کے سپہ سالار اعظم مارشل میونخ نے یہ جنگ نہایت بلند حوصلوں کے ساتھ شروع کی تھی، وہ قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہا تھا، اور اُس نے زارینہ سے وعدہ کیا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر رہے گا، قسطنطنیہ کی راہ میں پہلا سنگ گراں کریمیا تھا، اس کو ہٹا کے بحر اسود پر روسی اقتدار کا قائم کر لینا اس مہم کا پہلا مرحلہ تھا، چنانچہ مارشل میونخ چوّن ہزار سپاہیوں کے ساتھ کریمیا کی طرف بڑھا اور پیریکوپ (Perekop) کے قلعہ بند شہر کو فتح کرتا ہوا جو برِ اعظم اور کریمیا کی درمیانی خاکنائے پر واقع تھا کریمیا میں داخل ہو گیا اور پہنچتے ہی قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا، اُس زمانہ میں کریمیا نہایت دولتمند ملک تھا، ترکی کے ساتھ اس کی تجارت بہت بڑھی ہوئی تھی، چنانچہ کوسلوف (Koslof) سے جو کریمیا کے مغربی ساحل کی خاص بندرگاہ تھی، ہر سال دو لاکھ مویشی اور بکثرت غلہ استنبول بھیجا جاتا تھا، مشرقی ساحل کا شہر کافہ غلاموں کی تجارت کی غالباً دنیا میں سب سے بڑی منڈی تھی،

شہر کوسلوف اپنی تجارت اور دولت کے لحاظ سے تمام کریمیا میں سب سے زیادہ ممتاز
تھا، ۱۷ جون ۱۷۳۶ء کو روسیوں نے اسے فتح کر کے لوٹ لیا، وہاں سے میونخ باغچہ سرائے
کی طرف بڑھا جو خوانین کریمیا کی قدیم جائے سکونت تھی، باغچہ سرائے کا تاتاری دستہ صرف
تھوڑی دیر مقابلہ کرکے پسپا ہوگیا، کریسی لکھتا ہے: "تب میونخ نے اپنے روسی اور
قزاق سپاہیوں کو اس شہر کے سامنے لاکر کھڑا کیا، جس کی مدافعت کرنے والا کوئی
باقی نہ رہ گیا تھا، پھر اپنی فوج کے ایک چوتھائی حصہ کو چند مقررہ گھنٹوں کے لئے بھیجنا
شروع کیا تاکہ شہر کے اندر جاکر لوٹ مار کرے، اس وحشیانہ اور ظالمانہ کام کی تکمیل پوری
طرح کی گئی، دو ہزار مکانات اور تمام پبلک عمارتیں برباد ہو گئیں، خوانین کا وسیع
محل، وہ عالیشان کتب خانہ جسے سلیم گرائی نے قائم کیا تھا، اور وہ جسے کریمیا کے جیسوئٹ
(Jesuit) مشن نے قائم کیا تھا سب جل کر خاک سیاہ ہوگئے، اس کے بعد
روسیوں نے سمفیروپولس (Simpheropolis) پر حملہ کیا، جو باغچہ سرائے
کے شمال مشرق میں واقع تھا، اس کے باشندے اور اس کی دولت سپاہیوں کی
درندگی اور لوٹ مار کے حوالہ کردی گئی، اور اس کی عمارتیں شعلوں کی نذر کردی گئیں
.... کریمیا کی تمام مہم میں میونخ کی فوج نے سفاکی و درندگی، بہیمیت
و بربریت کی انتہا کردی، روسیوں نے بوڑھوں، بچوں، اور عورتوں پر ذرا بھی رحم
نہیں کیا، جہاں روسی فوجوں کی مطلق مزاحمت نہیں کی گئی، وہاں بھی انھوں نے
شہروں اور قصبوں میں آگ لگادی، اور باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا، قدیم یادگاریں بے رحمی
کے ساتھ مٹادی گئیں، کتب خانے اور مدرسے شعلوں کی نذر کردیئے گئے، اور
قومی عمارتیں اور عبادت گاہیں قصداً اور عمداً برباد کر ڈالی گئیں، یہ پوری مہم

(جو بغیر کسی اعلانِ جنگ کے شروع کردی گئی تھی) خالص سیتھئین درندگی کی روح کیساتھ ترتیب اور انجام دی گئی"[1]

اس درمیان میں اور سمتوں میں بھی روس کی دوسری فوجیں بڑھتی جا رہی تھیں چنانچہ تھوڑے دنوں کے محاصرہ کے بعد جنرل لاسکی نے ازف کو فتح کرلیا اور کلبرن (Killburn) کے تاتاری دستہ نے جنرل لیونٹوو (Leontiew) کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، بقول کریسی "جنگ کے پہلے سال میں روس کا فریب اور اُس کی طاقت تقریباً ہر جگہ کامیاب رہی" البتہ نومبر ۱۷۳۶ء میں جب میونخ کی فوجیں موسم سرما کی شدت سے بچنے کے لئے کریمیا سے نکل آئی تھیں، تو فتح گرائی جدید خان کریمیا یوکرین پر حملہ آور ہوا اور وہاں کے روسی دستہ کو شکست دیکر تین ہزار روسی قیدیوں کے ساتھ کریمیا کو لوٹ آیا،

آسٹریا کا فریب دولت علیہ اب جنگ کو ختم کردینا چاہتی تھی، اور اُس نے فرانس ہونڈان اور آسٹریا کے سفیروں کے ذریعہ روس سے صلح کی متعدد بار کوششیں کیں، لیکن روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ سلطنت عثمانیہ کی موجودہ مشکلات سے فائدہ اٹھانے کے لئے آسٹریا خود بھی بیتاب ہے اُس نے صلح کے بجائے جنوری ۱۷۳۷ء میں آسٹریا سے ایک خفیہ معاہدہ کرلیا جس کی اہم ترین دفعہ یہ تھی کہ دونوں سلطنتیں متحد ہوکر ترکی پر حملہ آور ہونگی، مگر چونکہ آسٹریا اپنے ارادہ سے باب عالی کو بے خبر رکھنا چاہتا تھا، اور خوب تیار ہوکر اُسی طرح اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا، جس طرح بغیر کسی اعلان جنگ کے روس نے ازف اور کریمیا پر چڑھائی کی تھی، اس لئے باب عالی کی خواہش

---

[1] کریسی جلد ۲ صفحہ ۱۸۰-۱۸۱،

پر اُس نے بظاہر روس سے صلح کرانے کی کوشش کی اور ۱۸۷۶ء کے اوائل میں بمقام ہنی روف د [illegible] ایک مجلس منعقد کی، جہاں روس اور آسٹریا کے سفیروں نے دولت عثمانیہ کے وکلا سے صلح کی گفتگو شروع کی، جس کا سلسلہ نومبر ۱۸۷۶ء تک قائم رہا، لیکن باب عالی کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور صلح نہ ہو سکی، روس اور آسٹریا کی طرف سے صلح کے جو شرائط پیش کئے گئے وہ اس درجہ سخت تھے کہ دولت علیہ کے لئے اُن کا تسلیم کرنا قطعاً محال تھا، روس کے مطالبات یہ تھے، کہ وہ تمام سابق صلحنامے جو باب عالی اور اُس کے درمیان ہو چکے ہیں منسوخ قرار دیئے جائیں، کریمیا، کیوبان اور وہ تمام علاقے جن میں تاتاری قبائل آباد ہیں اس کے حوالہ کر دیئے جائیں، ولاچیا اور مولڈیویا کا استقلال تسلیم کر کے انھیں روس کی حفاظت اور سیادت میں دیدیا جائے، باب عالی فرماں روائے روس کے لئے "شہنشاہ" کا لقب تسلیم کرے، اور روسی جہازوں کو بحر اسود، باسفورس اور دردانیال سے ہو کر بحر روم میں آنے جانے کی آزادی دیدی جائے، مذکورۂ بالا مطالبات کے علاوہ روس نے ایک کرور چالیس لاکھ روبل کا مطالبہ بھی پیش کیا، آسٹریا نے اپنے لئے بوسنیا اور سرویا کے سارے علاقوں کو صلح کی قیمت قرار دی، عثمانی وکلا نے ان اہانت آمیز شرائط کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا، اور صلح کی یہ مجلس ایک طویل نشست کے بعد ناکام ہو کر برخاست ہوگئی،

لیکن ناکامی صرف اُسی حد تک تھی جہاں تک ترکوں کا تعلق تھا، روس اور آسٹریا کی کامیابی میں کوئی شبہہ نہ تھا، اس لئے کہ اُن کا مقصد ترکوں کو صلح کے فریب میں مبتلا رکھکر آئندہ مہم کے لئے خفیہ طور پر تیار ہونا تھا، اور وہ پوری طرح حاصل ہو گیا،

چنانچہ صلح کی گفتگو ہنوز جاری ہی تھی کہ روس اور آسٹریا دونوں نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں پر حملہ کر دیا۔ ۱۷۳۷ء کے اوائل میں مارشل میونخ نے ستر ہزار سپاہ کے ساتھ اوکزاکوف (Oczakow) پر حملہ کر دیا جو بحر اسود کے شمالی ساحل پر ایک نہایت اہم عثمانی قلعہ تھا اور جنرل لاسکی چالیس ہزار روسیوں کو لیکر کریمیا میں داخل ہوا اور میونخ کی قائم کردہ مثال کے مطابق قتل و غارت شروع کر دی، اوکزاکوف کے ترکی دستے نے جو بیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھا، نہایت جانبازی کیساتھ مدافعت کی، لیکن بدقسمتی سے محاصرہ کے چند ہی دنوں بعد قلعہ کے سب سے بڑے بارودخانہ میں آگ لگ گئی، جس سے چھ ہزار ترک سپاہی ہلاک ہو گئے، سرعسکر اس واقعہ سے گھبرا گیا، خصوصاً یہ دیکھ کر کہ قلعہ کے اندر شعلے زیادہ تیز ہو رہے ہیں اور اُن سے مزید نقصان کا اندیشہ ہے اور باہر روسی فوج تازہ حملہ کے لئے تیار ہو رہی ہے، اس نے صلح کا سفید علم بلند کر کے اس شرط کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے کہ وہ اور اس کی سپاہ فوجی قیدی خیال کیجائے گی، لیکن روسیوں نے اس شرط کی قطعاً پروا نہ کی اور قلعہ میں داخل ہو کر بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا، بالآخر مارشل میونخ کو سرعسکر اور اس کے سپاہیوں کی حفاظت کے لئے روسی فوج کا ایک دستہ قلعہ میں روانہ کرنا پڑا، لیکن اُس وقت تک عثمانی دستہ کا ایک بہت بڑا حصہ قتل ہو چکا تھا، اور صرف تین ہزار ترک سرعسکر کے ساتھ میونخ کے لشکر میں زندہ پہنچ سکے، روسی فوج کو بھی اس معرکہ میں بہت زیادہ نقصان پہنچا، چنانچہ اوکزاکوف میں ایک مضبوط دستہ متعین کرنے کے بعد میونخ یوکرین کو لوٹ آیا، اور اُس سال کسی دوسری مہم پر روانہ ہونے کی ہمت نہیں کی، جنرل لاسکی ۲۳ جولائی ۱۷۳۷ء کو کریمیا میں داخل ہو گیا تھا قرہ سو بازار

کے قریب تاتاریوں کو شکست دیکر اُس نے تمام ملک میں قتل و خونریزی کا بازار گرم کر دیا، اور ایک ماہ کی غارت گری اور آتش زنی کے بعد جب بہیمیت و بربریت کی پیاس کسی قدر کم ہوئی تو اگست میں واپس چلا گیا، کریسی کا بیان ہے کہ روسی فخر کرتے تھے کہ اس مختصر سے حملہ میں اُنھوں نے چھ ہزار مکانات، اڑتیس مسجدیں، دو گرجے اور پچاس چکیاں جلا ڈالیں،

آسٹریا کی شکست

اسی سال (۱۷۳۷ء میں) آسٹریا نے بھی جس کے وکلاء نیمی روف کی کانگریس میں ترکوں کو صلح کی گفتگو میں مصروف رکھے ہوئے تھے بغیر کسی اعلانِ جنگ کے دفعۃً نیش پر حملہ کر دیا، اور جولائی ۱۷۳۷ء میں ایک فوج فیلڈ مارشل سکنڈورف (Seckendorf) کی سرکردگی میں سرویا کو روانہ کی اور دوسری بوسنیا میں بھیجی، نیش پر قبضہ پانے کے بعد سکنڈورف نے اپنی فوج کا ایک حصہ ودین کی فتح کیلئے روانہ کیا، لیکن عثمانیوں کو اس شہر کے استحکام کا موقع مل گیا تھا اسلئے آسٹروی فوجیں جن پر شہزادہ یوجین کی سابق فتوحات کا نشہ ہنوز طاری تھا پے درپے حملوں کے باوجود اس مہم میں کامیاب نہ ہوسکیں، اس شکست کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ آسٹریا کے جنرل آپس ہی میں جھگڑنے لگے، اور پھر اُن کی باہمی مخالفتوں سے فوج میں جو کمزوری رونما ہونے لگی تھی اُس میں وبا اور سامانِ رسد کی قلت نے اور اضافہ کر دیا، برخلاف اس کے ترک صدرِ اعظم کے زیرِ سیادت حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، ان کی فطری دلیری فرانس کے مشہور ماہرِ حرب بونیوال (Bouneval) کی معیت و مشورہ سے جو مسلمان ہو کر عثمانی فوجوں کے نظام و تربیت کا نگراں مقرر ہو گیا تھا، اور زیادہ مؤثر ہو گئی تھی، سیکنڈروف نے شکست کھا کر اپنی بقیہ فوجوں کے ساتھ ہنگری کا رخ کیا،

ترکوں نے نیش کو واپس لے لیا اور آسٹروی علاقہ کے متعدد حصوں میں داخل ہوگئے، بوسنیا کی مہم کا نتیجہ بھی ایسا ہی رہا، وہاں کے مسلمان باشندوں نے بہادری کیساتھ آسٹریا کی فوجوں کا مقابلہ کیا، اور آخرکار انھیں بوسنیا سے نکال باہر کیا،

دوسرے سال شہنشاہ آسٹریا نے نئے جنرلوں کی سرکردگی میں تازہ فوجیں روانہ کیں، ادھر ترکوں کی طرف سے بھی ایک نیا صدر اعظم یکیان محمد پاشا اُن کے مقابلہ میں بڑھا، اور پیش قدمی کرکے میڈیا پر قبضہ کرلیا، جو ہنگری کے علاقہ میں تھا، اور پھر آگے بڑھکر دریائے ڈینوب کے ساحل پر اورسوا (Orsova) کے اہم قلعہ کا محاصرہ کرلیا، میڈیا سے قریب کورنیا کے مقام پر آسٹروی فوجوں کو ایک لڑائی میں عارضی کامیابی نصیب ہوئی، (۴ر جولائی ۱۷۳۸ء) لیکن فوراً ہی صدر اعظم تازہ فوجوں کے ساتھ پہنچ گیا اور غنیم کو بھگاکر سمندریا پر قبضہ کرلیا، ۱۵ر اگست ۱۷۳۸ء کو اورسوا نے بھی ہتھیار ڈالدئیے، آسٹروی فوجیں بھاگ کر بلغراد میں پناہ گزیں ہوگئیں،

روس کے مقابلہ میں ترکوں کی کامیابی کوئی شاندار نہ تھی، تاہم ۱۷۳۸ء میں اُنھوں نے روسیوں کو بحر اسود کے ساحل پر آگے بڑھنے سے روکے رکھا، مارشل میونخ نے دریائے نیپر اور دریائے بوگ کو عبور کرکے چند ترکی اور تاتاری دستوں کو شکست دی، لیکن جب بندر کے محاصرہ کی غرض سے دریائے نیسٹر تک پہنچا تو وہاں اس کا سامنا ایک مضبوط عثمانی لشکر سے ہوا، جو بندر کی راہ میں حائل تھا، اور جس پر غلبہ پانا اُس کے لئے ناممکن ثابت ہوا متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں، جن میں سے ایک میں ساسی گرائی نے بیس ہزار تاتاری اور اسی قدر عثمانی سپاہ کی مدد سے روسیوں کو سخت شکست دی، میدان جنگ میں روسی فوج کو جو نقصان پہنچا اس سے زیادہ

نقصان وبا اور سامان رسد کی قلت نے پہنچایا، اور میونخ کے لئے اپنی بقیہ سپاہ کیساتھ یوکرین کو لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اسی سال جنرل لاسکی نے تینتیس ۳۳ پینتیس ۳۵ ہزار سپاہیوں کے ساتھ کریمیا پر پھر حملہ کیا، یہ تیسرا حملہ تھا، پہلے ۲ دو حملوں میں چونکہ سپاہیوں نے ملک کو حتی الامکان پوری طرح تباہ کر دیا تھا، اسلئے جنرل لاسکی کو سامان رسد کی فراہمی میں سخت دشواریاں پیش آئیں اور اُسے مجبوراً بہت جلد کریمیا سے نکل جانا پڑا،

مشرقی تجویز" سنہ ۱۸۳۸ء کے موسم سرما میں فرانس کی وساطت سے صلح کی گفتگو پھر چھیڑی گئی، دولت علیہ جنگ ختم کرنے کی غرض سے بہت کچھ نقصان برداشت کرنے پر تیار تھی لیکن روس کا نشۂ فتح کسی طرح صلح کی اجازت نہ دیتا تھا، اور اُس نے ایسے شرائط پیش کئے جن کا قبول کرنا دولت علیہ کے لئے قطعاً محال تھا، زارینہ روس کی وزارت حرب پر مارشل میونخ کا اثر بہت زیادہ تھا، اور میونخ ہی کی مخالفت نے صلح کی تمام کوششوں کو ناکام کر دیا، اُس نے زارینہ کو یقین دلایا کہ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا جو تعداد میں اپنے مسلمان حکمرانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، ترکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بےچین ہے، اور اُس کی نگاہیں زارینۂ روس کی طرف لگی ہوئی ہیں، جسے وہ اپنا جائز فرمانروا تسلیم کرتی ہے، اس نے اس بات پر زور دیا کہ عیسائی رعایا کے جوش سے فائدہ اُٹھانے اور قسطنطنیہ کی طرف بڑھنے کا بس یہی موقع ہے کہ ابھی روسی فتوحات کا اثر رعایا کے دلوں پر تازہ ہے، بہت ممکن ہے کہ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے، زارینہ نے میونخ کی اس "مشرقی تجویز" (Oriental project) کو منظور کیا، اور اس کی ہدایت کے مطابق سلطنت عثمانیہ کے یوروپین صوبوں میں اپنے جاسوس روانہ کئے تاکہ عیسائی رعایا کو دولت علیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں،

۱۷۳۹ء میں میونخ نے جنگ کا سلسلہ پھر شروع کیا، اور مولڈیویا کی سرحد میں داخل ہونے کیلئے اُس نے پوڈولیا کی راہ اختیار کی جو اُس وقت مملکت پولینڈ کا ایک صوبہ تھا پولینڈ اس جنگ میں کسی فریق کا شریک نہ تھا، لیکن میونخ اس طرح پوڈولیا میں داخل ہوا جیسے کسی دشمن کے ملک میں داخل ہوتے ہیں، راستہ میں روسی فوجوں نے جی بھر کے لوٹ مار کی اور یوں اس صوبہ کو ویران کرتے ہوئے مولڈیویا کی سرحد کو عبور کر کے خوتیم کے مقام پر ایک ترکی لشکر کو شکست دی، اس کے بعد میونخ یاسی کی طرف بڑھا جو مولڈیویا کا پایہ تخت تھا، اور اس پر قبضہ کر لیا، پھر اُس نے بندر کا رُخ کیا اور چاہتا تھا کہ بندر اور اُس علاقہ کے دوسرے قلعوں کو فتح کرتا ہوا جنوب کی طرف یوروپین ٹرکی کے قلب میں داخل ہونے کی کوشش کرے، لیکن اثنائے راہ میں اُسے اپنے حلیف آسٹریا کی تباہ کن شکست کی اطلاع ملی اور معلوم ہوا کہ آسٹریا نے بہت دب کر سلطنت عثمانیہ سے صلح کر لی ہے،

آسٹریا کی فیصلہ کن شکست

واقعہ یہ تھا کہ اسی درمیان میں آسٹریا کی فوجوں نے پھر سرویا پر حملہ شروع کر دیا تھا، والیس (Wallis) اور نایپرگ (Neipperg) آسٹریا کے دو نئے اور مشہور جنرلوں نے ایک زبردست فوج کے ساتھ پیٹروارڈین سے نکل کر جنوب کا رُخ کیا، اُدھر صدر اعظم الحاج محمد پاشا تقریباً دو لاکھ سپاہ لے کر اُن کے مقابلہ کے لئے آ رہا تھا، سمندریا اور پیٹروارڈین کے درمیان کروٹزکا (Krotzka) کے مقام پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا، آسٹریا کو سخت شکست ہوئی، اور اُسکی فوجوں نے بھاگ کر بلغراد میں پناہ لی، عثمانیوں نے تعاقب کیا اور بلغراد پر گولہ باری شروع کر دی

صلح نامہ بلغراد

والیس اور نایپرگ کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا، اُن کی ہمت چھوٹ گئی اور

بقول ایورسلے اب وہ صلح کے لئے ویسے ہی بےچین تھے، جیسے اس مہم کی ابتدا میں لاف زن
اور آمادۂ جنگ نظر آتے تھے، بالآخر سفیر فرانس ولینوف (Villeneuve)
کی وساطت سے شرائطِ صلح طے ہوگئے اور آسٹریا نے اپنے حلیف روس سے مشورہ
کا انتظار بھی نہیں کیا، اُس نے بلغراد اور بوسنیا، سرویا اور ولاچیا کے تمام علاقے جو
صلحنامہ پساروویچ کے وقت اسے دیئے گئے تھے، دولت علیہ کو واپس کر دیئے، اس
صلحنامہ پر یکم ستمبر ۱۷۳۹ء کو فریقین کے دستخط ہوگئے، آسٹریا کی طرف سے ایک دفعہ یہ بھی
رکھی گئی کہ دولت علیہ روس کے ساتھ بھی صلح کرلے، چنانچہ مارشل میونخ کو اس واقعہ
کی اطلاع دی گئی، میونخ کو آسٹریا کی شکست اور بلغراد کے صلحنامہ کا حال معلوم
کر کے سخت غصہ آیا، لیکن اب اس کے لئے بھی صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کیونکہ
وہ خوب سمجھتا تھا کہ الحاج محمد پاشا کی عظیم الشان فوج کا مقابلہ آسٹریا کی مدد کے بغیر
ممکن نہیں، زارینہ کو بھی مجبوراً صلح کے لئے آمادہ ہونا پڑا، اور میونخ کے تمام منصوبے
جو اُس نے قسطنطنیہ کی فتح کی نسبت باندھ رکھے تھے، دفعۃً خاک میں مل گئے، روس
اور دولت عثمانیہ کے درمیان جو شرائطِ صلح ۱۸ ستمبر ۱۷۳۹ء مطابق ۴ جمادی الآخر
۱۱۵۲ھ میں طے ہوئے ان کے رو سے مولڈیویا اور کریمیا کی تمام فتوحات اور شہر
اوکزاکوف سے روس دست بردار ہوگیا، نیز اُس نے معاہدہ کیا کہ شہر ازف مسمار کر دیا جائیگا
ازف کا علاقہ دونوں سلطنتوں کے درمیان حدفاصل قرار پایا، صلحنامہ کی تیسری دفعہ
میں یہ شرط خاص طور پر رکھی گئی کہ بحر ازف یا بحر اسود میں روس کا کوئی بیڑا رہنے نہ پائیگا
اور نہ وہ ان سمندروں کے ساحل پر کوئی جنگی جہاز تعمیر کر سکے گا، بحر ازف اور بحر اسود میں
روس کے جنگی یا تجارتی جہازوں کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا گیا، اور تجارتی اغراض کیلئے

صرف ترکی جہازوں کے استعمال کی اجازت دی گئی،

صلحنامہ بلغراد دولت علیہ کے لئے ایک عظیم الشان کامیابی تھی اس نے معاہدہ پسارووِیچ کی اہانت کا داغ دھو دیا، اور آسٹریا اور روس کو ترکوں کے عزم و شجاعت سے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی، یورپین مورخین اس صلحنامہ کو فرانس کی حکمت عملی کی ایک نمایاں کامیابی قرار دیتے ہیں، اور اس کے تکملہ کا سہرا ولینوف کے سر باندھتے ہیں، بلاشبہہ ولینوف کی وساطت سے کام لیا گیا، لیکن اُس سے پہلے بھی دورانِ جنگ میں اس نے کئی بار صلح کی کوشش کی تھی، مگر ہر کوشش بے سود اور ناکام ثابت ہوئی حقیقت یہ ہے کہ اصلی حکمت عملی قوت کی ہے، دنیا نے ہمیشہ سے صرف اسی حکمت عملی کو تسلیم کیا ہے، اور تاریخ کا ہر صفحہ اسی کی کارفرمائی کا شاہد ہے، بلغراد کا صلحنامہ صرف کروٹزکا کی فیصلہ کن جنگ کا نتیجہ تھا ورنہ دنیا کی کوئی طاقت آسٹریا اور روس کو ان شرائط کے منظور کرنے پر راضی نہیں کر سکتی تھی،

سوئڈن سے معاہدہ ولینوف کو جو رسوخ باب عالی میں حاصل تھا اُسے کام میں لا کر اس نے ۱۷۴۰ء میں دولت عثمانیہ اور سوئڈن کے درمیان بھی ایک معاہدہ کرا دیا، جس کے رو سے فریقین روس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہو گئے فرانس کی خارجی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ پولینڈ میں روس کے اثر کو قائم ہونے سے روکا جائے چنانچہ اس معاہدہ کی غرض بھی یہی تھی، لیکن چند ہی سالوں کے بعد جب روس، پروشیا اور آسٹریا نے متحد ہو کر پولینڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تو نہ فرانس کو مدافعت کی جرأت ہوئی اور نہ دولت علیہ اس غارت گری کو روک سکی،

فرانس کے لیے مخصوص مراعات ولینوف کی کوشش سے فرانس کو جو مخصوص فائدہ پہنچا وہ یہ تھا کہ

باب عالی نے ۱۶۷۳ء کے معاہدہ کی تجدید کرکے اُن تمام حقوق کا تحفظ کر دیا جو فرانسیسی تاجروں کو سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھے، نیز ستمبر ۱۷۴۰ء کے معاہدہ کے ذریعہ بعض جدید حقوق کے اضافہ کے ساتھ قدیم حقوق میں بھی فرانس کے حسب خواہ ترمیم کر دی، سلطان نے محمد سعید کو اپنا خاص سفیر بنا کر شاہ فرانس کے پاس روانہ کیا تاکہ وہ سلطان کی طرف سے تجارتی مراعات کو پیش کرے شاہ فرانس نے سلطان کے شایانِ شان اعزاز کیساتھ سفیر کا استقبال کیا، اور اس کی واپسی پر دو جنگی جہاز اور کچھ فرانسیسی توپچی سلطان کی خدمت میں بھیجے تاکہ عثمانی فوجوں میں وہ جدید طریقے جاری کریں جنھیں فرانس کے ممتاز ماہر فن حرب لووا نے فرانسیسی فوجوں میں رائج کیا تھا،

یوروپین حکومتوں کی باہمی لڑائیاں

صلحنامہ بلغراد کے بعد تقریباً تیس سال تک سلطنت عثمانیہ اور اسکی ہمسایہ سلطنتوں کے درمیان کوئی جنگ پیش نہیں آئی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ باب عالی موقع پانے کے باوجود جارحانہ اقدام سے اجتناب کرتا رہا، لیکن بڑا سبب یہ تھا کہ آسٹریا اور روس جو اس کی سب سے بڑی دشمن سلطنتیں تھیں، خود اپنے جھگڑوں میں مبتلا تھیں اور انھیں متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی فرصت نہ تھی ۱۷۴۰ء میں آسٹریا کے شہنشاہ چارلس ششم کا انتقال ہو گیا، اور اس کی لڑکی میریا تھیریسا (Maria Theresa) تخت پر بیٹھی، لیکن آسٹریا کی تقریباً تمام ہمسایہ عیسائی مملکتوں نے میریا کی مخالفت کی اور فرانس کی سرکردگی میں آٹھ سال تک اس جنگ کو جاری رکھا، جو آسٹریا کی جنگ جانشینی (War of Austrian Succession) کے نام سے موسوم ہے، اور جو بالآخر صلحنامہ ایلاشپیل (۱۷۴۸ء) کے تکملہ پر میریا کے حق میں ختم ہوئی، اسی طرح ۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۳ء تک جنگ ہفت سالہ کا سلسلہ قائم

رہا، جس نے یورپ کی سلطنتوں کو باہمی نزاعات میں مصروف رکھا، دولت علیہ نے ان میں سے کسی جنگ میں بھی حصہ نہیں لیا، حالانکہ اپنے قدیم دشمن آسٹریا کی پریشانی حالی سے فائدہ اُٹھا کر ہنگری کے سابق عثمانی مقبوضات کو واپس لے لینے کا بہت اچھا موقع تھا، برخلاف اس کے وہ نہایت دیانت داری کے ساتھ معاہدۂ بلغراد کی پابندی پر قائم رہی، یورپ کے قانونِ سیاست کے رو سے اسکی یہ خاموشی انتہائی غیر دانشمندی پر مبنی تھی، لیکن جو قانون سیاست سے بلند تر اصول یعنی اخلاق کا پابند ہے، وہ اسی خاموشی کا متقاضی تھا، باب عالی نے نہ صرف اُن جنگوں کی شرکت سے اجتناب کیا، بلکہ اپنے اثر سے محاربین میں صلح کرانے کی بھی امکانی کوشش کی، دشمن کی کمزوری سے فائدہ نہ اُٹھانے میں دولت علیہ نے جس بلندی اخلاق کا ثبوت دیا، اس کا اعتراف یورپین مورخین بھی کرتے ہیں،

مختلف شورشیں جہاں تک یورپ کی سلطنتوں کا تعلق تھا ۱۷۶۸ء تک دولت عثمانیہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی، لیکن ۱۷۴۳ء میں ایران سے پھر لڑائی چھڑ گئی، جو تین سال تک جاری رہنے کے بعد ۱۷۴۶ء میں تقریباً اُنہی شرائط پر ختم ہوئی، جن پر سلطان مراد رابع کے عہد میں ایران اور باب عالی کے درمیان صلحنامہ ہوا تھا، اس جنگ کے علاوہ سلطنت کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً مقامی پاشاؤں کی بغاوتیں بھی برپا ہوتی رہیں، جن سے کامل امن وسکون قائم نہ ہوسکا، دور دراز صوبوں کے والی کبھی کبھی مطلق العنان ہوجاتے تھے، اور حکومت کو بعض اوقات اُن کی سرکشی سے چشم پوشی کرنی پڑتی تھی، بغاوت کا سب سے زیادہ اثر مصر کے صوبہ میں تھا، جو بتدریج دولت علیہ کے قبضہ واقتدار سے نکلا جارہا تھا،

ایک سیاسی غلطی — ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں میں بعض ترک خاندانوں کو مخصوص امتیازات حاصل تھے، جن میں سب سے زیادہ اہم امتیاز وہاں کی زمینوں کا لگان وصول کر کے باب عالی میں پیش کرنا تھا، چونکہ سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوت وقتاً فوقتاً رونما ہوتی رہتی تھی، اس لئے ان خاندانوں کی سرکشی کے اندیشہ سے باب عالی نے وہ امتیازات اُن سے لے کر قسطنطنیہ کے دولت مند تاجروں کو دیدیئے، ان میں زیادہ تر یونانی تاجر تھے، جنھوں نے اپنی دولت کے معاوضہ میں بڑے بڑے القاب حاصل کر لئے تھے، ولاچیا اور مولڈیویا کے شریف ترک خاندانوں کی جگہ پر یہی دولتمند تاجر سرکاری مالگذاری وصول کرنے کے لئے مقرر کئے گئے، ان لوگوں نے رعایا کے ساتھ نہایت سختی اور تشدد کا برتاؤ کیا، اور ترک شرفا پر بڑے مظالم کئے، یہاں تک کہ قدیم ترک خاندان یکے بعد دیگرے ختم ہوتے گئے، اور اُن کے بجائے تاجروں کے نئے خاندان قائم ہو گئے، ان کی سختی اور تشدد کا سب سے زیادہ مضر نتیجہ یہ ہوا کہ عام رعایا برگشتہ ہو کر روس کی طرف مائل ہو گئی، [1]

وہابی تحریک — سلطنت کی مختلف شورشوں میں ایک نہایت اہم شورش وہابی تحریک کی تھی، جس کا آغاز اسی عہد میں شیخ عبدالوہاب نجدی نے کیا تھا، اس تحریک میں ابن سعود شیخ نجد کی حمایت سے بہت کچھ قوت آگئی تھی، اور باب عالی کو اس کے فرو کرنے میں خاصی کاوش کرنی پڑی، لیکن سلطان محمود کے عہد میں اس کا اثر بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا، اور اُس کے جانشینوں کی کوششیں بھی اس کے استیصال میں ناکام رہیں، تاآنکہ سلطان محمود ثانی کے عہد میں محمد علی پاشا والی مصر نے اس فرقہ کی سیاسی قوت

---

[1] فرید بک ص ۱۵۱،

کو توڑ کر اس کے آخری امیر کو گرفتار کر لیا اور اُسے ۱۸۱۸ء میں قسطنطنیہ روانہ کر دیا جہاں وہ قتل کر دیا گیا،

وفات ۲۷ صفر ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۷۵۴ء کو سلطان محمود اول نے وفات پائی، اُس کو تعمیرات سے بہت دلچسپی تھی، اُس نے قسطنطنیہ نیز مختلف صوبوں میں متعدد عظیم الشان عمارتیں بنوائیں، "جامع نورعثمانی" کی تعمیر اسی نے شروع کی تھی، اُس نے چار کتب خانے بھی پایہ تخت میں قائم کئے، وہ اپنے عدل و حلم اور تمام رعایا کے ساتھ یکساں انصاف کرنے میں خاص طور پر مشہور تھا،

عثمان ثالث

۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۷ء

سلطان محمود خاں اول کی وفات پر اس کا بھائی عثمان خاں ثالث تخت نشین ہوا، اُس نے صرف تین سال حکومت کی، اور اپنے مختصر عہد میں سلطان محمود ہی کے سیاسی اصولوں کا پابند رہا، چنانچہ ہمسایہ حکومتوں سے کوئی آویزش نہیں ہوئی، آسٹریا کی جنگ جانشینی کے بعد ۱۷۵۶ء میں "جنگ ہفت سالہ" شروع ہوگئی جس نے یورپین حکومتوں کو دو مخالف جماعتوں میں تقسیم کر کے سات سال تک وسط یورپ کو میدان کارزار بنائے رکھا، دولت عثمانیہ کے لئے یہ دوسرا نادر موقع تھا جب وہ دشمنوں کی باہمی جنگ سے فائدہ اٹھا سکتی تھی، مگر عثمان ثالث اس جنگ میں اخلاق و شرافت کے اُسی اصول پر قائم رہا جس کی مثال محمود اول نے آسٹریا کی جنگِ جانشینی کے موقع پر پیش کی تھی، سلطنت کے اندرونی نظم و نسق میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، اس عہد میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا،

۱۶؍ صفر ۱۱۷۱ھ مطابق ۳۰؍ اکتوبر ۱۷۵۷ء کو سلطان عثمان ثالث نے وفات پائی

مصطفیٰ ثالث

سنہ ۱۱۷۱ھ تا سنہ ۱۱۸۷ھ مطابق سنہ ۱۷۵۷ء تا سنہ ۱۷۷۳ء

عثمان ثالث کے بعد مصطفیٰ ثالث تخت پر آیا، یہ سلطان احمد ثالث کا لڑکا تھا، تخت نشینی کے وقت اسکی عمر پچاس سال کی تھی، اور یہ طویل مدت امورِ سلطنت سے علیحدہ محل کے ایک حصہ میں بسر ہوئی تھی، تاہم فطری اہلیت نے تجربہ کی کمی بہت کچھ پوری کردی تھی، اور اگر روس سے جنگ نہ چھڑ گئی ہوتی تو کوئی شبہہ نہیں کہ اسکی فرض شناسی اور تدبر سے سلطنت کو بہت فائدہ پہنچتا، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ مصطفیٰ نام کے جتنے سلطان ہوئے، اُن سب کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور اُس کے مقبوضات کے اہم حصے دشمنوں کے ہاتھ میں چلے گئے، تاہم مصطفیٰ ثالث کے عہد کے ابتدائی چھ سال جب کہ انصرامِ حکومت صدرِ اعظم راغب پاشا کے ہاتھ میں تھا دولت علیہ کی خوشحالی اور ترقی کے سال تھے،

راغب پاشا راغب پاشا سلطان محمود اول کے آخری دور میں صدر اعظم رہ چکا تھا، اپنی غیر معمولی لیاقت، تدبر اور حسنِ انتظام کے لحاظ سے وہ صدر اعظم صوقوللی پاشا اور وزرائے کوپریلی کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے، اپنی وفات تک اُس نے دولت علیہ کو دوسری

سلطنتوں کی آویزش سے محفوظ رکھا اور قیامِ امن کے ساتھ پوری توجہ سلطنت کی فلاح وبہبود پر صرف کرتا رہا، اُس نے سلطنت کے مختلف صیغوں کی اصلاح کی، اوقاف کی نگرانی کا خاص طور پر اہتمام کیا، شفاخانے بنوائے اور اپنی جیب خاص سے ایک کتب خانہ عام قائم کیا، گرانی اور قحط کے سدباب کے لئے اُس نے اندرون ملک میں ذرائع حمل ونقل کو آسان بنادینے کی ایک ایسی تجویز اختیار کی جس کی تکمیل نہایت درجہ مفید ثابت ہوتی، لیکن اُسے پورا کرنے سے پہلے ہی اُس کا انتقال ہوگیا، وہ تجویز یہ تھی کہ خلیج نائکومیڈیا کے مشرقی سرے سے ایک نہر نکال کر جھیل سبنجا (Sabandja) میں ملادی جائے، اور دوسری نہر جھیل سبنجا سے نکال کر دریائے سقاریہ میں ملادی جائے جو بحر اسود میں گرتا ہے، اس طرح باسفورس سے گذرے بغیر خلیج نائکومیڈیا سے بحر اسود تک آمدورفت جاری ہوجاتی، ان دو بڑی نہروں سے چھوٹی چھوٹی نہروں کا سلسلہ قائم کردیا جاتا، جن سے ملک کے ایک حصہ کی چیزیں دوسرے حصوں تک بہت آسانی کے ساتھ منتقل کیجاسکتی تھیں، تجارتی فائدہ کے علاوہ سبنجا میں ترکی بحریہ کا بھی ایک محفوظ اور مضبوط مرکز قائم کیا جاسکتا تھا، یہ تجویز کوئی نئی نہیں تھی، مصطفےٰ ثالث سے قبل سلیمان اعظم، مراد ثالث اور محمد رابع نے بھی اس کو عملاً شروع کردیا تھا لیکن تکملہ کسی سے بھی نہ ہوسکا، کریسی کا بیان ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے قیام سے پہلے بھی دو بار بیتھنیا کے فرماں رواؤں نے اور ایک بار شہنشاہ ٹریجن (Trajan) نے اسی تجویز کو اختیار کیا تھا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اسکے فوائد کے احساس کے باوجود اسکی تکمیل کسی نے بھی نہ کی حالانکہ نہ فاصلہ زیادہ تھا اور نہ زمین ایسی تھی جس کی کھودائی دشوار ہوتی،

پرشا سے اتحاد راغب پاشا کی خارجی سیاست کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ دولت عثمانیہ کو روس اور آسٹریا کی دشمنی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے دوسری عیسائی مملکتوں سے اتحاد قائم کیا جائے، آسٹریا کی جنگ جانشینی اور پھر جنگ ہفت سالہ کے بعد پرشا کا شمار یورپ کی نہایت طاقتور مملکتوں میں ہونے لگا تھا، اور اُس کے فرماں روا فریڈرک ثانی سے روس اور آسٹریا دونوں حد درجہ بغض و عناد رکھتے تھے، راغب پاشا نے اسی بنا پر پرشا کی دوستی کو بہت ضروری خیال کیا، اور اس کے لئے شروع ہی سے کوشش کرتا رہا، بالآخر ۱۷۶۱ء میں باب عالی اور پرشا کے درمیان ایک معاہدۂ اتحاد مرتب ہوگیا، اور فریڈرک ثانی کے سفیر نے قسطنطنیہ میں اس پر دستخط کر دیئے، فریڈرک کو دولت عثمانیہ سے اتحاد کرنے میں روس اور آسٹریا کی دشمنی سے قطع نظر اس وجہ سے بھی تامل نہ ہوا کہ اس کے برعکس صورت اختیار کرنے میں اُسے کوئی خاص فائدہ نظر نہ آتا تھا کیونکہ اُس کا ملک ہر طرف عیسائی مملکتوں سے گھرا ہوا تھا، اور اگر سلطنت عثمانیہ کا کوئی علاقہ نکل بھی جاتا تو اس سے پرشا کی مملکت میں اضافہ ہونے کا امکان نہ تھا اسی قسم کا اتحاد سوئڈن، نیپلز اور ڈنمارک سے بھی پہلے ہی قائم کرلیا گیا تھا، راغب پاشا چاہتا تھا کہ پرشا سے دوستی کا جو معاہدہ ہوا ہے اُسے مستحکم کرنے کے لئے اس شرط کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ فریقین جارحانہ اور مدافعانہ جنگوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں گے، لیکن اس مسئلہ میں گفتگو کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۱۷۶۳ء میں راغب پاشا کا انتقال ہوگیا، اور یہ کام ادھورا رہ گیا،

فریڈرک کا نقض عہد راغب پاشا کی وفات کے بعد سلطان نے انتظام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لیا، وہ ایک نہایت جفاکش اور لائق فرماں روا تھا، اور سلطنت کی

فلاح و بہبود کا دل سے خواہاں تھا لیکن اپنے وزیروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں کے انتخاب میں اکثر غلطی کر جاتا جو سلطنت کے لئے مضر ثابت ہوتی، اتفاق یہ کہ اُس کے ہمعصر فرماں رواؤں میں دو ایسے تھے جو اپنی غیر معمولی لیاقت اور طاقت کے اعتبار سے یورپ کے عظیم ترین فرماں رواؤں میں شمار کئے جاتے ہیں، یعنی کیتھرائن ثانیہ جس نے ۱۷۶۲ء میں اپنے شوہر زار کو قتل کرا کے روس کے تخت پر قبضہ کر لیا تھا، اور فریڈرک ثانی جو اپنے کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں فریڈرک اعظم کے نام سے مشہور ہے، یہ صحیح ہے کہ فریڈرک اور باب عالی کے درمیان دوستی کا ایک معاہدہ ہو چکا تھا لیکن یہ معاہدہ اُسی وقت تک قائم رہا جب تک اس کی پابندی فریڈرک کی ہوس و خود غرضی کے لئے روک نہ بنی، جوں ہی اُس نے محسوس کیا کہ پرشا کے اغراض اس معاہدہ کے مسترد کر دینے ہی سے پورے ہو سکتے ہیں، اس نے بلا تامل اسے توڑ کر دولت عثمانیہ کے دشمنوں سے رشتۂ اخوت جوڑ لیا،

کیتھرائن ثانیہ کیتھرائن ثانیہ ایک فوجی بغاوت کے بعد تخت پر آئی تھی، جن فوجی سرداروں نے اُس کے شوہر زار روس کو قتل کر کے اسے تخت پر بٹھایا تھا وہ مزید قتل و غارت گری کے لئے بیتاب تھے، اور ان کی نگاہیں ہر کمزور مملکت کی طرف اُٹھتی تھیں جس پر روس کی دست اندازی آسانی سے ممکن تھی، اس مقصد کے لئے انھوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ پہلے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے اندرون ملک میں خانہ جنگی شروع کرا دیتے اور پھر کمزور جماعت کی حمایت کے بہانہ سے دخل اندازی کرنے لگتے، اور جب خود انہی کی پیدا کی ہوئی بدامنی اُن کی کوششوں سے ترقی کر جاتی تو قیام امن کے دعوے کے ساتھ روسی فوجیں اُس ملک میں داخل کر کے اُس پر قبضہ

کر لیتے، کیتھرائن کے عہد کے ابتدائی سالوں میں یہ تدبیر خصوصیت کے ساتھ پولینڈ میں عمل میں لائی گئی، پرشا بھی اس غارت گری میں روس کا شریک ہوگیا، فریڈرک ثانی کو روس اور آسٹریا کے خلاف دولت عثمانیہ سے اتحاد کی خواہش باقی نہ رہی، بلکہ اُس نے سنہ ۱۷۶۴ء میں کیتھرائن کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا جس کے رو سے فریقین پابند ہوگئے کہ ایک دوسرے کے مقبوضات کا تحفظ کریں گے، اور عہد کیا کہ اگر کسی فریق پر حملہ ہوگا تو دوسرا فریق دس ہزار پیدل اور ایک ہزار سواروں سے اُس کی مدد کریگا، لیکن اگر روس پر ترکوں نے حملہ کیا یا پرشا پر فرانسیسیوں نے تو مدد بجائے فوج کے نقد کی شکل میں ہوگی اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ بھی تھی جس کا تعلق پولینڈ سے تھا، اور اس کے تکملہ کے چند ہی روز بعد دونوں حکومتوں کے درمیان پولینڈ کی تقسیم کی نسبت ایک تازہ معاہدہ بھی ہوگیا، جس میں میریا تھریسیا بھی شریک کی گئی، روس اور پرشا کی فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کرلیا، اور کیتھرائن کے ایک سابق آشنا اسٹانسلاس پونیاٹوسکی (Stanislaus Koinatowski) کو جبر پولینڈ کے تخت پر بٹھایا گیا، حالانکہ پولینڈ کے باشندے اُسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھے، روسی جنرل رپنن (Repnin) نے وارسا میں ڈکٹیٹر کی حیثیت اختیار کرلی، باب عالی نے روس اور پرشا کی اس ظالمانہ کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا، مگر ان سلطنتوں نے مطلق پروا نہ کی، برخلاف اس کے روس نے اپنے طرز عمل سے ظاہر کردیا کہ وہ باب عالی کو جنگ پر مجبور کردینا چاہتا ہے، اُس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کریمیا، موریا، مونٹی نگرو اور جارجیا کے علاقوں میں دولت علیہ کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کی، اس کے علاوہ جب پولینڈ کے وطن پرستوں کی ایک جماعت روسیوں کے مظالم سے بھاگ کر سلطنت عثمانیہ

کے حدود میں پناہ گزیں ہوئی تو روسی جنرل وائسمین (Weissmann) نے بلطہ تک اُس کا تعاقب کیا، جو بسرابیا کی سرحد پر خان کریمیا کے علاقہ میں واقع تھا، اور شہر پر گولہ باری کرکے اُسے برباد کر دیا،

اعلان جنگ روس کی مذکورۂ بالا کارروائیوں سے مجبور ہو کر سلطان نے ۶ر اکتوبر ۱۷۶۸ء کو قسطنطنیہ میں ایک دیوان منعقد کیا اور ارکین سلطنت سے اس باب میں مشورہ کیا، سب نے بالاتفاق روس کی درازدستیوں کی بنا پر جنگ کی رائے دی اور پولینڈ کے ساتھ اُس کے طرزِ عمل کو معاہدہ بلغراد کی خلاف ورزی قرار دیکر جنگ کو ضروری قرار دیا البتہ صدرِ اعظم محسن زادہ پاشا تنہا شخص تھا جس نے اس رائے کی مخالفت کی، اصول کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ دولت علیہ اس وقت جنگ کے لئے کافی طور پر تیار نہ تھی اور پوری تیاری کے بغیر لڑائی چھیڑ دینا کسی طرح مناسب نہ تھا، اس مخالفت کی بنا پر جو بعد کے واقعات سے بالکل حق بجانب ثابت ہوئی، وہ صدارت کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا، اور اسکی جگہ امین محمد پاشا جو سلطان کا داماد تھا صدرِ اعظم مقرر ہوا، دیوان کے فیصلہ کے مطابق ۶ر اکتوبر ۱۷۶۸ء کو جنگ کا اعلان کر دیا گیا،

آغازِ جنگ اعلانِ جنگ میں عجلت کی گئی، موسم سرما میں ایشیا کی فوجوں کو منتقل کرنا بہت دشوار تھا، اور اسی وجہ سے ۱۷۶۹ء کے موسم بہار تک عثمانی فوجیں اکٹھا نہ ہو سکیں لیکن یہ تاخیر روس کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی، اُس نے سلطنت عثمانیہ کے شمالی علاقوں پر حملہ شروع کر دیا، اعلانِ جنگ کے وقت ترکی قلعوں کی حالت بھی قابلِ اطمینان نہ تھی، نہ اُن کی قلعہ بندی مستحکم تھی اور نہ سامان رسد کافی مقدار میں جمع تھا، موسم سرما میں بابِ عالی نے ہر کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی، مگر وقت تنگ تھا، اور موسم بہار میں

باقاعدہ جنگ شروع ہونے تک بھی پوری تیاری نہ ہو سکی،

ابتدائی فتح بہرحال جنگ کے ابتدائی دور میں کریم گرائی، خان کریمیا نے روسیوں کو عاجز کر دیا، جنوری ۱۷۶۹ء میں اس نے بلطہ میں ایک لاکھ تاتاری سپاہیوں کا ایک زبردست لشکر تیار کر کے دریائے بوگ کو عبور کیا، اور دو ہفتہ تک روس کے جنوبی علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا رہا، اس مہم میں بیرن دی توت (Baron de Tott) مشہور فرانسیسی ماہر حرب بھی اس کے ساتھ تھا جسے شاہ فرانس نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و تربیت کے لئے باب عالی میں بھیجا تھا، جنوبی روس کی لشکر کشی کے بعد کریم گرائی کریمیا کو واپس آگیا، اور ایک ہی ماہ کے اندر اس کا انتقال ہو گیا، لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے یونانی طبیب نے اُسے زہر دیدیا، یہ طبیب امیر ولاچیا کا آدمی تھا، اُس کی وفات پر سلطان نے دولت گرائی کو کریمیا کا خان مقرر کیا، لیکن کریم گرائی کی لیاقت و شجاعت سے اُسے کوئی مناسبت نہ تھی،

روس کی تیاریاں، اسی درمیان میں کیتھرائن نے پانچ فوجیں میدان جنگ کو روانہ کیں، پہلی فوج نے شہزادہ گالٹزن (Galitzin) کی سرکردگی میں مولڈیویا پر حملہ کر کے خوزیم کا محاصرہ کر لیا، دوسری فوج جنرل رومانزوف (ROMANZOFF) کے زیر قیادت دریائے نیپر اور بحر ازوف کے درمیان روسی قلعوں کے استحکام اور ازوف اور تگنروگ کے قلعوں کی از سر نو تعمیر کے لئے روانہ ہوئی جو معاہدہ بلغراد کے رو سے مسمار کر دیئے گئے تھے، تیسری فوج دس گیارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ پولینڈ پر قبضہ کرنے کے لئے بڑھی، تاکہ اس طرف سے ترکوں کو مدد نہ مل سکے، چوتھی نے قبارطہ اور کیوبان کے تاتاری علاقوں کا رخ کیا، اور پانچویں تفلیس کی طرف روانہ ہوئی

تاکہ وہاں سے شہزادگانِ جارجیا کے ساتھ مل کر ارضِ روم اور طرابزون پر حملہ کرے، ساتھ ہی مونٹی نگرو کی عیسائی رعایا کے پاس روپیہ، سامانِ حرب اور فوجی افسر روانہ کئے گئے کہ انھیں ترکوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کریں،

امین پاشا کی نااہلی | روس کی ان تیاریوں کے باوجود امین پاشا ہی ۱۷۶۹ء تک مقابلہ کے لئے روانہ نہ ہوسکا اور روانہ ہونے کے بعد بھی خود یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ کوچ کس سمت کو ہونا چاہیئے، اُس نے فوجی افسروں کو مشورہ کے لئے جمع کیا، اور فنِ حرب سے اپنی عدم واقفیت کا اعتراف صاف الفاظ میں کرتے ہوئے فوج کی نقل و حرکت سے متعلق اُن کی رائے دریافت کی، اس نے کہا:-

"مجھے جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے، فوج کی نقل و حرکت کا فیصلہ آپ لوگوں پر ہے اور یہ آپ ہی بتائیں کہ افواجِ عثمانیہ کی کامیابی کے لئے بہترین تدبیریں کیا ہوں گی آپ لوگ بلاتکلف اپنے خیالات ظاہر کریں اور اپنے مشورہ سے میری رہنمائی کریں"

افسرانِ فوج کو سپہ سالار کے اس اعترافِ نااہلی پر سخت تعجب ہوا لیکن اُن کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کہ بحث و مباحثہ کے بعد کسی صحیح فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کریں، چنانچہ متعدد افسروں نے مختلف رائیں پیش کیں، آخر میں صرف اس پر اتفاق ہوسکا کہ دریائے ڈینوب کو عبور کرکے مولڈیویا میں داخل ہوجائیں، اور پھر جیسی صورت مناسب ہو اُس کے مطابق عمل کریں، چنانچہ فوج نے دریائے ڈینوب کو عبور کیا، پھر دریائے پرتھ کے ساحل پر خاندیپی (Khandepe) پہنچی جو خوزیم اور یاسی کے درمیان میں واقع ہے، وہاں سامانِ رسد کی قلت اور پسوؤں اور مچھروں کی کثرت نے سپاہیوں کو پریشان کردیا، اور امین پاشا نے مجبور ہوکر بندر کا رُخ کیا، لیکن اُس طرف بھی وہی

دشواریاں پیش آئیں جن سے خاندیبی میں دوچار ہونا پڑا تھا، اس درمیان میں شہزادہ گالٹزن پوڈولیا سے تازہ افواج لے کر ترکوں کے مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا، روس نے پولینڈ کو مجبور کر کے اس سے دولت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کرا دیا تھا، جس کے جواب میں باب عالی نے بھی بادل ناخواستہ پولینڈ کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے، خوزیم کے قریب روسی اور عثمانی فوجوں میں متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں، جن میں صدر اعظم امین پاشا اور شہزادہ گالٹزن دونوں نے اپنی نااہلی کا پورا پورا ثبوت دیا، سلطان نے امین پاشا کو معزول کر کے واپس بلا لیا، اور اگست ۱۷۶۹ء میں اُسے قتل کرا دیا، امین پاشا کا جانشین صدر اعظم علی پاشا ایک بہادر افسر تھا، سالار عسکر ہونے کے بعد اُس نے روسی فوجوں پر خوزیم کے قریب متعدد حملے کئے اور پولینڈ میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن آخر کار اُسے ہزیمت ہوئی اور ۱۸ ستمبر ۱۷۶۹ء کو خوزیم نے ہتھیار ڈال دیئے، ترکی فوجوں نے پسپا ہو کر دریائے ڈینوب کی طرف کوچ کیا، کیتھرائن نے بھی گالٹزن کو اس کی نالائقی کی بنا پر واپس بلا لیا، اور اسکی جگہ رومانزوف کو روسی فوجوں کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا، جس نے تھوڑے ہی دنوں میں تمام مولڈیویا پر قبضہ کر لیا،

مولڈیویا میں روس کی شکست

لیکن اس کامیابی سے کیتھرائن کے حوصلوں کی تشفی نہ ہوئی، اسکی "مشرقی تجویز" کا اہم ترین مقصد ترکوں کو یورپ سے نکال دینا تھا، یہی مقصد پیٹر اعظم کے پیش نظر بھی تھا، اور مارشل میونخ کی تمام سرگرمیاں بھی صرف اسی کے لئے تھیں، یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے روسی فوجوں کی فتوحات کے علاوہ عیسائی رعایا کو بھی دولت علیہ کے خلاف برگشتہ کر دینا بہت ضروری تھا، چنانچہ کیتھرائن نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے آدمیوں کو خفیہ طور پر راہبوں کے لباس میں یونان اور

یورپین ٹرکی کے جنوبی علاقوں میں بھیجنا شروع کر دیا تھا تاکہ عیسائی رعایا کو علمِ بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کر رکھیں موریا کی یونانی رعایا میں کیتھرائن کے فرستادوں کی کوششیں خاص طور پر کامیاب ہوئیں، اور ان لوگوں نے اصرار کے ساتھ کیتھرائن سے مدد کی درخواست کی اور اُسے یقین دلایا کہ وہ ترکوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے پر بالکل تیار ہیں، یہ وقت دولت علیہ کے لئے مختلف پریشانیوں کا وقت تھا ایک طرف اگر کریمیا اور دریائے ڈنیوب کے ساحلی علاقوں پر روسی فوجیں غالب آ رہی تھیں تو دوسری طرف مصر کے والی علی بیگ نے تقریبًا خود مختاری حاصل کر لی تھی، پھر شام میں بھی بغاوت پھیلی ہوئی تھی، روس نے باغیوں کی مدد کر کے اُن کی ہمتوں کو اور بھی بڑھا دیا اور کیتھرائن کو توقع ہو گئی کہ ایک ہی کوشش میں یونان مصر اور شام تینوں صوبے سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل جائیں گے، یونان والوں کے اصرار پر اس نے ایک بحری جنگی بیڑہ الکسیز اورلوف (Alexis Orlof) کی سرکردگی میں روانہ کیا جو فروری ۱۷۷۰ء میں ساحل موریا کے سامنے نمودار ہوا، باغیوں نے روسی فوج کا پرجوش استقبال کیا، اور اس علاقہ کے ترک باشندوں پر جن کی تعداد نسبتًہ بہت کم تھی شدید ترین مظالم توڑے[1]، محسن زادہ پاشا سابق صدر اعظم موریا کا حاکم تھا، اُس نے نہایت استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر یونانی باغیوں اور اُن کے روسی حلیفوں کو میدان جنگ میں شکست دی، روسی دستہ شکست کھا کر اپنے جہازوں پر بھاگا اور فورًا لنگر اُٹھا کر یونانیوں کو خیرباد کہتا ہوا روانہ ہو گیا، واپسی میں جزائر موڈن و کورن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، ۷ جولائی ۱۷۷۰ء کو جزیرہ سیوس (Scios) کے قریب

---

[1] ایورسلے ص ۲۱۴،

ایک عثمانی بیڑہ سے مقابلہ ہوا، ترکوں کو شکست ہوئی لیکن اس جنگ میں عثمانی بیڑے کے ایک افسر حسن الجزائری نے اپنی حیرت انگیز شجاعت کا لوہا غنیم سے بھی منوا لیا، اس نے اپنا جہاز روسی امیر البحر کے جہاز کے قریب لیجا کر گولہ باری شروع کر دی اور دشمن سے گھرے ہونے کے باوجود کمال بے خوفی کے ساتھ لڑتا رہا، یہاں تک کہ دونوں جہازوں میں آگ لگ گئی،

عثمانی جہازوں کی بربادی۔

عثمانی بیڑہ شکست کے بعد شسمہ (Tchesme) کی چھوٹی سے بندرگاہ میں پناہ گزیں ہوا جہاں روسی امیر البحر الفنسٹن (Elphinstone) نے اُس کا محاصرہ کر لیا، الفنسٹن ایک انگریز افسر تھا جس کی خدمات روس نے حاصل کر لی تھیں، اس کے علاوہ اور بھی متعدد انگریز روسی بیڑہ کے ذمہ دار عہدوں پر مامور تھے، انہی میں سے ایک نے جس کا نام ڈگڈیل (Dugdale) تھا، الفنسٹن اور ایک دوسرے انگریز افسر گریگ (Greig) کے مشورہ سے عثمانی بیڑہ کو برباد کر دینے کی ایک نہایت خطرناک تدبیر اختیار کی، وہ اپنے جہاز کو لے کر شسمہ کی بندرگاہ میں داخل ہوا، جہاں عثمانی جہاز ایک دوسرے سے ملے ہوئے محصور کھڑے تھے، اور جب اُن کے قریب پہنچ گیا تو ایک جہاز میں آگ لگا دی، آگ لگنے سے قبل ہی اس کے جہاز کے تمام روسی سپاہی اپنی جان بچانے کے لئے پانی میں کود پڑے تھے، اور اس کو تنہا چھوڑ دیا تھا، لیکن ڈگڈیل نے اس کی پروا نہ کی اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر عثمانی بیڑہ کے ایک جہاز میں آگ لگا دی، یہ آگ فوراً ہی دوسرے جہازوں تک پھیل گئی، اور چونکہ بندرگاہ کے تنگ ہونے کی وجہ سے تمام جہاز پاس ہی پاس کھڑے ہوئے تھے، اس لئے پورا بیڑہ دیکھتے دیکھتے جل کر برباد ہو گیا، صرف ایک

جہاز باقی رہ گیا جسے روسیوں نے گرفتار کرلیا، اور پھر شسمہ کے شہر قلعہ اور توپخانہ پر بھی انھوں نے قبضہ کرلیا،

اس کے بعد الفنسٹن نے چاہا کہ روسی بیڑہ کے ساتھ فوراً دردانیال کو روانہ ہوجائے اور بحر مارمورا میں داخل ہوکر قسطنطنیہ پر گولہ باری شروع کردے لیکن اورلوف نے اس تجویز پر عمل کرنے میں پس وپیش اور تاخیر کی، ترکوں نے اسکی اطلاع پاتے ہی دردانیال کے دونوں ساحلوں پر دو دو توپخانے آمنے سامنے نصب کردیئے اور اس مورچہ بندی کے بعد روسی جہازوں کے لئے دردانیال میں داخل ہونا ناممکن ہوگیا،

حسن کی حیرت انگیز کامیابی

ادھر سے مایوس ہوکر اورلوف روسی بیڑہ کے ساتھ جزیرہ لمنوس پہنچا، اور وہاں اپنی فوجیں اُتار کر جزیرہ کے خاص قلعہ کا محاصرہ کرلیا، دو ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ کے ترکی دستہ نے بعض شرائط پر ہتھیار ڈال دینا منظور کرلیا، لیکن اسی درمیان میں حسن الجزائری نے باب عالی سے اس بات کی اجازت حاصل کرلی کہ قسطنطنیہ کے چار ہزار اوباشوں کی ایک فوج مرتب کرکے لمنوس کو روسی پنجہ سے چھڑا لینے کی کوشش کرے، جب اس سے کہا گیا کہ ایسی فوج سے یہ مہم سر نہ ہوسکے گی، تو اُس نے جواب دیا کہ اگر حملہ ناکام رہا تو بھی اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ دارالسلطنت کے بدمعاشوں میں چار ہزار کی کمی ہوجائے گی، چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۷۷۰ء کو علی الصباح اس عجیب وغریب فوج کے ساتھ لمنوس کے مشرقی ساحل پر اُتر کر اُس نے محاصرہ کرنے والوں پر اچانک حملہ کردیا، روسیوں کا اکثر حصہ قتل ہوگیا، بقیہ اپنی جان لے کر بھاگا اور جہازوں پر سوار ہوکر فوراً روانہ ہوگیا، اس مہم کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد سلطان نے حسن کو عثمانی بحریہ کا قپودان پاشا مقرر کیا، حسن نے ایک تازہ بیڑہ مرتب کرکے چند ہی

روز کے بعد بندر مونڈریسو (Mondreso) کے قریب روسی بیڑہ کو پھر
شکست دی اور لوف کو مجبوراً اپنے جہاز لے کر وہاں سے بھاگنا پڑا،

علی بیگ کی بغاوت اس وقت مصر اور شام میں بغاوت برپا تھی، اور لوف نے باغی مملوکوں
کے سردار علی بیگ کی مدد کے لئے چار ہزار روسی سپاہی شام میں اتارے عکہ کے
عامل شیخ طاہر نے بھی علی بیگ کا ساتھ دیا، چنانچہ شیخ طاہر اور روسی فوج کی مدد سے
اس نے غزہ، بیت المقدس، یافا اور دمشق وغیرہ شام کے متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا،
وہ چاہتا تھا کہ اس کے بعد اناطولیہ پر حملہ آور ہو لیکن مصر کے ایک مملوک امیر ابوذہب
نے جو علی بیگ کا عزیز تھا، خود اس کے خلاف بغاوت کر دی جس کے مقابلہ کے لئے
علی بیگ کو مصر واپس جانا پڑا، علی بیگ کو شکست ہوئی، اور وہ مع اپنے چار سو روسی
مددگاروں کے مارا گیا، ابوذہب نے علی بیگ اور روسی امراء کے سر کاٹ کر قسطنطنیہ
بھیج دیئے،

ترکوں کی مسلسل شکست اس درمیان میں دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں میں روس
سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا، اور عثمانی فوجوں کو پے درپے شکستیں ہو رہی تھیں، ۱۷۷۰ء
میں روسی سپہ سالار رومانزوف نے تمام مولڈیویا کو تاراج کر ڈالا، صدر اعظم خلیل پاشا
تیس ہزار عثمانی سپاہ اور تاتاریوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مقابلہ کے لئے آگے
بڑھا، کرتال کے مقام پر دونوں فوجیں مقابل ہوئیں، میدان روسیوں کے ہاتھ رہا،
اور ترک اپنی توپیں اور بہت کچھ سامان چھوڑ کر منتشر ہو گئے ۱۷۷۰ء کے آخر تک دریائے ڈینوب
کے شمال میں جتنے عثمانی قلعے تھے سب پر روس کا قبضہ ہو گیا، صدر اعظم کی فوج میں صرف
دو ہزار سپاہی ہی باقی رہ گئے، آئندہ سال (۱۷۷۱ء) عثمانی اقتدار کے لئے اور زیادہ

بربادکن ثابت ہوا، شہزادہ ڈولگوروکی (Dolgorouki) اسی ہزار روسی اور ساٹھ ہزار تاتاری سپاہ کے ساتھ جو کیتھرائن کی فوج میں شامل ہوگئے تھے، کریمیا پر حملہ آور ہوا، سلیم گرائی خان کریمیا نے شروع میں تو مقابلہ کیا، لیکن جلد ہمت ہار گیا، اور ملک کو روسیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر قسطنطنیہ روانہ ہوگیا، اُس کے یوں بھاگ کھڑے ہونے سے تاتاریوں کی ہمت چھوٹ گئی اور بہتوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر اناطولیہ میں پناہ لی، جو باقی رہ گئے اُنھوں نے روسی فاتحوں سے صلح کر لینی چاہی، ڈولگوروکی نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا، اور وعدہ کیا کہ زارینہ کے زیر سیادت اہل کریمیا کی آزادی برقرار رکھی جائے گی، اور کریمیا کے شاہی خاندان کا ایک رکن وہاں کا فرماں روا مقرر کر دیا جائیگا، اس وعدہ کی بنا پر تاتاریوں نے زارینہ کی وفاداری کا حلف لیا، اور اپنے اڑتالیس نمایندوں کو سلیم گرائی کے دو لڑکوں کے ساتھ کیتھرائن کے دربار میں سینٹ پیٹرس برگ روانہ کیا، اس کے بعد کافہ، کرش اور ینی قلعہ کے قلعوں نے اپنے دروازے روسیوں کے لئے کھول دیئے، کریمیا میں جو ترکی دستہ متعین تھا، اُس نے روسی فوج کا مقابلہ کیا، لیکن اُس کی تعداد غنیم کے مقابلہ میں اس قدر کم تھی کہ مقاومت بے سود ثابت ہوئی اور شکست کے بعد ترکی سر عسکر گرفتار ہو کر سینٹ پیٹرس برگ بھیج دیا گیا، سارے کریمیا پر روس کا تسلط قائم ہوگیا، اسی سال روسی فوجوں نے یکے بعد دیگرے ولاچیا اور مولڈیا پر بھی قبضہ کر لیا، اور خوزیم اور یاسی کے اہم قلعے بھی فتح کر لئے، البتہ اوکزاکوف اور کلبرن کی مدافعت میں عثمانی فوجیں کامیاب رہیں، اور محسن زادہ پاشا نے روسیوں کو شکست دیکر جیورجیوو (Giurgevo) کے قلعہ پر جو دریائے ڈینوب کے ساحل پر واقع تھا دوبارہ قبضہ کر لیا، مگر جارجیا اور منگریلیا سے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا،

یورپ کی خداعی

روسی فوجوں کی ان فتوحات سے اب آسٹریا اور پرشا کی حکومتیں متردد نظر آنے لگیں، کیونکہ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت خود اُن کے لئے خطرناک ہو رہی تھی، چنانچہ دونوں نے کوشش شروع کی کہ کسی طرح دولت عثمانیہ اور روس میں صلح ہو جائے اس جنگ میں یوروپین حکومتوں کی سیاست مکروفریب کا ایک ایسا نمونہ تھی جس کی مثال صرف یورپ ہی کی تاریخ میں مل سکتی ہے، اس اجمال کی تفصیل کیلئے سطور ذیل ملاحظہ ہوں

فرانس

حکومت فرانس دولت عثمانیہ کی دوست اور روس کی دشمن تھی، اسکی خارجی سیاست کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ دولت علیہ سے مل کر روس کے دائرۂ اقتدار کو بڑھنے سے روکے خصوصاً پولینڈ کو اسکی زد سے محفوظ رکھے، لیکن اس کے باوجود وہ روس سے ترکوں کی حمایت میں جنگ کرنے پر تیار نہ تھی، برخلاف اس کے اسکی پالیسی یہ تھی کہ خود جنگ سے علیحدہ رہکر سلطنت عثمانیہ اور روس کو باہم لڑا دے تاکہ دونوں ایک ہی وقت میں کمزور ہو جائیں، چنانچہ فرانس کے وزیر اعظم شوازیل (Choiseul) نے دسمبر ۱۷۶۹ء میں ایک خط پرنس کونتز (KAUNITZ) وزیر اعظم آسٹریا کو اس مضمون کا لکھا کہ ترکی اور روس کی جنگ جتنے ہی عرصہ تک قائم رہے، فرانس اور آسٹریا کے اتحاد کیلئے مفید ہے، کیونکہ اس صورت میں دونوں حریف یکساں طور پر کمزور ہو جائیں گے اور اگر زمانہ نے مساعدت کی تو اس سے ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوں گے[1]، نہ صرف یہ کہ اس جنگ کے جاری رکھنے میں حکومت فرانس اپنا فائدہ دیکھ رہی تھی، بلکہ روس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لئے باب عالی کو اپنی ترغیبوں سے مجبور بھی اُسی نے کیا، چنانچہ جب کیتھرائن کے ایجنٹ یونان، کریٹ، بوسینا اور مونٹی نیگرو میں پہنچ کر عیسائی رعایا کو دولت عثمانیہ

۱؎ "المسئلۃ الشرقیہ" از مصطفےٰ کامل پاشا، مطبوعہ مصر، حصہ اول ص ۳۸-۳۹،

کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے لگے تو فرانس کے سفیر ورجنیز (Vergennes)
نے اس بات پر زور دیا کہ روس کی ان کارروائیوں کا جواب دیا جائے اور پھر کچھ عرصہ کے
بعد جب اہلِ پولینڈ کی ایک جماعت روس کے مظالم سے تنگ آکر سلطنت عثمانیہ کی سرحد میں
پناہ گزیں ہوئی اور روسی دستوں نے وہاں اُن کا تعاقب کیا تو بابِ عالی کو اعلانِ جنگ
پر آمادہ کرنے میں زیادہ دخل سفیر فرانس ہی کے مشورہ کو تھا، حکومت فرانس کے نزدیک
یہ جنگ اتنی اہم اور ضروری تھی کہ اُس نے اپنے سفیر کو اس عظیم الشان خدمت کے صلہ
میں تین ملین کی گرانقدر رقم پیش کی تھی، مگر ورجنیز نے اس رقم کو واپس کر دیا، اور لکھا کہ
"جنگ کا اعلان ہو گیا ہے، میں نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی، تین ملین کی رقم جو میرے
کام کے لئے بھیجی گئی ہے واپس کرتا ہوں، اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے[1]

انگلستان، فرانس کی دشمنی تو چھپی ہوئی تھی لیکن انگلستان کا طرزِ عمل واضح طور پر مخالفانہ
تھا گو بظاہر وہ بھی اپنے کو دولت عثمانیہ کے دوست کی حیثیت سے پیش کر رہا تھا، چنانچہ
جیسا کہ مصطفےٰ کامل پاشا نے لکھا ہے، اٹھارہویں صدی میں انگلستان کی سیاست دولت
عثمانیہ کی نسبت دورخی تھی، ایک طرف تو وہ روسیوں کو جنگ میں پوری مدد دے رہا تھا
اور دوسری طرف دولت عثمانیہ کی دوستی کا دم بھر رہا تھا، تاکہ اُس کے رازوں سے واقف
ہو کر حکومت روس کو باخبر کرتا رہے، انگلستان کی اس پالیسی کے مختلف اسباب تھے،
چند ہی سال قبل انگلستان نے فرانس کو شکست دیکر ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، جس کی
وجہ سے فرانس اس کا سب سے بڑا دشمن تھا، اور چونکہ فرانس دولت عثمانیہ کا حلیف تھا، اسلئے
قدرۃً انگلستان روس کی جانب مائل ہوا، روس اور انگلستان کے اتحاد میں اس وجہ سے

---

[1] میریٹ ص ۱۴۷،

بھی سہولت ہوئی کہ ابھی تک روس کی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول نہیں ہوئی تھی، اور انگلستان کو روس کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا تھا، علاوہ بریں ان دونوں سلطنتوں میں تجارتی تعلقات بھی تھے، روس کی درآمد تمامتر انگلستان سے ہوتی تھی، اگر انگلستان روس کا ساتھ نہ دیتا تو ان تجارتی تعلقات کا منقطع ہوجانا یقینی تھا، لیکن چونکہ اُسی زمانہ میں انگلستان اپنی سلطنت کے اندرونی خلفشار میں مبتلا تھا، یعنی ایک طرف امریکہ کے نوآبادکار آزادی اور خودمختار حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم کرنے کی جدوجہد جاری تھی، اسلئے روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ میں وہ کوئی نمایاں حصہ نہ لے سکا، تاہم اسکے متعدد جنگی جہاز روسی بیڑہ میں شامل تھے اور بہت سے انگریز افسر روسی جہازوں اور فوجوں میں کام کر رہے تھے[۱] پھر بھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا وہ دولت علیہ کی دوستی کے پردہ میں روس کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا، اور علانیہ دشمنی کو اپنے مقصد کے خلاف سمجھتا تھا، اس لئے اُس نے ۱۷۷۰ء میں باب عالی کے سامنے اپنی خدمات روس سے صلح کرانے کے لئے پیش کیں، اس کے جواب میں باب عالی نے سفیر برطانیہ کو یہ لکھا کہ "یہ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ انگلستان اپنی وساطت سے صلح کرانے کی تجویز پیش کر رہا ہے، حالانکہ اُس کے جہاز روسی بیڑہ میں شامل ہوکر ہم سے جنگ کر رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ اُس کی یہ تجویز صرف روس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے ہے، پس انگلستان کو چاہئے کہ اپنی پالیسی صاف طور پر ظاہر کر دے، تاکہ باب عالی کو معلوم ہوجائے کہ وہ کس کے ساتھ ہے"، اس جواب کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کو معلوم ہوگیا کہ باب عالی اُس کی

---

[۱] مصطفیٰ کامل پاشا ص ۴۳،

دورخی پالیسی سے واقف ہو، چنانچہ اس نے شرمندہ ہوکر اپنے جہاز اور افسر روس سے واپس بلالئے، لیکن یہ اُس وقت ہوا جب لڑائی قریب ختم کے تھی، پھر بھی انگلستان روس کے ساتھ حق دوستی کچھ نہ کچھ اداکرتا رہا، چنانچہ جب باب عالی نے پرشا اور آسٹریا سے یہ خواہش کی کہ وہ درمیان میں پڑکر صلح کرادیں تو برطانوی سفیر نے ایک جاسوس کی طرح اسکی اطلاع حکومت روس کو دیدی تاکہ وہ ہوشیار ہوجائے، کیتھرائن کو جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے جنرل رومانزوف کو ہدایت کی کہ وہ صدر اعظم کو لکھے کہ روس باب عالی کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ سفیر روس اوبرسکوف جو اعلان جنگ کے وقت قسطنطینیہ میں قید کردیا گیا تھا آزاد کردیا جائے اور پرشا اور آسٹریا کو صلح کے معاملہ میں نہ پڑنے دیا جائے، کیونکہ ایسی صورت میں فرانس بھی دخل دیگا، اور اسکی مداخلت زارینہ کو قطعاً منظور نہیں ہو، روس کیساتھ انگلستان کی شرکت کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ دوران جنگ میں جب فرانسیسی وزیر اعظم شوازیل نے اپنی مجلس میں یہ تجویز پیش کی کہ روسی بیڑوں پر ضرب لگائی جائے تو قبل اسکے کہ خود فرانس کی مجلس میں یہ تجویز نامنظور کردیجائے، برطانوی وزارت نے یہ اعلان کیا کہ روس کے خلاف ہر کارروائی انگلستان کی اہانت اور دشمنی تصور کیجائیگی،[1] اسی کے ساتھ حکومت فرانس کا بھی اس تجویز کو نامنظور کردینا یہ واضح کردیتا ہو کہ دولت عثمانیہ کے ساتھ اسکی دوستی کی حقیقت کیا تھی،

پرشا فریڈرک اعظم بھی روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، مگر اس طرح کہ دولت عثمانیہ کو نقصان نہ پہنچنے پائے، وہ روس سے جنگ کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا بلکہ اس کا حلیف ہونے میں اپنا فائدہ دیکھ رہا تھا، اس کی خارجی

---

[1] مصطفےٰ کامل پاشا صہ۴۷، و میریٹ صہ۱۴۹،

سیاست کے دو اہم جزو تھے، پولینڈ کی تقسیم اور سلطنت عثمانیہ کی بقا، پولینڈ کی سرحد مملکت پرشا سے ملی ہوئی تھی، اور پرشا کو اپنے حدود کی توسیع کا موقع صرف پولینڈ ہی میں حاصل تھا جس پر روس کے فریب و استبداد کا تسلط قائم تھا گو حکومت بظاہر اہل پولینڈ کے ہاتھ میں تھی، فرانس پولینڈ کی تقسیم کا سخت مخالف تھا، اور چونکہ آسٹریا فرانس کا حلیف تھا، اس لئے فریڈرک کے لئے ضروری تھا کہ تقسیم پولینڈ کا لالچ دے کر آسٹریا کو فرانس کی دوستی سے علیحدہ کرے، آسٹریا اور روس کی شرکت کے بغیر فریڈرک کے لئے اپنا مقصد حاصل کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ جب روس اور دولت عثمانیہ کی جنگ شروع ہوئی تو فریڈرک نے اس بات کی کوشش کی کہ آسٹریا کو فرانس کے اتحاد سے علیحدہ کر کے پرشا، روس اور آسٹریا کا ایک اتحاد ثلاثہ پولینڈ کی تقسیم کے لئے قائم کرے، لیکن جب فریڈرک کے سفیر نے روسی وزیر اعظم سے اس مسئلہ میں گفتگو کی تو موخر الذکر نے یہ جواب دیا کہ اتحاد ثلاثہ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی تقسیم بھی ہونا چاہئے، فریڈرک اس کے لئے راضی نہ تھا، بظاہر تو اس میں پرشا کا فائدہ تھا، لیکن جیسا کہ مصطفےٰ کامل پاشا فرماتے ہیں فریڈرک پرشا کا حقیقی فائدہ دولت عثمانیہ کی بقا اور استقلال میں دیکھتا تھا، وہ اپنی بصیرت سے یہ دیکھ رہا تھا کہ پرشا اور روس کی دوستی ایک روز ختم ہو جائے گی، اور اس وقت سلطنت عثمانیہ کا قیام بطور ایک قلعہ اور چٹان کے ہوگا، جو روس کو آگے بڑھنے سے روکے گی اور جس کی قوت پر پرشا اعتماد کرے گا، بہرحال حکومت روس کے اس جواب کے باوجود فریڈرک نے تقسیم پولینڈ کی تجویز ترک نہ کی، بلکہ اس مقصد کے لئے اس نے آسٹریا سے ایک مخفی اتحاد کرنا چاہا، اخفار کا اہتمام صرف اس غرض سے کیا گیا کہ حکومت روس کو تشویش پیدا ہو جائے اور وہ پرشا کے ساتھ اتحاد کرنے کی ضرورت محسوس کرے، چنانچہ شہر نیس میں فریڈرک نے

میریا تھیریسیا اور اس کے لڑکے جوزف ثانی سے جو انتظام سلطنت میں اب اپنی ماں کا شریک تھا، ملاقات کی اور اگست ۱۷۶۹ء میں آسٹریا اور پرشیا کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہو گیا، روس چونکہ اس معاہدہ کے مضمون سے ناواقف تھا اسلئے اسکو یہ خطرہ ہوا کہ اس معاہدہ میں مسئلۂ شرقیہ کا فیصلہ اس کے مفاد کے خلاف کیا گیا ہے، چنانچہ جیسا کہ فریڈرک نے پیش بینی کی تھی روس کو بھی پرشیا کے ساتھ اتحاد کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور ۱۲ اکتوبر ۱۷۶۹ء کو اس نے ۱۷۶۴ء کے معاہدہ کی تجدید کر دی جس کے رو سے روس اور پرشیا آٹھ سال کے لئے حلیف بن گئے تھے، فریڈرک کی خواہش پر اس تازہ معاہدہ کی مدت ۱۷۸۰ء تک بڑھا دی گئی،

اس کے بعد فریڈرک نے یہ چاہا کہ روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان صلح کرا دے باب عالی کی طرف سے بھی صلح کے لئے پرشیا اور آسٹریا کی وساطت کی خواہش کی گئی، لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا سفیر انگلستان نے باب عالی کی اس خواہش کی اطلاع حکومت روس کو کر دی، اور کیتھرائن نے پرشیا اور آسٹریا کی وساطت قبول کرنے سے انکار کر دیا اسی اثناء میں روسی فوجیں بندر اور اکرمان وغیرہ پر قابض ہو گئیں، اور ان فتوحات سے روس کے حوصلے بہت بڑھ گئے، چنانچہ جب فریڈرک نے دولت عثمانیہ اور روس میں صلح کرانے کے لئے کیتھرائن سے اصرار شروع کیا، تو اس نے ۲۰ ستمبر ۱۷۷۰ء کو فریڈرک کو ایک خط لکھا جس میں صلح کے شرائط حسب ذیل قرار دیئے :-

ازف اور کابارڈا پر روس کا قبضہ تسلیم کیا جائے اور ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتیں دولت عثمانیہ کی فرماں روائی سے آزاد کر دی جائیں، یا یہ دونوں صوبے تاوان جنگ کے طور پر چوتھائی صدی کے لئے روس کو دیدیئے جائیں، بسرابیا اور کریمیا کے

تاتاریوں کی خودمختاری تسلیم کرلیجائے، بحرِاسود میں روسی جہازوں کو آزادی حاصل ہو، یونانی مجمع الجزائر میں سے ایک جزیرہ روس کو دیدیا جائے، اور اُن تمام یونانیوں کے لئے جنھوں نے دورانِ جنگ میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی تھی عام معافی کا اعلان کردیا جائے[1]،

مذکورۂ بالا شرائط معلوم کرنے کے بعد فریڈرک نے اپنے بھائی پرنس ہنری کو جو سینٹ پیٹرس برگ میں مقیم تھا، ۳۰ جنوری ۱۷۷۱ء کو یہ لکھا کہ "روس کے شرائطِ صلح نے مجھے حیرت زدہ کردیا ہے، اور میں انھیں ترکوں اور اہلِ آسٹریا کے سامنے پیش کرنے سے معذور ہوں کیونکہ وہ قطعاً ناقابلِ قبول ہیں" پھر ۵ جنوری ۱۷۷۱ء کو اُس نے خود کیتھرائن کو بھی ایک خط لکھا کہ اگر وہ آسٹریا کے ساتھ جنگ کرنے سے بچنا چاہتی ہے، تو اُسے چاہئے کہ ازف اور کاربادا کے لینے اور بحرِاسود میں جہازرانی کی آزادی حاصل کرنے پر قناعت کرے، فریڈرک خوب جانتا تھا کہ ولاچیا اور مولڈیویا پر روس کا قبضہ آسٹریا کو کسی طرح گوارا نہ ہوگا، کیونکہ انہی صوبوں پر خود آسٹریا کی نظریں بھی لگی ہوئی تھیں،

آسٹریا اس جنگ میں حکومت آسٹریا کی پالیسی سب سے زیادہ پُرفریب تھی، وہ روس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہوکر دولت عثمانیہ سے اتحاد بھی کرنا چاہتی تھی اور اس اتحاد سے فائدہ اٹھاکر سلطنت عثمانیہ کے بعض علاقوں پر قبضہ بھی کرلینا چاہتی تھی، چنانچہ وہ کبھی دولت علیہ کی طرف مائل ہوتی اور کبھی روس کی طرف، علاوہ بریں وہ دولت علیہ کو فرانس کے اتحاد سے جو خود اُس کا حلیف بھی تھا علٰحدہ کردینا چاہتی

[1] مصطفٰے کامل پاشا صفحہ ۴۹،

تھی، کیونکہ اس اتحاد کی صورت میں وہ باب عالی کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی، فرانس اس وقت مالی معاوضہ میں دولت عثمانیہ کی مدد اپنے جہازوں سے کرنے پر آمادہ تھا لیکن آسٹریا کے سفیر مقیم قسطنطنیہ نے اس تجویز کی مخالفت کی، اور عثمانی وزراء کو سمجھایا کہ خشکی کی لڑائی میں بحری بیڑے مفید نہ ہوں گے، اور یہ کہ فرانس کا مقصد دراصل دولت علیہ کی مدد کرنا نہیں ہے، بلکہ روس کی دشمنی میں وہ ایک طویل مدت تک جنگ کو جاری رکھنا چاہتا ہے، عثمانی وزراء نے اس رائے کی صحت کو تسلیم کرکے فرانس کی تجویز نامنظور کردی، آسٹریا کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں روس کا تسلط کریمیا پر ہوگیا جس کی وجہ سے باب عالی کو آسٹریا کے ساتھ اتحاد کرنا بہت غنیمت معلوم ہوا، اور اُس نے عجلت سے کام لیا، چنانچہ ۸ جولائی ۱۷۷۱ء کو دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا، جس کے شرائط حسب ذیل تھے:۔

(۱) روس کے مقابلہ میں آسٹریا دولت عثمانیہ کی مدد کریگا،

(۲) سلطنت عثمانیہ کا کوئی حصہ آسٹریا علیحدہ نہ ہونے دیگا،

(۳) دولت عثمانیہ کی عزت کے خیال سے آسٹریا پولینڈ کے استقلال کی حفاظت کریگا،

(۴) اس کے معاوضہ میں دولت عثمانیہ نے عہد کیا کہ وہ ایک کرور تیرہ لاکھ پچاس ہزار فلورن کی رقم آسٹریا کو ادا کرے گی،

(۵) نیز والاچیا کو چک کا علاقہ آسٹریا کے حوالہ کردے گی، اور

(۶) سلطنت عثمانیہ میں آسٹریا کی تجارت اور صنعت وحرفت کی ترقی کے لئے ہر طرح سے مدد کرے گی،

اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ فریقین اسے مخفی رکھیں گے، خصوصاً فرانس سے

جو اس وقت آسٹریا کا حلیف تھا،

سفیر آسٹریا نے جب اس معاہدہ کی نقل اپنی حکومت کے پاس دستخط کے لئے بھیجی، تو کونتز دولت عثمانیہ کی طرف سے مطمئن ہوگیا، اور اب اُسے روس کو دھمکی دینے کا ایک اچھا آلہ ہاتھ آگیا، اُس کا مقصد روس پر یہ ظاہر کر دینا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے علاقوں پر قبضہ کرنا آسٹریا کو شریک کئے بغیر آسان نہ ہوگا، کونتز اس میں کامیاب رہا، کیتھرائن نے اپنے ایک خاص سفیر کو سلطنت عثمانیہ کی تقسیم سے متعلق مندرجۂ ذیل تین تجویزیں لیکر حکومت آسٹریا کے پاس بھیجا،

(۱) سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا، البانیا اور مقدونیا پر آسٹریا قبضہ کرلے، اور سلطنت عثمانیہ کے بقیہ حصے مع قسطنطنیہ کے روس کے لئے چھوڑ دے،

(۲) ولاچیا، سرویا، بلغاریا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا لے لے، اور مقدونیا، البانیا، رومانیا، اکثر جزائر یونان، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ روس کو دیدے، کریمیا اور مولڈیا خود مختار حکومتیں کر دیجائیں،

(۳) ترکوں کو دریائے ڈنیوب کے شمالی علاقوں پر باقی رکھا جائے، سرویا، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے آسٹریا کو دیدیئے جائیں، بحر اسود کے ساحلی علاقوں پر روس کا قبضہ ہوجائے، اور تاتاری صوبے آزاد ہیں[1]،

روسی سفیر نے تقسیم پولینڈ سے متعلق بھی بعض تجویزیں پیش کیں، حکومت آسٹریا نے باوجود اُس معاہدہ کے جو اُس نے ابھی حال میں باب عالی سے کیا تھا، اور جس میں سلطنت عثمانیہ کے تحفظ و استقلال کا ذمہ لیا تھا، نیز پولینڈ کی تقسیم کے روکنے کا عہد کیا تھا

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا ص ۵۶-۵۵،

روس کے پیش کردہ شرائط پر گفتگو شروع کر دی، برخلاف اس کے باب عالی نے جو معاہدہ آسٹریا سے کیا تھا، اُس پر وہ دیانتداری کے ساتھ قائم رہا اور ۲۵ر جولائی ١٧٧١ء کو اُس رقم کی ایک قسط جس کی ادائگی معاہدۂ مذکورہ میں اُس نے اپنے ذمہ لی تھی، حکومت آسٹریا کے پاس روانہ کر دی، حکومت آسٹریا نے اس رقم کو تو لے لیا، مگر باب عالی کے تقاضوں کے باوجود معاہدہ پر دستخط کرنے سے گریز کرتی رہی، کونتز چاہتا تھا کہ روس کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ ہو جائے جس سے آسٹریا کو اُس سے زیادہ فائدہ پہنچے، جتنا دولت عثمانیہ سے اتحاد کرنے میں پہنچتا تھا، اُس کو یہ بھی خوف تھا کہ اگر وہ ترکوں کے ساتھ اتحاد کر لیگا تو روس اور پرشا پولینڈ کو باہم تقسیم کر لیں گے، اور اُسے کچھ نہ دیں گے، بہر حال جب باب عالی کی طرف سے معاہدہ پر دستخط کرنے کا اصرار ہوا تو کونتز نے ۴ر اکتوبر ١٧٧١ء کو ایک مخلصانہ تحریر باب عالی میں بھیجی اور اُسے اطمینان دلایا کہ حکومت آسٹریا اپنے معاہدہ پر وفاداری کے ساتھ قائم ہے، لیکن معاہدہ پر دستخط کرنا اب بھی ٹال گیا،

اسی اثنا میں برطانوی سفیر مقیم قسطنطنیہ کو اس خفیہ معاہدہ کی نقل ہاتھ آگئی، اُس نے اس کی ایک ایک نقل فریڈرک اعظم اور کیتھرائن کے پاس بھیجدی، فریڈرک نے اپنے سفیر کو ہدایت کی کہ باب عالی کو حکومت آسٹریا کی خود غرضیوں سے متنبہ کر دے، اور یہ ظاہر کر دے کہ وہ دولت عثمانیہ کو کس قدر نقصان پہنچانا چاہتی ہے، اُس نے اپنے سفیر مقیم پیرس کو بھی لکھا کہ وزارت فرانس کے سامنے یہ تجویز پیش کرے کہ روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان صلح کرانے کے لئے ایک کانفرنس قسطنطنیہ میں منعقد کیجائے، فریڈرک کا مقصد یہ تھا کہ آسٹریا نے دولت علیہ اور فرانس کے ساتھ جو غداری کی ہے، وہ یورپین سلطنتوں کے سامنے کھل جائے، مگر وزارت فرانس اس کانفرنس کی تحریک کرنے کیلئے

آمادہ نہ ہوئی،

اس درمیان میں جنگ کا سلسلہ جاری تھا، اور روسی فوجوں میں فتوحات کے باوجود کمزوری کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، خصوصًا پولینڈ میں یہ آثار زیادہ نمایاں تھے، روس کی مالی حالت بھی روز بروز زیادہ خراب ہوتی جارہی تھی، ان حالات کو دیکھتے ہوئے کیتھرائن اب جنگ کو ختم کرنے پر مائل ہوئی، چنانچہ اُس نے ۲ر دسمبر ۱۷۷۱ء کو فریڈرک کے پاس ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا کہ حکومت روس مولڈیویا اور ولاچیا کے مطالبہ سے دستبردار ہوتی ہے، لیکن اس کے معاوضہ میں یہ چاہتی ہے کہ دولت عثمانیہ بندر اور اوکزاکوف کے شہر اُس کے حوالہ کر دے، اسی خط میں کیتھرائن نے تقسیم پولینڈ سے متعلق فریڈرک کی تجویز بھی منظور کر لی اس شرط کے ساتھ کہ اگر آسٹریا روس سے جنگ کرے تو فریڈرک روس کی مدد کے لئے بیس ہزار فوج ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں میں روانہ کرے،

تقسیم پولینڈ اس مسئلہ میں فریڈرک اور کیتھرائن کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اُس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پرشا اور روس پولینڈ کی تقسیم پر متحد ہوگئے، اس اتحاد کی وجہ سے آسٹریا کے سامنے صرف دو صورتیں رہ گئیں، یا تو وہ اُن معاہدوں کو پورا کرے، جو اُس نے فرانس اور دولت عثمانیہ کے ساتھ کئے تھے اور پولینڈ کو تقسیم نہ ہونے دے، یا پھر روس اور پرشا سے مل کر خود بھی پولینڈ کی تقسیم میں شریک ہو جائے، اور فرانس اور دولت علیہ کے معاہدوں کی پروانہ کرے، کونتز نے یورپین حکومتوں کے اس اُصول کی بنا پر کہ سیاست میں عہد و پیمان کوئی چیز نہیں، دوسری صورت اختیار کی، چنانچہ ۲۸ر جنوری ۱۷۷۲ء کو اُس نے حکومت روس کو لکھا کہ آسٹریا نے تقسیم پولینڈ کی تجویز

نیز سلطنت عثمانیہ سے متعلق کیتھرائن کے مطالبات کو منظور کر لیا ہے، اور یہ توقع ظاہر کی کہ پولینڈ کی طرح سلطنت عثمانیہ کی تقسیم بھی عمل میں آئے گی، اور آسٹریا کو بھی اس تقسیم میں حصہ ملے گا، اپنی حکومت کی اس غداری پر خود دیبر یا تھریسیا نے بھی نفرین کرتے ہوئے اقرار کیا کہ "آسٹریا نے جو سیاست اختیار کی وہ شرافت، سلطنت کی عزت عہد و پیمان اور عقیدہ کے بالکل مخالف تھی"[1] بہر حال کونتز کی اس پالیسی کی وجہ سے تقسیم پولینڈ کی تجویز پر روس، پرشا اور آسٹریا کا اتفاق ہو گیا اور یہ بد قسمت ملک کی جو پہلے ہی سے روس کے فریب اور درانداز یوں کا شکار اور اس کے پیدا کئے ہوئے فتنوں کی وجہ سے جماعتوں کی باہمی نزاعات میں مبتلا تھا پہلی تقسیم ۱۷۷۲ء میں ہو گئی، باب عالی نے جب یہ دیکھا کہ حکومت آسٹریا اس کے ساتھ فریب کر رہی ہے تو اس نے معہودہ رقم کی آئندہ قسط نہیں بھیجی، کونتز نے اس چیز کو دولت عثمانیہ اور آسٹریا کے اتحاد کی شکست کا سبب قرار دیا، حالانکہ جس معاہدہ کی بنا پر یہ اتحاد قائم ہوا تھا، اس پر کونتز نے آخر وقت تک دستخط نہیں کئے تھے، اور نہ حکومت آسٹریا کی طرف سے معاہدہ کی کوئی شرط پوری کی گئی تھی، برخلاف اس کے باب عالی کو جس نے دیانتداری کے ساتھ رقم مذکور کی ایک قسط آسٹریا کو ادا کر دی تھی، اور آسٹریا نے اسے بلا تامل قبول بھی کر لیا تھا، اسی معاہدہ کے فریب میں مبتلا رکھکر کونتز نے نہ صرف پولینڈ بلکہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے متعلق بھی کیتھرائن سے مراسلت شروع کر دی تھی،

صلح کا نفرنسین جب دولت عثمانیہ کو یہ معلوم ہوا کہ روس ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں سے دست بردار ہو کر صلح کے لئے آمادہ ہے، تو وہ بھی راضی ہو گئی، اور

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا ص ۶۰،

دونوں حکومتوں کے نمایندے شرائط صلح طے کرنے کے لئے ۱۰ر جون ۱۷۷۲ء کو شہر فوکشانی میں جمع ہوئے، بیس روز کی گفت و شنید کے بعد تاتاریوں کی آزادی کے مسئلہ کے علاوہ اور تمام شرائط طے ہوگئے، ترک نمایندے اس بات پر زور دے رہے تھے کہ تاتاریوں کا دولت عثمانیہ کے زیر اقتدار رہنا ضروری ہے، کیونکہ سلطان کو بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے ان پر فرماں روائی کا حق حاصل ہے، حکومت روس نے اس مطالبہ کو منظور نہ کیا، چنانچہ اسی بات پر کانفرنس شکست ہوگئی، چند مہینوں کے بعد روس نے ایک دوسری کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی، اور دولت علیہ نے اسے منظور کرلیا، چنانچہ یہ کانفرنس بخارسٹ میں منعقد ہوئی، اور شرائط صلح پر مہینوں بحث و مباحثہ ہوتا رہا، اس کانفرنس میں روس اس بات پر راضی تھا کہ تاتاریوں کو دولت عثمانیہ کے زیر سیادت رہنے دیا جائے، لیکن وہ کرش اور ینی قلعہ کو چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہ ہوا، اور دولت علیہ ان دونوں قلعوں سے دست بردار ہونے پر راضی نہ ہوئی، بالآخر ۱۰ر فروری ۱۷۷۳ء کو روسی سفیر اوبرسکوف نے کیتھرائن کی طرف سے مندرجہ ذیل شرائط صلح باب عالی میں پیش کر کے الٹی میٹم دیا کہ اگر یہ شرائط قبول نہ کئے گئے تو جنگ از سر نو شروع کردی جائے گی:۔

(۱) روس تاتاریوں کی آزادی کا محافظ قرار دیا جائے اور کرش اور ینی قلعہ کے قلعوں پر روس کا قبضہ قائم رکھا جائے،

(۲) بحر اسود اور بحر ایجین میں روس کے تجارتی اور جنگی جہازوں کو آمد و رفت کی پوری آزادی حاصل ہو،

(۳) مذکورۂ بالا قلعوں کے علاوہ کریمیا کے تمام دوسرے قلعے تاتاریوں کو واپس

کر دیئے جائیں،

(۴) مولڈیویا کا امیر گریگوری غیکا (Gregory Ghika) جو اس وقت روسیوں کے قبضہ میں تھا، پھر مولڈیویا کا موروثی فرماں روا مقرر کر دیا جائے اور وہ ہر تین سال میں ایک بار اپنی ریاست کی ایک سال کی آمدنی بطور خراج باب عالی کو پیش کرتا رہے،

(۵) روس کا ایک مستقل نمایندہ قسطنطنیہ میں مقیم رہے،

(۶) کلبرن پورے مالکانہ حقوق کے ساتھ روس کو دیدیا جائے، اور اوکزاکوف کا قلعہ مسمار کر دیا جائے،

(۷) باب عالی روس کے فرمانرواؤں کے لئے "پادشاہ" کا لقب نیز سلطنت عثمانیہ کے اُن عیسائی باشندوں کی حمایت کا حق تسلیم کرے، جو کلیسائے یونان سے تعلق رکھتے ہوں[ل]

نجارسٹ کانفرنس کی ناکامی | سلطان اور وزرائے سلطنت صلح کے خواہاں تھے، اور مذکورۂ بالا شرائط میں سے دفعہ اول کے علاوہ ہر دفعہ کے منظور کر لینے پر آمادہ تھے، دفعہ اول میں بھی روس بالآخر اس بات پر راضی ہوگیا تھا کہ تاتاریوں پر دولت علیہ کی سیادت قائم رکھی جائے، البتہ وہ کرش اور ینی قلعہ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوا، اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا سبب بن گیا، باب عالی نے صورت حالات سے مجبور ہو کر اور تمام شرائط منظور کر لئے مگر کرش اور ینی قلعہ سے دست بردار ہونا اسے کسی طرح منظور نہ تھا، جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مفتی اعظم اور سلطنت کے تمام علمار نے اس شرط کے قبول کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا، نیز دیوان میں بھی

ل کریسی جلد ۲ صہ ۲۴۲،

اس کی مخالفت شدت سے کی گئی تھی، علمار کی مخالفت کے باوجود اس شرط کو قبول کر کے اگر صلح کر لی جاتی تو اس سے قسطنطینیہ میں بغاوت کے برپا ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا چنانچہ کرش اور ینی قلعہ کے تنازعہ پر بخارسٹ کی صلح کانفرنس بھی شکست ہو گئی، اور جنگ از سر نو شروع کر دی گئی،

محسن زادہ پاشا

فوکشانی اور بخارسٹ کی کانفرنسوں کے دوران قیام میں صلح کا جو وقفہ میسر آگیا تھا، اُس سے فائدہ اُٹھا کر صدر اعظم محسن زادہ پاشا نے استحکام سلطنت کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، ۱۷۶۸ء میں جنگ شروع ہونے سے پیشتر بھی وہ صدر اعظم رہ چکا تھا، لیکن چونکہ اُس نے سلطان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ پوری طرح تیار ہونے سے قبل جنگ شروع کر دینا دولت عثمانیہ کیلئے مضر ہو گا، اسلئے مصطفےٰ نے اُسے صدارت کے عہدہ سے معزول کر دیا تھا، اس کے بعد وہ موریا کا سرعسکر مقرر ہوا، اور وہاں اُس نے روسیوں اور یونانیوں کو زبردست شکست دیکر موریا میں عثمانی تسلط کو از سر نو قائم کر دیا، اس شاندار کامیابی کے صلہ میں سلطان نے اُسے صوبہ ودین کا سرعسکر مقرر کیا، جو شمال کا سرحدی صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا، وہاں بھی محسن زادہ پاشا کی لیاقت خاص طور پر نمایاں رہی، دوران جنگ میں سلطان مصطفےٰ کو احساس ہوا کہ محسن زادہ پاشا کو صدارت کے عہدہ سے معزول کرنے میں اُس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی، چنانچہ ۱۷۷۱ء کے آخر میں اُس نے دوبارہ اُس کو صدر اعظم مقرر کیا، محسن زادہ پاشا نے فوکشانی اور بخارسٹ کی کانفرنسوں میں صلح کے لئے انتہائی کوشش کی تھی لیکن پندرہ ماہ کی اس مغتنم فرصت میں جبکہ شرائطِ صلح پر گفتگو اور مراسلت ہوتی رہی، اُس نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و استحکام میں بھی

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اور ہر ممکن ذریعہ سے اُن کے اندر دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک تازہ جوش پیدا کرنے کی کوشش کی پیہم شکستوں نے فوج کے اخلاق بھی خراب کردیئے تھے، سپاہیوں میں ایک طرف تو لوٹ مار کی عادت پیدا ہو رہی تھی، اور دوسری طرف وہ دشمن کی قوت سے مرعوب ہونے لگے تھے محسن زادہ پاشا نے لوٹ مار کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں، اور جن افسروں نے دشمن کے مقابلہ میں بزدلی دکھا کر اپنی فوج کے سامنے ایک بُری مثال قائم کی تھی، اُنھیں قتل کرا دیا، اُس نے شکست خوردہ دستوں کو از سر نو منتظم کیا، اور اہل بوسنیا اور سلطنت کے دوسرے جنگجو قبائل سے تازہ فوجیں تیار کیں، اُس نے دریائے ڈینوب کے اُن قلعوں کو جو اس وقت تک ترکوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے خصوصاً سلسٹریا کو تازہ دستوں اور سامانِ رسد سے خوب مستحکم کر لیا، اور شوملہ کو اپنا فوجی مستقر بنایا،

معرکہ سلسٹریا ۱۷۷۳ء کے موسم بہار میں جنگ پھر چھڑ گئی، روسی اور عثمانی فوجوں کے درمیان متعدد معرکے ہوئے جن میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے فریق کو فتح ہوئی، لیکن ان فتوحات سے روس کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، کیونکہ سلسٹریا، وارنا اور شوملہ کے مضبوط اور اہم قلعوں پر ترک ابھی تک بدستور قابض تھے، آخر کار جنرل رومانزوف نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سلسٹریا کا محاصرہ کر لیا، سلسٹریا کے سرعسکر عثمان پاشا نے آگے بڑھ کر رومانزوف کو دریا عبور کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر جنرل وائیسمن کے حملہ نے اُسے کامیاب نہ ہونے دیا، اور اُس کی فوج بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتی ہوئی سلسٹریا میں واپس آگئی، اس کے بعد رومانزوف نے شہر پر گولہ باری شروع کی، ستر توپیں پیہم گولے برسا رہی تھیں، یہاں تک کہ دیواروں میں کئی جگہ رخنے پیدا ہوگئے، اور روسی

فوجیں شہر کے اندر داخل ہونے کے لئے پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئیں، چھ گھنٹہ تک نہایت سخت معرکہ رہا، ترک حیرت انگیز جانبازی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، لیکن رومانزوف مسلسل تازہ دستے اپنی فوج کی مدد کے لئے بھیجتا جاتا تھا، آخر کار ترکوں کو پسپا ہونا پڑا، اور روسی شہر کے اندر پہنچ گئے، مگر یہ کامیابی عارضی تھی، شہر کے اندر ترکوں نے عثمان پاشا کے زیر قیادت جس دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، اُس سے رومانزوف کی آنکھیں کھل گئیں، آبادی کے تمام مرد دشمن کے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے، اُنھوں نے ہر ہر قدم پر روسیوں کو آگے بڑھنے سے روکا اور ایسی شدت سے لڑے کہ روسی بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہوئے، اُن کے آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے، اور ایک ہزار زخمی ہوئے، عثمان پاشا کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان نے اُسے "غازی" کا لقب عطا کیا،

روسی مظالم اس کے بعد روسیوں نے قرہ سو کے مقام پر عثمانی لشکر پر حملہ کیا اور اسے شکست دی، اس کامیابی سے اُن کے حوصلے بڑھ گئے، اور رومانزوف نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ وارنا کی طرف روانہ کیا اور دوسرا شوملہ کی طرف، شوملہ کے راستہ میں بازارجیک کا غیر محفوظ شہر پڑتا تھا جس کا تقریباً پورا فوجی دستہ اور اکثر باشندے شہر خالی کر کے چلے گئے تھے، روسیوں نے اسے نہایت آسانی سے فتح کر لیا، لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے، "فتح کی سہولت نے اُن کو شہر کی باقی ماندہ آبادی کے ساتھ جو تقریباً تمام تر کمزور اور بوڑھے مردوں، بیکس عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی انتہائی وحشیانہ سلوک کرنے سے باز نہیں رکھا،" عورتیں، بوڑھے اور بچے سب کے سب دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کے مار ڈالے گئے،

روس کی شکست لیکن روسیوں کو ان مظالم کی سزا بہت جلد مل گئی، جب...

شوملہ میں قرہ سو کی شکست اور بازارجیک کی تباہی کی اطلاع پہنچی تو صدرِ اعظم نے فوجی افسروں کی ایک مجلس منعقد کر کے مشورہ کیا، رئیس آفندی (وزیرِ خارجہ) عبدالرزاق نے اپنی خدمات پیش کیں، چنانچہ وہ واصف آفندی (ترک مورخ) مفتی فلیپوپولیس اور اور صرف چار سو آدمیوں کے دستہ کے ساتھ جو تقریبًا تمام تر اُسی کے ملازم تھے، روسیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوگیا، راستہ میں اُس نے عثمانی فوج کے منتشر دستوں کو جو شکست کے بعد گردونواح کے علاقوں میں پھیل گئے تھے، از سرِ نو جمع کیا، اور انھیں لے کر کوزلیجہ کے مقام پر روسی فوج کے مقدمۃ الجیش کو شکست دی، اس کے بعد وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا دفعۃً بازارجیک کے روسی دستوں پر ٹوٹ پڑا، روسی اس اچانک حملہ سے ایسے بدحواس ہوئے کہ اپنا تمام سامان چھوڑ کر بھاگے، یہاں تک کہ ترکوں نے علاوہ اسلحوں اور گولہ بارود کے ذخیرہ کے بقول فان ہیمر چولھے پر چڑھی ہوئی گوشت کی دیگچیوں پر بھی قبضہ کر لیا[1]، اسی درمیان میں روسیوں کو وارنا میں بھی سخت شکست ہوئی، اُن کے دو ہزار آدمی مارے گئے، اور مالِ غنیمت میں دس توپیں اور سامان کی سو گاڑیاں ترکوں کے ہاتھ آئیں، وارنا کی جنگ اور بازارجیک پر دوبارہ قبضہ ۱۷۷۳ء کی مہم کے آخری معرکے تھے، اس مہم میں ترکوں کی کامیابی کا پلہ بہ نسبت روسیوں کے بہت بھاری تھا،

وفات | ۲۵ دسمبر ۱۷۷۳ء کو سلطان مصطفےٰ ثالث کا انتقال ہوگیا،

مصطفےٰ اپنے اکثر پیشروؤں کی طرح ایک بلند علمی ذوق رکھتا تھا، اُس نے بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں، اور تعلیم کو ترقی دی، ملکی اصلاحات کی ضرورت وہ شدت سے محسوس کرتا تھا، اور اس سلسلہ میں اُس نے بعض اہم اصلاحات

۱؎ فریدبک ص ۱۵۹،

جاری کیں، مثلاً حرم کے اخراجات میں بہت کچھ تخفیف کر دی، صیغہ اوقاف کا کام قیزلر اغاسی کے ہاتھ سے نکال کر صدر اعظم کے سپرد کر دیا، اور مالیات کی درستی کی کوشش کی، لیکن جب سے روس کی جنگ کا سلسلہ شروع ہوا مصطفیٰ کی ساری توجہ سلطنت کے تحفظ کی جانب مبذول رہی، اور اندرونی اصلاحات کا کام ملتوی ہوگیا، پھر بھی اُس کا یہ کارنامہ کم قابلِ قدر نہیں. کہ اُس نے بعض اصلاحات کو عمل میں لاکر سلیم ثالث اور محمود ثانی کے لئے ایک عمدہ مثال قائم کر دی،

عبد الحمید اوّل

سنہ ١١٨٧ھ تا سنہ ١٢٠٣ھ مطابق سنہ ١٧٧٣ء تا سنہ ١٧٨٩ء

مصطفےٰ ثالث کے بعد اُس کا بھائی عبد الحمید تخت پر آیا، روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا، کیتھرائن نے سابق ہزیمتوں کی تلافی کے لئے کافی تیاریاں کر لی تھیں، برخلاف اس کے ترک اب جنگ کو ختم کر دینا چاہتے تھے، عام باشندوں کے علاوہ فوج کے افسر، وزراء اور خود سلطان بھی صلح کے خواہاں تھے، صرف علماء کی جماعت یہ عذر پیش کر رہی تھی کہ سلطان کے لئے بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے تاتاریوں کو اپنی سیادت سے محروم کر دینا اور کرش اور ینی قلعہ کے قلعوں کو جو کریمیا کے اہم ترین قلعے تھے روسیوں کے حوالہ کر دینا کسی طرح مناسب نہیں لیکن سنہ ١٧٧٤ء کی مہم کا آغاز ہی ترکوں کے لئے اس قدر خلافِ توقع ہوا کہ علماء کے ان دلائل کے باوجود باب عالی کو صلح کا فیصلہ کر لینا پڑا،

ترکوں کی شکست

١٤ اپریل سنہ ١٧٧٤ء کو صدر اعظم محسن زادہ پاشا اپنے مستقر شوملہ سے نکل کر ہرسوا کی طرف بڑھا، جہاں روسی فوجیں ایک نئے جنرل سوارو (Suwarrow -) کی سرکردگی میں لڑائی کے لئے تیار کھڑی تھیں، سوارو نے ترکوں کے حملہ کا انتظار نہیں کیا، بلکہ خود پیش قدمی کرکے کوزلیجہ کے مقام پر صدر اعظم کی فوج پر حملہ آور

ہوا اور اُسے شکست دی، ترکی لشکر کا تمام سامان مع انتیس توپوں کے روسیوں کے ہاتھ آیا، محسن زادہ پاشا نے شوملہ واپس آکر دیکھا کہ اُس کے پچیس ہزار سپاہیوں میں سے صرف آٹھ ہزار باقی رہ گئے ہیں، کچھ تو میدانِ جنگ میں کام آئے، لیکن زیادہ تعداد ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھی، اتنی قلیل جمعیت کے ساتھ روس کی فاتح فوج کا روکنا جو اب تیزی کیساتھ شوملہ کی طرف بڑھتی آرہی تھی، محال تھا، بدقسمتی سے ینی چری نے عین اس نازک موقع پر بغاوت کردی، اور جب رئیس آفندی نے اُن کو دشمن کے مقابلہ کے لئے مجتمع کرنے کی کوشش کی تو اس کا سر اُڑا دیا، اس حالت میں صدر اعظم نے اپنے ایک افسر کو روسی سپہ سالار رومانزوف کے پاس بھیجا، اور التوائے جنگ کی خواہش کی، رومانزوف نے اس سے انکار کردیا، لیکن شرائط صلح پر گفتگو کرنے کے لئے صدر اعظم کو دعوت دی، چنانچہ محسن زادہ پاشا نے سلطان کی اجازت حاصل کرنے کے بعد دولت عثمانیہ کے وکلا کو روانہ کیا، تا کہ شہزادہ ریپنن سے جو سلطنت روس کا نمائندہ تھا شرائط صلح طے کریں،

صلحنامہ کینارجی ۱۶ جولائی ۱۷۷۴ء کو کینارجی (Kainardji) کے مقام پر مجلس صلح منعقد ہوئی اور صرف سات گھنٹوں کی گفت و شنید کے بعد تمام شرائط فریقین کے درمیان طے ہو گئے، فوکشانی اور بخارسٹ کی صلح کانفرنسوں کی مدت اور نتائج کے مقابلہ میں کینارجی کا یہ صلحنامہ حد درجہ حیرت انگیز ہے، لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے دونوں فریق اب جنگ کو ختم کر دینے کے دل سے خواہاں تھے، روس کا حال باوجود اُسکی شاندار فتوحات کے سلطنت عثمانیہ سے کہیں زیادہ خراب تھا، دورانِ جنگ میں اُس کا جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہو چکا تھا، اور اُس کے سپاہیوں کی جتنی تعداد میدانِ جنگ میں کام آئی تھی، اُس سے زیادہ سامانِ رسد کی کمی اور وبائی بیماریوں

سے ہلاک ہوگئی تھی، اُس کے متعدد صوبے طاعون نے برباد کر ڈالے تھے، استراخان کے قریب کا ایک علاقہ حکومت روس کے مظالم کی وجہ سے تقریباً ویران ہوگیا تھا، وہاں کے چار لاکھ باشندے نقل مکان کر کے ۱۷۷۱ء میں سلطنت چین میں جا کر آباد ہوگئے تھے علاوہ بریں پوگاشف (Pugatcheff) کے دعوی سلطنت سے خود روس کے اندر ایک ایسی شورش پیدا ہوگئی تھی جس نے چند ہی دنوں میں خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی، اور پوگاشف کے حامیوں نے ۱۷۷۳ء اور ۱۷۷۴ء میں جنوبی روس کے تمام علاقے تاراج کر ڈالے، پوگاشف نسلاً ایک روسی قزاق تھا، گذشتہ جنگ میں وہ روسی فوج کا افسر رہ چکا تھا، مگر کسی وجہ سے فوج سے علیحدہ ہوگیا، اور کچھ دنوں ادھر اُدھر پھرتا رہا، پھر ۱۷۷۳ء میں دفعتہً اُس نے اعلان کیا کہ میں کیتھرائن کا مقتول شوہر شہنشاہ پیٹر ثالث ہوں جسے تخت سلطنت کی خاطر کیتھرائن نے اپنے عاشقوں سے سازش کر کے اپنی دانست میں قتل کرا دیا تھا، چونکہ روس میں بہت سے لوگ کیتھرائن کی حکومت کے خلاف تھے اس لئے وہ پوگاشف کے ساتھ ہوگئے، صلح کے لئے روس کی آمادگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تقسیم پولینڈ کا پہلا معاہدہ حال ہی میں ہوا تھا، اور کیتھرائن اس بات کی سخت ضرورت محسوس کر رہی تھی کہ دولت عثمانیہ کی طرف سے مطمئن ہو کر پوری توجہ کے ساتھ پولینڈ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کرے، کریسی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگر یہ حالات پیش نظر رکھے جائیں تو پھر اس فیاضی اور عالی ہمتی کی حقیقت کھل جاتی ہے جو روس نے بزعم خود سلطنت عثمانیہ کے ساتھ معاہدہ کینارجی میں برتی اور زیادہ سخت شرائط پر اُسے مجبور نہ کیا[1]، صلحنامہ کے شرائط تو چار روز قبل ہی طے ہوگئے تھے، لیکن

---

[1] کریسی جلد ۲ صفحہ ۲۵۰۔

روبا نزووف نے دستخط کے لئے ۲۱ر جولائی کی تاریخ مقرر کی جو معاہدہ پرتھ کے تکملہ کی تاریخ تھی مقصد یہ تھا کہ آیندہ وہ تاریخ روسیوں کے بجائے عثمانیوں کی شکست و ذلت کی یادگار رہے کینارجی کا مقام بھی اس وجہ سے منتخب کیا گیا تھا کہ وہیں ایک سال قبل روسی جنرل وائسیمن ترکوں کے ہاتھ سے جنگ میں مارا گیا تھا،

صلحنامۂ کینارجی اٹھائیس[۲۸] دفعات پر مشتمل تھا، ان میں دو خفیہ دفعات کا اضافہ بھی کیا گیا، جن کے رو سے باب عالی نے وعدہ کیا کہ تین سال کے اندر چار ملین روبل حکومت روس کو ادا کرے گا، اور کیتھرائن نے ذمہ لیا کہ روسی بیڑہ بحرایجین سے فوراً واپس بلالیا جائیگا، اور دفعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

روس تقریباً ان تمام عثمانی علاقوں سے دست بردار ہوگیا، جن پر اُسکی فوجوں نے قبضہ کرلیا تھا، کریمیا البتہ دولت علیہ کو واپس نہ ملا، بلکہ سرحد پولینڈ تک بسرابیا کا تاتاری علاقہ اُس کے ساتھ شامل کرکے ایک مستقل تاتاری حکومت قائم کردی گئی، جس کے خان کے انتخاب کا حق صرف تاتاریوں کو دیا گیا، اور اس انتخاب میں روس اور باب عالی کی مداخلت ممنوع قرار دی گئی، اس دفعہ میں یہ تصریح خاص طور پر کردی گئی تھی "کہ کسی عذر کی بنا پر حکومت روس یا دولت عثمانیہ خان کریمیا کے انتخاب میں دخل نہ دیگی اور نہ مملکت مذکورہ کے خانگی، سیاسی، ملکی اور اندرونی معاملات میں مداخلت کریگی، بلکہ دونوں قوم تاتار کو سیاسی اور ملکی حیثیت سے اُن طاقتوں کے ہم پلہ تسلیم کرینگی جو خودمختار ہیں اور صرف خدا کے زیر فرمان ہیں" تاہم کریمیا اور دوسرے تاتاری علاقوں میں سے روس نے کرش، ینی قلعہ، ازف، اور کلبرن کے قلعوں اور اُن کے ملحق اضلاع پر اپنا قبضہ قائم رکھا، یہ استثنا راپنے اندر آیندہ خطرات کا بہت کچھ سامان

رکھتا تھا، کیونکہ ان علاقوں پر قابض رہنے سے روس کو کریمیا پر حملہ کرنے کا ہر وقت موقع حاصل تھا، قبارطہ کے دونوں علاقے بھی، اگرچہ وہاں کے باشندے مسلمان تھے، روس کو دیئے گئے، باقی اور تمام عثمانی مقبوضات جو روس نے دوران جنگ میں فتح کر لئے تھے، اور جن میں ولاچیا، مولڈیویا، بسرابیا، جارجیا اور منگریلیا شامل تھے سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیئے گئے، اوکزاکوف کے قلعہ اور ضلع پر ترکوں کا قبضہ قائم رہا، ولاچیا اور مولڈیویا کو دولت عثمانیہ کے حوالہ کرتے ہوئے یہ تصریح کر دی گئی کہ وہاں کے باشندوں کے تمام باغیانہ جرائم جو دوران جنگ میں سرزد ہوئے تھے معاف کر دیئے جائیں گے، عیسائی رعایا کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی اور آئندہ اُن پر زیادہ نرمی سے ساتھ حکومت کی جائیگی، دولت عثمانیہ کی طرف سے سفیر روس متعینہ قسطنطنیہ کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ بوقت ضرورت ان صوبوں کے حق میں باب عالی میں معروضات پیش کرے، اور وعدہ کیا گیا کہ ان معروضات کی سماعت پوری توجہ کے ساتھ کیجائے گی،

عام عیسائی رعایا کے متعلق جو دفعہ صلحنامہ میں شامل کی گئی وہ نہایت اہم تھی، اُس کے رو سے حکومت روس کو سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت کا حق حاصل ہو گیا، اور روس کے سفیروں کو باب عالی میں عیسائیوں کی طرف سے معروضات پیش کرنے کی اجازت دیدی گئی، یہ حق کسی دوسری مسیحی حکومت کو نہیں دیا گیا، روس کی رعایا کو بیت المقدس کی زیارت کی بھی عام اجازت دی گئی، یہ زائرین ہر قسم کے محصول سے معاف کر دیئے گئے اور باب عالی نے اُن کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا،

روس اور دولت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں کو اُن تمام سمندروں میں جو ان

سلطنتوں کے کنارے واقع تھے آمد و رفت کی پوری آزادی دی گئی، اسی دفعہ میں روس کو یہ حق بھی دیا گیا کہ سلطنت عثمانیہ کے جس حصہ میں مناسب سمجھے اپنے قنصل مقیم رکھے، لیکن دولت علیہ کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اپنے قنصل سلطنت روس میں بھیجے! اس کے لئے صرف اسی قدر کافی سمجھا گیا کہ اُسکی رعایا کو روس میں بری اور بحری تجارت کی اجازت دیدی گئی اور عثمانی تاجروں کے ساتھ مراعات کا وعدہ کیا گیا،

صلحنامہ میں یہ بھی طے پایا کہ آئندہ ایک روسی سفیر قسطنطنیہ میں مقیم رہا کریگا اور زار روس "بادشاہ" کے لقب سے پکارا جائیگا، باب عالی نے زار روس کیلئے "بادشاہ" کا لقب اس وقت تک تسلیم نہیں کیا تھا معاہدہ کینارجی سے قبل دونوں سلطنتوں کے درمیان جتنے معاہدے اور صلحنامے ہو چکے تھے سب کالعدم قرار دئیے گئے علاوہ اُس معاہدہ کے جو علاقہ ازف کے حدود اور سرحد کیوبان کی تعیین کے لئے ۱۷۰۰ء میں ہوا تھا، اُس کی پابندی بدستور قائم رکھی گئی،

صلحنامہ کی کسی دفعہ میں پولینڈ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں آیا، حالانکہ ابتداً جنگ کے منجملہ اور اسباب کے ایک اہم سبب قضیۂ پولینڈ بھی تھا ایک اور معنی خیز بات یہ تھی کہ اس صلحنامہ کی ترتیب میں کوئی دوسری حکومت شریک نہیں کی گئی، یہ کیتھرائن کی ایک کھلی ہوئی کامیابی تھی،

صلحنامہ کینارجی کی اہمیت

صلحنامۂ کینارجی بہ لحاظ اپنے نتائج کے اُن تمام صلحناموں سے زیادہ اہم ہے جو دولت عثمانیہ کے آغاز زوال کے بعد باب عالی اور عیسائی حکومتوں کے درمیان اس سے قبل ہو چکے تھے، دولت علیہ کی فوجی قوت کا خوف یورپ کے دل سے صلحنامہ کارلووٹز کے بعد ہی نکل گیا تھا، لیکن صلحنامہ کینارجی نے یہ حقیقت

بھی واضح کر دی کہ ترکوں کے لئے خود اپنے مقبوضات کا تحفظ بھی دشوار ہو گیا ہے کریمیا
اور دوسرے تاتاری علاقوں کا سلطنت عثمانیہ کے حدود سے نکل جانا دولت علیہ کے
انحطاط و زوال کی ایک ناقابلِ انکار شہادت تھی صلحنامہ کارلووٹز کے بعد ہنگری کی
عیسائی رعایا دولت عثمانیہ کی حکومت سے آزاد ہو گئی تھی، لیکن کریمیا ایک خالص اسلامی
صوبہ تھا، اور اُس کا ہاتھ سے نکل جانا ہنگری کی دست برداری سے بہت زیادہ اہم
تھا صلحنامہ کینارجی میں کریمیا کی آزادی صاف الفاظ میں تسلیم کر لی گئی تھی، اور فریقین
نے اُس کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کا سختی سے عہد کیا تھا، لیکن یہ آزادی
محض روسی تسلط کا دیباچہ تھی، کریمیا کو دولت عثمانیہ سے آزاد کرانے کی کوشش کیتھرائن
نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ اس پر قبضہ کرنا آسان ہو جائے، چنانچہ صلحنامہ کے
چند ہی دنوں بعد اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کریمیا میں اندرونی خلفشار پیدا
کرانا شروع کر دیا، اور پھر اپنے ہی برپا کئے ہوئے فتنہ کو دبانے کے حیلہ سے اس نے
اپنی فوجیں بھیج کر پورے ملک پر قبضہ کر لیا، اس صلحنامہ کی ایک دوسری اہم دفعہ جس کے
نتائج دولت عثمانیہ کے لئے نہایت مضر تھے، وہ تھی جسمیں روس کو سلطنت عثمانیہ کی
عیسائی رعایا کی حمایت کا حق خصوصاً اُن عیسائیوں کی جو کلیسائے یونان سے وابستہ
تھے دیا گیا تھا، یہ ایک ایسا حق تھا جو مستقبل میں دولت علیہ کے لئے اہم ترین خطرات
سے پُر تھا، مصطفےٰ کامل پاشا فرماتے ہیں کہ عیسائی رعایا کی حمایت سے متعلق جو شرط
رکھی گئی اُس سے دولت عثمانیہ ہمیشہ کے لئے ایک آفت میں مبتلا ہو گئی، کیونکہ اسکے
بعد ہر یوروپین سلطنت دولت علیہ کے معاملات میں عیسائیت کے نام پر دخل
دینے لگی، اور پھر جب کبھی دولت علیہ اور یورپ کی کسی حکومت میں جنگ ہوتی تو اسکا

سبب مسیحیت اور اُس کے حقوق قرار دیئے جاتے تھے[1]۔

بعض اصلاحات صلحنامہ کینارجی کا اخلاقی اثر ترکوں پر بُرا پڑا، وہ روس کی طاقت سے مرعوب نظر آنے لگے، تاہم ایک جماعت استقلال کے ساتھ سلطنت کی خدمت کیلئے مستعد رہی اور شکست وہزیمت کی اس کاری ضرب سے بھی اُس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی، اس جماعت کا سب سے زیادہ ممتاز فرد حسن پاشا الجزائری تھا، سلطان کو اس پر کامل اعتماد تھا، اور اُس نے حسن پاشا کو تقریبًا غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے حسن پاشا نے بری اور بحری فوجوں کو از سرِ نو منظم کرنے کے لئے بعض نہایت مفید اصلاحات جاری کرنی چاہیں، لیکن جہاں تک بری فوج کا تعلق تھا، اُسے کامیابی نہیں ہوئی، ینی چری اور "سپاہی" دستوں نے جدید آلاتِ حرب اور اصلاح شدہ فوجی قواعد کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، البتہ بحریہ کی اصلاح میں حسن پاشا کی کوششیں ایک حد تک بارآور ہوئیں، ایک انگریز جہاز ساز کی مدد سے اُس نے نئے طرز کے جنگی جہاز تعمیر کرائے اور الجزائر اور دوسری بربری ریاستوں نیز بحر اڈریاٹک کے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں سے بہترین جہاز رانوں کو بلا کر ان جہازوں پر مقرر کیا، اُس نے کپتانوں کو مجبور کیا کہ اپنے جہازوں کی دیکھ بھال ہمیشہ خود کرتے رہیں، اُس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ لائق اور تجربہ کار جہاز رانوں کی کافی تعداد ضرورتِ ناگہانی کے لئے ہر وقت قسطنطنیہ میں موجود رہے، پہلے یہ دستور تھا کہ موسم سرما میں جہاز بندرگاہوں میں کھڑے کر دیئے جاتے تھے اور جہاز رانوں کو رخصت کر دیا جاتا تھا، حسن پاشا نے اس دستور کے خطرہ کو ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ دار السلطنت کو یوں غیر محفوظ چھوڑ دینے سے روسی جہاز بحر اسود کی بندرگاہوں

لہ مصطفیٰ کامل پاشا ص ۶۵۔

سے نکل کر باسفورس پر آسانی سے قابض ہو سکتے ہیں، اور پھر وہ عثمانی بیڑہ کو اُسکی بندرگاہوں
میں فنا کر سکتے ہیں، چنانچہ اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ جس طرح بری فوجوں کے لئے قسطنطنیہ
میں بارکیں بنی ہوئی ہیں جن میں وہ موسم سرما میں قیام کرتی ہیں، اسی طرح جہازرانوں
کے لئے بھی بارکیں بنوا دیجائیں، لیکن صدر اعظم اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں نے خفیہ
طور پر اس تجویز کی پرزور مخالفت کی، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دار السلطنت میں اتنی بڑی
بحری فوج کے قیام سے حسن پاشا کو کس قدر قوت حاصل ہو جائیگی، چونکہ صدر اعظم ان بارکوں
کی تعمیر کے لئے روپیہ دینے میں برابر حیلے حوالے کرتا رہا، اس لئے مجبور ہو کر حسن پاشا نے
خود اپنے ذاتی روپیہ سے جہازرانوں کے لئے ایک مستقر مختصر پیمانہ پر تعمیر کرا دیا، اُس نے
جہاز کے افسروں کی فنی تعلیم کے لئے ایک بحری مدرسہ بھی قائم کیا، لیکن اُسکی یہ تمام
تجویزیں سلطنت کے دوسرے عہدہ داروں کی مخالفت کی وجہ سے آخر کار ناکام رہیں
اسی مخالفت کی وجہ سے وہ نظامِ جاگیری کی اصلاح میں بھی کامیاب نہ ہو سکا، جو
اہل دربار کی غیر دیانتداری کے باعث نہایت ابتر ہو رہا تھا اور جنگ کے موقعوں پر بابِ عالی
کو اس کے فوائد سے بہت کچھ محروم رہنا پڑتا تھا،

بغاوتوں کا استیصال

حسن پاشا کی ان تجویزوں کے ناکام رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ
اسے ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی غرض سے جو گذشتہ جنگ کے دوران میں سلطنت
کے مختلف صوبوں میں نمودار ہو گئی تھیں، اکثر پایہ تخت سے باہر رہنا پڑتا تھا اور اُسکے
حریفوں کو اُسکی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھانے کا موقع مل جاتا تھا، چنانچہ شام میں
شیخ طاہر نے خودسری اختیار کر لی تھی، سلطان نے حسن پاشا کو اُسکی تنبیہ کے لئے روانہ
کیا، حسن پاشا نے عکہ کا محاصرہ کر کے اُسے فتح کر لیا اور شیخ طاہر کو قید میں ڈالدیا، پھر اُسنے

عکہ کے ملحق علاقہ کو بھی سر کیا اور بغاوت کا فتنہ کچھ دنوں کے لئے فرو ہو گیا،
دو ہی سال کے بعد ۱۷۸۰ء میں حسن پاشا کو موریا کی سرکشی دور کرنے کے لئے جانا پڑا، ۱۷۷۰ء میں جب روسی جنرل اورلوف کی حمایت میں موریا کے یونانی باشندوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، تو البانی دستے اُن کے مقابلہ میں بھیجے گئے تھے، اور انھوں نے یونانیوں اور روسیوں کو شکست دیکر بھگا دیا تھا، یہ دستے امن قائم ہونے کے بعد وہیں رہ گئے تھے، اور اب انھوں نے خود دولت علیہ کے خلاف سر اُٹھایا، وہ ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے تھے، اور قتل وغارتگری میں اُن کے ہاں یونانیوں اور ترکوں کی کوئی تفریق نہ تھی، حسن پاشا نے موریا پہنچکر اُن کو شکست دی اور وہاں سے نکال باہر کیا، اس کے بعد سلطان نے اُسے موریا کا حاکم مقرر کر دیا، اُس نے از سر نو امن و امان قائم کیا اور زراعت وتجارت کو ترقی دی،
کچھ دنوں کے بعد مصر میں مملوکوں کی بغاوت رونما ہوئی، سلطان نے حسن پاشا کو ان کی سرکوبی کے لئے بھی روانہ کیا، چنانچہ اُس نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا اور باغیوں کے زیر کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، اگر تھوڑی سی مہلت اُسے اور مل گئی ہوتی تو وہ مصر کی بغاوت کا بھی استیصال کر دیتا، لیکن ۱۷۸۷ء میں روس سے جنگ کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور سلطان نے اُسے قسطنطنیہ واپس بلا لیا،

کیتھرائن کے منصوبے | صلحنامہ کینارجی کی سیاہی ابھی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی، کہ کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں پھر شروع کر دیں، اس کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا یعنی ترکوں کو یورپ سے نکال کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا، یہ مقصد پیٹر اعظم کی وصیت کے مطابق حکومت روس کا اولین فرض قرار پا چکا تھا، چنانچہ

جب ۱۷۶۸ء میں کیتھرائن نے اپنی فوجیں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیں تو اُسکی غرض یہ نہ تھی کہ چند قلعوں پر قابض ہو جائے، اور بحر اسود میں روسی جہازوں کو آمدورفت کی اجازت دیدی جائے، بلکہ وہ شروع سے آخر تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی، لیکن حالات خلاف توقع پیش آئے، ترکوں کا عزم و استقلال اُن کی شجاعت کے مساوی ثابت ہوا، اور روسی فوجوں کو بعض سخت شکستیں اُٹھانی پڑیں، جان و مال کے شدید نقصان کے علاوہ پوگاشف کی پیدا کردہ خانہ جنگی نے بھی کیتھرائن کو صلح کیلئے مجبور کیا، لیکن جب ۱۱ جنوری ۱۷۷۵ء کو پوگاشف گرفتار ہوکر قتل کر دیا گیا، نیز پولینڈ کے اُن صوبوں پر جو از روئے تقسیم روس کے ہاتھ آئے تھے پوری طرح تسلط قائم ہو گیا تو کیتھرائن کے دل میں قسطنطنیہ کی فتح کا حوصلہ پھر جوش زن ہوا، چنانچہ یہ اسی حوصلہ کی ایک بین شہادت تھی کہ جب ۱۷۷۹ء میں کیتھرائن کا دوسرا پوتا پیدا ہوا تو اُس نے اُس کا نام قسطنطین رکھا اور اس کی رضاعت اور پرورش و پرداخت کے لئے یونانی عورتیں مقرر کیں، اور جب وہ لڑکا بڑا ہوا تو بڑے بڑے لائق یونانی اساتذہ سے اُس کو تعلیم دلوائی، اس طرح شہزادہ نے یونانی زبان میں بھی مہارت حاصل کرلی، ایک انگریز مسٹر ایٹن (Eton)، جو اُس وقت سینٹ پٹرس برگ میں مقیم تھا، اور شہزادہ پوٹمکن اور حکومت روس کے دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں سے گہرے تعلقات رکھتا تھا، بیان کرتا ہے کہ شہزادہ قسطنطین کی ساری تعلیم اسی مقصد کو سامنے رکھکر دی گئی تھی کہ وہ قسطنطنیہ کے تخت کا اہل ہو سکے اور اُس وقت کسی شخص کو بھی زارینہ کے اس ارادہ کے متعلق کوئی شبہ نہ تھا[۱]

---

[۱] کریسی جلد ۲ ص ۲۷۱،

ایٹن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ۱۷۷۹ء میں کیتھرائن اور شہزادہ پوٹمکن نے ایک اسکیم مرتب کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ کے نوآبادکاروں کے خلاف روس انگلستان کو پوری مدد دے اور اس کے معاوضہ میں انگلستان روس کی مدد کرے جب وہ پھر ترکوں پر حملہ آور ہو، چنانچہ اس اسکیم کے مطابق جزیرہ مائنر کا (Minorca) جو اس وقت انگریزوں کے قبضہ میں تھا، روس کو دیا جانے والا تھا تاکہ بحر روم میں روسی جہازوں کے لئے ایک اسٹیشن کا کام دے، نیز یونانی باغیوں کے جمع ہونے کے لئے ایک محفوظ مقام حاصل ہو جائے، پوٹمکن اس اسکیم کو برطانوی سفیر مقیم سینٹ پیٹرس برگ کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ روس کے وزیر خارجہ کاؤنٹ پانین (Panin) نے جو انگلستان کے مقابلہ میں فرانس کا حامی تھا، درمیان میں پڑ کر اس معاملہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا، ایٹن لکھتا ہے کہ اس اسکیم کی ناکامی پر پوٹمکن مرتے وقت تک افسوس کرتا رہا، اور وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دولت عثمانیہ کے خلاف روس کی کامیابی انگلستان سے اتحاد کرنے پر منحصر ہے[1]، خود کیتھرائن کا ذاتی خیال اس سے مختلف تھا،

سلطنت عثمانیہ کی مجوزہ تقسیم گذشتہ جنگ میں کیتھرائن کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ سے متعلق اپنے حوصلوں کو پورا کرنا آسٹریا کی شرکت کے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ اُس نے ترکوں سے لڑائی چھیڑنے سے پہلے شہنشاہ جوزف ثانی سے جو میریا تھریسیا کی وفات (۱۷۸۰ء) کے بعد سلطنت آسٹریا کا مطلق العنان فرماں روا تھا، دو ایک بار ملاقات کی اور اُسے اپنا گرویدہ اور اپنی "مشرقی تجویز" کا پرجوش حامی بنا لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جون ۱۷۸۱ء

---

[1] کریسی جلد ۲ ص ۲۶۲،

میں دونوں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ سے ایک معاہدہ ہو گیا، جسکی رو سے کیتھرائن اور جوزف نے مشرق ادنیٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کیا، اس معاہدہ میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا، لیکن ستمبر ۱۷۸۲ء میں کیتھرائن نے جوزف کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک مستقل اسکیم پیش کی،

اسکیم کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ روس اور آسٹریا متحد ہو کر ترکوں کو ان کے تمام یورپین مقبوضات سے نکال دیں گے، اور ان کے نکل جانے کے بعد پھر ان علاقوں کی تقسیم میں کوئی دشواری باقی نہ رہے گی، مجوزہ تقسیم یہ تھی کہ اوکزاکوف، دریائے بوگ اور دریائے نیسٹر کا درمیانی علاقہ اور بحر ایجین کے دو جزیرے روس کو دیدیئے جائیں، مولڈیویا، بسرابیا اور ولاچیا کو متحد کر کے ڈاسیا کے نام سے ایک آزاد مملکت قائم کر دیجائے اور شہزادہ پوٹمکن کو اس کا بادشاہ بنا دیا جائے، آسٹریا کے حصہ میں سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا اور ڈلماشیا کے صوبے رکھے گئے تھے، ڈلماشیا چونکہ وینس کا مقبوضہ تھا، اس لئے اس کی تلافی کے لئے وینس کو موریا، قبرص (سائپرس) اور کریٹ دیئے گئے، کیتھرائن کو یورپین حکومتوں میں سے مخالفت کا اندیشہ صرف فرانس کی طرف سے تھا، اس لئے فرانس کو راضی کرنے کے لئے مصر و شام کے صوبے اس کے سامنے پیش کئے جانے والے تھے،

لیکن اس اسکیم کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ تھا، جس میں ایک بازنطینی سلطنت کا نقشہ مرتب کیا گیا تھا، یعنی تھریس، مقدونیا، بلغاریا، شمالی یونان اور البانیا کو ملا کر ایک نئی سلطنت قائم کی گئی تھی، جس کا پایہ تخت قسطنطنیہ تھا، اور کیتھرائن کا دوسرا پوتا شہزادہ قسطنطین اس سلطنت کا فرماں روا قرار دیا گیا تھا، چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس شہزادہ کی تعلیم و تربیت میں یہی مقصد کیتھرائن کے پیش نظر تھا، کیتھرائن کو

اپنی اسکیم کی کامیابی پر اس قدر اعتماد تھا کہ اُس نے پہلے ہی سے اس نئی سلطنت کیلئے ایک سکہ بھی ڈھلوا لیا تھا جس کے ایک طرف شہزادہ قسطنطین کے چہرے کی شبیہ تھی اور دوسری طرف ایک تمثیلی نشان تھا جو ہلال پر صلیب کی آئندہ فتح و نصرت کو ظاہر کر رہا تھا، یورپین حکومتوں کے اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے کہ مبادا سلطنت روس اور یہ جدید بازنطینی سلطنت بعد میں ایک ہی فرماں روا کے زیر حکومت آجائیں کیتھرائن کافی ضمانت دینے پر آمادہ تھی۔[1]

شہنشاہ جوزف کو مذکورۂ بالا اسکیم سے پورا پورا اتفاق نہ تھا اُس کا خیال تھا کہ اس تقسیم میں آسٹریا کا حصہ کم رکھا گیا ہے، وہ ڈلماشیا کے علاوہ اِسٹریا (Istria) کا علاقہ بھی چاہتا تھا اور سرویا کے علاوہ ولاچیا کے کوچک کا بھی اُمیدوار تھا، اُسے یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ دریائے ڈینوب کے بقیہ علاقے سلطنت عثمانیہ سے نکل کر روس کے دائرۂ اقتدار میں آجائیں، تاہم وہ سمجھتا تھا کہ کیتھرائن کی مخالفت کرنے سے بجز نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس لئے اُس نے اس اسکیم کو منظور کرکے کیتھرائن کی دوستی کو قائم رکھا۔

کریمیا پر روس کا قبضہ

یہ اسکیم بہرحال کاغذ ہی تک محدود رہی اور کیتھرائن کے حوصلوں کے باوجود عمل میں نہ آسکی لیکن ۱۷۸۳ء میں اُس نے کریمیا پر قبضہ کرکے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، باضابطہ قبضہ تو ۱۷۸۳ء میں ہوا مگر اس کے لئے کوشش صلحنامہ کینارجی کے بعد ہی سے شروع ہوگئی تھی، اس صلحنامہ میں حکومت روس نے عہد کیا تھا کہ وہ کریمیا کے اندرونی اور ملکی معاملات میں مطلق مداخلت نہ کرے گی، اور نہ اُس کے فرماں روا کے انتخاب میں کوئی دخل دے گی، لیکن اس کے باوجود

۱؎ میریٹ ص ۱۵۶-۱۵۵،

اُس نے دوستانہ مشورہ کے طور پر کریمیا کے اندرونی معاملات میں ابتدا ہی سے دخل دینا شروع کر دیا تھا، اور جب باب عالی نے احتجاج کیا کہ یہ معاہدہ کینارجی کی صریح خلاف ورزی ہے، تو اس کا جواب یہ دیا کہ اہل کریمیا کے باہمی جھگڑوں سے خود روس کے سرحدی علاقوں پر مضر اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، تاتاریوں نے دولت گرائی کو اپنا خان منتخب کیا تھا، کیتھرائن نے اُسے اپنے اثر میں لانے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوئی، اس لئے اس نے اب یہ تدبیر اختیار کی کہ سازشوں کے ذریعہ دولت گرائی کے خلاف ملک میں سخت شورش برپا کرا دی، اور پھر اس شورش کو فرو کرنے کے حیلہ سے اپنی فوجیں کریمیا میں روانہ کیں، روسی افسر برابر یہ اعلان کرتے جاتے تھے کہ اُن کا مقصد ہرگز کریمیا کو فتح کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ صرف امن قائم کرنے کے لئے آئے ہیں، بہرحال اُنھوں نے دولت گرائی کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا، اور اس کی جگہ شاہین گرائی کو منتخب کرایا، یہ شخص روس کے زیر اثر اور تاتاریوں میں حد درجہ نامقبول تھا، چنانچہ کیتھرائن کے حسب توقع بہت جلد اُسکے خلاف شورش برپا ہو گئی، اور تاتاریوں نے اُسے تخت سے معزول کر دینا چاہا، چونکہ باب عالی بھی شاہین کا مخالف تھا، اس لئے اُس نے ۱۷۷۶ء میں ایک وفد سینٹ پٹرس برگ روانہ کیا، اور کیتھرائن سے مدد کی درخواست کی، کیتھرائن اسی موقع کا انتظار کر رہی تھی، اُس نے شاہین کو اپنی سرپرستی کا اطمینان دلایا اور روسی سپہ سالار روما نزوف کو حکم دیا کہ فوجیں تیار رکھی جائیں، تاکہ اگر ترک اس معاملہ میں روس کی مخالفت کریں تو اُن کا مقابلہ کیا جائے، لیکن باب عالی میں اس وقت روس سے جنگ چھیڑنے کی قوت نہ تھی، البتہ کیوبان کے تاتاری قبائل نے

روس کی اس خطرناک مداخلت کے خلاف ہتھیار اُٹھائے، لیکن جنرل سوار وئے نے شکست دیکر اُن کا زور توڑ دیا۔ ۱۷۷۹ء میں باب عالی اور روس کے درمیان ایک جدید معاہدہ ہوگیا، جسمیں صلحنامہ کینارجی کی دفعات ازسرنو تسلیم کی گئیں، حالانکہ کریمیا کیساتھ روس کا طرزِ عمل صلحنامہ مذکور کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تھا، اس معاہدہ میں سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے شاہین گرائی کو کریمیا کا جائز فرماں روا بھی تسلیم کیا، لیکن شاہین گرائی زیادہ دنوں تک تخت پر نہ رہ سکا، پوٹمکن نے اپنے ایجنٹ خان کے دربار میں متعین کر دیئے، اُنھوں نے اُس کو روسی رسم ورواج اور روسی لباس اختیار کرنے کی ترغیب دی جس سے تاتاریوں کے قومی اور مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچا، اور اُس کے خلاف عام بیزاری پھیلنے لگی، ان روسیوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ شاہین کے خلاف جو شورش پھیل رہی تھی، اُسے اپنی خفیہ کوششوں سے بہت بڑھا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا علانیہ بغاوت پر آمادہ ہوگئی، اب شاہین کے ان روسی مشیر کاروں نے اُسے کیتھرائن سے فوجی مدد طلب کرنے کی رائے دی، وہ غریب اُن کے ہاتھوں میں کچھ ایسا مجبور ہو رہا تھا کہ چاروناچار اُس کو روس سے مدد کی درخواست کرنی پڑی، چنانچہ فوراً روسی فوجیں کریمیا میں پہنچ گئیں، اور بغاوت فرو کر دی گئی، لیکن اب کیتھرائن کو تاتاریوں کی فلاح وبہبود کے لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ کریمیا بلا تاخیر سلطنت روس میں شامل کر لیا جائے، جن احسان ناشناسوں نے اس تجویز کی مخالفت کی اُنھیں بیدردی کے ساتھ قتل یا جلاوطن کر دیا گیا، اور شاہین گرائی کو مجبور کیا گیا کہ زارینہ کے حق میں کریمیا اور کیوبان کی مملکت سے دست بردار ہو جائے، اُس سے ایک تحریر بھی اس مضمون کی حاصل کر لی گئی کہ اُس کے خاندان کے وہ افراد

جو وراثۃً تخت و تاج کے مستحق ہوتے آیندہ ہمیشہ کے لئے کریمیا کی فرماں روائی سے معزول کئے گئے،

ظلم و فریب کی اس حیرت انگیز کارروائی کے لئے سند جواز بھی ویسی ہی نظیر پیش کی گئی، چنانچہ تاتاریوں کے ملک پر اس طرح قبضہ کر لینے بعد کیتھرائن کی طرف سے جو اعلان اپریل ۱۷۸۳ء میں شائع کیا گیا، وہ اُسی قسم کی خداعیوں سے پر تھا، جسکا نمونہ تقسیم پولینڈ کے موقع پر یورپ کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا، یعنی کریمیا اور کیوبان کو سلطنت روس میں شامل کر لینے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ قوم تاتار کو طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کے مصائب سے نجات دلائی جائے، اور روس کے سایۂ عاطفت میں پُرامن زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز کیا جائے، مغربی یورپ میں کیتھرائن کے ان الطاف خسروانہ پر تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہونے لگے لیکن خود تاتاریوں نے ان نعمتوں کی ناقدری کی، اور ایک جماعت ملکی آزادی کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی، جنرل پوٹمکن (جو شہزادہ پوٹمکن کا عزیز تھا) نے فوراً ہی اُن کی تنبیہ کر دی، قتل عام میں تیس ہزار تاتاری جنمیں بوڑھے بچے، عورتیں سبھی شامل تھے تہ تیغ کر دیئے گئے، روسیوں کے مظالم سے بچنے کے لئے ہزاروں وطن چھوڑ کر بھاگ گئے، بھاگنے والوں میں پچھتر ہزار آرمینی عیسائی بھی تھے، جنمیں سے سات ہزار کے علاوہ باقی سب فاقہ کشی اور سردی کی شدت سے راستہ ہی میں ہلاک ہو گئے[1]،

فرانسیسی مورخ ژون کیر اس سلسلہ میں رولیر کا حسب ذیل بیان نقل کرتا ہے، "صلحنامۂ کینارجی کے نتائج بہت جلد محسوس ہو گئے، مسقووی کارپردازوں کی

---

[1] کریسی جلد ۲ صفحہ ۲۷۶،

سازشوں سے قرم میں فساد ہوا، دولت غزائے معزول کیا گیا اور اُس کی جگہ شاہین غزائے مقرر ہوا جس نے آپ کو کیتھرائن کی سرپرستی میں دیا، امرار نے نئے خان قرم کے خلاف بغاوت کی، خان نے روس سے مدد کی درخواست کی، (۱۷۸۳ء) پوٹمکن نے فوراً ستر ہزار آدمیوں کے ساتھ قرم پر حملہ کر دیا، لیکن اُسکی فتح کو فتح کی دیوی نے شرف نہیں بخشا، قتل کے ساتھ یہ فتح حاصل ہوئی، اور پھانسیوں کے ساتھ اس کا اعلان ہوا، خود خان کی آنکھوں کے سامنے کئی ہزار شریف تاتاری سنگسار اور قتل کر دیئے گئے ......
روسیوں نے بدقسمت شاہین غزائے کو ایک زمانہ تک ٹال مٹول میں رکھا، آخر بیچارے کو اپنی سلطنت سے جس کی اُس نے تحقیر کی تھی دست کش ہونا پڑا، بعدازاں روسیوں نے اُس کو کالوگا میں قید کیا اُسکو سخت تکلیفیں دیں اور اُس کے ساتھ نہایت وحشیانہ برتاؤ کیا، اور بالآخر اسکو ترکوں کے انتقام کے لئے سرحدی علاقے پر چھوڑ دیا، ترکوں نے اُسکو پکڑا اور رہوڈس روانہ کیا، جہاں فرانسیسی قونسل کی مزاحمت کے باوجود قتل کر دیا گیا[۱]۔"

کریمیا کے مذکورہ بالا واقعات کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو وہاں سخت اضطراب پیدا ہوا لیکن اس وقت دولت عثمانیہ کی فوجی قوت ایسی نہ تھی کہ روس کے خلاف فوراً اعلانِ جنگ کر دیا جاتا، فرانس کو بھی کیتھرائن کی اس کارروائی سے نہایت تشویش ہوئی، چنانچہ اُس نے روس کے مقابلہ میں جس کی قوت اب خطرناک طور پر بڑھتی جا رہی تھی، مغربی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کرنا چاہا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اُس نے

[۱] تاریخ دولت عثمانیہ ازد لاژون کیر، (اردو ترجمہ) سلسلہ نصاب علیہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن جلد اوّل صفحہ ۳۴۳

Histoire de l'empire Ottoman, by A. de la Jonquiere.

انگلستان کی طرف توجہ کی، اور جون ۱۷۸۳ء میں فرانسیسی سفیر مقیم لندن نے انگلستان کے وزیر خارجہ مسٹر فاکس (C. J. Fox) سے مل کر کہا کہ شاہ فرانس کو سینٹ پٹرس برگ کی وزارت سے یہ سرکاری اطلاع ابھی ملی ہے کہ روس نے کریمیا اور کیوبان پر قبضہ کر لیا، کیا انگلستان اس قسم کی فتح کو بے اعتنائی کے ساتھ دیکھتا رہے گا؟ فاکس نے جواب دیا کہ مجھے اس میں شبہہ ہے کہ روس نے حقیقۃً ان صوبوں پر قبضہ کر لیا ہے، کیونکہ فریڈرک ایسا ہونے نہ دیگا، اور قبل اس کے کہ ایسا ہو وہ روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیگا، اس کے بعد سفیر فرانس نے اس مسئلہ پر فاکس سے متعدد بار گفتگو کی اور انگلستان اور فرانس کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ اگر کیتھرائن کی فتوحات کو روکا نہ گیا تو بہت جلد روسی بیڑہ باسفورس میں نظر آئیگا، اور قسطنطینہ پر بھی کیتھرائن کا قبضہ ہو جائیگا لیکن فاکس کی بے اعتنائی بدستور قائم رہی، اور آخر میں ان تمام باتوں کا جواب اُس نے یہ دیا کہ کریمیا سلطنت روس میں شامل کیا جا چکا، اور اس معاملہ میں مداخلت کرنے کا وقت اب باقی نہیں رہا، علاوہ بریں انگلستان اور روس کے درمیان کچھ معاہدے ہو چکے ہیں جن کو توڑنا مناسب نہیں، فاکس کی طرف سے مایوس ہو کر سفیر فرانس نے خود جارج سوم، شاہ انگلستان سے ملاقات کی اور اسکو روسی فتوحات کی اہمیت سمجھائی، اور بتایا کہ آسٹریا اور روس مل کر سلطنت عثمانیہ کو باہم تقسیم کر لینا چاہتے ہیں، جس طرح کہ اُنھوں نے پولینڈ پر چھاپا مار کر اُس کے بڑے حصہ کو تقسیم کر لیا، جارج سوم ان واقعات سے بہت متاثر ہوا، اور اُس نے کہا کہ "اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو چند دنوں میں یورپ مثل ایک جنگل کے ہو جائے گا، جہاں طاقتور کمزوروں کو لوٹ لے گا اور کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے گا"۔

لیکن جارج اپنی وزارت اور پارلیمنٹ کے خلاف کچھ کر نہیں سکتا تھا، اور یہ دونوں دولت عثمانیہ کے مخالف اور روس کے طرفدار تھے، علاوہ بریں چونکہ حال ہی میں امریکہ کی جنگ آزادی ختم ہوئی تھی اور اُس میں فرانس کی اعانت سے امریکہ والوں نے انگلستان کو شکست دی تھی، اس لئے باوجود اس کے کہ فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کے درمیان صلحنامہ ہو گیا تھا، انگریزوں میں اب بھی فرانس کے خلاف بیزاری کا جذبہ عام طور پر پھیلا ہوا تھا، اور وہ اُس کے ساتھ اتحاد کرنے پر آمادہ نہ تھے، چنانچہ مایوس ہو کر سفیر فرانس نے ۸ راگست ۱۷۸۳ء کو اپنی حکومت کو اطلاع دیدی کہ روس کے خلاف انگلستان کا تعاون حاصل ہونے کی کوئی اُمید نہیں،

پرشا اور آسٹریا کی طرف سے بھی فرانس کو ایسی ہی مایوسی ہوئی، فریڈرک نے ۱۷۵۶ء کے اُس معاہدۂ اتحاد کی شکایت کی جس کے رو سے فرانس اور آسٹریا ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے، اور حکومت فرانس کو جواب دیا کہ پرشا سے اتحاد کی خواہش کرنے سے پہلے اُسے چاہئے کہ آسٹریا سے اپنے دوستانہ تعلقات منقطع کر دے اسی طرح حکومت آسٹریا نے بھی جو سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے لئے روس سے سازش کر رہی تھی، سفیر فرانس کی گذارشات پر مطلق توجہ نہ کی[1]،

فرانس تنہا دولت عثمانیہ کی حمایت میں روس سے جنگ کرنے پر تیار نہ تھا، چنانچہ جب اُس نے آخری طور پر باب عالی کو یہ اطلاع دی کہ مغربی حکومتوں سے مدد ملنی ممکن نہیں تو مجبوراً ۸ رجنوری ۱۷۸۴ء کو روس سے ایک صلحنامہ کر لینا پڑا، جس کے رو سے کریمیا اور کیوبان پر کیتھرائن کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا،

---

[1] کریسی جلد ۲ صفحہ ۲۷۷۔

"قسطنطنیہ کا راستہ"

لیکن کیتھرائن کا سب سے بڑا مقصد یعنی قسطنطنیہ کی فتح ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا، اور اُس کی ساری توجہ اب اسی کے لئے وقف ہو رہی تھی، اُس نے آسٹریا کے ساتھ باہمی امداد کا ایک جدید معاہدہ کیا اور اوائل ۱۷۸۷ء میں شہنشاہ جوزف کے ہمراہ کریمیا کے سفر کے لئے روانہ ہوئی، دوران سفر میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم پر علانیہ گفتگو ہوتی رہی، کیتھرائن کو قسطنطنیہ کی فتح کا اتنا یقین تھا کہ جب وہ شہر خرسن سے گذر رہی تھی تو شہر کے جنوبی دروازہ کی محراب پر یہ الفاظ جلی حروف میں لکھوا دیئے تھے: "قسطنطنیہ کا راستہ"

اعلان جنگ

کیتھرائن حملہ کے لئے بالکل تیار تھی لیکن وہ چاہتی تھی کہ پیش قدمی کا الزام ترکوں کے سر رہے، اس غرض سے اُس نے اپنے ایجنٹ خفیہ طور پر مولڈیویا ولاچیا، یونان اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں پہلے سے بھیج دیئے تھے تاکہ عیسائی رعایا کو بغاوت کے لئے آمادہ کر رکھیں، روسی قنصل بھی جو صلحنامہ کینارجی کے بموجب سلطنت کے مختلف حصوں میں مقرر کر دیئے گئے تھے، رعایا کو بھڑکا رہے تھے، امیر ولاچیا نے علانیہ خودسری کرکے روس کے دامن میں پناہ لی تھی، باب عالی نے حکومت روس سے یہ مطالبہ کیا کہ امیر ولاچیا کو پناہ نہ دی جائے اور اُن قنصلوں کو معزول کر دیا جائے جو دولت علیہ کے خلاف رعایا کو اُبھار رہے ہیں، لیکن کیتھرائن نے اسے نامنظور کر دیا، اور اس کے جواب میں بسرابیا کے صوبہ اور اوکزاکوف اور اکرمان کے شہروں کا مطالبہ کیا، اس بنا پر کہ یہ علاقے پہلے خان کریمیا کے زیر نگیں تھے، جس کی مملکت اب روس میں شامل ہو گئی تھی، ترکوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، وہ اس توہین آمیز برتاؤ کو اب مطلق برداشت

نہیں کر سکتے تھے، جس کے ذریعہ سے کیتھرائن اُنھیں جنگ کے لئے برانگیختہ کر رہی تھی مجبور ہو کر باب عالی نے ۱۵ راگست ۱۷۸۷ء کو روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

انگلستان کا فریب

مذکورۂ بالا حالات کے پیش نظر باب عالی کی طرف سے اعلانِ جنگ بہرحال ناگزیر تھا، تاہم اُسے جنگ کی ترغیب دینے میں انگلستان کے "دوستانہ مشوروں" کو بھی بہت کچھ دخل تھا، سفیر فرانس نے دولت عثمانیہ کی حمایت میں انگلستان سے اتحاد کرنے کی جو کوشش کی اور مسٹر فاکس نے روس کی دوستی کا جیسا کھلا ہوا ثبوت دیا، اُس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، بایں ہمہ انگلستان دولت علیہ کا ہمدرد بنا رہا اور دوستی کے پردہ میں دشمنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ایک طرف تو اُس نے اس بات کی کوشش کی کہ فرانس اور دولت علیہ میں پھوٹ ڈال دے اور دوسری طرف اپنی مدد کا فریب دیکر باب عالی کو روس کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر آمادہ کر دیا، زِنکیزر انگلستان کی اس پالیسی پر لوالے کا حسب ذیل بیان نقل کرتا ہے:-

"انگلستان نے جس کے مشورے، جس کا توسط، جس کی غیر جانبداری ترکی کے حق میں سم قاتل کا کام کر رہی تھی، باب عالی کے سامنے فرانس کے اغراض کو بُری روشنی میں پیش کیا، اور یہ اتہام لگایا کہ فرانس دراصل اُس سے عیاری اور بیوفائی کو کام میں لا رہا ہے، اور دیوان کو ترغیب دی کہ وہ فرانسیسی تجاویز صلح کو رد کر دے، روس سے سازش کر کے اُس نے باب عالی کو باور کرایا کہ روس دراصل خوف سے پیچھے ہٹ رہا ہے، اور یہ کہ اب سابقہ فتوح کے واپس لینے کا وقت آگیا ہے، اُس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ آسٹریا کو لڑائی سے باز رکھے گا، سوئڈن اور لہستان (پولینڈ) کو اُس کی طرف سے لڑائی پر آمادہ کریگا، اور اپنی بحری قوت سے پوری مدد کریگا۔"[1]

[1] تاریخ دولت عثمانیہ (اردو ترجمہ) از زِنکیزر جلد اول صفحہ ۳۴۳

ترکوں کی ابتدائی شکست اعلانِ جنگ کے بعد سلطان نے غازی حسن پاشا کو فوراً مصر سے واپس بلالیا، جہاں وہ مملوکوں کی بغاوت فرو کرنے میں مشغول تھا، اور اسے بحر اسود اور ملحق علاقہ کی بری اور بحری فوجوں کی کمان دیکر اوکزاکوف روانہ کیا تاکہ وہاں سے کلبرن پر حملہ آور ہو جو دریائے نیسٹر کے دہانہ پر اوکزاکوف کے بالمقابل دوسرے ساحل پر واقع تھا، کلبرن میں روسی فوج کا سپہ سالار سوارو تھا جو اپنے وقت کا بہت مشہور جنرل تھا، اُس نے عثمانی فوج کے نصف حصہ کو بغیر کسی مزاحمت کے دریا عبور کرنے دیا اور پھر دفعۃً اُس پر حملہ کر دیا، ساتھ ہی روسی اور عثمانی بیڑوں میں بھی جنگ چھڑ گئی، جس کی وجہ سے بقیہ ترکی دستے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے کلبرن نہ پہنچ سکے اور چھ سات ہزار سپاہی جو کلبرن کے ساحل پر اُتر چکے تھے، سوارو کے اچانک اور شدید حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور قریب قریب سب لڑتے ہوئے مارے گئے، بحری جنگ میں بھی ترکوں کو شکست ہوئی اور حسن پاشا کے جہازوں کا بیشتر حصہ برباد ہو گیا

آسٹریا کا فریب اس کے بعد ۱۷۸۷ء کی بقیہ مدت میں پھر کوئی لڑائی نہیں ہوئی بلکہ موسم سرما کے مہینے فریقین نے آئندہ جنگ کی تیاریوں میں صرف کئے، ۱۷۸۸ء کے شروع میں سوئڈن اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس کی وجہ سے کیتھرائن کو روسی فوجوں اور جہازوں کا معتد بہ حصہ بحر بالٹک اور اُس کے ساحلی علاقوں کی طرف روانہ کر دینا پڑا، ابھی تک آسٹریا نے دولت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا حالانکہ روس اور آسٹریا میں معاہدۂ اتحاد ہو چکا تھا، اور اس کے رو سے آسٹریا کو شروع ہی سے روس کا ساتھ دینا چاہئے تھا، وجہ یہ تھی کہ جب لڑائی شروع ہوئی اُس وقت جوزف صوبہ نیدر لینڈز کی شورش فرو کرنے میں مشغول تھا، چنانچہ

جب تک ادھر سے کسی حد تک اطمینان نہ ہو چکا، اُس نے دولت علیہ کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھایا، برخلاف اس کے اُس نے اپنے سفیر کے ذریعہ سے باب عالی میں یہ پیغام بھیجا کہ وہ روس اور دولت عثمانیہ میں صلح کرا دینے کے لئے تیار ہے، لیکن ہمدردی اور دوستی کی یہ نمایش اُسی وقت تک قائم رہی، جب تک اُسے اپنی سلطنت کی اندرونی مشکلات کی طرف سے نجات نہ حاصل ہوئی، جوں ہی نیدرلینڈز کی شورش ختم ہوئی اُس نے دولت علیہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اعلان جنگ سے قبل ہی جب کہ وہ بظاہر روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان صلح کی کوشش کر رہا تھا اُس نے باب عالی کو اس فریب میں مبتلا رکھکر بلغراد پر قبضہ کر لینا چاہا، چنانچہ ۲ر دسمبر ۱۷۸۷ء کی شب میں آسٹرین فوج کے ایک دستہ نے بلغراد پر اچانک حملہ کر دیا، چونکہ بقیہ دستے وقت پر پہنچ نہ سکے تھے، اس لئے یہ حملہ ناکام رہا، اور قریب تھا کہ پورا دستہ ترکوں کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا لیکن آسٹرین کمانڈر نے بلغراد کے سرعسکر سے معافی مانگ کر اپنے ساہیوں کی جان بچا لی، سرعسکر نے ان حملہ آوروں کو صحیح وسالم واپس چلے جانے کی بھی اجازت دیدی، باب عالی نے حکومت آسٹریا کے اس شرمناک طرز عمل کی شکایت جوزف سے کی، اور اُسے وہ زمانہ یاد دلایا جب شہنشاہ چارلس ششم کی وفات پر یورپ کی مسیحی سلطنتیں جنگ جانشینی کو بہانا کر کے آسٹریا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھیں، اور میریا تھریسیا کو اُس کے حق سے محروم کرنے پر تلی ہوئی تھیں، لیکن دولت علیہ نے آسٹریا کے مصائب سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا، حالانکہ اُسے چارلس کے فریب کا بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع تھا، بلکہ اسکے برخلاف وہ انتہائی دیانتداری کے ساتھ اپنے معاہدہ کی پابند رہی، اور آسٹریا کے

خلاف ہتھیار اُٹھانے سے قطعی طور پر انکار کر دیا، لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے حکومت آسٹریا پر حرص و ہوس کا اتنا غلبہ تھا کہ احسانمندی، ایمانداری اور وقار و عزت کے شریفانہ جذبات اُس کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکے، چنانچہ ۱۰ فروری ۱۷۸۸ء کو جوزف نے دولت علیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا،

جوزف کو نہ صرف بوسنیا اور سرویا بلکہ مولڈویا اور ولاچیا کی فتح کا حوصلہ بھی تھا، چنانچہ اس مہم کے لئے اُس نے ۲ لاکھ فوج اور ۲ ہزار توپیں فراہم کیں، طے یہ پایا تھا کہ ایک روسی فوج مولڈویا میں داخل ہو کر آسٹریا کی فوج کے ساتھ آگے بڑھے گی، لیکن چونکہ اسی زمانہ میں سوئیڈن اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی اس لئے کیتھرائن آسٹریا کی مدد کے لئے دس ہزار سے زیادہ فوج نہ روانہ کر سکی، اسی معذوری سے روسی بیڑہ بھی حسب وعدہ بحر ایجین میں نہ پہنچ سکا، تاہم بحر اسود میں روس کا ایک طاقتور بیڑہ جنگ کے لئے تیار تھا، اور روسی فوجیں بحر اسود اور بحر کاسپین کے درمیانی علاقوں میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، روس کی خاص فوج شہزادہ پوٹمکن کی سپہ سالاری میں دریائے بوگ کے قریب پڑی ہوئی تھی، لیکن اگست ۱۷۸۸ء تک روسی فوجیں صرف تیاریوں میں مصروف رہیں اور کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی،

جوزف کی مضحکہ خیز شکست

باب عالی نے یہ دیکھ کر کہ روس کی طرف سے فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے، ایک زبردست فوج آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ کی، جس نے دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے منڈیا کے مقام پر آسٹرین فوج کو شکست دی، جوزف اس شکست خوردہ فوج کی مدد نیز ہنگری کی حفاظت کے لئے اسّی ہزار سپاہیوں کو لیکر فوراً روانہ ہوا، اور سلاطینہ میں خیمے نصب کر دیئے، جہاں سے قریب ہی صدر اعظم کا

لشکر پڑا ہوا تھا، لیکن بالکل آخر وقت میں جبکہ عثمانی لشکر پر حملہ کرنے کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں جوزف کو اپنی کامیابی میں شبہہ پیدا ہوا، اور اُسکی ہمت چھوٹ گئی وہ ایسا گھبرایا کہ فوراً ہی کوچ کا فیصلہ کرلیا، اس خطرہ سے کہ مبادا ترکوں کو خبر ہو جائے اور وہ دفعۃً حملہ کر دیں، واپسی نہایت خفیہ طور پر آدھی رات کو شروع ہوئی، آسٹرین فوج میں سخت اضطراب برپا تھا، وہ تیزی کے ساتھ تمسوار کی طرف بھاگی جارہی تھی، اتنے میں کسی طرح یہ خبر اُڑ گئی کہ ترک پیچھا کرتے ہوئے آرہے ہیں، اور عنقریب حملہ کیا چاہتے ہیں، اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ ساری فوج میں انتہا درجہ کی بدحواسی پھیل گئی، توپخانے پیچھے تھے اور پوری رفتار کے ساتھ بھگائے ہوئے لائے جارہے تھے، پیدل سپاہیوں نے یہ سمجھا کہ ترک سر پر آگئے، اُنھوں نے فوراً چھوٹے چھوٹے دستے قائم کرکے ہر طرف بے تحاشا گولیاں چلانی شروع کر دیں، جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ دستے خود ایکدوسرے ہی پر گولیاں چلا رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہی ہاتھوں سے دس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، اُس کے بعد ترکوں نے پہنچکر در اصل حملہ کیا، آسٹرین پہلے ہی سے ہمت ہار چکے تھے، مقابلہ نہ کر سکے اور سراسیمہ ہو کر بھاگے، اُن کے توپخانوں اور رلاؤ لشکر کا بڑا حصہ ترکوں کے ہاتھ آیا، جوزف کا شوق سپہ سالاری پورا ہو گیا، اُس نے پھر کسی فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں کی، یہ واقعہ ستمبر کا تھا، نومبر میں آسٹریا اور دولت علیہ کے درمیان تین مہینے کے لئے عارضی صلح ہو گئی، اس ایک سال کی مہم میں آسٹریا کے تیس ہزار آدمی میدانِ جنگ میں اور چالیس ہزار وبائی بیماریوں سے ہلاک ہو گئے تھے[1]

---

[1] ایورسلے صفحہ ۲۲۶،

سقوط اوکزاکوف | اگست ۱۷۸۸ء میں پوٹمکن نے اوکزاکوف کا محاصرہ شروع کر دیا تھا، لیکن دسمبر تک یہ قلعہ فتح نہ ہو سکا، آخر میں عاجز آکر اس نے جنرل سوارو کو مدد کے لئے بلایا، سوارو کے پہنچنے سے محاصرہ کی شدت بہت بڑھ گئی، آخری حملہ ۱۷ دسمبر کو ہوا، چار ہزار روسی ترکی بندوقوں کی باڑھ سے ڈھیر ہو گئے، لیکن سوارو تازہ دستے پے در پے آگے بھیجتا جاتا تھا، آخر میں روسیوں کی کثرت تعداد غالب آئی، اور وہ قلعہ میں داخل ہو گئے اندر پہنچنے کے بعد بھی ترکوں نے حیرت انگیز جانبازی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا مگر روسی فوجوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو وہ زیادہ دیر تک روک نہ سکے، روسیوں نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد قتل عام شروع کر دیا، اور تین روز تک ناقابل ذکر درندگی کے ساتھ یہ خونین کھیل کھیلتے رہے، بوڑھے، بچے، اور عورتیں سب کے سب نہایت سفاکی سے تہ تیغ کر دیئے گئے، چالیس ہزار کی آبادی میں سے صرف چند سو جانیں (جنہیں زیادہ تر بچے اور عورتیں تھیں)، روسیوں کی خونخوار تلواروں سے سلامت بچ سکیں، یہ قلیل تعداد بھی بعض روسی افسروں کی ذاتی کوششوں سے بچ سکی،

اوکزاکوف کے محاصرہ میں اٹین، شہزادہ پوٹمکن کے ساتھ تھا، ترکوں کی شجاعت اور سرفروشی کے مناظر تو اُس نے پہلے بھی دیکھے تھے، مگر اس موقع پر وہ اُن کے صبر و استقلال کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ ہو گیا، وہ لکھتا ہے:-

"ترکی عورتیں اور بچے (جن کی تعداد تقریباً چار سو تھی) اوکزاکوف کی فتح کے بعد جب شہر سے نکال کر روسی فوج کے پڑاو پر لائے گئے، تو پہلی رات کو سب کے سب ایک خیمہ میں ٹھہرا دیئے گئے، موجودہ حالات میں اُن کے قیام کے لئے اس سے بہتر کوئی انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا، گو اُس رات کو سخت برف باری ہو رہی تھی، او

ان غریبوں کو سردی کی شدت اور کپڑوں کے نہ ہونے سے بیحد تکلیف تھی، ان میں سے بہتیرے زخموں کی شدید تکلیف میں بھی مبتلا تھے، چونکہ میں ترکی زبان بولتا تھا، اس لئے مجھے اُن کی حفاظت اور نگرانی کی خدمت سپرد کی گئی، میں نے دیکھا کہ ان سبھوں پر کامل سکوت طاری ہے، کوئی عورت نہ روتی ہے اور نہ آہ وفغاں کرتی ہے حالانکہ اُن میں سے شاید ہر ایک کا باپ یا بچہ یا شوہر قتل ہو چکا تھا، یہ عورتیں سکون اور استقلال کے لہجہ میں بات کرتیں اور جو سوالات میں اُن سے کرتا، اُن کے جواب بغیر کسی اضطراب کے دیتیں ہیں حیرت میں تھا اور یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ اُن کی یہ حالت بے حسی کا نتیجہ ہے، یا اس بات کا کہ اُنھوں نے قسمت کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے اور سنے ہیں، اور یا پھر اس کا سبب تسلیم و رضا کی وہ تعلیم ہے، جو اُن کا مذہب اُنھیں دیتا ہے، اور آج بھی میں اس کا سبب معلوم کرنے سے ویسا ہی قاصر ہوں، اُن میں سے ایک عورت خاموش لیکن غیر معمولی طور پر غمگین انداز میں بیٹھی ہوئی تھی، میرا جی چاہا کہ اُسے کچھ تسلی دوں، چنانچہ میں نے اُس سے کہا کہ تو کیوں نہیں ہمت سے کام لیتی اور مصیبت کو ایک مسلمان کی طرح برداشت کرتی جیسے کہ تیری ساتھی عورتیں برداشت کر رہی ہیں، اُس نے میرا جواب ان موثر الفاظ میں دیا، :- "میں نے اپنے باپ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اب میرا ایک ہی بچہ رہ گیا ہے" میں نے جلدی سے پوچھا کہ وہ بچہ کہاں ہے، اُس نے سکون کے ساتھ جواب دیا کہ "یہ ہے" اور ایک بچہ کی طرف اشارہ کیا جو اُس کے پہلو میں پڑا ہوا تھا، اور جس نے اُسی وقت دم توڑا تھا، میں اور وہ لوگ جو میرے ساتھ تھے بے اختیار رو پڑے لیکن وہ ذرا بھی نہیں روئی، اُس رات کو میں ان مصیبت زدہ عورتوں اور بچوں کو جو زخموں

اور سردی کی تکلیف سے مر رہے تھے اپنے گرم زمین دوز کمرے میں لے گیا، اور جتنے آدمیوں کی اُس میں گنجایش تھی اُنھوں کو وہاں ٹھہرایا، وہ لوگ بارہ روز میرے ساتھ رہے، لیکن اس پوری مدت میں ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ کوئی شکوہ کیا، اور نہ اپنے شدید اندرونی صدمہ کو ظاہر ہونے دیا، بلکہ ہر عورت (خواہ وہ بوڑھی ہو یا جوان) اپنی سرگذشت مجھ سے اس طرح بیان کرتی تھی جیسے وہ کسی غیر متعلق آدمی کا قصہ کہہ رہی ہو، بغیر فریاد، بغیر ٹھنڈی سانسوں اور بغیر آنسوؤں کے"[1]

سلطان کی وفات دوسرے سال یا پچ ۱۷۸۹ء میں صدر اعظم یوسف پاشا تازہ فوجوں کے ساتھ آسٹریا کی مہم پر روانہ ہوا، اُس نے فوج کا ایک حصہ پیچھے چھوڑ دیا تاکہ ولاچیا اور مولڈیویا میں غنیم کی نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہے، اور خود نوے ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے ڈینوب کو عبور کر کے ٹرانسلونیا میں داخل ہو گیا، وہاں سے اُس کا قصد خود آسٹریا پر چڑھائی کرنے کا تھا، لیکن ۷ راپریل ۱۷۸۹ء کو سلطان عبد الحمید کا انتقال ہو گیا اور سلیم ثانی کی تخت نشینی کے ساتھ ہی صدارت کے عہدہ پر بھی ایک دوسرا آدمی مقرر کیا گیا، نیا صدر اعظم ودین کا سابق والی تھا، فوجی لیاقت کے اعتبار سے وہ صدر اعظم کے عہدہ کا بالکل مستحق نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف پاشا کی مہم فسخ کر دی گئی، اور عثمانی فوجیں ٹرانسلونیا سے واپس بلا لی گئیں،

---

[1] کریسی جلد ۲ صفحہ ۲۹۲ فٹ نوٹ،

سلیم ثالث

۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء

سلطان سلیم خاں ثالث ستائیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، وہ فطرۃً بہت ذہین اور حوصلہ مند تھا اور اُس کے چچا سلطان عبدالحمید اول نے اُس کی تعلیم و تربیت خاص توجہ کے ساتھ کی تھی، دولت عثمانیہ کے مروجہ دستور کے مطابق سلیم کو بھی عبدالحمید کے عہد حکومت میں نظر بند رہنا پڑا تھا لیکن یہ نظر بندی محض برائے نام تھی سلطان مرحوم کی غیر معمولی شفقت نے اُسے بہت زیادہ آزادی دے رکھی تھی، جس سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے امور سلطنت سے متعلق بہت کچھ مفید معلومات حاصل کر لئے تھے، اس کے احباب میں ایک اطالوی طبیب لورنزو (Lorenzo) نامی تھا، اس کے ذریعہ سے اُس نے مغربی یورپ کی سلطنتوں کے ملکی اور فوجی دستور و قوانین سے بھی کافی واقفیت حاصل کر لی تھی، اور وہ اسباب بھی معلوم کر لئے تھے، جنھوں نے مغربی قوموں کو آل عثمان کے مقابلہ میں نمایاں طور پر فائق و ممتاز بنا دیا تھا اُس نے شاہ فرانس اور اُس کے بعض وزراء سے خفیہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا تھا، اور سلطنت عثمانیہ میں اصلاحات جاری کرنے کے بارہ میں اُن سے مشورہ

کیا کرتا تھا، اُس کے والد مرحوم سلطان مصطفےٰ خاں ثالث نے اُس کے لئے اپنے عہد حکومت کی ایک سرگذشت چھوڑی تھی، جس میں اُس عہد کے خاص خاص واقعات، ترکوں کے انحطاط وزوال، اور نظامِ سلطنت کے فساد و انتشار پر مفصل تبصرہ تھا، اور آخر میں ان خرابیوں کو دور کرنے کی وصیت بھی درج تھی، چنانچہ تخت پر آنے سے پہلے ہی سلیم اصلاحات کے لئے تیار ہو چکا تھا اور زمامِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد غالباً سب سے پہلا کام یہی کرتا، لیکن روس و آسٹریا سے جنگ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا، اسلئے اُس کو ساری توجہ اُسی جانب مبذول کرنی پڑی، اور اصلاحات کو مجبوراً کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دینا پڑا،

جنگ کا سلسلہ شہنشاہ جوزف گذشتہ تجربہ کی بنا پر نیز علالت کی معذوری سے خود میدانِ جنگ میں نہ آسکا اور آسٹرین فوج کی کمان مارشل لوڈن (Loudon) کو سپرد کی جو "جنگ ہفت سالہ" کا ایک آزمودہ کار اور مشہور جنرل تھا، لوڈن نے بوسنیا اور سرویا پر حملہ کیا اور ان دونوں صوبوں میں اُسے کامیابی ہوئی، سرویا کی عیسائی رعایا نے اُس کا خیر مقدم کیا، لیکن بوسنیا کی مسلمان آبادی جانبازی سے مقابلہ کرتی رہی، بہرحال بوسنیا اور سرویا کے بیشتر علاقوں پر لوڈن نے قبضہ کر لیا، آسٹریا کی ایک دوسری فوج شہزادہ کوبرگ (Coburg) کی سرکردگی میں جنرل سوارو کی روسی فوج کے ساتھ مولڈیویا کی طرف بڑھی، سلطان سلیم نے اُن کے مقابلہ میں حسن پاشا کو سالارِ عسکر بنا کر روانہ کیا، حسن پاشا ایک بڑی فوج کے ساتھ شہزادہ کوبرگ کی طرف بڑھا جو مولڈیویا کی سرحد پر فوکشانی میں پڑا ہوا تھا، کوبرگ کی شکست یقینی تھی، اگر سوارو (۳۶) گھنٹے کے اندر (۶۰) میل کا دشوار گذار پہاڑی راستہ طے کر کے اسکی مدد کو عین وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا،

اُس نے ترکی حملہ کا انتظار نہ کیا بلکہ پہنچنے کے چند ہی گھنٹوں کے بعد خود حسن پاشا کے لشکر پر حملہ کر دیا، یہ حملہ پوری طرح کامیاب رہا ترکوں کے پیر اُکھڑ گئے اور اُن کا تمام توپخانہ اور بہت زیادہ سامان غنیم کے ہاتھ آیا، اس کے بعد سلطان نے ایک دوسری فوج روانہ کی جس سے ۱۶ ستمبر ۱۷۸۹ء کو دریائے رمنک کے قریب جنرل سوارو کی فوج سے سخت مقابلہ ہوا، اس معرکہ میں بھی ترکوں کو شکست ہوئی، ان پے در پے شکستوں سے قسطنطنیہ میں سخت شورش پھیلی، اور لوگوں نے سارا الزام سالار عسکر حسن پاشا کے سر عائد کر کے سلطان سے اُس کے قتل کا مطالبہ کیا، حسن پاشا دولت علیہ کی خدمت میں بوڑھا ہو گیا تھا، اور اُس نے سلطنت کے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے لیکن اس شورش کے فرو کرنے کے لئے سلیم کو مجبوراً اُس کے قتل کا حکم دینا پڑا، اسی سال بلغراد اور سمندریا پر بھی آسٹریا کا قبضہ ہو گیا، ۱۷۹۰ء میں آسٹریا اور روس کی فوجیں متحدہ طور پر قسطنطنیہ کی جانب بڑھنے والی تھیں، لیکن دو وجوہ سے یہ مہم ناتمام رہی،

آسٹریا سے صلح پہلی بات تو یہ ہوئی کہ شہنشاہ جوزف نے اپنی وسیع سلطنت میں جو اصلاحات جاری کی تھیں اُن کے خلاف سلطنت کے تقریباً ہر حصہ میں بغاوت برپا ہو گئی اور اُسے مجبوراً اپنی فوجیں اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ترکوں کے مقابلہ سے ہٹا لینی پڑیں، دوسرا سبب یہ ہوا کہ ۱۷۹۰ء ہی میں جوزف کا انتقال ہو گیا اور اُس کا جانشین اُس کا بھائی گرانڈ ڈیوک لیوپولڈ (Leopold) ہوا، وہ شروع ہی سے اپنی سلطنت کے اندرونی خلفشار اور حکومت پرشا کی دراز دستیوں کے اندیشہ سے دولت عثمانیہ سے ایک باعزت صلح کر لینے کا خواہشمند تھا، علاوہ بریں وہ دولت عثمانیہ کے خلاف روس سے اتحاد کرنے کو سلطنت آسٹریا کے لئے کچھ مفید نہیں

خیال کرتا تھا، چنانچہ چند چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد جن میں سے ایک میں آسٹرین فوج نے اورسوا پر قبضہ کر لیا، اور دوسری میں گرجیوو کے قریب میدان ترکوں کے ہاتھ رہا، باب عالی اور آسٹریا کے درمیان عارضی طور پر صلح ہو گئی، جس کا تکملہ ۴؍ اگست ۱۷۹۱ء کو صلحنامہ سسٹوا (Sistova) کے ذریعہ کر دیا گیا، اس صلحنامہ کی ترتیب میں انگلستان، پرشا اور ہالینڈ کی وساطت کو خاص دخل تھا، اس کی رو سے آسٹریا نے وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں بوسنیا، سرویا اور ولاچیا کے صوبوں میں فتح کئے تھے اور جنہیں بلغراد اور سمندریا کے اہم قلعے بھی شامل تھے دولت عثمانیہ کو واپس کر دیئے، صرف کروشیا کے ایک مختصر سے خطہ اور اورسوا کے قدیم شہر پر اپنا قبضہ باقی رکھا،

یونانیوں کی بغاوت

لیکن کیتھرائن نے دولت علیہ سے صلح کرنے میں انگلستان پرشا اور ہالینڈ کی وساطت قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا، حالانکہ انہی کی مداخلت سے اُسے سویڈن کے ساتھ صلح کرنی پڑی تھی، وہ اب تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی، اور فخریہ کہتی تھی کہ اگر مغربی سلطنتیں اُسے سینٹ پیٹرس برگ چھوڑنے پر مجبور کریں گی تو وہ قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنائے گی، اسی مقصد سے اُس نے یونانیوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف بھڑکانے کی پوری کوشش کی، اور ۱۷۸۷ء میں جنگ شروع ہونے سے قبل یونان کے ہر حصہ میں اپنے نمایندے بھیجکر وہاں کے باشندوں کو بغاوت کے لئے تیار کر دیا، چنانچہ ۱۷۹۰ء میں یونان کے چند ممتاز آدمیوں کا ایک وفد بھی اُسکی خدمت میں سینٹ پیٹرس برگ حاضر ہوا اور ترکوں سے آزادی حاصل کرنے کیلئے اُس سے فوجی مدد کی استدعا کی، کیتھرائن نے مدد دینے کا وعدہ کیا، پھر یہ وفد شہزادہ قسطنطین کے پاس گیا، جسے کیتھرائن نے بازنطینی سلطنت کا پہلا تاجدار نامزد کیا تھا،

قسطنطین نے ارکانِ وفد سے یونانی زبان میں کہا: "جاؤ تم جیسا چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا" یونانیوں نے تیرہ جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کر رکھا تھا، کیتھرائن نے اس کے لئے توپیں فراہم کر دیں اور ایک یونانی افسر لمبرو کویزیانی (Lambro Cavizziani) کو اس بیڑہ کا امیر البحر مقرر کیا، لیکن جب بحر ایجین میں عثمانی جہازوں سے مقابلہ ہوا، تو پورا یونانی بیڑہ شکست کھا کر غرق ہو گیا،

سقوط اسمٰعیل | بحری جنگ کا یہ نتیجہ کیتھرائن کے لئے زیادہ تشویش کا باعث نہ ہوا کیونکہ اُس کی بری فوجیں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، ۱۷۹۰ء کا سب سے بڑا معرکہ اسمٰعیل کی فتح تھی جو بحر اسود سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر دولت عثمانیہ کا ایک نہایت اہم قلعہ تھا، روسی فوجوں کے بلغاریا میں داخل ہونے کے لئے اس قلعہ کی فتح نہایت ضروری تھی، پوٹمکن نے مہینوں اُس کا محاصرہ جاری رکھا، لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی، آخر میں اُس نے یہ مہم جنرل سواروف کے سپرد کی، سواروف نے ۶ دسمبر کو کمان اپنے ہاتھ میں لی، اور ۲۲ دسمبر کو روسی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں، لیکن ترکی دستہ نے مدافعت میں جانبازی کا حق ادا کر دیا، روسیوں کو اصلی مقابلہ شہر میں داخل ہونے کے بعد پیش آیا، بقول کریسی ہر سڑک ایک میدانِ جنگ تھی اور ہر مکان ایک قلعہ تھا، آخر میں روسی ہر طرف قتل عام کرتے ہوئے ناف شہر میں پہنچے جہاں ترکوں اور تاتاریوں کا ایک دستہ عثمانی شجاعت کے حیرت انگیز جوہر دکھانے کے لئے اکٹھا ہو گیا تھا، دو گھنٹے نہایت سخت لڑائی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس دستہ کا ایک ایک سپاہی لڑتا ہوا مارا گیا، اس جنگ میں چونتیس ہزار ترک ہلاک اور دس ہزار گرفتار ہوئے، روسیوں نے شہر میں داخل ہو کر درندگی کی جو مثال پیش کی اُس سے خود سواروف کی نگاہیں بھی نا آشنا تھیں، چنانچہ اُس نے

اپنے ایک دوست سے بعد میں اعتراف کیا کہ اس ناقابل دید منظر کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے[1]

صلح کی گفتگو سلطان سلیم نے روس کے مقابلہ میں تازہ فوجیں روانہ کیں، لیکن اُنھیں بھی شکست ہوئی، اس درمیان میں انگلستان، پرشا، اور ہالینڈ صلح کے لئے برابر کوشش کر رہے تھے، شروع میں تو کیتھرائن نے اُن کی مداخلت کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور شاہ پرشا کو یہ جواب لکھوا دیا کہ "زارینہ جنگ و صلح میں صرف اپنی خواہش کی پابند ہے، اور اپنے اُمور مملکت میں کسی کی مداخلت گوارا نہ کریگی"، لیکن جب اکتوبر ۱۷۹۱ء میں جنگ کے سب سے بڑے محرک اور حامی پوٹمکن کا انتقال ہو گیا اور اتحاد ثلثہ (انگلستان، ہالینڈ اور پرشا) کی طرف سے بھی اصرار بڑھتا ہی گیا تو مجبوراً کیتھرائن نے صلح کے شرائط پر گفتگو کرنا منظور کر لیا، اتحادیوں نے روس کے سامنے بھی وہی شرط پیش کی، جس پر آسٹریا کو رضامند کیا گیا تھا یعنی فریقین دورانِ جنگ کے تمام مفتوحات سے دست بردار ہو جائیں، لیکن کیتھرائن کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئی اور صلح سے صاف انکار کر دیا، وہ کم از کم اوکزاکوف اور دریائے نیسٹر و دریائے بوگ کے درمیانی علاقہ پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتی تھی، اتحادی اس پر رضامند نہ تھے اور اُنھوں نے روس پر دباؤ ڈالنے کی تیاریاں شروع کر دیں،

انگلستان کی نئی پالیسی انگلستان کے لئے روس کی مخالفت ایک بالکل نئی چیز تھی، اٹھارہویں صدی کے بیشتر حصہ میں روس کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے، اور اُس نے کبھی ان جارحانہ تجاویز کی مخالفت نہیں کی جو دولت عثمانیہ کے خلاف

---

[1] ایورسلے ص۲۳۰،

حکومت روس کے پیش نظر تھیں، اور جن پر وہ استقلال کے ساتھ عمل کرتی چلی آرہی تھی۔ لارڈ چیتھم (Lord Chatham) وزیر اعظم برطانیہ جس کی سیاست خارجہ پر اب تک عمل درآمد تھا، ترکوں کی حمایت کا مستقل طور پر مخالف تھا، یہ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۷۸۳ء میں کیتھرائن نے کریمیا کو زبردستی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو انگلستان میں اس کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہیں ہوئی، برخلاف اس کے چارلس فاکس نے جو اس وقت وزیر خارجہ تھا، علانیہ کہا کہ "میری سیاست خارجہ ایک عمیق بنیاد پر قائم ہے، شمالی طاقتوں (بہ شمول روس) سے اتحاد رکھنا ہر روشن خیال انگریز کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے، اور ہمیشہ رہے گا"[۱]۔ اسی بنا پر جب ۱۷۹۱ء میں انگلستان کے نوجوان وزیر اعظم مسٹر پٹ (.........) نے حکومت کی قدیم سیاست سے جس پر خود اُس کا باپ لارڈ چیتھم شدت سے عامل تھا انحراف کر کے دولت عثمانیہ کی حمایت میں روس کو صلح کے لئے مجبور کرنا چاہا، اور پارلیمنٹ سے ایک جنگی بیڑہ کی تیاری کے لئے روپیہ کی درخواست کی تاکہ اگر کیتھرائن اتحادیوں کی وساطت کو مسترد کر دے اور صلح کے لئے راضی نہ ہو تو اُسے جنگی جہازوں کے ذریعہ راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے تو انگلستان میں اس تحریک کی پرزور مخالفت کی گئی، اور پارلیمنٹ میں فاکس نے جو اب مخالف پارٹی کا لیڈر تھا نہایت شدت کے ساتھ اختلاف کیا، پٹ نے اس بیڑہ کو پرشا کے تحفظ اور یورپ میں توازن قوت کے قائم رکھنے کے لئے ضروری قرار دیتے ہوئے اپنی تقریر میں اصلی زور انہی دو مقاصد پر دیا، اُس نے بتایا کہ ترکوں کی حمایت مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ ان مقاصد کے حصول میں دولت عثمانیہ کی بقا معین ہوتی تھی،

---

[۱] ایورسلے ص ۲۳۲،

پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر کئی بار بحثیں ہوئیں جن میں مخالف پارٹی کے مقرروں نے ترکی کو محض ایک وحشی ملک ٹھہرایا، اور کہا کہ نہ یورپ کے نظام مملکت میں اُسے کوئی دخل ہے اور نہ اُس کے حشر کا کوئی اثر توازن قوت پر پڑ سکتا ہے، اُنھوں نے کیتھرائن کی فراخدلی اور عالی ظرفی کی تعریف و تحسین میں واقعات کو نظر انداز کر دیا اور روس کی دراز دستیوں کی طرف سے جو خطرہ مسٹر پٹ نے یوروپین مملکتوں سے متعلق ظاہر کیا تھا، اُس کا خوب مضحکہ اڑایا، فاکس نے کہا کہ سلطنت عثمانیہ پر روس کا قبضہ ہو جانا ایک خلاف قیاس بات ہے، اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو بہتر ہی ہوگا، اُسکی جماعت کے ایک رکن مسٹر وہٹ بریڈ (Whitbread) تھے اُنھوں نے فرمایا: "فرض کیجیے کہ زارینہ کے قصد و ارادہ کی نسبت جو باتیں بیان کیجاتی ہیں، وہ سب پوری بھی ہو جائیں اور وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے ترکوں کو اُن کے تمام یوروپین صوبوں سے نکال دے تو بھی کیا کوئی غیر جانبدار شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اس واقعہ سے نوع انسانی کو بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔"[1] ۱۷۹۲ء کے سشن میں اس مسئلہ پر پھر بحث ہوئی اور مسٹر پٹ نے واضح طور پر بیان کیا کہ آیندہ انگلستان کی سیاست خارجہ کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ یورپ میں توازن قوت کو قائم رکھا جائے اور اسی بنا پر جہاں تک ممکن ہو نہ سلطنت روس کی قوت کو بڑھنے دیا جائے اور نہ سلطنت عثمانیہ کی قوت کو گھٹنے دیا جائے[2]،

فاکس وغیرہ کی شدید مخالفت کے باوجود پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے پٹ کی تجویز منظور کر لی، لیکن پٹ کو اس کا اندازہ بخوبی ہو گیا تھا کہ رائے عامہ روس

[1] کریسی جلد ۲ ص ۳۰۸، [2] ایضاً ص ۳۰۹،

سے جنگ کرنے کی مخالف ہو، چنانچہ اُس نے اپنی تجویز واپس لے لی، اور روس کے مقابلہ میں جنگی بیڑہ بھیجنے کا خیال ترک کر دیا، لیکن وہ روس کی قوت کو بڑھنے دینے پر کسی طرح تیار نہ تھا، اُس کے نزدیک روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جلد سے جلد صلح ہوجانا نہایت ضروری تھا، اس غرض سے وہ کیتھرائن پر برابر دباؤ ڈالتا رہا،

صلحنامہ یاسی۔ کیتھرائن بھی اب صلح کے لئے آمادہ معلوم ہوتی تھی، پولینڈ کے جو صوبے روس آسٹریا اور پرشیا کی غاصبانہ تقسیم کے بعد اہل ملک کے زیر حکومت باقی رہ گئے تھے، اُن میں محبانِ وطن نے کوسی اسکو (Kosciusko) کے زیر قیادت اصلاحات شروع کر دی تھیں جو کیتھرائن کے مصالح کے منافی تھیں، وہ پولینڈ کی دوسری تقسیم کا عزم کر چکی تھی، اور اب چاہتی تھی کہ ترکوں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جنرل سوارو ف روس کی فتحمند اور آزمودہ کار فوجوں کے ساتھ پولینڈ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کرے، چنانچہ ۱۷۹۱ء کے وسط ہی سے صدر اعظم اور جنرل رپنن میں صلح کی گفتگو شروع ہوگئی اور اگست میں تمام شرائط طے ہو گئے، ۹ر جنوری ۱۷۹۲ء کو یاسی کے مقام پر فریقین میں باضابطہ طور پر ایک صلحنامہ مرتب ہو گیا، اُسکی ترتیب وتکملہ میں کوئی دوسری حکومت شریک نہیں کی گئی، روس نے قلعہ اوکزاکوف اور دریائے نیسٹر اور دریائے بوگ کے درمیانی علاقہ کے علاوہ تمام فتوحات جو بسارابیا، مولڈیویا، ولاچیا اور کیوبان کے صوبوں پر مشتمل تھیں دولت عثمانیہ کو واپس کر دیں، دریائے نیسٹر سلطنت روس کی نئی سرحد قرار پایا جس کے مغرب کے تمام مفتوحہ علاقے سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیئے گئے، یونان بدستور باب عالی کے زیر حکومت رہا، اس صلحنامہ کے رو سے کیوبان کا صوبہ بھی دولت علیہ کو واپس مل گیا

لیکن اس علاقہ میں جو چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں ان پر زارینہ کی سیادت تسلیم کرلی گئی،

کیتھرائن کی موت کیتھرائن نے یہ صلح محض حالات سے مجبور ہو کر کی تھی، اور اس سے اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ پولینڈ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد پوری تیاری کیساتھ سلطنت عثمانیہ کے یورپی اور ایشیائی صوبوں پر بیک وقت حملہ کرے، چنانچہ چار سال کے اندر اُس نے پولینڈ پر اپنا تسلط مکمل طور پر قائم کرلیا، ۱۷۹۳ء میں پولینڈ کی دوسری تقسیم عمل میں آئی جس میں کیتھرائن اور فریڈرک نے آسٹریا کو شریک نہیں کیا، لیکن ۱۷۹۵ء میں جب یہ بدقسمت ملک آخری طور پر تقسیم کیا گیا، تو اس لوٹ میں روس، پرشا، اور آسٹریا تینوں شریک ہوئے، غرض پولینڈ کی طرف سے مطمئن ہو کر کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کی تیاریاں فوراً شروع کردیں، اُس نے تین لاکھ فوج اور ایک زبردست جنگی بیڑہ تیار کرلیا تھا، اور جنگ کا اعلان بہت جلد کرنے والی تھی، لیکن قضا نے مہلت نہ دی اور ۱۷۹۶ء میں اسکی موت کی وجہ سے یہ مہم جو دولت عثمانیہ کے لئے غالباً روس کی سابق جنگوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی، ملتوی ہوگئی،

ملکی نظم ونسق سلطان سلیم نے صلحنامہ یاسی کے بعد اپنی ساری توجہ ملکی اصلاحات پر مرکوز رکھنی چاہی، کیونکہ سلطنت کے ہر شعبہ خصوصاً محکمہ فوج کی حالت حد درجہ خراب تھی لیکن چند ہی سال کے بعد فرانس سے جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے اصلاحات کا کام جو شروع کردیا گیا تھا ملتوی ہوگیا، اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ کے نظم ونسق کی جو حالت تھی اس کا اندازہ کریسی کے صفحات سے

بخوبی ہوتا ہے، ہم اس کے بیان کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں:

پاشا سلیم کی سلطنت میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کی چھبیس ولایتیں شامل تھیں، یہ ولایتیں ایک سو تریسٹھ علاقوں میں تقسیم تھیں جن کو لوا کہتے تھے، ہر لوا میں متعدد قضا یا ضلعے ہوتے تھے، ہر قضا اپنا انتظام خود کرتا، اور وہ عموماً ایک شہر اور اس کے ماتحت علاقوں پر مشتمل ہوتا یا ایک ضلع (ناحیہ) پر جس میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قصبے یا گاؤں شامل ہوتے تھے، ولایت کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا جسے "سہ اسپ دمہ" نشان عطا ہوتا تھا[لہ]، ایسے پاشا کا منصب ایک وزیر کے منصب کے برابر ہوتا، وہ اپنی ولایت کے ایک یا چند خاص لواؤں پر براہ راست حکومت کرتا، بقیہ لواؤں کے مقامی حکام پر وہ ایک عام سیادت رکھتا تھا، بہتر لواؤں کی حکومت ایسے پاشاؤں کے سپرد تھی جو "پاشائے دونشان" تھے، انہی لواؤں اور ولایتوں کو عموماً پاشالق کہتے تھے، عام طور پر پاشاؤں کا تقرر ہر سال ہوتا تھا، لیکن اگر کوئی پاشا اتنا طاقتور ہوتا کہ اُسے برطرف کرنے میں باب عالی کو بغاوت کا اندیشہ ہوتا یا وہ دیوانِ عالی کے بعض وزراء کو رشوت کے ذریعہ سے اپنا حامی بنائے رکھتا تو ایک ہی شخص کئی کئی سال تک بلکہ کبھی کبھی تمام عمر اپنے عہدہ پر مامور رہتا، بائیس لواؤں کے پاشا مدت العمر کے لئے مقرر تھے۔

اعیان انتظام کے سلسلہ میں پاشا کی مدد کے لئے باب عالی کی طرف سے دو یا تین

لہ یہ عثمانی فوج کا نشان تھا، گھوڑے کی دم نیزہ کے سرے پر باندھ دی جاتی تھی، اور پاشاؤں کے منصب کے لحاظ سے دموں کی تعداد معین ہوتی تھی، چنانچہ درجہ اوّل کے پاشا "پاشائے سہ نشان" اور درجہ دوم وسوم کے "پاشائے دونشان" و "پاشائے یک نشان" کہے جاتے تھے،

آدمی مقرر کئے جاتے تھے، جن کا انتخاب اس ولایت (صوبہ) کے باشندے کرتے تھے، یہ لوگ اعیان کہلاتے تھے، کبھی کبھی اعیان کا عہدہ موروثی ہوتا تھا، لیکن اُس صورت میں یہ ضروری تھا کہ نئے اعیان کو اپنے مورث کی جگہ پر مقرر ہونے کے لئے باشندوں کی کثرت رائے حاصل ہو، عیسائی رعایا کے افسر اُنہی کی قوموں میں سے مقرر کئے جاتے تھے، جو ٹیکس اُن کے ضلع پر لگایا جاتا تھا اسکی تشخیص افراد پر یہی افسر کیا کرتے تھے،

باب عالی کا ضعف

گو اٹھارہویں صدی کے آخر تک سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبے ہاتھ سے نکل گئے تھے، مثلاً ہنگری، ٹرانسلوانیا، اور کریمیا میں اُسکی حکومت کا خاتمہ ہوچکا تھا، نیز بحر اسود اور بحر ازوف کے شمالی ساحلی علاقوں سے بھی اُس کا قبضہ اُٹھ چکا تھا، تاہم سلطنت کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا، وہ اس وقت بھی دنیا کی عظیم الشان سلطنتوں کا ہم پلہ تھا، لیکن اس وسیع سلطنت کے بہتیرے صوبوں پر سلطان کی حکومت محض برائے نام تھی، باب عالی کی کمزوری اور مقامی حکام کی خودسری قریب قریب ہر جگہ نمایاں تھی، عرب میں وہابیوں کا زور تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ جن پر ابھی تک اُن کا قبضہ نہ ہوا تھا، باقی سارا ملک اُنہی کے زیر تسلط تھا، مصر میں باب عالی کے حکام کا اقتدار ختم ہوچکا تھا، اگرچہ قاہرہ میں سلطان کا علم اب بھی لہرا رہا تھا اسی طرح شام میں دروزیوں اور لبنان اور فلسطین کے پہاڑی باشندوں نے تقریباً خود خودمختاری حاصل کر لی تھی، یونان کے شمالی علاقوں کے بعض فرقے بھی خودمختار ہوگئے تھے مونٹی نیگرو اور ہرزیگووینا کا بھی یہی حال تھا، مولڈیویا اور ولاچیا دولت عثمانیہ کو واپس کر دیئے گئے تھے، اگرچہ یہ دونوں صوبے باب عالی سے زیادہ حکومت روس کے زیر اثر

تھے، بغاوت اور خانہ جنگی بڑے بڑے پاشاؤں کا عام شیوہ تھا، مثلاً عکہ میں جزار پاشا نے محصول اور خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور سلطان کے آدمیوں کو جو یہ رقمیں وصول کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے قتل کرا دیا تھا، پاشائے بغداد کی خود سری بھی ایسی ہی تھی، چنانچہ کئی سال تک بغداد کی ولایت سے باب عالی کو کچھ بھی رقم وصول نہ ہوئی، وودین کا مشہور پاشا پزوان اوغلو سالوں افواج سلطانی کا مقابلہ کرتا رہا اور قریبی صوبوں پر ایک خود مختار فرماں روا کی طرح وقتاً فوقتاً حملے کیا کرتا تھا، ان کے علاوہ بہت سے دوسرے پاشاؤں کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی، ان تمام بغاوتوں اور شورشوں کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کے بہت کم حصہ میں امن و امان قائم تھا، ورنہ عام طور پر رعایا بے اطمینان اور جان و مال کی طرف سے خطرہ میں مبتلا تھی،

رعایا کے مصائب جن صوبوں کے پاشا باب عالی کے مطیع و منقاد بھی ہوتے وہاں بھی رعایا کے مصائب تھوڑے نہ تھے، پاشاؤں کا تقرر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عموماً سالانہ ہوا کرتا تھا اور وہ اکثر رشوت کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا تھا، خود امیدوار کے پاس اس جلیل القدر عہدہ کی "خریداری" کے لئے کافی روپیہ مشکل ہی سے ہوتا تھا، وہ عموماً کسی دولت مند یونانی یا ارمنی ساہوکار سے روپیہ قرض لیتا تھا، اور وہ ساہوکار حقیقۃً اس پاشا ہی کا مرتہن ہو جاتا تھا، اس کا ایک معتمد ایجنٹ پاشا کے ساتھ سکریٹری کی حیثیت سے رہا کرتا تھا، اور اکثر وہی صوبہ کا اصلی حکمراں ہوتا تھا، یہ عیسائی ایجنٹ اپنی ہم مذہب رعایا کو خصوصیت کے ساتھ بہت ستاتے تھے چونکہ پاشا کو ہر سال اپنے عہدہ کی "خریداری" کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اس لئے ساہوکار کی گرفت سے آزاد ہونا آسان نہ تھا، کبھی باب عالی

کی طرف سے یہ مطالبہ بھی ہوتا تھا کہ امیدوار سرکاری مالگذاری کی بروقت ادائگی کے لئے کسی ارمنی صراف (ساہوکار) کی ضمانت پیش کرے، اس سے ساہوکاروں کا اقتدار اور بھی بڑھ گیا تھا، اور اُن کا دست ستم رعایا پر زیادہ دراز ہوتا جاتا تھا، ان ساہوکاروں کے ایجنٹ رعایا سے مالگذاری وصول کرنے میں بیحد سختی کرتے تھے، اور وصول کردہ رقم کا زیادہ سے زیادہ حصہ خود دبا لینے کی کوشش کرتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ محاصل کا بہت تھوڑا حصہ باب عالی میں پہنچتا تھا، اعیان ولایت جن کا فرض تھا کہ اپنے ہموطنوں کو پاشا اور اُس کے لیٹرے ساتھیوں کے مظالم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اکثر خود بھی شریک جرم ہو جاتے تھے اعیان میں سے اگر کوئی ایماندار شخص ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تو پاشا اُسکا سخت مخالف ہوجاتا اور جھوٹے الزامات عائد کرکے قاضی کی عدالت کے ذریعہ اُسے تباہ وبرباد کرنے کی کوشش کرتا، اس خوف سے اعیان بھی پاشا کی مخالفت کرتے ہوئے ڈرتے تھے سالانہ مالگذاری اگر پابندی کیساتھ خزانہ سلطانی میں پہنچتی رہتی تو باب عالی کی طرف سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی کہ یہ رقم کن جائز یا ناجائز طریقوں سے وصول کی گئی ہے، البتہ اگر پاشا کے خلاف صوبہ کے باشندوں کی طرف سے پرزور شکایتیں باب عالی میں پہنچتیں اور تحقیقات کرنے پر وہ صحیح ثابت ہوتیں تو پاشا نہ صرف معزول کر دیا جاتا بلکہ اُسے قتل کی سزا بھی دیجاتی لیکن اس سزا سے رعایا کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، کیونکہ مقتول پاشا کی تمام املاک بحق سلطان ضبط کر لیجاتی، اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا پاشا مقرر کر دیا جاتا، جو مذکورۂ بالا وجوہ سے ساہوکاروں ہی کی گرفت میں رہتا، اور وہ بھی عموماً وہی طریقے اختیار کرتا جو اُس کے پیشرو نے اختیار کئے تھے، ان تعدیوں کی ایک بڑی وجہ

یہ بھی کہ پاشا اپنی ولایتوں میں شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ رہا کرتے تھے، جس کے قائم رکھنے کے لئے کافی روپیہ کی ضرورت ہوتی تھی علاوہ بریں اُنھیں فوج بھی رکھنی پڑتی تھی جس کے اخراجات بھی صوبہ ہی کے باشندے پورے کرتے تھے،

پاشا کے بعد بے اور آغا کا درجہ تھا جو اپنے اپنے علاقوں میں ویسا ہی اختیار رکھتے تھے جیسا پاشا اپنی ولایت میں رکھتا تھا، ان کے علاوہ تمام سلطنت میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے عمال تھے جنھوں نے چار چار پانچ پانچ گانوں کی مالگذاری کا ٹھیکہ باب عالی سے لے رکھا تھا، یہ لوگ رعایا سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اُن کی سختیاں بھی ساہوکاروں کے ایجنٹوں سے کم نہ تھیں،

نظام جاگیری کی ابتری سلطنت کا ضعف واختلال نظام جاگیری کی ابتری سے اور بھی ترقی کر گیا تھا، بہتیرے اہم صوبوں میں تقریبًا خودمختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں، سلیمان اعظم نے جن مضبوط بنیادوں پر نظام جاگیری کو قائم کیا تھا اور جاگیرداروں کو قابو میں رکھنے کے لئے جو ضوابط مقرر کئے تھے، وہ سب اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام سے بیشتر بدل چکے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے ہر حصہ خصوصًا ایشیائی صوبوں میں ایک بڑی تعداد خودسر جاگیرداروں کی پیدا ہوگئی تھی، جو نسلاً بعد نسلٍ اپنی جاگیروں پر قابض چلے آتے تھے، یہ جاگیردار عمومًا دَرہ بے کہے جاتے تھے یہ لوگ صرف نام کے لئے سلطان اور پاشا کے مطیع تھے، ورنہ حقیقۃً بالکل آزاد تھے اور اپنے علاقوں میں جو چاہتے کرتے، باب عالی میں اتنی قوت نہ تھی کہ ان سے اپنے احکام کی تعمیل کرا سکتا،

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ جس بدنظمی میں مبتلا تھی اس کا اندازہ سرجان ہاب ہاؤس (Sir John Hob house) کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے جو موصوف کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے، یہ بیان اگرچہ صرف ایک صوبہ البانیا سے متعلق ہے، تاہم اس سے دوسرے صوبوں کے حالات کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے، سرجان لکھتے ہیں:۔

"البانیا میں تقریباً ہر قسم کی حکومت کے نمونے ملتے ہیں، بعض ضلعوں اور شہروں پر ایک شخص کی حکومت ہے، جس کا ترکی لقب بوباشی یا یونانی لقب کپتان ہے، جو مسیحی یورپ سے لیا گیا ہے، بعض اپنے اکابر کے زیر حکومت ہیں اور بعض کسی کی حکومت تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہر شخص خود اپنے خاندان کا حاکم ہے، چند مقامات پر حکومت معرض تعطل میں ہے، اور گو بظاہر طوائف الملوکی کی حالت نہیں ہے تاہم کوئی حاکم بھی نہیں ہے، ہمارے زمانہ میں آرجیروکاسٹرو (Argyro castro) کے وسیع شہر کی یہی حالت تھی، مفصلات کے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں ہر آغا یا بے جو گویا ہمارے قدیم تعلقہ داروں کا جواب ہو سکتا ہے، ایک چھوٹا سا سردار ہے، اور گاؤں کے لوگوں پر ہر طرح کا حق رکھتا ہے، باب عالی کا احترام جس نے دولت عثمانیہ کے دور عظمت میں ملک کو چھوٹی چھوٹی پاشائیوں اور امارتوں میں تقسیم کر دیا تھا اب بہت کم رہ گیا ہے، اور مختلف علاقوں کے حدود جو اس نے قائم کئے تھے درہم برہم اور فراموش ہو چکے ہیں،"۔

مرکزی حکومت قسطنطنیہ کی برائے نام مرکزی حکومت میں صدر اعظم ملکی اور فوجی معاملات میں سب سے بڑا عہدہ دار تھا، مذہبی معاملات میں مفتی اعظم کا عہدہ سلطان کے بعد جو خلیفۃ المسلمین

بھی تھا سب سے بڑا تھا صدر اعظم کے ماتحت قائم مقام کے علاوہ جو نائب صدر کی حیثیت رکھتا تھا ایک اور وزیر تھا جس کا تعلق ملکی اور فوجی دونوں شعبوں سے تھا، امور خارجہ رئیس آفندی کے سپرد تھے، چاؤش باشی صدر اعظم کے دیوان عدالت کا نائب صدر اور وار السلطنت کی پولیس کا افسر اعلیٰ تھا، ان کے علاوہ نشانجی، دفتر دار اور متعدد دوسرے عہدہ دار تھے، ایک بہت بڑی تعداد حضوریوں اور ایسے لوگوں کی تھی جو بلا لحاظ اس امر کے کہ انہیں ضروری قابلیت ہے بھی یا نہیں سرکاری عہدوں پر مامور تھے اور سلطنت کی بدنظمی سے حتی الامکان پورا فائدہ اٹھا رہے تھے،

دیوان | دیوان سلطانی اب عموماً ڈیڑھ مہینہ میں ایک بار منعقد ہوتا تھا، صدر اعظم کے دیوان کا اجلاس نسبتۃً جلد جلد ہوا کرتا تھا اور یہ بطور دیوان عدالت کے منعقد ہوتا جس میں صدر اعظم کے علاوہ قپودان پاشا، دونوں قضاۃ عسکر، نشانجی اور دفتر دار شریک ہوتے، اہم مواقع پر تقریباً چالیس ارکان کی ایک بڑی مجلس منعقد ہوتی جس میں سلطنت کے تمام شعبوں کے اعلیٰ عہدہ دار شرکت کرتے، ناگہانی ضرورتوں کے موقع پر ارکین دیوان جب طلب کئے جاتے تو وہ مسئلۂ زیر غور پر کھڑے کھڑے مشورہ کرتے، ایسی مجلس کا نام " استادہ دیوان" تھا،

مخصوص مراعات | جماعت علما، اور خصوصاً اس کے پیشوا مفتی اعظم کی قوت بہ نسبت پہلے کے بڑھ گئی تھی، اور برابر ترقی کرتی جاتی تھی، یہی حال اوقاف کی تعداد کا تھا، اشخاص کی ذاتی جائدادوں کے علاوہ کہیں کہیں پورے پورے ضلع اور شہر مسجدوں اور دوسرے مذہبی اداروں پر وقف تھے، ان اوقاف کے متولی مقررہ زر استثنار کے سوا جس کی مقدار عموماً بہت کم ہوتی تھی ، ہر قسم کے محصولوں اور مطالبوں سے بری تھے، ایسی ہی رعایتیں اکثر ان لوگوں کو بھی حاصل تھیں جو سلطانہ والدہ اور بعض دوسرے

عالی مرتبہ اشخاص کے ذاتی علاقوں کے باشندے تھے، بہتیرے ضلعے ایسے بھی تھے جہاں عیسائی رعایا قدیم رواج یا شاہی فرمان کے بموجب بلاشرکت غیرے قابض تھی، اور جہاں کسی ترک کے لئے جاکر آباد ہونا قطعاً ممنوع تھا، سلطنت کے مختلف حصوں میں مغربی اقوام کے لوگ آباد تھے، جو باب عالی کے سایۂ عاطفت میں خود اپنے ملکی قوانین اور قنصلوں کے ماتحت آسودگی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس عام بدنظمی کے دور میں بھی کچھ حکام ایسے تھے جو نہایت لیاقت اور عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے، اسی طرح بعض پاشا بھی باوجود سخت گیر ہونے کے اپنی ولایتوں میں کامل طور پر امن وامان قائم کئے ہوئے تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ میں جو تھوڑی بہت تجارت اور خوشحالی پائی جاتی تھی وہ انہی مراعات اور ایسے ہی حکام اور پاشاؤں کی رہینِ منت تھی،

فوج

فوج جو اندرونی بغاوتوں کو فرو کرکے سلطنت میں امن وامان قائم کرنے اور اُسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ تھی، اُس کی حالت حکومت کے ہر شعبہ سے زیادہ خراب تھی، اُس کی دو قسمیں تھیں، تنخواہ دار اور غیر تنخواہ دار، تنخواہ دار فوج کا سب سے بڑا اور اہم ترین حصہ ینی چری تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں اُن کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار تھی، ینی چری دستے سلطنت کے مختلف شہروں میں رہتے تھے، جہاں اُنھوں نے ایک طرح کی فوجی حکومت قائم کر رکھی تھی، اور اسکے ساتھ ساتھ مختلف کاروبار بھی کرتے تھے، اگرچہ سرکاری رجسٹر میں ینی چری کا شمار ایک لاکھ پچاس ہزار درج تھا، لیکن ان کی تعداد حقیقۃً اتنی نہ تھی، سینکڑوں ہزاروں نام فرضی درج رجسٹر کر لئے گئے تھے، جن کی تنخواہیں باب عالی

سے وصول کی جاتی تھیں، پھر بھی ینی چری کی تعداد بہت زیادہ تھی اور جنگ و امن دونوں حالتوں میں ان کی اہمیت دوسرے فوجی دستوں سے بڑھی ہوئی تھی، وہ اپنے مذہب میں نہایت سخت تھے، اور چونکہ انھیں معلوم تھا کہ سلاطین اُن پر کامل اعتماد نہیں رکھتے، اس لئے وہ بھی ہر ایجاد اور اصلاح کو حسد اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ہمیشہ رعایا کو ستانے اور باب عالی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ رہا کرتے تھے،

ینی چری کے علاوہ توپچیوں کی فوج تھی جس کی تعداد تیس ہزار تھی، یہ بھی ینی چری دستوں کی طرح سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، ادرنہ اور قسطنطنیہ کے بوستانجی یعنی قصر سلطانی کے باغبانوں کا شمار بھی فوج میں تھا، اور ان کا مسلح دستہ سلطان کے "باڈی گارڈ" کی خدمت انجام دیتا تھا، ان کے علاوہ باقاعدہ پیدل فوج کے دوسرے دستے بھی تھے، "سپاہیوں" اور سلحداروں کے قدیم سوار دستے بھی اب تک قائم تھے، اگرچہ ان کی تعداد اور قوت میں بہت کچھ کمی ہوگئی تھی، بے ضابطہ فوج میں خصوصیت کے ساتھ وہ دستے شامل تھے جو زعامت اور تیمار کے جاگیر دار جنگ کے موقعوں پر فراہم کرتے تھے، لیکن جاگیروں میں جو فساد و انتشار پھیلا ہوا تھا، اس کی وجہ سے ان دستوں کی تعداد اور فوجی قابلیت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، اور نہ یہ یقین تھا کہ جتنے سپاہی جاگیرداروں کے علم کے نیچے جمع ہوں گے وہ آخر وقت تک جنگ میں شریک بھی رہیں گے، علاوہ بریں جنگ کے زمانہ میں کچھ نئے دستے بھرتی کر لئے جاتے تھے، جن کو میری عسکری کہتے تھے، انھیں صرف لڑائی کی مدت کی تنخواہ دیجاتی تھی، جب کسی ترکی شہر کا محاصرہ

ہوتا تو محاصرہ کے قائم رہنے تک اُس شہر کے مسلمان باشندوں کا ایک فوجی دستہ بنا دیا جاتا، اُسے یرلی نفرات کہتے تھے، ان کے علاوہ رضاکاروں کے بے ضابطہ دستے بھی تھے جو لڑائی کے موقعوں پر عثمانی لشکر کے ساتھ ہو جاتے،

سلطان کی باضابطہ اور بے ضابطہ فوجوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا صوبوں میں پاشاؤں کے فوجی دستے بھی ہوتے تھے جنھیں پاشا خود بھرتی کرتے تھے، اور جن کی تنخواہیں وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے، یہ دستے مستقل نہ تھے، بلکہ صرف جنگ کی مدت تک رکھے جاتے تھے،

ان مختلف ذرائع سے سپاہیوں کی ایک عظیم الشان تعداد علم سلطانی کے نیچے اکٹھا ہو جاتی تھی، چنانچہ جنگ کی ابتدا میں تین لاکھ آدمیوں تک غنیم کے مقابلہ میں روانہ کئے جا سکتے تھے، اور اگر میدان عثمانیوں کے ہاتھ رہتا تو ان کے علاوہ بے شمار دوسرے رضاکار فوج میں شامل ہونے کے لئے تیار ملتے، لیکن یہ انبوہ زیادہ تر بے ضابطہ دستوں پر مشتمل ہوتا جو نظم و تجربہ دونوں سے عاری ہوتے، یہ دستے بہت کم چھ مہینے سے زیادہ کے لئے بھرتی کئے جاتے، شکست کے پہلے ہی موقع پر وہ ہزاروں کی تعداد میں میدان جنگ چھوڑ کر منتشر ہو جاتے اور اپنے گھروں کو واپس جاتے ہوئے راستہ میں دشمن یا سلطان کے جو علاقے بھی ملتے بلا امتیاز اُنھیں لوٹتے جاتے، ترک سپاہی اپنی فطری شجاعت اور ملکۂ تیغ زنی کی وجہ سے اب بھی ایک خوفناک حریف تھا، اور ترک سواروں کی طوفانی یورش خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں کوئی دوسری سوار فوج گذرنے کی جرأت بھی نہ کر سکتی دشمن کے لئے اور بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی، لیکن جہاں تک فوجی ضبط و نظم کا

تعلق تھا مسیحی یورپ کی فوجوں کے مقابلہ میں عثمانی فوج بہ الفاظ نپولین محض ایک ایشائی بھیڑ تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ سوار اور پیدل دونوں فوجوں میں اسلحہ کے متعلق کوئی ضابطہ نہ تھا، اور نہ اُن کو باقاعدہ دستوں میں لڑنے کی تعلیم دیجاتی تھی، ہر سپاہی جو ہتھیار چاہتا استعمال کرتا، اور جب لڑائی شروع ہو جاتی، تو جس طرح چاہتا لڑتا، فرانسیسی جنرل بوئیر (Boyer) اُس زمانہ کے ترک سپاہیوں کی نسبت لکھتا ہے کہ "ان میں نہ کوئی ترتیب ہے نہ ثابت قدمی، وہ دستے بنا کر فوجی اصول کے مطابق چل بھی نہیں سکتے، بے ترتیب ٹولیوں میں آگے بڑھتے ہیں، اور دفعۃً غضبناک ہو کر نہایت شدت کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیتے ہیں"

بحریہ بحریہ کی حالت غازی حسن پاشا کی کوششوں کے باوجود بری فوجوں سے بھی زیادہ خراب تھی[1]

غرض اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ بحیثیت مجموعی اپنے زوال و پستی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی، سلطان سلیم کی اصلاحی کوششوں سے اُس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا، یہ صحیح ہے کہ ان اصلاحات کی مخالفت شدت کے ساتھ کی گئی، یہاں تک کہ فوج نے علانیہ بغاوت کر دی، اور سلیم کو اپنے تخت کی حفاظت کے لئے مجبوراً اصلاحات کو منسوخ کر دینا پڑا، گو اس کے باوجود وہ نہ صرف معزول کر دیا گیا، بلکہ ایک سال کے بعد قتل بھی کر دیا گیا لیکن ان اصلاحات سے جو نئی روح پیدا ہو گئی تھی وہ پھر کبھی فنا نہ ہوئی، اور دولت عثمانیہ کے آئندہ فرمانرواؤں اور مدبروں نے سلیم ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، سلطان محمود ثانی، اور

[1] کریسی جلد ۲ صفحہ ۲۹-۳۱۴۔

سلطان عبدالمجید اول کے اصلاحی کارناموں کا سنگِ بنیاد سلیم ہی کے ہاتھوں سے رکھا گیا تھا،

اصلاحات

سلیم نے اصلاحات کا آغاز صلحنامۂ یاسی کے فوراً بعد کر دیا تھا، اُس نے سلطنت کے ہر شعبہ کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ایک جامع اسکیم مرتب کی تھی، نظامِ جاگیری اس حد تک ابتر ہو چکا تھا کہ اُسے منسوخ کر دینا ہی مناسب خیال کیا گیا، تجویز یہ تھی کہ موجودہ جاگیرداروں کے مرنے پر اُن کی جاگیریں (زعامت اور تیمار دونوں) ضبط کر لی جائیں اور آیندہ ان جاگیروں کی آمدنی سرکاری خزانہ میں جمع کیجائے اور اس سے ایک نئی فوج کے مصارف ادا کئے جائیں، ولایتوں کی اصلاح نظم ونسق کے لئے یہ قرار پایا کہ پاشاؤں کے اختیارات کم کر دیئے جائیں ہر ولایت کا حاکم تین سال کے لئے مقرر کیا جائے، اور اس مدت کے خاتمہ پر اُس کا دوبارہ تقرر صرف باشندگانِ ولایت کی رضامندی سے کیا جائے، ولایتوں سے متعلق ایک اور اصلاح بھی تجویز کی گئی جس سے باشندوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا وہ یہ کہ مالگذاری وصول کرنے کے لئے جو ٹھیکے لوگوں کو دیئے جاتے ہیں وہ سب موقوف کر دیئے جائیں اور آیندہ تمام مالگذاری صرف سرکاری خزانہ کے عمال کے ذریعہ سے وصول کیجائے، مرکزی حکومت میں صدرِ اعظم کے اختیارات کسی قدر محدود کر دیئے گئے اور تمام اہم مسائل پر دیوان سے مشورہ کرنا اُس کے لئے ضروری قرار دیا گیا،

تعلیم

سلیم نے رعایا کے ہر طبقہ میں تعلیم پھیلانے کی کوشش کی اور تمام سلطنت میں مدرسے قائم کئے، اسکی سرپرستی سے یونانیوں نے خاص طور پر فائدہ اُٹھایا، اور اپنے قدیم

مدرسوں کو مستحکم کرنے کے علاوہ بہت سے جدید مدرسے بھی قائم کرلئے، لیکن انکی انقلاب پسند جماعت نے مدرسوں اور مطبعوں کے ذریعہ سے اپنی قوم میں دولت عثمانیہ کے خلاف شورش برپا کرنے کی کوشش کی، باوجود اس کے سلیم نے یونانی مدرسوں اور چھاپہ خانوں کو بند نہیں کیا، بلکہ قسطنطنیہ میں ایک مطبع قائم کرکے یونانی پادریوں کے ذریعہ سے اس فتنہ کا سدباب کرنا چاہا، سلطنت عثمانیہ میں پہلا مطبع سلطان احمد ثالث کے عہد میں قائم ہوا تھا، سلیم نے علوم کی نشر واشاعت کے لئے متعدد مطبعے قائم کئے، اس کے حکم سے معنا فیات (Tactics) اور استحکامات کے فن کی بہت سی کتابوں کے ترجمے فرانسیسی زبان سے ترکی زبان میں کرکے شائع کئے گئے، اس نے عثمانیوں کی سیاسی تربیت کی غرض سے یورپ کے خاص خاص پایہ تختوں میں مستقل سفارت خانے قائم کرنے چاہے، چنانچہ لندن، پیرس، ویانا اور برلن میں ترکی سفارتیں قائم ہوگئیں، اور سفیروں کے ساتھ عثمانیوں کی ایک جماعت روانہ کی گئی، لیکن حکومت روس نے بعض حیلوں سے ترکی سفارتخانہ کو اپنے یہاں قائم نہ ہونے دیا،

فوج سلیم نے سب سے زیادہ توجہ فوجی اور بحری اصلاحات پر کی، ینی چری کی خودسری پر نظر رکھتے ہوئے وہ خوب جانتا تھا کہ مذکورۂ بالا اصلاحات کے جاری کرنے اور سلطنت کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک منظم اور روفادار فوج کی کتنی ضرورت ہے، پیٹر اعظم کی مثال بھی ہمیشہ اس کے پیش نظر تھی جس نے یوروپین فوجوں کے نمونہ کے مطابق جدید فوجیں تیار کرکے اندرونی اور بیرونی دونوں دشمنوں کو شکست دیدی تھی، ینی چری کی سرکشی روزبروز بڑھتی جارہی تھی،

وہ سلطنت کے امن و امان کے لئے ایک مستقل خطرہ تھے، وہ اپنے نظام میں کسی اصلاح کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، یہی وجہ تھی کہ سلیم کو ایک ایسی فوج قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جو یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق مرتب کی گئی ہو، اور جس پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکے، گذشتہ جنگ میں جو قیدی گرفتار ہو کر آئے تھے، اُن میں ایک ترک بھی تھا جو مدت سے روسی فوج میں ملازم تھا، اور ترقی کر کے لفٹننٹ کے عہدہ تک پہنچ گیا تھا، اُس کا نام عمر آغا تھا، صدر اعظم یوسف پاشا اکثر اُس سے روسیوں کے فوجی نظام پر باتیں کیا کرتا تھا، چنانچہ عمر آغا کی خواہش پر اُسنے عثمانیوں کا ایک دستہ یوروپین طرز پر مرتب کئے جانے کی اجازت دیدی، عمر آغا نے اس دستہ کو یوروپین طریقہ سے مسلح کر کے تربیت دینا شروع کیا، جنگ کے خاتمہ پر جب یوسف پاشا قسطنطنیہ کو واپس ہوا تو عمر آغا اور اُس کے نئے دستہ کو بھی ساتھ لایا اور اُن کے لئے قسطنطنیہ سے قریب ایک گاؤں میں چھاؤنی بنوا دی، جب سلیم کو اس کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ایک روز خود جا کر اس دستہ کا معائنہ کیا، اور دیکھتے ہی عثمانی فوجوں پر اُسکی برتری محسوس کر لی، اُس نے نہ صرف اُسے قائم رکھا، بلکہ دیوان میں یہ تجویز پیش کی کہ ینی چری میں بھی یہ جدید نظام جاری کر دیا جائے ینی چری نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے سلیم کو بالآخر وعدہ کرنا پڑا کہ نظام جدید کی پابندی ینی چری پر عائد نہ کیجائے گی، تاہم عمر آغا کا دستہ بدستور قائم رکھا گیا،

۱۷۹۶ء میں جنرل دوبائے (Dubayet) جمہوریہ فرانس کے سفیر کی حیثیت سے قسطنطنیہ آیا، وہ سلطان کو نذر دینے کے لئے متعدد توپیں، اور

چند فرانسیسی توپچی اور انجنیئر بھی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا تاکہ عثمانی توپچی اُن کی مدد سے یورپ کے جدید حربی اصولوں سے واقف ہو جائیں اور اپنے سلاح خانوں اور توپ ڈھالنے کے کارخانوں میں ضروری اصلاحات جاری کر سکیں، اس کے ساتھ فرانسیسی پیدل اور سوار فوجوں کے بہت سے افسر بھی تھے جنھیں وہ "سپاہی" (سوار) اور ینی چری (پیدل)، فوجوں کی تنظیم و تربیت کے لئے لایا تھا، سلیم نے ان تحفوں کو بہت خوشی کے ساتھ قبول کیا، اور ان سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی، چنانچہ توپخانوں میں فرانسیسی توپچیوں کی مدد سے بہت کچھ اصلاحیں کی گئیں اور سواروں کا ایک دستہ بھی یوروپین طرز پر مسلح اور مرتب کر لیا گیا، لیکن ینی چری نے برہم ہو کر یورپ کے اسلحہ اور جنگی طریقوں کے اختیار کرنے سے قطعی انکار کر دیا، مجبوراً فرانسیسی افسروں نے اُسی فوج کو تعلیم دینے پر قناعت کی جو عمر آغا خاں کی تربیت میں قائم کی گئی تھی، قسطنطنیہ پہنچنے کے چند ہی مہینوں کے بعد جنرل دوبابے کا انتقال ہو گیا اور اُس کے بہتیرے افسر فرانس واپس چلے گئے، لیکن قپودان کوچک حسین پاشا نے نظام جدید[۱] کی قدر و اہمیت کا اندازہ کر کے کچھ افسروں کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا اور اونچی اونچی تنخواہوں کا لالچ دیکر مسلمانوں کو عمر آغا کی فوج میں داخل ہونے کی ترغیب دی۔ سنہ ۱۷۹۸ء میں جب فرانس اور دولت علیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو اس نئی فوج کی تعداد چھ سو تھی،

بحریہ کوچک حسین سنہ ۱۷۹۲ء میں قپودان پاشا مقرر ہوا تھا، وہ بارہ سال تک اس عہدہ پر مامور رہا، اور اس مدت میں اُس نے ترکی بیڑہ اور سلاح خانہ کی نئی تنظیم کی، اُس نے فرانسیسی اور انگریزی بیڑوں کے نمونہ پر عثمانی بیڑہ کو از سر نو منظم کیا

[۱] "نظام جدید" اُس نئی فوج کا بھی نام تھا جو یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق مرتب کی گئی تھی اور سلیم کی اصلاحات کا مجموعی نام بھی "نظام جدید" تھا،

اور بہت سے نئے جنگی جہاز بنوائے، اُس نے سوئڈن اور فرانس کے ماہر انجینیروں کی ایک بڑی تعداد بلوائی اور اُن کی مدد سے عثمانیوں کو جدید طرز کی توپیں ڈھالنا سکھائیں، سلطان عبدالحمید اوّل کے عہد میں برن دی توت کے زیر نگرانی ایک مدرسہ توپچیہ قسطنطنیہ میں قائم ہوا تھا، کوچک حسین پاشا نے اُسے نئے سرے سے منظم کیا اور ایک جدید بحری مدرسہ قائم کیا، ان مدارس کے طلبہ کیلئے اُس نے فن استحکامات سے متعلق فرانسیسی پروفیسروں اور دوسرے ماہرین فن کی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں طبع کرائے، اور مدرسہ توپچیہ میں ایک کتبخانہ قائم کیا، جسمیں وہ تمام اہم کتابیں جمع کیں جو یورپ میں جدید فنونِ جنگ اور ریاضیات پر لکھی گئی تھیں، اس کتبخانہ میں چارسو کتابیں تھیں، جنمیں بہترین فرانسیسی مصنفین کی کتابوں کا انتخاب تھا، فرانسیسی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا، جو بقول ژون کنیر "اُس زمانہ کے لحاظ سے نہایت بیباکانہ بدعت تھی" حسین پاشا نے بحری ڈاکوؤں کے استیصال کی بھی پوری کوشش کی، جنھوں نے بحر ایجین کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، اُس نے اپنے تقرر کے پہلے ہی سال میں لمبرو کنزیانی (Lambro Canziani) مشہور بحری ڈاکو کے بیڑہ کا قلع قمع کر دیا، اسکی سرگرمیوں سے ان ڈاکوؤں کی قوت بہت کچھ کمزور ہو گئی۔

نپولین اسی درمیان میں انقلاب فرانس کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے، اور فرانسیسی فوجیں حریت، مساوات اور اخوت کے نعرے بلند کرتی ہوئی سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، چند سال کے اندر نپولین بونا پارٹ نے وینس کی قدیم جمہوریہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، اور پھر اپنی فاتح فوج کے ساتھ

آسٹریا کی جانب بڑھا، لیکن سلیم نے (دولت عثمانیہ کے قدیم دشمنوں (وینس وآسٹریا) کے خلاف اُس کے روایتی حلیف (فرانس) کے جارحانہ اقدام سے فائدہ اٹھانے کی مطلق کوشش نہیں کی بلکہ اپنی توجہ تمامتر ملکی اصلاحات کی جانب رکھی، شاہ فرانس لوئی شانزدہم کے قتل سے وہ ضرور متاثر ہوا، لوئی کے ساتھ اُسکے ذاتی تعلقات تھے، چنانچہ تخت نشینی سے پہلے بھی وہ اس سے خط وکتابت کیا کرتا تھا، پھر بھی اپنی سلطنت کی اندرونی حالت پر نظر رکھتے ہوئے نیز اُن اصلاحات کی تکمیل کے لئے جو اُس نے شروع کر دی تھیں، سلیم کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ یورپ کے اس ہنگامہ رستخیز سے الگ رہے، مگر اُس کی یہ کنارہ کشی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی، ۱۷۹۷ء میں صلحنامہ کیمپو فورمیو (Campo Formio) کے رو سے جو آسٹریا اور جمہوریہ فرانس کے درمیان طے ہوا جمہوریہ وینس کا خاتمہ ہو گیا، خود وینس اور اُس کے اطالوی مقبوضات کا ایک بڑا حصہ آسٹریا کے ہاتھ آیا، اور بحر اڈریاٹک کے مقبوضات، جزائر آئیونین اور وہ شہر جو بحر اڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر وینس کی ملک تھے، جمہوریہ فرانس کے قبضہ میں آئے، اسطرح فرانسیسی علاقے سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے بالکل متصل ہو گئے، نپولین کی حیرت انگیز فتوحات نے جمہوریہ فرانس کے حوصلے بہت بڑھا دیئے تھے، چنانچہ جزائر آئیونین کے حاصل کرنے کے بعد اُسے عثمانی مقبوضات کی طرف بڑھنے کا خیال پیدا ہوا، اور سلطنت عثمانیہ کے ضعف و اختلال نے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچائی، بہتیرے صوبوں کے پاشا مثلاً علی پاشا والی یانینہ، عثمان پاشا (پزوان اوغلو) والی ودین، اور جزار پاشا، والی عکا، قریب قریب خود مختار ہو چکے تھے، مصر محض نام کے لئے سلطان کے زیر حکومت تھا، ورنہ

اصلی حکومت مملوکوں کی تھی، باب عالی کی طرف سے جو پاشا وہاں مقرر ہوتا تھا، اسے حقیقۃً مملوکوں کے مقابلہ میں کوئی اختیار حاصل نہ تھا، سرویا اور یونان بغاوت کے جذبات سے لبریز تھے اور صرف موقع کا انتظار کر رہے تھے، سارے یورپ کی طرح فرانس کی مجلس عاملہ (ڈائرکٹری) کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ بہت قریب ہے اور وہ اس سلطنت کی تقسیم میں سب سے بڑا حصہ لینے کا قصد کر رہی تھی، اسی غرض سے نپولین نے اپنے فرستادے ان میں سے کئی صوبوں خصوصاً یونان میں روانہ کئے تھے، اور وہاں کے باشندوں کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر وہ دولت علیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کریں گے تو فرانسیسی فوج اُن کی مدد کرے گی، چنانچہ طولون میں پینتیس ہزار آزمودہ کار فرانسیسی سپاہیوں کی ایک فوج تیار کی گئی، جنگی جہازوں کے علاوہ سواری اور باربرداری کے تین سو جہاز تھے، عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ حملہ سلطنت عثمانیہ کے کسی یورپین صوبہ پر ہوگا، لیکن آخر وقت میں نپولین کی تحریک سے حکومت فرانس نے یہ فیصلہ کیا کہ مصر کی راہ سے انگلستان پر ضرب لگائی جائے، نپولین کو یہ اُمید تھی کہ وہ مصر کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان پر حملہ کریگا، اور سلطنت برطانیہ کو برباد کر کے فرانس کے لئے ایک عظیم الشان مشرقی سلطنت قائم کریگا، لیکن مصر دولت عثمانیہ کے زیر حکومت تھا، اور مملوکوں کی سرکشی اور عملی خود مختاری کے باوجود سلطان کی فرماں روائی سے آزاد نہیں سمجھا جاتا تھا، دولت عثمانیہ اور فرانس کے درمیان دوستانہ تعلقات مدت سے قائم تھے، اس لئے مصر پر حملہ کرنے کا کوئی معقول عذر فرانس کے پاس نہ تھا، مگر نپولین باب عالی کی کمزوری اور مملوکوں کی سرکشی سے پوری طرح واقف تھا، اس نے مصر

پہنچ کر اپنی مہم کا مقصد یہ ظاہر کیا کہ میں سلطان کی حمایت اور اہلِ مصر کو مملوکوں کے مظالم سے نجات دلانے آیا ہوں، اسی مصلحت سے اُس نے دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی اعلانِ جنگ نہیں کیا،

نپولین کو حکومت فرانس کی طرف سے یہ خفیہ احکام ملے تھے کہ مصر پر قبضہ کر کے جہاں تک ممکن ہو انگریزوں کو اُن کے ایشیائی مقبوضات سے نکال دیا جائے، بحر احمر پر فرانسیسی تسلط مکمل طور پر قائم کر دیا جائے، اور مالٹا پر قبضہ کر لیا جائے، ان احکام کے علاوہ خود نپولین کی ذاتی اسکیم یہ تھی کہ ایشیا میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے کے بعد یونانیوں اور دوسرے عیسائی فرقوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف اُبھارے، ترکوں کو شکست دیکر قسطنطنیہ پر قبضہ کرے، اور پھر وہاں سے یورپ پر حملہ آور ہو،

مالٹا ۱۹ مئی ۱۷۹۸ء کو نپولین نہایت خاموشی کے ساتھ طولون سے روانہ ہوا، اُس کے ساتھ فرانس کے علماء اور ماہرینِ فن کی ایک جماعت بھی تھی جو مصر کے مطالعہ اور وہاں کے حالات کی اصلاح و ترقی کے اسباب پر غور کرنے کے لئے اس مہم میں شریک کی گئی تھی، نپولین نے مہم کے اصلی مقصد کو یہانتک خفیہ رکھا کہ فوج کو بھی اطلاع نہ دی، طولون سے روانگی کے تین ہفتہ بعد فرانسیسی بیڑا مالٹا پہنچا، مبارزین سینٹ جان کی وہ شجاعت جس نے سلیمان اعظم جیسے فاتح کے حملہ کو بھی ناکام رکھا تھا، دو صدیوں کے اندر عیش و عشرت کی نذر ہو چکی تھی، باہمی اختلافات نے اُن کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا تھا، چنانچہ اُنھوں نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیئے اور یہ اہم جزیرہ سلطنت فرانس میں شامل کر لیا گیا،

اسکندریہ | مالٹا کی فتح کے بعد نپولین نے جزیرہ کریٹ کا رخ کیا، مگر یہ معلوم کرکے کہ انگریز امیر البحر نلسن (Nelson) اس کے تعاقب میں ہے، وہ فوراً اسکندریہ کی طرف روانہ ہوگیا، اور اب پہلی بار اس نے فوج کو اس کی منزلِ مقصود سے آگاہ کیا، اس نے اپنے اعلان میں فوج کو یوں مخاطب کیا:-

"سپاہیو! تم ایک ایسی فتح کے لئے جا رہے ہو جس کے اثرات دنیا کی تہذیب اور تجارت پر بے حساب ہوں گے، تم انگلستان پر موت کی ضرب لگانے سے پہلے ہی ایک نہایت یقینی اور کاری ضرب لگاؤ گے، .... ممالیک جو تمامتر انگریزی تجارت کے حامی ہیں تمہارے پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد نیست و نابود ہو جائیں گے"

نلسن کو جب طولون سے فرانسیسی بیڑے کی روانگی کا علم ہوا تو یہ قیاس کرکے کہ نپولین مصر پر حملہ کرنا چاہتا ہے، خود بھی اپنے جنگی جہازوں کے ساتھ اسکندریہ کی طرف روانہ ہوگیا، لیکن وہاں ۲۸ جون کو پہنچنے کے بعد اُسے اطلاع ملی کہ فرانسیسی بیڑے کا کہیں پتہ نہیں، چنانچہ مایوس ہو کر وہ سسلی کو لوٹ آیا، اس کی واپسی کے دو ہی روز بعد یکم جولائی کو نپولین اسکندریہ پہنچا، وہاں کا مختصر ترکی دستہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کرسکا، ۱۷ محرم سنہ ۱۲۱۳ھ مطابق ۲ جولائی سنہ ۱۷۹۸ء کو نپولین نے اسکندریہ پر قبضہ کرلیا،

اسکندریہ پر حملہ کرنے کا عذر نپولین اس کے سوا کچھ نہ پیش کرسکا کہ مصر پر اصلی حکومت مملوکوں کی ہے اور وہ انگریزی تجارت کے حامی ہیں، نیز یہ کہ انھوں نے فرانسیسی تاجروں کے ساتھ بدسلوکیاں کی ہیں، بہرحال اس نے باب عالی کو

یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مصر کا حملہ حقیقۃً ایک دوستانہ فعل ہے، کیونکہ اس سے مملوکوں کی قوت کا خاتمہ ہو جائیگا جنھوں نے عثمانی اقتدار کو محض نام کے لئے باقی رکھا ہے۔ لیکن نپولین کی خاص کوشش یہ تھی کہ مصر کے عام باشندوں کی حمایت حاصل کیجائے چنانچہ اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مسلمان باشندوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کیجائے۔ اُسنے ایک اعلان شائع کیا جسمیں مملوکوں کے مظالم کا ذکر کرنے کے بعد اپنے کو اہلِ مصر کا حامی اور مددگار ثابت کرنا اور انھیں اس امر کا یقین دلانا چاہا کہ فرانسیسی مہم کا مقصد صرف یہ ہے کہ مصر کو مملوکوں کے پنجہ سے نجات دلائی جائے۔

"ایک طویل مدت سے جارجیا اور کوہ قاف میں خریدے ہوئے غلاموں کا گروہ دنیا کے سب سے زیادہ خوبصورت مقام کو اپنے مظالم کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہے، لیکن خداوند عالم جس کے اختیار میں سب کچھ ہے اُن کی سلطنت کے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، اے اہلِ مصر! اُنھوں نے تم سے بیان کیا ہے کہ میں تمھارے مذہب کو برباد کرنے کی غرض سے آیا ہوں، اُن کی باتوں کا یقین نہ کرو، اُنھیں یہ جواب دو کہ میں تمھارے حقوق کو دوبارہ قائم کرنے اور غاصبوں کو سزا دینے کے لئے آیا ہوں اور یہ کہ خدا، اُس کے رسولؐ اور قرآن کی جتنی عزت مملوک کرتے ہیں اُس سے زیادہ میں کرتا ہوں ...... نہایت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ہمارا ساتھ دیں گے، اُن کی خوشحالی اور مرتبہ میں ترقی ہوگی ...... لیکن سخت افسوس ہے اُن کی حالت پر جو مملوکوں کے ساتھ ہوکر

---

[1] سوانح نپولین اول از ڈاکٹر ہالینڈ روز ص۱۸۰ مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء (The Life of Napoleon I by J. Holland Rose)

ہم سے لڑیں گے، ...... ہر شخص مملوکوں کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کریگا، اور پکارے گا:۔ بزرگی اور عظمت ہے سلطان کے لئے! بزرگی اور عظمت ہو فرانسیسی فوج کے لئے جو سلطان کی حلیف ہو، مملوکوں پر لعنت اور اہلِ مصر کیلئے خوش قسمتی!"

نپولین نے مصریوں کے اطمینان کے لئے اٹلی اور مالٹا کی فتوحات کا بھی حوالہ دیا:۔"کیا ہم نے پوپ کو برباد نہیں کر دیا جو لوگوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کا حکم دیتا تھا؟ کیا ہم نے مبارزینِ مالٹا کو برباد نہیں کر دیا اسلئے کہ وہ احمق یہ خیال کرتے تھے کہ مسلمانوں سے جنگ کرنا خدا کی مرضی کے مطابق ہو؟"

قاہرہ کی مہم

اسکندریہ میں ایک فوجی دستہ جنرل کلیبر (Kleber) کے زیرِ قیادت متعین کر کے نپولین ایک ہفتہ کے اندر قاہرہ کی طرف روانہ ہو گیا، ریگستان میں دھوپ کی شدت فرانسیسی فوجوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھی، پیاس کی تکلیف سب سے زیادہ تھی، راستہ کے کنوؤں کو عربوں نے پتھر کے ٹکڑوں سے پاٹ دیا تھا، اور تھوڑا سا پانی بھی بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا، نتیجہ یہ تھا کہ ایک ایک گھونٹ پانی کے لئے سپاہی آپس میں لڑ بیٹھتے تھے، اُس فوج کا ایک اعلیٰ افسر بیان کرتا ہے کہ ایک گلاس پانی سونے کی تول بکتا تھا، سپاہیوں کے علاوہ افسروں میں بھی اس مہم کے شدائد سے سخت برہمی تھی، ان حالات کے باوجود خود نپولین کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ پیدا ہوا اور نہ اُس کے بشرے سے خفیف سی پریشانی بھی ظاہر ہوتی تھی، ایک روز ایک فوجی دستہ کے جس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا، ایک سپاہی نے بے خوف ہو کر نپولین سے یہ سوال کیا کہ "کیا آپ اسی طرح ہم لوگوں کو ہندوستان لیجائیں گے؟" نپولین نے فوراً

ص ۱۴۹

جواب دیا کہ "نہیں، میں تم جیسے سپاہیوں کے ساتھ اس مہم پر روانہ نہ ہونگا"[1]
سوال کرنے والا اور اُس کے ساتھی اس جواب سے پانی پانی ہوگئے،

جنگ اہرام | مراد بے اور ابراہیم بے نے جو مملوکوں کے سردار اور حقیقۃً مصر کے اصلی حکمراں تھے آگے بڑھکر فرانسیسی فوج کو روکنا چاہا، پہلے آٹھ سو مملوک سواروں کا ایک دستہ سامنے آیا جسے نپولین نے آسانی کے ساتھ منتشر کر دیا، لیکن جب وہ قاہرہ کے قریب پہنچا تو ۷ر صفر ۱۲۱۳ھ مطابق ۲۱ر جولائی ۱۷۹۸ء کو انبابیہ کے مقام پر مراد بے سے مقابلہ پیش آیا، جو دس بارہ ہزار سواروں کو لیکر پایہ تخت کی حفاظت کے لئے مستعد کھڑا تھا، اس معرکہ میں جو جنگ اہرام کے نام سے مشہور ہے (کیونکہ اہرام مصر سامنے نظر آرہے تھے) مملوکوں نے ایسی شجاعت دکھائی کہ فرانسیسی متحیر رہ گئے، لیکن اُن کی حیرت انگیز شجاعت گولیوں کی باڑھ کے سامنے کارگر نہ ہوسکی علاوہ بریں فرانسیسی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی، اور یہ سب نہایت آزمودہ کار سپاہی تھے، برخلاف اس کے مراد بے کی فوج میں بارہ ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے، جن میں مملوک صرف پانچ ہزار تھے، باقی نوآموز فلاحین تھے، مراد بے کی شکست سے قاہرہ کا راستہ صاف ہوگیا، اور چھ روز بعد نپولین نے اُس پر باضابطہ قبضہ کر لیا، دو ہفتہ تک قاہرہ میں قیام کرنے کے بعد وہاں کے ضروری انتظامات سے فارغ ہوکر، نپولین ابراہیم بے کے تعاقب میں روانہ ہوا، اور اُسے شکست دیکر شام کی طرف بھگا دیا،

جنگ نیل | اس درمیان میں نلسن یہ معلوم کرکے کہ فرانسیسی بیڑہ مصر پہنچ چکا ہے اسکندریہ

[1] ہالینڈ روز صفحہ ۱۶۹.

کی طرف روانہ ہوگیا تھا، اور پہنچتے ہی، ارصفر مطابق یکم اگست کو اُس نے فرانسیسی جہازوں پر جو خلیج ابوقیر میں لنگر انداز تھے حملہ کر دیا، یہ لڑائی تاریخوں میں جنگ نیل کے نام سے مشہور ہے، نلسن کو شاندار فتح حاصل ہوئی، فرانسیسی امیرالبحر مارا گیا، اُس کے تقریباً تمام جہاز برباد ہوگئے یا گرفتار کر لئے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ نپولین کی فوج جو قاہرہ پر قابض تھی فرانس سے بالکل منقطع ہوگئی، نپولین کو اس حادثہ کی اطلاع اُس وقت ہوئی جب ابراہیم بے کو شکست دینے کے بعد ۱۱ر اگست کو وہ قاہرہ واپس آیا، اُس نے یہ خبر سُن کر صرف اس قدر کہا، "اب ضروری ہو کہ یا تو ہم انہی ملکوں میں رہجائیں یا قدما کی طرح شاندار طریقہ سے یہاں سے نکلیں، انگریز ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اپنے قصد و ارادہ سے زیادہ بڑے کارنامے کر دکھائیں"

قیام مصر | نپولین نے یہ دیکھکر کہ موجودہ صورت حال میں فرانس سے کمک نہیں پہنچ سکتی اور مصر میں مجبوراً قیام کرنا پڑیگا، ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے اُس کی فوج کو خارج کی مدد کی ضرورت باقی نہ رہی، طولون سے اُس کے ساتھ مختلف علوم و فنون کے اہل کمال آرہے تھے، چنانچہ اُن میں سے بعض نے سامان رسد کی دشواریاں دور کرنے کے لئے بڑے پیمانہ پر غلہ کی کاشت شروع کی اور غلہ پیسنے کے لئے بڑی بڑی پون چکیاں قائم کیں، بعض نے انگور کے باغ لگائے اور سپاہیوں کے لئے ایک قسم کی جو کی شراب تیار کی، آلات اور مشینوں کی فراہمی کے لئے کارخانے قایم کئے گئے، زمین سے خام شورہ نکالا گیا اور شورہ کے کارخانوں میں فوج کی ضروریات کے لئے کافی بارود تیار کی گئی،

علمی سرگرمیاں | علمی سرگرمیوں کا بھی یہی حال تھا، نپولین نے ایک کیمیاوی

معمل قائم کیا جہاں فرانس کے مشہور علماے سائنس برتھولے (Bertholett) اور مونج (Monge) تجربے کیا کرتے تھے، نپولین ان تجربوں کو دیکھنے کے لئے خود بھی ہفتہ میں کئی بار معمل میں جایا کرتا تھا، اُس نے علماے سائنس کی ایک مجلس "ادارۂ مصریہ" کے نام سے قائم کی، جس کا افتتاح ۲۳ر اگست ۱۷۹۸ء کو ایک مملوک سردار کے محل میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ کیا گیا، مونج اس مجلس کا صدر اور نپولین نائب صدر تھا، اس مجلس میں متعدد علمی شعبے تھے، نپولین نے اپنا نام شعبۂ ریاضیات میں درج کرایا، ارکانِ مجلس کے کارنامے علمی تجربات تک محدود نہ تھے، بلکہ اُن کی سرگرمیوں کا کافی حصہ مصر کے آثار قدیمہ، وادی نیل کی پیمائش اور ارضیاتی تحقیقات پر مشتمل تھا[۱]، نپولین نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "اصلی اور واحد فتوحات جن پر بعد میں افسوس اور پشیمانی نہیں ہوتی وہی ہیں جو جہالت پر حاصل کی جائیں"، مصر کے چندروزہ قیام میں اُس نے جو کچھ کر دکھایا وہ اس کے تمام کارناموں میں اس قول کی بہترین شرح ہے،

مصریوں سے میل جول نپولین کی ان سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مصر میں گویا مستقل طور پر قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، ملکی باشندوں سے میل جول بڑھانے کے لئے اُس نے اُن کے رسم ورواج بھی اختیار کرلئے، اور اپنی قوم کے بعض رواج ان میں جاری کئے، وہ کبھی کبھی مصری لباس بھی پہنا کرتا تھا، اس نے مدرسے قائم کئے، سڑکوں اور نہروں کی مرمت کرائی، اور نوجوان مصری عورتوں سے اپنی سپاہیوں کی شادی کردی، فرانسیسی سپاہی بھی نئے ماحول سے جلد مانوس ہوگئے،

[۱] ہالینڈ روز ص ۱۹۴-۹۵،

اور قاہرہ کے عیش و عشرت میں وطن کی یاد بھول گئے،

قاہرہ کی بغاوت

لیکن نپولین اگر یہ سمجھا تھا کہ ان کارروائیوں سے اہلِ مصر فرانسیسی حکومت کو خوشی کے ساتھ قبول کرلیں گے تو اس کی غلط فہمی بہت جلد دور ہوگئی ۲۱ اکتوبر ۱۷۹۸ء کو قاہرہ میں ایک زبردست بغاوت نمودار ہوئی جس میں بہت سے فرانسیسی مارے گئے تاہم محبانِ وطن کی یہ کوشش بالکل ناکام رہی، اُن سے نہایت خوفناک انتقام لیا گیا، فرانسیسی مورخ ارنسٹ ہامیل (Ernest Hamel) لکھتا ہے:۔

"یہ بغاوت ہولناک، وحشیانہ اور ظالمانہ طریقہ سے فرو کی گئی، دستے قائم کرکے فوج باغیوں پر ٹوٹ پڑی اور انھیں سچ مچ ذبح کرکے ڈال دیا، بوناپارٹ نے حکم دیدیا تھا کہ تمام مسلح باشندے جو سڑک پر پائے جائیں قتل کردیئے جائیں، باغیوں نے جلد اطاعت قبول کرلی، اگرچہ اُن کے پانچ ہزار سے زیادہ آدمی قتل ہوگئے، فاتح (نپولین) کی رحمدلی کی بہت کچھ تعریف کی گئی ہے لیکن اس رحمدلی کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے، ایک مقررہ مدت تک تیس قیدی روزانہ قتل کئے جاتے رہے، مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں دہشت بیٹھ جائے، ایک روز صبح کو فرانسیسی دستے خچروں کا ایک جھنڈ جن پر بورے لدے ہوئے تھے ہنکاتے ہوئے قاہرہ میں لائے، اُس وقت وہاں آدمیوں کا بڑا اژدحام تھا، اور ہر شخص یہ معلوم کرنے کا مشتاق تھا کہ بوروں میں کیا چیز ہے، سپاہیوں نے بیک وقت تمام بورے کھول ڈالے اور اُن کے اندر سے سیکڑوں سر برآمد ہوئے ...... آخر ان بدنصیبوں کا جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانا

چاہتے تھے جسے دشمن نے حملہ کرکے برباد کرڈالا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ریگستان کے سیاہ باشندے یوروپین تہذیب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کریں گے[۵۱]"

اعلانِ جنگ | پنولین کے حملہ کے وقت مصر اگرچہ عملاً مملوکوں کے زیر تسلط تھا، تاہم دولت عثمانیہ کی سیادت بدستور تسلیم کیجاتی تھی، اور وہاں کا حاکم اعلیٰ باب عالی ہی کا فرستادہ پاشا ہوا کرتا تھا، چونکہ سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت قابلِ اطمینان نہ تھی اور سمندر کی راہ سے فرانسیسی فوجوں کی کمک روکی نہیں جاسکتی تھی، اس لئے سلیم کو اعلانِ جنگ کرنے میں کسی قدر تامل تھا لیکن مصر کی فتح سے ہندوستان پر بھی زد پڑتی تھی، اور نپولین کی "مشرقی سلطنت" کی اسکیم اب مخفی نہ رہ گئی تھی، اس لئے انگلستان نے اس خطرہ کے سدباب کے لئے باب عالی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، اسی طرح روس نے بھی فرانس کی دشمنی میں دولت علیہ سے اتحاد کرنے کی خواہش کی، اور اپنا جنگی بیڑہ اُسکی مدد کے لئے پیش کیا، چنانچہ سلطنت عثمانیہ، انگلستان اور روس کے درمیان ایک اتحاد قائم ہوگیا، اور باب عالی نے ۲۱ ربیع الاول ۱۲۱۳ھ (۲ ستمبر ۱۷۹۸ء) کو جمہوریہ فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا، اس کے بعد روسی اور ترکی بیڑوں نے دردانیال سے نکل کر جزائر آیونین پر قبضہ کرلیا جو معاہدہ کیمپوفورمیو کے رو سے سلطنت فرانس میں شامل کرلئے گئے تھے، روس اور دولت عثمانیہ کا یہ پہلا اتحاد تھا جو ایک متفقہ جنگ کے لئے کیا گیا تھا، دونوں حلیف ابتک ایک دوسرے کے شدید ترین دشمن تھے،

شام | سلیم نے شام اور جزیرہ روڈس میں فوجوں کی تیاری کا

---

۵۱ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۱۲ صفحہ ۴۶۷،

حکم دیا، شام کی فوج کا سپہ سالار جزار پاشا مقرر ہوا جو اپنی سابق خودسری کے باوجود اُس وقت دولت عثمانیہ کی خدمت کے لئے آمادہ ہوگیا تھا، تجویز یہ تھی کہ شامی فوج صحرا کو عبور کرکے فرانسیسیوں پر مصر میں حملہ آور ہو، اور اُسی وقت مصطفیٰ پاشا روڈس کی فوج کے ساتھ خلیج ابوقیر کی طرف سے حملہ کرے لیکن بجائے اسکے کہ نپولین مصر میں ان حملوں کا انتظار کرتا وہ پچیس ہزار سپاہیوں کو لیکر جن میں کچھ مملوک بھی شامل تھے، جنوری ۱۷۹۹ئہ میں شام کی طرف روانہ ہوگیا، اور ۱۵ر فروری کو العریش، ۲۵ر فروری کو غزہ اور ۷ا مارچ کو یافہ فتح کرلیا، یافہ کے ترکی دستے نے جس کی تعداد پانچ ہزار تھی، اس شرط پر ہتھیار ڈالے تھے کہ انھیں فوجی قیدی سمجھا جائیگا لیکن شہر پر قبضہ کرنے کے بعد نپولین نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور پورے دستہ کو قتل کرادیا،

اِس کے بعد وہ عکا کی طرف بڑھا جس کی فتح کے بعد پورے شام کی فتح میں کوئی روک باقی نہ رہ جاتی، ۲۰ر مارچ کو محاصرہ شروع ہوا، اور دو مہینے تک جاری رہا، لیکن نپولین کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور یہ شہر فتح نہ ہوسکا، محصورین کی غیر معمولی شجاعت کے علاوہ ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ بحری سمت سے عکا کو مدد برابر پہنچ رہی تھی، اور محاصرہ کے لئے جو بڑی بڑی توپیں نپولین نے سمندر کے راستہ سے روانہ کی تھیں اُنھیں انگریز امیرالبحر سر سڈنی اسمتھ نے چھین لیا تھا اور خود فرانسیسیوں کے خلاف استعمال کر رہا تھا، اس درمیان میں نپولین کو یہ اطلاع ملی کہ دمشق کی عثمانی فوج عکا کی مدد کے لئے روانہ ہوچکی ہے اُس نے جنرل کلیبر کو ایک دستہ کے ساتھ روانہ کیا، کہ اس فوج کو آگے بڑھنے سے

رد کے جبل طابور کے قریب فریقین کا مقابلہ ہوا، اور ترکوں نے کلیبر کے پورے دستہ کو گھیر لیا، اگر نپولین عین وقت پر اُس کی مدد کے لئے نہ پہنچ جاتا تو کلیبر مع اپنے سپاہیوں کے گرفتار ہو جاتا، لیکن ۱۶ اراپریل کو جبل طابور پہنچتے ہی اُس نے ترکوں کو شکست دیکر بھگا دیا، اس کے بعد وہ پھر عکا واپس آگیا، ۷ رمئی کو روڈس سے فوجی کمک پہنچی جس سے محصورین کے حوصلے اور بڑھ گئے، اس کے بعد کلیبر نے پوری قوت کے ساتھ ایک آخری حملہ قلعہ پر کیا، مگر وہ بھی پہلے حملوں کی طرح ناکام رہا، بالآخر مایوس ہو کر نپولین نے ۲۰ رمئی کو محاصرہ اُٹھا لیا، اور مصر کی طرف روانہ ہوا، اُسکی "مشرقی سلطنت" کی اسکیم ہمیشہ کے لئے درہم برہم ہو گئی، عکا کی طرف دیکھ کر اُس نے بڑی حسرت سے کہا کہ "اُس حقیر قلعہ سے مشرق کی قسمت وابستہ تھی"۔

جنگِ ابوقیر نپولین کے مصر پہنچنے کے بعد ہی روڈس کی پندرہ ہزار عثمانی فوج مصطفےٰ پاشا کے زیر قیادت خلیج ابوقیر میں داخل ہوئی اور آسانی کے ساتھ وہاں کے فرانسیسی دستہ کو شکست دیدی، یہ سنکر نپولین فوراً قاہرہ سے روانہ ہو کر ۲۵ رجولائی کو ابوقیر پہنچا، مصطفےٰ پاشا پہلے سے تیار تھا، لڑائی گھمسان کی ہوئی اور ترک ایسی بہادری سے لڑے کہ فرانسیسیوں کے پیر اکھڑ گئے، لیکن فتح کے جوش میں اُنھوں نے منتشر ہو کر زخمی سپاہیوں کے سر کاٹنے شروع کر دیئے، نپولین نے فوراً اس حالت سے فائدہ اُٹھایا، اور اپنے تازہ دم دستوں کو جنرل میوراد (Murat) کی سرکردگی میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا، میوراعثمانی سرعسکر کے خیمہ تک پہنچ گیا، یہاں تک کہ دونوں میں دست بدست لڑائی ہونے لگی، اور دونوں نے ایک دوسرے کو زخمی کیا، اس عرصہ میں ترک جو پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے، فرانسیسیوں

کے تازہ حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے، بہتیرے جان بچانے کے لئے سمندر میں کود پڑے اور انمیں سے زیادہ تر ڈوب کر ہلاک ہو گئے، ایسی صورت میں مصطفےٰ پاشا کے لئے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اس فتح نے عکا کی ناکامی کی کچھ تلافی کر دی، اور مصر میں نپولین کا اقتدار قائم ہو گیا،

مصر پر عثمانی تسلط | انہی دنوں فرانس سے جو اطلاعات موصول ہوئیں اُن کے لحاظ سے نپولین نے جلد از جلد وہاں پہنچ جانا ضروری خیال کیا، چنانچہ مصر کا انتظام جنرل کلیبر کو سپرد کر کے وہ ۲۲ اگست کو نہایت خفیہ طور پر اپنے بعض افسروں کے ساتھ اسکندریہ سے فرانس کو روانہ ہو گیا، کلیبر نے سڈنی اسمتھ سے جو مصطفےٰ پاشا کی فوج کے ساتھ مصر آیا تھا صلح کی گفتگو شروع کی اور بالآخر تخلیہ مصر کا معاہدہ کر لیا لیکن جب برطانوی امیر البحر لارڈ کائتھ (Keith) نے اس امر پر اصرار کیا کہ فرانسیسی فوج کو اپنے ہتھیار رکھ دینے چاہئیں تو کلیبر نے غصہ سے معاہدہ چاک کر ڈالا، اور اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "سپاہیو! اس گستاخی کا جواب فتوحات کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا،" چنانچہ وہ چھ ہزار کا ایک دستہ لیکر عثمانی فوج پر حملہ آور ہوا، جو اوائل ۱۸۰۰ء میں صدر اعظم کے زیر کمان مصر پہنچی تھی، اور ۲۰ مارچ کو ہلیو پولیس (Heliopolis) کی جنگ میں اُسے شکست دی، لیکن اس کے چند روز بعد کسی نے اُسے قتل کر دیا، کلیبر کا جانشین منو (MENOU) اپنی فوجی لیاقت کے اعتبار سے اُس کا ہم پلہ نہ تھا، جنگ ہلیو پولیس کے بعد ایک سال تک فرانسیسی فوج مصر پر قابض رہی، مارچ ۱۸۰۱ء میں سر ابرکرومبی (Abercromby) کی سرکردگی میں ایک انگریزی فوج

مصر آئی، اس کے بعد ایک دوسری فوج جنرل برڈ (Baird) کے ساتھ پہنچی، فرانسیسی فوج کا کچھ حصہ قاہرہ میں تھا اور کچھ اسکندریہ میں، مارچ میں سر ابرکرمبی نے اسکندریہ میں فرانسیسیوں کو شکست دی اور جون میں ترکی اور انگریزی فوجوں نے قاہرہ کے فرانسیسی دستہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، ستمبر میں فرانسیسی سپہ سالار نے مصر سے نکل جانے کا معاہدہ کیا، فرانسیسی فوج کو انگریزی جہازوں پر فرانس واپس جانے کی اجازت دی گئی، اور مصر پر دولت عثمانیہ کا تسلط از سرِ نو قائم ہوگیا،

فرانس سے صلح

مارچ ۱۸۰۲ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان معاہدہ امیان (Amiens) کے رُو سے ایک عارضی صلح ہوگئی، ساتھ ہی فرانس اور دولت علیہ کے درمیان بھی صلحنامہ ہوگیا، نپولین نے فرانس کے قنصل اوّل کی حیثیت سے مصر پر دولت عثمانیہ کی فرماں روائی تسلیم کر لی، اور سلطان نے اُن حقوق و مراعات کی تجدید کی جو اہلِ فرانس کو اپنے سابق بادشاہوں کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھے،

اندرونی شورشیں

۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہوجانے کے بعد سلیم کو چار سال کے لئے جنگ سے مہلت مل گئی لیکن جہاں تک سکون کا تعلق تھا وہ اس مختصر فرصت میں بھی میسر نہ آیا، وہابیوں نے شام پر از سرِ نو حملہ شروع کر دیا تھا، ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں اُنھوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ کر کے تمام عرب پر اپنا تسلط قائم کر لیا، مصر میں فرانسیسی فوجوں کے چلے جانے کے بعد ممالیک کی خودسری بدستور شروع ہوگئی، باب عالی کی طرف سے جو فوجیں اُن کے

مقابلہ کیلئے بھیجی گئیں اُن سے وہ عرصہ تک لڑتے رہے، شام میں جزار پاشا پھر خود مختار بن بیٹھا اور مرتے دم (۱۸۰۴ء) تک سرکشی پر قائم رہا، ودین میں پزوان اوغلو کی بغاوت باب عالی کی انتہائی کوششوں کے بعد بھی فرو نہ ہوسکی، یہانتک کہ سلیم نے مجبور ہوکر ۱۷۹۸ء میں اسکی پوری مدت حیات تک کے لئے اُسے اُن تمام علاقوں کا حاکم تسلیم کر لیا جن پر وہ بہ اختیار خود قابض ہوگیا تھا، اور بطور سند اُس کو درجہ اوّل کے پاشا کا نشان عطا کیا، غرض صلح کے زمانہ میں بھی سلطنت کے مختلف حصوں میں شورش برپا تھی،

سرویا سب سے زیادہ نازک سرویا کا حال تھا، اُس وقت سرویا کا والی حاجی مصطفٰے پاشا تھا، وہ ایک نہایت رحمدل اور دردمند شخص تھا، اور رعایا میں اس قدر مقبول تھا کہ عیسائی اُسے "اہل سرویا کی ماں" پکارتے تھے، اس کے عہد میں ہر طرف امن وامان تھا، تجارت ترقی پر تھی، اور سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف ہوتا تھا[1] لیکن سلیم کی فوجی اصلاحات نے سرویا کے ینی چری دستوں کو اتنا برانگیختہ کیا کہ اُنھوں نے بغاوت کرکے تمام صوبہ میں قتل وغارت گری شروع کردی، نتیجہ یہ ہوا کہ سرویا کے باشندے عاجز آکر اُنکے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سلطانی فوجوں کی مدد سے اُن کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا، مگر اس کامیابی سے اُن کے اندر آزادی کا حوصلہ پیدا ہوگیا، اور اب اُنھوں نے وطنی آزادی کے لئے خود دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا،

---

[1] ریاستہائے بلقان، از ملر ص ۳۰۹،

اس جرأت کے مختلف اسباب تھے، سلطنت عثمانیہ اور آسٹریا کی گذشتہ جنگ میں جس کا خاتمہ صلحنامہ سسٹوا پر ہوا تھا، جب آسٹریا کی فوجیں سرویا میں داخل ہوئیں تو وہاں کی عیسائی رعایا نے حملہ آوروں کا خیر مقدم کیا، اور فوجی دستے قائم کرکے دولت علیہ کے خلاف آسٹریا کو بہت کچھ مدد پہنچائی، صلحنامہ سسٹوا کے رو سے سرویا پھر دولت عثمانیہ کو واپس مل گیا، عثمانی تسلط کے قائم ہونے پر عیسائی رعایا کے فوجی دستے توڑ دیئے گئے لیکن پچھلی جنگ میں جو فوجی روح اُن کے اندر پیدا ہوگئی تھی وہ فنا نہ ہوئی، اس روح کو حاجی مصطفےٰ نے بھی زندہ رکھنا چاہا، اُس نے رعایا کو ینی چری کی غارت گری سے محفوظ رکھنے کے لئے سروی کسانوں کے مسلح دستے قائم کردیئے، تحریک آزادی کا ایک دوسرا سبب وہ شورشیں تھیں جو خود مختار حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں متعدد صوبوں میں برپا تھیں، سرویا بھی ان شورشوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اور اس کے باشندوں میں بھی آزادی کا جذبہ پیدا ہوگیا، یہ جذبہ انقلاب فرانس کی ہنگامہ خیزیوں سے اور بھی ترقی کرگیا، لیکن ان اسباب کے باوجود سرویا میں قومی آزادی کی تحریک دفعۃً تیز نہ ہوجاتی اگر ینی چری نے اپنے مظالم سے وہاں کے باشندوں کو عاجز نہ کردیا ہوتا،

ینی چری کی قتل وغارتگری یوں تو سلطنت کے ہر حصہ میں ینی چری کی خودسری بڑھی ہوئی تھی، لیکن سرویا میں بالخصوص اُن کی سرکشی کی کوئی انتہا نہ تھی، بلغراد اور دوسرے شہروں کے ینی چری دستے نہ صرف عیسائی رعایا میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کئے ہوئے تھے، بلکہ اپنے ہم مذہب "سپاہی"

جاگیرداروں پر بھی جن کو وہاں کی زمینیں سلطان کی طرف سے فوجی خدمات کے صلہ میں ملی تھیں اُن کا دستِ ستم اُتنا ہی دراز تھا، چنانچہ عیسائی رعایا اور سپاہی جاگیردار دونوں نے ینی چری کے مظالم کے خلاف باب عالی میں فریاد کی، سلیم نے بکیر پاشا کو بلغراد کا والی مقرر کرکے روانہ کیا، اور اُسے حکم دیا کہ ینی چری دستوں کو بلغراد اور سرویا کے تمام علاقوں سے نکال دے، بکیر پاشا نے ینی چری کے سردار دلی احمد کو قتل کرکے اُنھیں سرویا سے نکال دیا، ینی چری نے پزوان اوغلو باغی ودین کے ہاں جاکر پناہ لی، پزوان اوغلو نے اُن کی سفارش باب عالی میں کی اور اس بات کی اجازت دلوا دی کہ اگر وہ امن وسکون کے ساتھ رہنے کا وعدہ کریں تو بلغراد واپس آسکتے ہیں، لیکن سرویا میں داخل ہونے کے بعد اُنکی غارت گری بدستور سابق پھر شروع ہوگئی، اُس وقت حاجی مصطفےٰ پاشا نے جو بکیر پاشا کے بعد سرویا کا والی مقرر ہوا تھا اہل سرویا کو ینی چری کے مقابلہ کیلئے اُبھارا، چنانچہ سروی دستوں نے پاشا اور سپاہی جاگیرداروں کی مدد سے باغیوں کو شکست دیکر بھگا دیا، اس واقعہ کی اطلاع جب قسطنطنیہ اور سلطنت کے دوسرے حصوں کے ینی چری دستوں کو پہنچی تو اُن میں سخت برہمی پیدا ہوئی علما اور عام مسلمانوں کو بھی کفار کی مدد سے ینی چری کا سرویا سے نکالا جانا حد درجہ ناگوار ہوا، سلیم نے رائے عامہ سے مجبور ہوکر مصطفےٰ پاشا کو حکم دیا کہ ینی چری کو بلغراد واپس آنے کی اجازت دیدی جائے، لیکن اُنھوں نے سرویا میں آتے ہی اپنے دشمنوں سے پورا پورا انتقام لینا شروع کر دیا، چنانچہ بلغراد پہنچ کر انھوں نے مصطفےٰ پاشا کو قتل کر دیا، اور پھر پورے صوبہ کو چار حصوں میں تقسیم کرکے اپنی جماعت

کے چار سرداروں کو ہر حصہ کا حاکم مقرر کیا، اپنی تعداد کو ناکافی دیکھ کر انھوں نے بوسنیا اور البانیا کے باغیوں کی ایک مسلح فوج بھی تیار کرلی اور اس کے بعد بیخوف ہوکر لوٹ مار کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کے مظالم سے عیسائی رعایا اور مسلمان جاگیردار دونوں بالکل عاجز آگئے، باب عالی کے پاس اُس وقت اتنی فوج نہ تھی کہ اُنھیں قابو میں لاسکے، اس لئے اُس نے صرف دھمکی سے کام نکالنا چاہا، اور اُنھیں متنبہ کیا کہ اگر وہ اپنا ہاتھ نہ روکیں گے تو اُن کی سرکوبی کے لئے "غیر قوم اور غیر مذہب کے سپاہی" متعین کردیے جائیں گے، ینی چری نے یہ قیاس کرکے کہ ان سپاہیوں سے باب عالی کی مراد سرویا کے عیسائی باشندے ہیں، اُنھیں بیدریغ قتل کرنا شروع کردیا،

ینی چری کا استیصال سرویا کے باشندوں میں آزادی کی روح اس سے پہلے ہی پیدا ہوچکی تھی، انھوں نے فوجی تربیت بھی ایک حد تک حاصل کرلی تھی، سلطانی فوج کی مدد سے ایک بار وہ انھی ینی چری دستوں کو شکست بھی دے چکے تھے، چنانچہ اب متفقہ طور پر اُنھوں نے اپنی قوم کے ایک کسان جارج پیٹرو ویچ (George Petrowitch) کو جو تاریخ میں عموماً قرہ جارج کے نام سے مشہور ہے سپہ سالار مقرر کرکے ینی چری کا مقابلہ شروع کیا، سپاہی جاگیرداروں نے بھی اُن کی مدد کی، اور باب عالی کی فوجیں بھی بکیر پاشا والی بوسینا کی سرکردگی میں اُن کی مدد کے لئے آگئیں، باب عالی نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب کی بار بلغراد کے ینی چری دستوں کا کامل استیصال کردیا جائے، عیسائی رعایا بھی انتہائی غیظ و غضب میں ان کی بیخ کنی پر آمادہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ینی چری کو شکست ہوئی،

کچھ بھاگ کر پزوان اوغلو کے پاس پناہ گزیں ہوئے، بقیہ قتل کر دیئے گئے،

سرویا کا مطالبہ آزادی

ینی چری کے استیصال کے بعد باب عالی نے حکم دیا کہ چونکہ ملک میں امن و امان قائم ہو گیا ہی اس لئے سرد ی دستوں کے باقی رکھنے کی ضرورت نہیں رہی، وہ توڑ دیئے جائیں، لیکن عیسائیوں میں اب آزادی کا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا، ینی چری کو شکست دیکر اُن کی ہمتیں بہت بڑھی ہوئی تھیں، بلغراد اور چند دوسرے قلعوں کے علاوہ سرویا کے باقی تمام علاقوں پر اُنہی کا قبضہ تھا، چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ باب عالی کے حکم کی تعمیل میں ہتھیار رکھ کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے اور جاگیرداروں کے ماتحت زراعت اور دوسرے کاروبار میں بدستور سابق مشغول ہو جاتے، اُنھوں نے ملکی آزادی حاصل کرنے کیلئے خود دولت علیہ کے خلاف جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور فوجی مدد کے لئے ایک وفد اگست ۱۸۰۴ئ میں زار روس کی خدمت میں بھیجا، زار نے انھیں مشورہ دیا کہ جنگ شروع کرنے سے قبل اپنے مطالبات باب عالی میں پیش کریں اور وعدہ کیا کہ باب عالی پر دباؤ ڈال کر اُن کے مطالبات منظور کرانے کی کوشش کرے گا، چنانچہ اس ہدایت کے بموجب ۱۸۰۵ئ میں اہل سرویا نے ایک وفد قسطنطنیہ بھیجا اور باب عالی سے یہ درخواست کی کہ آئندہ سرویا کے تمام قلعوں میں سروی دستے متعین کر دیئے جائیں اور چونکہ گذشتہ ہنگاموں میں پورا صوبہ سخت مصیبتوں میں مبتلا تھا اس لئے خراج اور محاصل کا تمام بقایا معاف کر دیا جائے، ان میں سے پہلا مطالبہ نہایت اہم تھا، اس کے معنی یہ تھے کہ دولت عثمانیہ کے زیر سیادت انھیں حکومت خود اختیاری دیدیجائے،

روس کی جنگی تیاریاں | اس وقت روس اور فرانس میں جنگ چھڑ چکی تھی، اور روس باب عالی میں اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اس جنگ میں دولت عثمانیہ کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا ۱۷۹۹ء کے بعد جب روس اور دولت علیہ میں اتحاد قائم ہوا سلیم نے روس کو بہت سی خاص مراعات دیدی تھیں، جن کو ترک نہایت خطرناک خیال کرتے تھے، مثلاً ۱۸۰۱ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد بھی اُس نے روسی جہازوں کے لئے باسفورس اور دردانیال سے گذرنے کی اجازت باقی رکھی، حالانکہ یہ اجازت ابتداءً محض ضرورت جنگ کی بنا پر دی گئی تھی، قسطنطنیہ میں ترکوں نے اس اجازت کے قائم رکھنے پر اس قدر برہمی کا اظہار کیا کہ بالآخر مجبور ہو کر سلیم کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ اگر روس کسی ایسی حکومت سے برسرپیکار ہوگا جس کے تعلقات دولت عثمانیہ سے دوستانہ ہوں گے تو یہ اجازت منسوخ کر دیجائیگی، اس اجازت سے فائدہ اُٹھا کر روس نے جزائر آئیونین میں اپنی فوجی قوت بہت بڑھالی تھی، اور ترک افسروں کے احتجاج کے باوجود البانیا کے باشندوں کو بھی اپنی فوج میں داخل کرنا شروع کر دیا تھا، ۱۸۰۲ء میں باب عالی نے روس سے یہ معاہدہ کرلیا تھا کہ مولڈیویا اور ولاچیا کے امیر اُس کے مشورہ کے بغیر معزول نہ کئے جائیں گے، اور تاجروں کے علاوہ دوسرے ترک ان علاقوں میں نہ بس سکیں گے، یہ گویا مولڈیویا اور ولاچیا کو روس کی سرپرستی میں دیدینا تھا ۱۸۰۵ء میں روس نے بحر اسود کے جنوبی مشرقی ساحل پر اپنا اقتدار اس سے بھی زیادہ قائم کرلیا، باب عالی نے اُسے دریائے فاسیس (واقع منگریلیا) میں جہازوں کی آمدورفت اور ان جہازوں کی حفاظت

کے لئے دریائے مذکور کے ساحلوں پر قلعے تعمیر کرکے اُن میں فوجی دستے رکھنے کی اجازت دیدی، بادشاہ ارض روم کو حکم ملا کہ ان قلعوں کی تعمیر میں روسیوں کی مدد کرے نیز جنگ ایران کے سلسلہ میں جو اُس وقت روس سے جاری تھی اُن کی اعانت کرے، اس اجازت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر روس نے اُن ضلعوں پر بھی قبضہ کرلیا جو دریائے فاسیس سے کافی فاصلہ پر واقع تھے، اور قلعہ انکریا (Anrakh-ria) پر قبضہ کرکے ایک دوسرا قلعہ بحر اسود کے ساحل پر تعمیر کرلیا،

یہ سب تیاریاں مکمل کرنے کے بعد جب زار نپولین کے خلاف آسٹریا اور انگلستان سے اتحاد کرنے جارہا تھا تو روسی سفیر اٹالنسکی (Italinski) نے اپنی حکومت کی طرف سے یہ مطالبات پیش کیے کہ باب عالی روس کے ساتھ فوراً ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد کرلے، نیز اپنی تمام رعایا کو جو کلیسائے یونان کی پیرو ہو زار کی سرپرستی میں دیدے، اور اس بات کا وعدہ کرے کہ جب کبھی ترکوں کی طرف سے اُن کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگی تو سفیر روس کی درخواست پر باب عالی اُسکی تلافی کرنے پر مجبور ہوگا، یہ مطالبات ٹھیک اس وقت پیش کیے گئے، جب روس ہی کی تحریک پر سرویا کے وفد نے اپنے مطالبات باب عالی میں پیش کیے تھے، یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرویا کے عیسائی یونانی کلیسا کے پیرو تھے،

سلیم کے لئے روس کے یہ مطالبات ناقابل برداشت تھے، خصوصاً وہ جس کا تعلق عیسائی رعایا کی سرپرستی سے تھا، کیونکہ اس کی منظوری حقیقتہً روس کی غلامی کی مترادف تھی، لیکن اس خطرہ سے کہ روسی فوجیں جو بحر اسود کی

بندرگاہوں میں جمع تھیں آٹھ روز کے اندر قسطنطنیہ پہنچ سکتی ہیں، روس نے جو دستے جزائر آئیونین میں اکٹھا کرلئے تھے وہ فوراً البانیا میں داخل ہوکر البانی اور یونانی باغیوں کے ساتھ ادرنہ پر چڑھائی کر سکتے ہیں، جارجیا کی روسی فوجیں جو ایرانیوں کے مقابلہ میں فتحیاب ہوچکی تھیں ایشیائے کوچک کی راہ سے دارالسلطنت کی طرف بڑھ سکتی ہیں، اور سرویا کے عیسائیوں کو ملا کر روس بلغاریا پر قبضہ کرسکتا ہے

سلیم اور ارکانِ دیوان نے یہی مناسب خیال کیا کہ ان مطالبات پر گفت وشنید کا سلسلہ کچھ دنوں جاری رکھا جائے اور اس درمیان میں ان حملوں سے بچنے کے لئے جو تدبیریں ممکن ہوں اختیار کیجائیں، چنانچہ اٹالنسکی سے گفتگو شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ کچھ عرصہ تک قائم رہا، اس فرصت میں سلیم نہایت سرگرمی کے ساتھ مدافعت کی تیاریاں کرتا رہا،

سرویا کی آزادی سلیم کو یقین تھا کہ روس سے جنگ ناگزیر ہے، اس لئے وہ سرویا کے مسئلہ کو جلد سے جلد طے کرلینا چاہتا تھا، آیندہ جنگ کے خیال سے وہ سرویا کے ساتھ برسرپیکار رہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا، لیکن چونکہ سرویا کی وفاداری پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس بات کا قوی احتمال تھا کہ لڑائی میں سرویا روس کا ساتھ دیگا، نیز اس اندیشہ سے بھی کہ اگر سرویا کا مطالبہ منظور کرکے بلغراد اور دوسرے قلعوں سے ترکی دستے نکال لئے گئے تو قسطنطنیہ میں سخت شورش برپا ہوجائیگی، سلیم نے اس مطالبہ کو نامنظور کردیا، اور سروی وفد کو قید کرلینے کا حکم دیا، ساتھ ہی اُس نے نیش کے پاشا کو سرویا کی بغاوت فرد کرنے کے لئے روانہ کیا، قرہ جارج نے پاشا کی فوج کا سرحد پر مقابلہ کیا اور اُسے شکست دی، اس کے بعد سلیم نے دو

فوجیں اور روانہ کیں، مگر اہل سرویا نے قرہ جارج کی سرکردگی میں انھیں بھی شکست دی اور بلغراد اور دوسرے سروی قلعوں پر جنمیں ترکی دستے متعین تھے قبضہ کر لیا، اس طرح ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں سرویا کے عیسائیوں نے بغیر کسی بیرونی مدد کے تقریباً کامل خودمختاری حاصل کرلی،

فرانس سے اتحاد | اس درمیان میں یورپ میں پھر جنگ چھڑ چکی تھی، اور ایک طرف فرانس اور دوسری طرف روس وانگلستان، اس جنگ میں سلطنت عثمانیہ کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کر رہے تھے، اپنے مطالبات کی منظوری کے لئے روسی سفیر کا تقاضا بھی برابر جاری تھا، برخلاف اس کے فرانسیسی سفیر سلیم پر زور ڈال رہا تھا کہ وہ ان مطالبات کو مسترد کر دے اور نپولین کو شہنشاہ فرانس تسلیم کر کے فرانس کے ساتھ اتحاد قائم کرلے، روسی اور برطانوی سفیر نپولین کو شہنشاہ تسلیم کرنے کے سخت مخالف تھے، اور انھوں نے متفقہ طور پر باب عالی کو دھمکی دی کہ اگر ایسا کیا گیا تو جنگ کا اعلان فوراً کر دیا جائیگا، قسطنطنیہ میں دونوں فریق کی کوششیں ابھی جاری تھیں کہ نپولین نے آسٹریا اور روس کی فوجوں کو زبردست شکست دیکر باب عالی کے لیت ولعل کا ایک حد تک خاتمہ کر دیا، ان شکستوں کا فوری اثر یہ ہوا کہ پندرہ ہزار روسی فوج جو سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کیلئے سیاسٹوپول میں تیار رکھی گئی تھی، وسط روس میں واپس بلالی گئی، کیونکہ وہاں کی فوجیں فرانسیسیوں کے مقابلہ میں مغرب کی جانب روانہ ہو رہی تھیں، نپولین کی ان فتوحات کا ایک دوسرا نمایاں اثر یہ ہوا کہ روسی سفیر کا لب ولہجہ بالکل بدل گیا، اور اس کے مطالبات کی شدت باقی نہیں رہی، چنانچہ باب عالی

کو بھی اب روس کی طرف سے وہ خطرہ نہ رہا جو پہلے تھا اور وہ فرانس سے اتحاد کرنے پر مائل ہونے لگا،

روس سے اعلان جنگ۔ ۲۶ر دسمبر ۱۸۰۵ء کو معاہدۂ پرسبرگ (Presburg) کے روسے فرانس اور آسٹریا کے درمیان صلح ہوگئی منجملہ اور علاقوں کے ڈلماشیا اور کروشیا کا ایک حصہ فرانس کے ہاتھ آیا، اور اب فرانسیسی اور عثمانی سلطنتیں ہم سرحد ہوگئیں، فرانسیسی سفیر نے اس صلحنامہ کی ایک نقل صدر اعظم کے سامنے پیش کی، اور اُن فوائد کو مفصل طور پر بیان کیا جو نپولین کی دوستی سے دولت عثمانیہ کو حاصل ہو سکتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ باب عالی نے نپولین کو فرانس کا شہنشاہ تسلیم کرلیا ۱۸۰۶ء میں نپولین نے جنرل سباستیانی (Sebastiani) کو اپنا غیر معمولی سفیر بنا کر سلیم کے پاس بھیجا، سباستیانی نے اس بات کی کوشش کی کہ دولت عثمانیہ اور روس میں جنگ چھڑ جائے تاکہ زار کو اپنی کچھ فوجیں پولینڈ سے ہٹا لینی پڑیں جہاں وہ فرانس کی فاتح افواج کے مقابلہ میں فریڈرک ولیم، شاہ پرشا کی مدد کر رہا تھا، چنانچہ سباستیانی کی تحریک پر سلیم نے مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کو جنکی نسبت تقریباً یقین تھا کہ وہ روس کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں اور اس سے سازش کرکے دولت علیہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں، ان حکومتوں سے برطرف کردیا چونکہ یہ فعل ۱۸۰۲ء کے معاہدہ کے خلاف تھا اس لئے روسی سفیر نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، سفیر برطانیہ نے بھی اس احتجاج میں روس کی ہمنوائی کی اور دونوں نے ملکر باب عالی کو دھمکی دی کہ عنقریب روسی فوجیں مولڈیویا میں داخل ہونگی، اور انگریزی بیڑہ قسطنطینہ کی طرف بڑھے گا، سلیم نے معاہدۂ مذکور کی

خلاف ورزی کی تلافی کر دینی چاہی اور معزول شدہ امیروں کو دوبارہ مقرر کرنے کے لئے احکام جاری کئے لیکن اس سے قبل ہی روس کی فوجیں مولڈیویا میں داخل ہو کر یاسی تک پہنچ چکی تھیں، زار الکزنڈر پہلے ہی سے جنگ کے لئے تیار تھا، مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کی معزولی سے اُس کو ایک بہانہ ہاتھ آگیا اور اُس نے فوراً بغیر کسی اعلان جنگ کے پینتیس ہزار فوج جنرل میکلسن (Michelson) کے زیر کمان ان صوبوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی میکلسن تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا ۲۷ر دسمبر ۱۸۰۶ء کو ولاچیا کے پایہ تخت بخارسٹ میں داخل ہو گیا، اب مجبور ہو کر باب عالی کو بھی روس کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا،

برطانیہ کا الٹی میٹم — حکومت برطانیہ نے روس کو پوری مدد دی، برطانوی سفیر مسٹر ار بتھناٹ (Arbuthnot) نے باب عالی کو الٹی میٹم دیا کہ اگر روس اور انگلستان کے ساتھ دولت عثمانیہ فوراً اتحاد نہ کرے گی اور فرانسیسی سفیر رخصت نہ کر دیا جائیگا تو روسی فوجیں نیز برطانیہ اور روس کے جنگی بیڑے حملہ کر دیں گے، رئیس آفندی (وزیر خارجہ) نے آربتھناٹ کو اس کے جواب میں یہ لکھا کہ دولت علیہ نے ہمیشہ جنگ سے احتراز کیا اور صلح قائم رکھنے کی کوشش کی، لیکن روس اُسے جنگ پر مجبور کرتا رہا، اس نے اپنے خط میں مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کا خاص طور پر حوالہ دیا کہ باوجود اس کے کہ سلطان نے انھیں معزول کر دیا تھا تاہم صرف روس کے مطالبہ پر اُس نے اپنے سابق حکم کو منسوخ کر دیا اور انھیں دوبارہ مقرر کرنے کے لئے فرمان جاری کیا، سلطان نے یہ ذلت محض جنگ سے بچنے کے غرض سے گوارا کی، لیکن روس نے اس کی پروانہ کی اور بغیر کسی

اعلانِ جنگ کے اپنی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا میں روانہ کر دیں، آخر میں اُس نے لکھا کہ "اگر برطانیہ عظمیٰ روس کی مدد میں سلطان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے، تو سلطان بھی قوت کا جواب قوت سے دیگا، اور اس انتہائی نامنصفانہ حملہ سے بچنے کے لئے خدا کی ذات پر بھروسہ کرے گا، اور اگر آخر کار ترکی کو فنا ہی ہونا ہے تو وہ اپنے پایہ تخت کی حفاظت کرنے میں فنا ہو گی، اور اُس وقت سب سے زیادہ خود انگریز قوم کو اُس ناقابلِ تلافی نقصان کا تجربہ ہوگا جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی سے واقع ہو کر رہے گا"[1]

یہ جواب پاتے ہی آربتھنات فوراً قسطنطنیہ سے روانہ ہو کر برطانوی بیڑہ پہنچا، جو امیرالبحر ڈک ورتھ (Duckworth) کی سرکردگی میں جزیرہ ٹینیڈوس کے قریب لنگر انداز تھا، ڈک ورتھ کو یہ ہدایت تھی کہ جلد سے جلد قسطنطنیہ پہونچ کر عثمانی بیڑہ کی سپردگی کا مطالبہ کرے اور اگر یہ مطالبہ پورا نہ کیا جائے تو عثمانی جہازوں میں آگ لگا کر قسطنطنیہ پر گولہ باری شروع کر دے، چنانچہ ۱۹ فروری ۱۸۰۷ء کو انگریزی بیڑہ بلا کسی نقصان کے دردانیال میں داخل ہو گیا، اور بحر مارمورا میں پہنچکر ترکوں کے ایک بڑے اور چار چھوٹے جہازوں پر گولہ باری کر کے اُنھیں ڈبو دیا، دردانیال کی مورچہ بندی اس قدر کمزور تھی کہ انگریزی بیڑہ کو اس سے گذرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی اور ترکی توپوں کی گولہ باری کے باوجود جنوبی ہوا سے فائدہ اٹھا کر اس نے آبنائے کو عبور کر لیا، ڈک ورتھ قسطنطنیہ سے چند میل کے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا، اور مندرجہ ذیل مطالبات

[1] کریسی جلد ۲ ص ۳۶۷،

صدر اعظم کی خدمت میں بھیجے :-

(۱) باب عالی روس اور انگلستان سے اتحاد کرے،

(۲) عثمانی بیڑہ اور دردانیال کے قلعے انگلستان کے حوالہ کر دیئے جائیں،

(۳) روس کو مولڈیویا اور ولاچیا دیدیا جائے،

(۴) سباستیانی کو رخصت کر دیا جائے اور فرانس سے جنگ کا اعلان کر دیا جائے،

باب عالی نے دس روز تک آربتھناٹ اور ڈک ورتھ کو صلح کی گفتگو میں مصروف رکھا، اس فرصت میں انتہائی جوش و سرگرمی کے ساتھ قسطنطنیہ کی قلعہ بندی کا کام ہوتا رہا، دار السلطنت کی پوری مسلمان آبادی سلیم اور جنرل سباستیانی کے زیر ہدایت دن رات کام کرتی تھی اور اس نے اپنے حیرت انگیز عزم و جانفشانی سے قسطنطنیہ کو اتنے مستحکم طریقہ پر قلعہ بند کر لیا کہ برطانوی امیر البحر کو بے نیل مرام واپس ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا، اُسے خطرہ پیدا ہوا کہ مبادا وہ خود اپنے تمام جہازوں کے ساتھ گرفتار ہو جائے، چنانچہ یکم مارچ کو اُس نے لنگر اُٹھانے کا حکم دیا، اور ۳ مارچ کو دردانیال سے ہو کر واپس ہوا لیکن اب کی بار اُس کا بیڑہ بمشکل سلامت گذر سکا، قدیم ترکی توپوں نے بھی آٹھ سو پونڈ کے سنگی گولے انگریزی جہازوں پر برسانے شروع کئے جن سے کئی جہاز زخمی ہوئے اور دو ڈوب گئے، اور چھ سو آدمی ہلاک ہوئے،

مصر کی ناکام مہم

اس ذلت کی تلافی کے لئے برطانیہ نے پانچ ہزار فوج مصر پر حملہ کرنے کی غرض سے سسلی سے روانہ کی، یہ فوج ۱۷ مارچ ۱۸۰۷ء کو اسکندریہ کے قریب اتری اور آگے بڑھکر شہر پر حملہ آور ہوئی، اسکندریہ میں اسوقت ساڑھے چار سو

ترکوں کا ایک دستہ متعین تھا جو مقابلہ نہ کر سکا اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا، لیکن انگریزی فوج کی یہی پہلی اور آخری کامیابی تھی، اس کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں اُن میں سے ہر ایک میں اُسے شکست ہوئی اور سینکڑوں آدمی تلف ہو گئے، آخر کار یہ معلوم کر کے کہ ایک زبردست عثمانی فوج قاہرہ سے روانہ ہو کر مقابلہ کے لئے آ رہی ہے جنرل فریزر (Fraser) نے صلح کا علم بلند کیا، اور مصر سے نکل جانے کے لئے یہ شرط پیش کی کہ تمام انگریز قیدی واپس کر دیئے جائیں، یہ شرط منظور کر لی گئی، اور ۲۵ ستمبر کو انگریزی بیڑہ ناکام و نامراد اسکندریہ سے روانہ ہو گیا،

قسطنطنیہ اور مصر کی ان ناکام مہموں سے برطانیہ کے اقتدار کو شدید صدمہ پہنچا،

روس سے جنگ کا سلسلہ | اس درمیان میں روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا، دریائے ڈنیوب کے ساحلی علاقوں میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں، لیکن وہ سب غیر اہم تھیں، کوئی فریق اپنی پوری طاقت کے ساتھ میدانِ جنگ میں نہیں آتا تھا، روس کی طاقت زیادہ تر نپولین کے مقابلہ میں صرف ہو رہی تھی اور سلطنت عثمانیہ بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کی مصیبت میں مبتلا تھی،

ینی چری کی بغاوت | ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد سلیم نے اصلاحات کا کام پھر شروع کر دیا تھا، دو تین سال کے اندر فوجی اصلاحات میں بہت کچھ ترقی ہو گئی تھی، فرانسیسی افسروں کی تربیت میں توپچیوں نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اب اُن کی اہمیت ینی چری سے بھی زیادہ ہو گئی تھی، عکا کی مدافعت میں عمر آغا کی چھوٹی سی فوج نے ایسے جوہر دکھائے، کہ "نظام جدید" کی برتری کا اعتراف دوست دشمن سب نے کیا، اسی فوج نے بلغاریا اور رومیلیا

کے ڈاکوؤں کا بھی استیصال کر دیا جن کے زبردست جتھے اُن صوبوں کے امن و امان کے لئے ایک مستقل خطرہ تھے، ان ڈاکوؤں کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اُنھوں نے ینی چری دستوں کو بھی شکست دیکر بھگا دیا تھا، سلیم نے "نظام جدید" کے دو دستے اور قائم کر کے فرانسیسی افسروں کے زیر نگرانی اُنھیں یورپ کی بہترین فوجوں کے نمونہ پر تعلیم دلوائی، اُس نے اُن کی تنخواہ کے لئے ایک علیحدہ فنڈ بھی قائم کیا، بعض پاشاؤں، خصوصاً عبدالرحمٰن پاشا والی کرمانیہ نے بھی ان فوجی اصلاحات میں سلیم کی پرجوش تائید کی اور اپنے صوبوں میں بھی یہ اصلاحات شروع کیں، سلیم کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ ۱۸۰۵ء میں اُس نے ایک فرمان جاری کیا کہ آئندہ ینی چری اور سلطنت کی دوسری فوجوں میں سے بہترین نوجوان منتخب کر کے "نظام جدید" میں داخل کئے جائیں، اس فرمان کے جاری ہوتے ہی ینی چری نے علانیہ بغاوت کر دی، اُس وقت ان کی قوت بلغراد میں ٹوٹ چکی تھی لیکن دوسرے صوبوں میں وہ اب بھی طاقتور تھے، چنانچہ آدرنہ میں دس ہزار ینی چری نے جمع ہو کر علمِ بغاوت بلند کر دیا، اور اگست ۱۸۰۶ء میں "نظام جدید" کے جو دستے اُنھیں قابو میں لانے کے لئے روانہ کئے گئے تھے، ان کو شکست دیدی۔ سلطنت کے اور حصوں میں بھی اُن کی شورشیں اس قدر بڑھیں کہ سلیم کو نہ صرف یہ فرمان منسوخ کر دینا پڑا، بلکہ دوسری فوجی اصلاحات بھی فی الحال روک دینی پڑیں، مفتی اعظم صالح زادہ اسعد آفندی کے اثر سے بغاوت کا فتنہ جلد فرو ہو گیا، البتہ ینی چری کے مطالبہ پر صدر اعظم حافظ اسمٰعیل پاشا معزول کر دیا گیا، اور اُسکی جگہ ینی چری کا آغا ابراہیم حلمی پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، "نظام جدید" کے خلاف

شورش اتنی زیادہ تھی کہ ۱۸۰۵ء میں جب روس نے مولڈیویا اور ولاچیا پر چڑھائی کی تو باب عالی کو روسیوں کے مقابلہ میں اس نئی فوج کے بھیجنے کی جرأت نہیں ہوئی،

سلیم کے خلاف سازش

فوجی اصلاحات کے روک دینے سے ینی چری کی بغاوت اُس وقت فرو ہو گئی لیکن اصلاحات کے خلاف جذبات اُسی طرح برانگیختہ تھے ۱۸۰۶ء کے شروع میں شیخ الاسلام اسعد آفندی کا انتقال ہو گیا، وہ سلیم کا ایک مخلص دوست اور اُس کی تمام اصلاحات کا پرجوش حامی تھا، اُس کی موت سلیم کے لئے نہ صرف ایک ذاتی سانحہ تھی، بلکہ اُسکی معزولی اور کل اصلاحات کی منسوخی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی، علماء کی جماعت بحیثیت مجموعی پہلے ہی سے اصلاحات کی مخالف تھی، نیا مفتی اعظم عطاء اللہ آفندی بھی تمامتر ینی چری کے زیر اثر تھا، لیکن سلیم کی معزولی میں جس شخص نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ قائم مقام موسیٰ پاشا تھا، اُس وقت صدر اعظم فوج کے ساتھ محاذ جنگ پر تھا، اور موسیٰ پاشا قائم مقام کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں اُسکی جگہ کام کر رہا تھا، اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے مفتی اعظم، ینی چری اور دار السلطنت کے بعض دوسرے فوجی دستوں کے ساتھ سلیم کے خلاف ایک گہری سازش کی، "نظام جدید" کا ایک حصہ اُس وقت باسفورس کے قلعوں کی حفاظت پر متعین تھا، بقیہ فوج ایشیا میں تھی، باسفورس کے دستۂ حفاظت میں دو ہزار خام سپاہی بھی تھے، جو "یمقی" کہلاتے تھے، اور "نظام جدید" کے سپاہیوں کے ساتھ اس غرض سے رکھے گئے تھے کہ بتدریج اُن سے متاثر ہوتے رہیں، لیکن موسیٰ پاشا نے ان میں یہ افواہ اڑا دی کہ سلطان انھیں بجبر نظامی دستوں کے ساتھ ملا دینا چاہتا ہے، اس خبر سے اُن میں سخت برہمی

پیدا ہوئی، دوسری طرف اُس نے یہ کیا کہ سلیم کو جو اُسکی سازش سے بالکل بیخبر تھا، ترغیب دیکر "یمقیوں" کے نام ایک حکم جاری کرایا کہ وہ نظامیوں کا سا لباس اختیار کرلیں، سلطان کا فرستادہ محمد آفندی جوں ہی یہ حکم لے کر پہنچا بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھے، محمد آفندی کو تو اُسی وقت باغیوں نے قتل کر دیا، اس کے بعد دار السلطنت کے ینی چری دستوں کو ساتھ لے کر وہ آت میدان میں جمع ہوئے، اور وہاں ینی چری نے اپنی شوربے کی دیگیں اُلٹ دیں، یہ بغاوت کا اعلان تھا، اور اس سے مقصود یہ تھا کہ اب وہ سلطان کا دیا ہوا کھانا نہ کھائیں گے،

سلیم کی معزولی

موسیٰ پاشا نے چونکہ سلیم کو بالکل دھوکے میں رکھا تھا، اسلئے وہ اس صورت حال کے لئے مطلق تیار نہ تھا، باغیوں کا سردار قباقچی اوغلو جب آت میدان میں آیا اس وقت بھی موسیٰ پاشا نے سلیم کو فریب دینے کی کوشش کی، اور اُسے اطمینان دلایا کہ یہ شورش بہت جلد فرو ہو جائے گی، چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ نظامی دستوں کو باسفورس سے طلب کرلیتا اور اُن کے آنے تک اپنے باڈی گارڈ کی مدد سے محل کی حفاظت کرتا، اُس نے باغیوں کو راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن انھیں راضی ہونا تھا نہ ہوئے، قباقچی اوغلو کے ہاتھ میں اصلاحات کے خاص خاص طرفداروں کی ایک فہرست تھی، اس میں وزرا، اکابر و اعیان سبھی شامل تھے، یہ سب کے سب گھسیٹ کر آت میدان میں لائے گئے، اور نہایت بیدردی سے قتل کر دیئے گئے، دو روز تک قتل کا سلسلہ جاری رہا، اصلاحات کے تمام طرفدار مارے گئے یا بھاگ گئے، آخر میں سلیم نے یہ دیکھکر کہ اب خود اس کے تخت پر حملہ ہوا چاہتا ہے ایک فرمان کے ذریعہ تمام

اصلاحات منسوخ کردیں، لیکن باغیوں نے اُس کی معزولی کا فیصلہ پہلے ہی کرلیا تھا، مفتی اعظم نے جو اس سازش میں شروع سے شریک تھا اپنے فتوے سے اس فیصلہ پر قانون کی مہر بھی ثبت کردی، ۲۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۲۲ھ (۲۹ مئی سنہ ۱۸۰۷ء) کو ینی چری موسیٰ پاشا کی سرکردگی میں قصر سلطانی میں داخل ہوئے، سلیم نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ نہایت وقار کے ساتھ تخت سے اترا، اور محل کے اُس حصہ میں چلا گیا جہاں شہزادہ مصطفیٰ اب تک نظر بند تھا، باغیوں نے مصطفیٰ کو لاکر تخت پر بٹھا دیا، سلیم نے اپنی بقیہ مدت عمر جو صرف ایک سال اور رہ گئی تھی، سلطنت عثمانیہ کے آیندہ وارث شہزادہ محمود کو تربیت دینے میں گذار دی،

مصطفےٰ رابع

۱۲۲۲ھ تا ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۷ء تا ۱۸۰۸ء

مصطفےٰ رابع تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اُس نے صرف تیرہ مہینے حکومت کی لیکن یہ حکومت محض نام کی تھی، اصلی اقتدار اُن باغیوں کو حاصل تھا جنھوں نے سلیم کو معزول کر کے اُسے تخت پر بٹھایا تھا، قباقچی اوغلو، باسفورس کے قلعوں کا حاکم مقرر ہوا، سلیم کی تمام اصلاحات منسوخ کر دی گئیں،

ان واقعات کی خبر سے عثمانی فوجیں جو دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں میں روس سے جنگ کر رہی تھیں بہت مطمئن اور مسرور ہوئیں، لیکن صدر اعظم ابراہیم حلمی پاشا نے جو اُس وقت سپہ سالار تھا اس بغاوت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، اس پر ینی چری نے اُسے قتل کر دیا، اور اُس کی جگہ چلپی مصطفےٰ پاشا کو سپہ سالار اور صدر اعظم مقرر کیا،

ابراہیم پاشا کے قتل اور چلپی مصطفےٰ کے تقرر سے فوج میں کمزوری اور انتشار پیدا ہو گیا، اگر روسی فوجوں کا بڑا حصہ اُس وقت پرشا میں نپولین سے جنگ کرنے میں مصروف نہ ہوتا تو اس کمزوری سے دولت عثمانیہ کو بہت نقصان

نقصان پہنچا، لیکن اس کی خوش قسمتی سے اسی درمیان میں (۱۴ر جون ۱۸۰۷ء) نپولین نے روسیوں کو فریڈلینڈ میں ایسی زبردست شکست دی کہ اُس کے اثر سے ڈینوب کی روسی فوجیں بھی پسپا ہونے لگیں،

نپولین کی غداری

اسکے بعد زار الکزنڈر نے نپولین سے صلح کی درخواست کی، لیکن قبل اس کے کہ فریقین ٹلسیٹ کے مقام پر شرائط صلح طے کریں، پرشا کے وزیر اعظم ہارڈنبرگ (Hardenberg) نے دونوں کے سامنے ایک دلچسپ اسکیم پیش کی، جس سے مقصود یہ تھا کہ نپولین کی توجہ پرشا پر قبضہ کرنے کے بجائے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی جانب مائل ہو جائے، اسکیم یہ تھی کہ ولاچیا، مولڈیویا، بلغاریا اور رومیلیا کے صوبے روس کو دیدیئے جائیں، یونان اور جزائر آیونین پر فرانس قبضہ کرلے، بوسنیا اور سرویا، آسٹریا کی سلطنت میں شامل کر دیئے جائیں، پولینڈ کو از سر نو مرتب کرکے شاہ سیکسنی (Saxony) کو اُس کا فرماں روا مقرر کر دیا جائے اور سیکسنی پر پرشا کی حکومت قائم کر دیجائے، لیکن نپولین پرشا کو شکست دیکر پامال کر چکا تھا، وہ ایک حقیر دشمن کی پیش کردہ اسکیم پر غور کرنے کے لئے تیار نہ ہوا،[له] تاہم سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ خود اسکی ذاتی اسکیم کے لئے اہمیت سے خالی نہ تھا، اس وقت اُس کا سب سے بڑا مقصد سلطنت برطانیہ کو نیست و نابود کر دینا تھا، لیکن اس کا حصول روس کو برطانیہ کے اتحاد سے علیحدہ کئے بغیر محال تھا، فریڈلینڈ کی شکست نے روس کی قوت بہت کچھ توڑ دی تھی، اور زار اب صلح کا خواہشمند بھی تھا، لیکن نپولین سے ملکر اپنے سابق حلیف برطانیہ سے جنگ کرنے کے لئے الکزنڈر خاطر خواہ معاوضہ کا اُمیدوار تھا، نپولین نے

اسے منظور کر لیا، چنانچہ معاہدۂ ٹلسیٹ (۷ر جولائی ۱۸۰۷ء) کی خفیہ دفعات میں یہ طے پایا کہ اگر باب عالی نپولین کے پیش کردہ شرائط پر روس سے صلح نہ کرے گا تو فرانس اور روس متحد ہو کر ترکوں کو قسطنطنیہ اور رومیلیا کے علاوہ باقی تمام یورپین ولایتوں سے نکال دیں گے، اور ان ولایتوں کو باہم تقسیم کر لیں گے، تقسیم کی شکل یہ تھی کہ فرانس بوسینا، البانیا، یونان اور مقدونیا پر قبضہ کرے گا اور مولڈویا ولاچیا، بلغاریا اور دریاے ماریٹزا تک کے تمام علاقے روس کو دیدیئے جائیں گے آسٹریا کو راضی کرنے کی غرض سے سرویا کا صوبہ اُس کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا[۱] الکزنڈر کو قسطنطنیہ کے حاصل کرنے پر بھی اصرار تھا، مگر نپولین نے اس سے قطعی انکار کر دیا، اس خفیہ معاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نپولین ذاتی اغراض کے لئے اپنی حلیف سلطنت عثمانیہ کو قربان کر دینے پر کہاں تک آمادہ تھا، حالانکہ روس سے دولت علیہ کی موجودہ جنگ زیادہ تر اُسی کی کوششوں کا نتیجہ تھی، بہرحال اگست ۱۸۰۷ء میں اُس کی وساطت سے فریقین میں عارضی طور پر صلح ہو گئی،

حالات آستانہ اس درمیان میں دار السلطنت کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی، حکومت کے تمام اختیارات مفتی اعظم اور قائم مقام موسی پاشا کے ہاتھ میں تھے، اور یہی دونوں سلطان کے نام سے حکمرانی کر رہے تھے لیکن چند دنوں کے بعد خود ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا، اور مفتی اعظم نے قبا قچی اوغلو سے سازش کر کے موسیٰ پاشا کو نہ صرف معزول بلکہ جلاوطن بھی کرا دیا اس کے بعد طاہر پاشا قائم مقام مقرر ہوا، مگر چونکہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے اختیارات

[۱] فریڈیک صد ۱۹۷،

استعمال کرنا چاہتا تھا، اس لئے مفتی اعظم نے اُسے بھی برطرف کرا دیا، طاہر پاشا نے مصطفےٰ پاشا بیرقدار کے پاس جاکر پناہ لی جو روستچق کا والی اور سلطان سلیم کے وفادار نمک خواروں میں تھا،

سلطان مصطفےٰ کی تخت نشینی کے بعد بھی سلیم کے حامیوں کی ایک جماعت اُسے دوبارہ تخت پر لانا چاہتی تھی، بیرقدار اس جماعت کا سردار تھا، چنانچہ طاہر پاشا کے آنے کے بعد اُس نے اپنا ایک معتمد صدر اعظم چلپی مصطفےٰ پاشا اور دوسرے وزرار کے پاس بھیجا اور انھیں یہ سمجھایا کہ مفتی اعظم اور قباقچی اوغلو نے صرف اپنی قوت اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے فوج میں شورش برپا کر رکھی ہے، اور فوج کے بھروسہ پر حکومت کے تمام نظم ونسق کے مالک بنے ہوئے ہیں، بیرقدار نے ابھی اپنے اصلی مقصد یعنی سلیم کو دوبارہ تخت پر بٹھانے کی تجویز کو بالکل مخفی رکھا تھا، اور صدر اعظم وغیرہ پر محض یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ صرف مفتی اعظم اور قباقچی اوغلو کو سزا دینا چاہتا ہی، چونکہ صدر اعظم کے اختیارات بھی ان دونوں کی وجہ سے پامال ہو رہے تھے اس لئے وہ بیرقدار سے مل گیا، اور قباقچی اوغلو کے قتل کا حکم دیدیا، چنانچہ وہ رات کے وقت اپنے محل میں قتل کر دیا گیا،

سلیم کا قتل اس اثنار میں بیرقدار ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ قسطنطنیہ کے قریب پہنچ چکا تھا، اُس نے متعدد اعیانِ حکومت کو طلب کرکے باغی فوج کی بیخ کنی اور سلطنت میں امن وامان قائم کرنے کا حلف لیا، اس کے بعد وہ فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، سلطان مصطفےٰ نے یہ سمجھ کر کہ مظاہرہ مفتی اعظم اور ینگچی فوج کے خلاف ہے مفتی کو برطرف کر دیا، اور اس فوج کو توڑ دینے کا حکم دیا، مگر بہت جلد

اُسے معلوم ہو گیا کہ بیرقدار کا اصلی مقصد کیا ہی، چنانچہ فوراً محل کا پھاٹک بند کر لیا گیا اور شاہی دستہ مدافعت کے لئے تیار ہو گیا، بیرقدار نے حملہ کا حکم دیا اور تھوڑی دیر میں محل کے اندر داخل ہو گیا، لیکن اسی درمیان میں مصطفےٰ نے سلیم اور اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمود دونوں کے قتل کا حکم دیدیا تھا، وہ جانتا تھا کہ ان کے بعد تنہا وہی سلطنت کا وارث باقی رہجائیگا، اور پھر کسی عثمانی کو اُسے قتل یا معزول کرنے کی جرأت نہ ہو گی، چنانچہ قبل اس کے کہ بیرقدار محل کے اُس حصہ میں پہنچ سکے، جہاں سلیم نظر بند تھا، مصطفےٰ کے جلادوں نے سلیم کا کام تمام کر دیا، سلیم اتنا طاقتور تھا کہ وہ بغیر کسی ہتھیار کے ان جلادوں کا مقابلہ کرتا رہا، اور ان میں سے کئی ایک کو مار کر گرا دیا، لیکن آخر میں قلب پر ایک کاری ضرب لگنے کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکا، اور جلادوں نے اُس کے گلے میں پھندا ڈال کر اُسے ختم کر دیا، اگر یہ مقابلہ چند منٹ اور جاری رہتا تو بیرقدار وہاں پہنچ گیا ہوتا، اور سلیم کی جان بچ جاتی، جب بیرقدار نے محل میں داخل ہو کر سلیم کو ہر طرف تلاش کرنا شروع کیا تو جلادوں نے اُس کی لاش اُس کے سامنے پھینک دی اور پکار کر کہا۔ "لو جسے تم تلاش کر رہے ہو وہ یہ ہے"۔ بیرقدار اپنے بادشاہ کی لاش پر گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، قپودان پاشا سعید علی قریب ہی کھڑا ہوا تھا، اُس نے بیرقدار کا شانہ ہلا کر کہا کہ "یہ وقت انتقام کا ہی، رونے کا نہیں ہی"۔ یہ سنتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اور اُس ایوان میں آیا، جہاں سلطان مصطفےٰ اپنے عہد حکومت کے آخری لمحات نہایت سراسیمگی کی حالت میں گذار رہا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ "تو یہاں کیا کرتا ہی، یہ جگہ اس شخص کے لئے خالی کر جو تجھ سے زیادہ اس کا مستحق ہی" بیرقدار نے اُسے کھینچ کر تخت سے اُتار دیا،

مصطفٰے نے سلیم اور محمود دونوں کے مار ڈالنے کا حکم دیا تھا، چنانچہ سلیم تو ختم کر دیا گیا، لیکن محمود کی جان بچ گئی، اُس کے ایک وفادار غلام نے اُسے حمام کے آتشدان میں ایسی ہوشیاری سے چھپا دیا تھا کہ جلاد اُس کی تلاش میں آخر وقت تک ناکام رہے، یہاں تک کہ بیرقدار کے سپاہیوں کے محل میں داخل ہونے کے بعد جلادوں کو خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ محمود کی تلاش سے مایوس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے

مصطفٰے کی معزولی

اُسی روز دہم جمادی الاولیٰ ۱۲۲۳ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۰۸ء سلطان مصطفٰے کی معزولی اور شہزادہ محمود کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا، چند دنوں کے بعد مصطفٰے قتل کر دیا گیا تاکہ پھر کوئی فتنہ برپا نہ ہو،

تاریخی کتابیں

تاریخ اسلام حصہ اوّل، (از آغاز اسلام تا حضرت حسنؓ) اس کتاب میں عرب قبل از اسلام کے حالات اور ظہور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی اسلام کی مذہبی، سیاسی، اور تمدنی تاریخ ہی، مرتبہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ضخامت ۳۰۷ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ صقلیہ اوّل، مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کی طرح اس کو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا اور تقریبًا پانچسو برس تک اس سے وابستہ رہی، مگر افسوس ہی کہ اسکی کوئی تاریخ اُردو، انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اسکی تاریخ مرتب کیگئی ہی، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام عہد بعہد کے دوروں کا عروج اور مسلمانوں کے مصائب اور جلاوطنی کا مرقع دکھایا گیا ہی، قیمت للعہ ۵۴۶ صفحے

تاریخ صقلیہ دوم، یہ سسلی کے اسلامی عہد کا تمدنی مرقع ہی، کتاب چند ابواب میں ہی، پہلے مسلمانانِ صقلیہ کے قبائلی حالات، اسلامی آبادیاں، اسلامی عہد کی زبان، ادیان، مذاہب اور باشندوں کے اخلاق و عادات کا ذکر ہے، پھر نظام حکومت کی تفصیل ہے، جس میں اس کے مختلف شعبوں اور ان کے اعمال کا ذکر ہے، پھر معاشی حالات کا بیان ہی، جن میں مسلمانوں کی صنعت و حرفت زراعت اور تجارت کا بیان ہی، اس کے بعد علوم و آداب کا تذکرہ ہے جس میں مختلف علوم، قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ، کلام، مناظرہ، شعر و شاعری، علوم عقلیات، ریاضیات و طبعیات کا تذکرہ ایک ایک فصل میں ہے، اور ان ہی میں مفسرین، محدثین، فقہا، صوفیہ، متکلمین، ادبا، اور شعرا کے مفصل سوانح حیات، ان کی تصنیفات اور کلام نثر و نظم کا ذکر ہے، آخری باب سسلی کے اسلامی تمدن سے یورپ کے استفادہ کے متعلق ہی، قیمت للعہ ۵۰۰ صفحے،

تاریخ اخلاق اسلامی، اس میں اسلامی تاریخ کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتوں سے نقد و تبصرہ ہے،

مصنفہ مولٰنا عبد السلام ندوی ضخامت ۲۷۶ صفحے، قیمت: ؏

مختصر تاریخ ہند، ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالبعلموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت: ؏

ہماری بادشاہی، ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچوں کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت: ؏

ہندوستان کی کہانی، ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان میں لکھا گیا ہے تاکہ ہمارے مکتبوں اور ابتدائی مدرسوں کے بچے اسکو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکیں، ضرورت ہے کہ یہ رسالہ چھوٹے بچوں کے نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ ان کو معلوم ہو کہ وہ کون تھے اور اب کیا ہیں؟ ضخامت ۷۶ صفحے قیمت ۱۲/

از مولوی عبد السلام قدوائی ندوی،

مسعود علی ندوی **منیجر** **دار المصنفین اعظم گڈھ**

(طابع محمد ادریس وارثی)